# اِنتساب

محترمی و مکرمی عالی جناب نواب سرور علی خاں بہادر
فیروز جنگ۔ سابق والیِ ریاست کورِوائی (وسطِ ہند)

کے نام

جن کی محبت کا نقش میرے دل پر ہمیشہ قائم رہیگا

نیاز مند
سلیم چشتی

# فہرست مضامین

# حصۂ اوّل

# مُسافر

## مُقدمہ

### وجہ تسمیہ

۱۹۳۳ء میں اقبال نے نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا سفر کیا تھا۔ واپسی پر اپنے تاثرات قلمبند کر کے "مسافر" کے نام سے شائع کئے۔ پہلا ایڈیشن جیبی سائز پر نومبر ۳۴ء میں جداگانہ شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۳۶ء میں اس کو "مثنوی پس چہ باید کرد" کے ساتھ شائع کیا گیا۔

### تقریبِ سفر

امان اللہ خاں کے عہدِ حکومت تک افغانستان میں قدیم نصابِ تعلیم مروّج تھا جب نادر شاہ برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے یہ چاہا کہ اس ملک کے باشندے مغربی علوم و فنون سے بھی آگاہی حاصل کریں۔ اس لئے انہوں نے علامہ مرحوم، سر راس مسعود مرحوم اور مولینا سید سلیمان ندوی مرحوم کو مدعو کیا کہ تدوینِ نصاب میں مشورہ دیں۔ فرضِ منصبی سے فارغ ہو کر علامہ نے غزنی اور قندہار

کی سیاحت بھی کی۔ بعد ازاں لاہور واپس آئے۔

## نادر شاہ کے سوانح حیات

نادر شاہ کا اصلی نام نادر خاں تھا۔ امان اللہ خاں کے عہدِ حکومت میں وہ سپہ سالار ہو گئے۔ پھر وزیرِ جنگ ہو گئے۔ جب ۱۹۲۹ء میں امان اللہ خاں کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا تو اس وقت وہ فرانس میں تھے۔ امان اللہ خاں کے جانے کے بعد ملک میں ہر طرف بدنظمی رونما ہو گئی۔ اس لئے ان کے جانشین عنایت اللہ خان نے بھی مجبوراً دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اس خلفشار میں ایک معمولی شخص بچۂ سقہ نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ اور حبیب اللہ خاں کا لقب اختیار کر کے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

جنرل نادر خاں نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور یورپ سے واپس آکر کچھ فوج فراہم کی اور اکتوبر ۲۹ء میں بچۂ سقہ کو شکست دی اور نادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت بہت جلد سارے ملک میں امن و امان قائم کر دیا۔ مگر نومبر ۱۹۳۳ء میں ایک افغان نوجوان نے انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا ظاہر شاہ تخت نشین ہوا۔ جو تا ایندم برسرِ حکومت ہے۔

## خلاصۂ مثنوی

ناظرین کی سہولت کے لئے ذیل میں اس مثنوی کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

تمہید میں اقبال نے نادر شاہ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا ہے اس کے بعد اپنی طلبی کا تذکرہ لکھا ہے اور آخر میں اپنی روانگی کا حال قلمبند کیا ہے۔

دوسری فصل میں اقوامِ سرحد سے خطاب کیا ہے۔ اس کے ضمن میں دینِ اسلام کی حقیقت بیان کی ہے اور افغانوں کو قرآن و حدیث کے مطالعہ کی دعوت دی ہے

جس کی بدولت غیر اللہ سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔
تیسری فصل میں نادر شاہ سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔
چوتھی فصل میں شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضری کی طرف اشارہ کیا ہے۔
پانچویں فصل میں حکیم سنائیؒ کے مزار پر حاضری کا تذکرہ کیا ہے۔
چھٹی فصل میں حکیم موصوف کی زبان سے فقر کا فلسفہ سپرد قلم کیا ہے۔
ساتویں فصل میں سلطان محمود غزنوی کے مزار پر حاضری کا حال لکھا ہے۔
آٹھویں فصل میں "مرد شوریدہ" کے پردے میں مسلمانوں کی حالتِ زار پر ماتم کیا ہے اور خدا سے یہ دعا کی ہے کہ ان کے دلوں میں پھر عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا کر دے تاکہ دنیا میں دوبارہ سر بلند ہو سکیں۔
نویں فصل میں قندھار کے سفر کی طرف اشارہ کیا ہے اور "خرقۂ مبارک" کی زیارت کا تذکرہ قلمبند کیا ہے۔
دسویں فصل میں احمد شاہ ابدالی کے مزار کی زیارت کا حال لکھا ہے۔
آخری فصل میں ظاہر شاہ سے خطاب کیا ہے اور اسے رموزِ سلطانی سے آگاہ کیا ہے۔
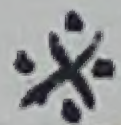
*

# آغازِ کتاب

## تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نادرِ افغاں شہِ درویش خو — رحمتِ حق بر روانِ پاکِ او
کارِ ملت محکم از تدبیرِ او — حافظِ دینِ مبیں شمشیرِ او
چون ابوذرؓ خود گداز اندر نماز — ضربتش ہنگامِ کیں خارا گداز
عہدِ صدیقؓ از جمالش تازہ شد — عہدِ فاروقؓ از جلالش تازہ شد
از غمِ دیں در دلش چوں لالہ داغ — در شبِ خاور وجودِ او چراغ!
در نگاہش ہستیٔ اربابِ ذوق — جوہرِ جانش سراپا جذب و شوق
خسروی شمشیر و درویشی نگہ — ہر دو گوہر از محیطِ لاالٰہ!
فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است! — ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰ است!
این دو قوت از وجودِ مومن است — ایں قیام و آں سجودِ مومن است
فقر سوز و درد و داغ و آرزوست — فقر را در خوں تپیدن آبروست
فقرِ نادر آخر اندر خوں تپید — آفریں بر فقرِ آں مردِ شہید!
اے صبا اے رہ نوردِ تیز گام — در طوافِ مرقدش نرمک خرام
شاہ در خواب است پا آہستہ نہ — غنچہ را آہستہ تر بکشا گرہ

از حضورِ او مرا فرماں رسید　　آنکہ جانِ تازہ در خاکم دمید

سوختم از گرمیٔ آوازِ تو
اے خوش آں قومے کہ داند رازِ تو
از غمِ تو ملتِ ما آشناست
می شناسیم ایں نوا ہا از کجاست!
اے بہ آغوشِ سحابِ ما چو برق
روشن و تابندہ از نورِ تو شرق
یک زماں در کوہسارِ ما درخش
عشق را باز آں تب و تابے بہ بخش
تا کجا در بند ہا باشی اسیر
تو کلیمی راہِ سینائے بگیر

طے نمودم باغ و راغ و دشت و در　　چوں صبا بگذشتم از کوہ و کمر
خیبر از مردانِ حق بیگانہ نیست　　در دلِ او صد ہزار افسانہ ایست!
جادہ کم دیدم از و پیچیدہ تر　　یا وہ گردد در خم و پیچش نظر
سبزہ وامانِ کہسارش مجوئے　　از ضمیرش بر نیاید رنگ و بوئے
سر زمینے کبکِ او شاہیں مزاج　　آہوئے او گیرد از شیراں خراج!
در فضایش جرّہ بازان تیز چنگ　　لرزہ بر تن از نہیبِ شاں پلنگ!
لیکن از بے مرکزی آشفتہ روز　　بے نظام و ناتمام و نیم سوز!
فرِّ بازاں نیست در پروازِ شاں　　از تدرواں پست تر پروازِ شاں!
آہ قومے بے تب و تابِ حیات　　روزگارش بے نصیب از واردات!
آں یکے اندر سجود، ایں در قیام　　کاروبارش چوں صلواتِ بے امام!

ریز ریز از سنگِ او مینائے او
آہ! از امروزِ بے فردائے او!

## اشعار ۱ تا ۶

تمہید کے پہلے چھ شعروں میں اقبالؔ نے نادر شاہ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) اس کی زندگی میں درویشی کا رنگ نظر آتا ہے۔

(۲) اس کی حسنِ تدبیر کی بدولت افغانوں کو استحکام نصیب ہوا اور وہ دینِ اسلام کا محافظ ہے۔

(۳) اس کی نمازوں میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی خشیت اور خود گدازی کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن میدانِ جنگ میں اس کی تلوار خارا گداز ہے۔

(۴) وہ مسلمانوں پر رحیم ہے مگر ملّت کے دشمنوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے۔ اس نے اپنی شانِ جمال سے حضرت صدیقِ اکبرؓ اور شانِ جلال سے حضرت فاروقِ اعظمؓ کا زرّیں عہد تازہ کر دیا۔

(۵) وہ ہر وقت دین کے غم میں کڑھتا رہتا ہے اور مشرق کی تاریک رات میں اس کا وجود بمنزلۂ چراغ ہے۔

(۶) اس کی نگاہوں سے عاشقانِ الٰہی کی مستی ٹپکتی ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کا خمیر عشق و محبت سے تیار ہوا ہے۔

حضرات صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ تو غایتِ شہرت کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ حضرتِ ابوذر غفاریؓ کے مختصر حالات ذیل میں درج کرتا ہوں۔

ان کا اصلی نام جندبؔ تھا۔ ابوذر کنیت ہے۔ "مسیح الاسلام" لقب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا "میری اُمت میں ابوذرؓ میں عیسٰی بن مریمؑ جیسا زہد پایا جاتا ہے"۔

جاہلیت میں نہایت مشہور رہزن تھے۔ لیکن رحمتِ حق نے ان کی دستگیری کی۔ جس کی تفصیل خود ان کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جب میں نے سنا کہ مکّہ میں

کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔

اسلام لانے والوں میں ان کا پانچواں نمبر ہے۔ قبولِ اسلام کے بعد حضورؐ کے حکم سے اپنے قبیلہ میں واپس آئے اور ان کی تبلیغی کوششوں سے نصف قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ جب حضورؐ نے ہجرت فرمائی تو یہ بھی مدینہ آگئے اور دن رات حضورؐ کی خدمت کرنے لگے۔

حضرت ابوذرؓ فطرتاً زہد پیشہ اور تارک الدنیا تھے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کی وفات کے بعد مدینہ سے شام چلے گئے۔ لیکن شامی مسلمانوں کے طرزِ عمل سے دل برداشتہ ہو گئے کیونکہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے لوگوں میں عیش و عشرت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت ابوذرؓ سب کو اپنی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے مشرب میں زائد از ضرورت دولت جمع کرنا اور قیمتی لباس زیب تن کرنا جائز نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے علانیہ ایسے مسلمانوں کو اس آیت کا مورد قرار دیا۔

"وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝"

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپؐ ان لوگوں کو دردناک عذاب کی بشارت دیدیجیے۔

امیر معاویہؓ نے ان کو مدینہ بھجوا دیا۔ لیکن یہاں بھی نہ رہ سکے۔ اس لئے مکہ کے قریب ایک گاؤں (ربذہ) میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں ۳۱ھ میں وفات پائی۔ حضرتِ ابوذرؓ زہد و ورع، تقویٰ، حق گوئی، توکل اور قناعت میں تمام صحابہؓ میں ممتاز تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالیہ میں جو مقام انہیں حاصل تھا اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مرض الموت میں ان کو طلب فرمایا۔ جب حاضرِ خدمت ہونے اس وقت حضور صلعم لیٹے ہوئے تھے۔ ابوذرؓ حضور صلعم کے اوپر جھک گئے۔ حضورؐ نے ہاتھ بڑھا کر انہیں سینۂ مبارک

سے چھپا لیا۔ ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔

## اشعار ۷ تا ۱۰

ان اشعار میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ انسان میں شانِ جمال اور شانِ جلال کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ان کا منبع کہاں ہے؟ کہتے ہیں کہ خسروی (شانِ جلال) نام ہے بزور شمشیر اجسام (مادیات) کی تسخیر کا یعنی بادشاہ تلوار کے زور سے انسانوں کے اجسام پر حکومت کرتا ہے، اور درویشی (شانِ جمال) کہتے ہیں انسانوں کے قلوب پر حکومت کرنے کو۔ یعنی درویش کی نگاہ میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ وہ جسے ایک نظر بھر کے دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ؎

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

(بالِ جبریل)

اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ خسروی اور درویشی، یہ وہ موتی ہیں جو لا الہ کے سمندر سے نکلتے ہیں یعنی اگر انسان حقیقی معنی میں موحد ہو جائے تو اس میں یہ دونوں شانیں پیدا ہو جاتی ہیں اور چونکہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم موحدین عالم کے سردار ہیں (آپؐ اوّل المسلمین ہیں) اور سب سے بڑے موحد ہیں اس لئے فقر اور شاہی (خسروی اور درویشی) آپؐ کی دو شانیں (واردات) ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ آپؐ کی ذات کی تجلیات ہیں۔ حق نے آپؐ کو ان دونوں شانوں کا مظہر اتم بنایا ہے۔ اس لئے جو شخص ان دونوں شانوں کو اپنے اندر جمع کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ آپ کی اتباع کرے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ ان دونوں قوتوں کا ظہور مومن کے وجود پر موقوف ہے۔ یعنی جب تک کوئی شخص حضورؐ کی غلامی اختیار نہ کرے اس میں یہ دونوں

شانیں بیک وقت جلوہ گر نہیں ہو سکتیں۔ جس طرح نماز نام ہے قیام اور سجود کا
اسی طرح مومن کی زندگی عبارت ہے خسروی (جلال) اور درویشی (جمال) سے۔
آخر میں فقر کی تعریف بیان کرتے ہیں کہ فقر، سوز، درد، داغ اور آرزو
(عشق) کا نام ہے۔ بالفاظِ دگر فقر عشقِ الٰہی کا ثمرہ ہے۔ اور فقیر (عاشق) کی زندگی
کی معراج یہ ہے کہ وہ راہِ خدا میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ کیونکہ شہادت ہی سے[1]
اسے عزت (آبرو) حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے۔

## اشعار ۱۱۲ تا ۱۱۳

ان اشعار میں اقبال نے نادر شاہ کی شہادت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا
یہ اشعار بطور جملۂ معترضہ لکھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مرحوم نے دین و ملت کی راہ میں
درجۂ شہادت حاصل کیا۔

اس کے بعد اقبال نے یہ لکھا ہے کہ نادر شاہ نے مجھے کابل آنے کی دعوت
دی، اور دعوت نامہ کا مضمون یہ تھا۔

"میں نے آپ کے کلام (آواز) کا مطالعہ کیا ہے۔ اور میں آپ کی ملت
پروری اور جذبۂ دینی سے بہت متاثر ہوں۔ بلاشبہ وہ قوم بہت مبارک ہے جو آپکے
خیالات (راز) سے آگاہی حاصل کرلے۔ ہماری قوم آپ کے جذبۂ دینی (غم) سے
بخوبی واقف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کے افکار کا سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ اس
لئے ہم چاہتے ہیں کہ آپ چند روز کے لئے کابل تشریف لائیں تاکہ ہم اور ہماری
قوم کے افراد آپ کے خیالات سے مستفید ہو سکیں۔"

آخری اشعار میں اپنے سفر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور ضمناً افغانوں

---

[1] اور چونکہ فقر کی تشریح مثنوی "پس چہ باید کرد" کی شرح میں لکھوں گا اس لئے
یہاں عمداً اس کی تشریح سے احتراز کیا ہے۔

کی "بے مرکزی" پر اظہارِ افسوس بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے مستقر سے روانہ ہو کر درّہ خیبر پہونچا (کابل جانے کا یہی راستہ ہے)۔ اس کے بعد قارئین سے اس درّہ کا تعارف کراتے ہیں۔ کہ یہ درّہ وہ ہے جس میں سے ہو کر بہت سے مردانِ حق ہندوستان آئے۔ "مردانِ حق" سے وہ صوفیائے کرام بھی مراد ہیں جو یہاں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں آئے۔ مثلاً حضرت شیخ علی ہجویری الملقب بہ داتا گنج بخش رح سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین اجمیری رح۔ قطب الاقطاب حضرت خواجہ بختیار کاکی رح۔ مخدوم جہانیاں حضرت سیّد جلال بخاری رح؛ امیر کبیر سیّد علی ہمدانی رح۔ اور حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی رح وغیرہم۔ نیز اُن فاتحین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے یہاں آ کر فتوحات حاصل کیں مثلاً سلطان محمود غزنوی سلطان شہاب الدین غوری، بابر اور احمد شاہ ابدالی وغیرہم۔

اس کے بعد اس خطّہ کے باشندوں (افغانوں) کی حالت پر تبصرہ کیا ہے۔ کہ اگرچہ یہ لوگ بہت بہادر ہیں مگر اتحاد و اتفاق کی نعمت سے محروم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

*

# فصلِ دوم

## خطاب بہ اقوامِ سرحد

اے زخود پوشیدہ خود را باز یاب ۔۔۔ در مسلمانی حرام است ایں حجاب!

رمزِ دینِ مصطفیٰ دانی کہ چیست ۔۔۔ فاش دیدن خویش را شاہنشہی است!

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش ۔۔۔ زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

آن مسلمانے کہ بیند خویش را ۔۔۔ از جہانے برگزیند خویش را

از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست ۔۔۔ تیغِ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ اوست

در مکان و لامکاں غوغائے او ۔۔۔ مہ سپہر آوارہ در پہنائے او

تا دلش سرے ز اسرارِ خدا است ۔۔۔ حیف اگر از خویشتن ناآشنا است

بندۂ حق وارثِ پیغمبراں ۔۔۔ او نگنجد در جہانِ دیگراں

تا جہانے دیگرے پیدا کند ۔۔۔ ایں جہانِ کہنہ را برہم زند

زندہ مرد از غیرِ حق دارد فراغ ۔۔۔ از خودی اندر وجودِ او چراغ!

پائے او محکم برزمِ خیر و شر ۔۔۔ ذکرِ او شمشیر و فکرِ او سپر

صبحش از بانگے کہ برخیزد ز جاں ۔۔۔ نے ز نویدِ آفتابِ خاوراں!

فطرتِ او بے جہات اندر جہات ۔۔۔ او حریم و در طوافش کائنات

ذرۂ از گردِ راہش آفتاب ۔۔۔ شاہد آمد بر عروجِ او کتاب

فطرتِ او را گشاد از ملت است ۔۔۔ چشمِ او روشن سواد از ملت است!

اندکے گم شو بقرآن و خبر — باز اے ناداں بخویش اندر نگر
در جہاں آوارۂ بیچارۂ — وحدتے گم کردۂ صد پارۂ
بندِ غیر اللہ اندر پائے تست — داغم از داغے کہ در سیمائے تست
ہیر خیل از مکرِ پنہانی بترس — از ضیاعِ روحِ افغانی بترس!
ز آتشِ مردانِ حق می سوز مت — نکتۂ از پیرِ روم آموز مت

"رزق از حق جو مجو از زید و عمر
مستی از حق جو مجو از بنگ و خمر
گل مخور گل را مخور گل را مجو
زانکہ گل خوار است دائم زرد رو
دل بجو تا جاوداں باشی جواں
از تجلی چہرہ ات چوں ارغواں
بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند
چون جنازہ نے کہ بر گردن برند"

شکوہ کم کن از سپہرِ لاجورد — جز بگردِ آفتاب خود مگرد
از مقامِ ذوق و شوق آگاہ شود — ذرۂ؟ صیادِ مہر و ماہ شو!
عالمِ موجود را اندازہ کن — در جہاں خود را بلند آوازہ کن
برگ و سازِ کائنات از وحدت است — اندریں عالم حیات از وحدت است
درگذر از رنگ و بو ہائے کہن — پاک شو از آرزو ہائے کہن
ایں کہن ساماں نیرزد با دو جو — نقش بند آرزوئے تازہ شو
زندگی ہم آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس
چشم و گوش و ہوش نیز از آرزو — مشتِ خاکے لالہ خیز از آرزو
ہر کہ تخمِ آرزو در دل نہ کشت — پائمالِ دیگران چوں سنگ و خشت!
آرزو سرمایۂ سلطان و میر — آرزو جامِ جہاں بینِ فقیر

آب و گل را آرزو آدم کند … آرزو ما را ز خود محرم کند
چوں شرار از خاکِ ما بر می جہد … ذرّہ را پہنائے گردوں می دہد!
پورِ آذر کعبہ را تعمیر کرد … از نگاہے خاک را اکسیر کرد
تو خودی اندر بدن تعمیر کن
مشتِ خاکِ خویش را اکسیر کن

## تمہید

اس فصل میں اقبال نے مسلمانانِ ہم عصر کو یہ پیغام دیا ہے کہ اگر دنیا میں عزت کی زندگی مطلوب ہے تو اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کرو۔ یعنی یہ معلوم کرو کہ دنیا میں تمہارا مقام اور منصب کیا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تمام اقوامِ عالم کا سردار اور رہنما بنایا ہے جس پر یہ آیت گواہی دے رہی ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۞ (۳-۱۱)

"تم بہترین اُمت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ تم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو۔"

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلائیں اور برائی سے باز رکھیں۔ ادنیٰ تامل سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ وہ اس فرض کو اسی وقت انجام دے سکتے ہیں۔ جب ان کے پاس طاقت (حکومت) ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کو دنیا کی قوموں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے اسلام اور غلامی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طاقت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ اللہ تم نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ میرے سوا کسی سے مت ڈرو اور اس بات پر یقین رکھو کہ تمہاری زندگی اور موت کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ دنیا میں میرے سوا کوئی تم پر حکمراں یا قاہر نہیں ہے۔ اگر تمہارے اندر ایمان و یقین کامل پیدا ہو جائے تو کوئی طاقت تمہیں مغلوب نہیں کر سکتی۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔

اور یقیناً تم غالب رہو گے اگر تم اپنے اندر ایمان پیدا کر لو۔ یہاں پر کس بات پر ایمان مطلوب ہے؟ اس بات پر کہ اللہ کے سوا کائنات کی کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

واضح ہو کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ انسان کے اندر بے پناہ طاقت اور حوصلہ، ہمت اور شجاعت پیدا کر دیتا ہے۔ جب کہ ایک مسلمان کے دل میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اللہ تم کے سوا کائنات میں کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے تو وہ کسی شئی سے نہیں ڈر سکتا۔ چنانچہ اقبالؔ نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

از ضمیر کائنات آگاہ اوست
تیغ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ" اوست

اس شعر سے پہلے شعروں میں اقبالؔ نے یہ کہا ہے کہ

(۱) اے مسلمان! تو اپنے آپ سے پوشیدہ ہے۔ اس لئے "خود را باز یاب"

(۲) اسلام کی روح یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو دیکھ لے تو کائنات پر حکمراں ہو جائے گا۔

(۳) دینِ اسلام کیا ہے؟ اپنے اسرار سے آگاہی حاصل کرنا۔ جو شخص اپنی حقیقت سے بیگانہ ہے وہ در اصل مُردہ ہے

(۴) جو مسلمان اپنے آپ کو دیکھ لیتا ہے۔ یعنی اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو برگزیدۂ کائنات یقین کر لیتا ہے۔

(۵) وہ کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اسے اس بات کا یقین کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ"

اس شعر کے بعد اگلے دس شعروں میں اس شخص کی صفات بیان کی ہیں
چونکہ ان اشعار کا سمجھنا اس نکتہ کے سمجھ لینے پر موقوف ہے کہ اللہ کے سوا کائنات میں کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس جگہ اس نکتہ (لا موجود الا اللہ) کی تشریح درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد فصل کا مطلب بیان کریں گے۔
واضح ہو کہ اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں اس عقیدہ کو مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی شئی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔
اس عقیدہ کو اصطلاح میں وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔
ذیل میں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی ۔ کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی ۔ تلاش خود کنی جز او نیابی
(پیام مشرق صفحہ ۲۳)

نہ آغاز خود نہ کس را خبر نیست ۔ خودی در حلقۂ شام و سحر نیست
ز خضر این نکتہ نادر شنیدم ۔ کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست
(ایضاً)

بانگ درا میں لکھتے ہیں۔
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں ۔ کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں ۔ پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ ۔ چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے
(بانگ درا ۔ صفحہ ۱۹۲)

زبورِ عجم سنہ ۱۹۲۷ء میں لکھتے ہیں:۔

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است     این گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

---

بکنارت آرمیدم تو بہ شیِ خود نمائی     بکنارہ بر فگندی دُرِ آب دارِ خود را

---

کشائے پردہ ز تقدیرِ آدمِ خاکی     کہ ما بہ رہگذرِ تو در انتظارِ خودیم

---

اگر زیری ز خود گیری زبر شو     خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

---

رموزِ بیخودی (سنہ ۱۹۱۸ء) میں لکھتے ہیں:۔

بر سرِ این باطلِ حق پیرہن     تیغِ "لاموجود الا ھو" بزن

---

ضربِ کلیم (سنہ ۱۹۲۶ء) میں لکھتے ہیں:۔

خودی ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری ۔ نہ ہے زمان و مکاں لا الٰہ الا اللہ

---

بالِ جبریل (سنہ ۱۹۲۵ء) میں لکھتے ہیں:۔

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات     خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

---

جاوید نامہ (سنہ ۱۹۳۲ء) میں لکھتے ہیں:۔

لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ     فاش تر خواہی؟ بگو ھو عبدہٗ

---

ارمغانِ حجاز (سنہ ۱۹۳۷ء) میں لکھتے ہیں:۔

تو اے نادان دلِ آگاہ دریاب     بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب

جہاں مومن کند پوشیدہ راناش ز "لاموجود الا اللہ" دریاب

خطباتِ مدراس (مذہبی فکر کی تشکیلِ جدید) میں لکھتے ہیں :-

"یہ کائنات اپنی تمام جزئیات و تفصیلات میں سالماتِ مادی سے لیکر انسانی خودی میں فکر کی آزاد حرکت تک انا لے کبیر (حق تعالیٰ) کا جلوۂ ذات ہے۔"

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ص ۱۲۸ تا صفحہ ۱۹۳

اسرارِ خودی (سنہ ۱۹۱۵ء) میں لکھتے ہیں :-

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

ان اشعار سے ثابت ہوا کہ اقبال نے از اول تا آخر اپنی تمام تصانیف میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔

(ب) اقبال کے مرشد مولانا رومؒ نے بھی یہی تعلیم دی ہے :-

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

ما ہے کہ نہ زیرد نے ببالاست کجاست جائے کہ نہ بے ما و نہ با ماست کجاست

اینجا آنجا مگو، بگو راست کجاست عالم ہمہ اوست آنکہ بیناست کجاست

(ج) عارف جامیؒ لکھتے ہیں :-

پس عالم، ظاہر حق است و حق، باطنِ عالم۔ عالم پیش از ظہور عینِ حق بود حق بعد از ظہور عین عالم۔ فی الحقیقت یک حقیقت است و ظہور و بطون و اولیت و آخریت، النسب و اعتبارات او بید کما قال اللہ تعالیٰ۔

ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

ہمسایہ و ہمنشیں و ہمرہ ہمہ اوست در دلقِ گدا و اطلسِ شہ ہمہ اوست

در انجمنِ فرق و نہاں خانہ جمع باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

(لوائح لمعنۃ دوم)

(ھ) خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ فرماتے ہیں :-

بشناس کہ کائنات رو در عدم اند
بل در عدم ایستادہ ثابت قدم
ایں کون معلق از خیال و وہم است
باقی ہمگی ظہورِ نورِ قدم

---

حضرت مولٰینا شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ لکھتے ہیں :-

" اللہ کی وحدانیت کے دو معنیٰ ہیں۔ علماء ظاہر کے نزدیک وحدانیت کے معنی یہ ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ معبود صرف ایک ہے دوسرا کوئی معبود نہیں۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک وحدانیت کے معنی یہ ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ موجود صرف ایک ہے دوسرا کوئی موجود نہیں۔ آیات قرآنی میں دونوں قسم کی وحدانیت کا ذکر موجود ہے۔ منجملہ ان آیات کے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جاننا چاہیئے کہ صرف ایک (ذاتِ حق) موجود ہے۔ پہلی آیت یہ ہے :-

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

پس تم جب طرف رخ کرو وہیں اللہ کا موجود ہونا تحقیق کہ اللہ صاحب وسعت اور صاحب علم ہے۔

دوسری آیت یہ ہے :-

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۔

اور نہیں تیر چلایا آپؐ نے جب تیر چلایا آپؐ نے بلکہ اللہ نے تیر چلایا۔

تیسری آیت :-

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شیٔ ہالک ہے۔ یعنی بالفعل معرضِ فنا میں ہے۔

نوٹ :- امام غزالیؒ اس آیت کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "ہالک" اسم فاعل ہے۔ اور اسم فاعل میں زمانہ نہیں پایا جاتا۔ اس لئے اس آیت کا یہ مطلب

نہیں ہے کہ ہر شئی آئندہ زمانہ میں فنا ہوگی بلکہ اس وقت بھی معرضِ فنا میں ہے
یعنی حقیقی معنیٰ میں ذاتِ حق کے سوا کوئی شئی موجود نہیں ہے۔

چوتھی آیت:۔

اللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا الخ

یعنی حقیقی معنیٰ میں صرف وہی موجود ہے۔

پانچویں آیت:۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ۝ وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ۝

جو زمین پر ہے سب فانی ہے صرف ذات آپ کے رب کی باقی ہے جو صاحب
عظمت واکرام ہے۔

چھٹی آیت:۔

سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ
لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ۝

اور دکھا دیں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں ملکوں میں اور ان کی ذاتوں میں یہاں
تک کہ ظاہر ہو جائیگا ان پر کہ یہ حق ہے آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہر شئی پر محیط ہے۔

ساتویں آیت:۔

ھُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

وہی اللہ اول ہے اور آخر ہے اور ظاہر ہے اور باطن ہے اور وہ ہر شئی کا
علم رکھتا ہے۔

آٹھویں آیت:۔

وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ

اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو

نویں آیت:۔

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ۔

ہم انسان سے اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

دسویں آیت :۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡهِمۡ ط

بلا شبہ جو لوگ آپؐ سے بیعت کرتے ہیں سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

گیارہویں آیت :۔

مَا یَکُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمۡ وَلَا خَمۡسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمۡ وَلَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكۡثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمۡ اَیۡنَ مَا كَانُوۡا ۚ

نہیں ہوتا ہے مشورہ تین شخصوں میں مگر اللہ ان میں چوتھا ہے۔ اور نہیں ہوتا مشورہ پانچ شخصوں میں مگر اللہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔ خواہ لوگ کم ہوں یا زیادہ، اللہ ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔ (ترجمہ فتاویٰ عزیزیہ جلد دوم ص۵۸ تا ص۶۲)۔ نیز اسی جلد کے ص۲۴ پر لکھتے ہیں :۔

جاننا چاہیے کہ وحدت الوجود کا قائل ہونا ایسے طور پر کہ احکام شرع کے خلاف نہ ہو، عین ایمان و اسلام[1] ہے۔ اس میں کفر کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یعنی تمام موجودات کو مظاہر حق جانے اور یہ سمجھے کہ وجود ایک ہے۔ لیکن وجود کے ہر مرتبہ کے لئے جداگانہ حکم ہے۔ مثلاً وجود بعض مراتب میں عبودیت کے ساتھ موصوف ہے اور بعض مراتب میں الوہیت کے ساتھ موصوف ہے۔ بعض مراتب میں حرام کے

---

[1] شاہ صاحب کے اس قول سے معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ، وحدت الوجود کی اس تعبیر کو تسلیم نہیں کرتے جو احکام شرع کے خلاف ہے۔ مثلاً شنکر اچاریہ اور اسپنوزا اور ہیگل نے وحدت وجود کی جو تعبیر پیش کی ہے چونکہ وہ احکام شرع کے خلاف ہے اس لئے کوئی مسلمان اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔

ساتھ اور بعض مراتب میں جلال کے ساتھ۔ بعض مراتب میں مظاہر کے ساتھ اور بعض میں نجس کے ساتھ وجود کے مراتب میں غلط نہ کرے اور یہ عقیدہ رکھے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد — گر فرقِ مراتب نکنی زندیقی (جامیؒ)

اور یہ بھی عقیدہ رکھے کہ عبد، بہرحال عبد رہے گا خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے اور رب، بہرحال رب رہے گا خواہ کتنا ہی تنزل کیوں نہ فرمائے۔[۱]

حضرات مشائخ کبار اور علماء نامدار نے ان سب امور کی تصریح فرمائی ہے قادریہ طریقہ کے مشائخ سے حضرت غوث اعظمؒ اور شیخ عبد الرزاقؒ کا یہی قول ہے اور چشتیہ طریقہ کے مشائخ سے حضرت سید گیسو درازؒ اور سید جعفر مکیؒ کا یہی ارشاد ہے اور نقشبندیہ طریقے کے مشائخ سے حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ، خواجہ عبداللہ احرارؒ، مولانا عبد الرحمن جامیؒ، مولانا عبد الغفور لاریؒ کا یہی فرمودہ ہے اور شیوخ عرب سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، شیخ صدر الدین قونویؒ، شیخ عبد الکریم جیلیؒ، شیخ ابراہیم کردیؒ، شیخ حسام الدین علی متقیؒ نے یہی تعلیم دی ہے۔ تو یہ جاننا کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ کفر ہے گویا ان تمام بزرگوں کی تکفیر ہے[۲]۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ (دیکھو ۲۴، صفحہ ۲۴۱)

---

[۱] یہ قول شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے اس قول کا ترجمہ ہے:-
وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ۔

[۲] ان بزرگوں کے علاوہ حسبِ ذیل اکابر اور علماء فحول نے بھی اسی عقیدہ کی تعلیم دی ہے شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ۔ حضرت مولانا عبد العلی بحر العلومؒ۔ حضرت خاتم الحکماء مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی مرحوم۔ حضرت مولانا عبد الحق خیر آبادی مرحوم۔ حضرت مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی مرحوم۔ شیخ العرب والعجم مرشدی حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب چشتی مہاجر مکیؒ۔ اور ان کے خلیفہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم۔ ۱۲

(ے) مولانا شبلی نعمانی مرحوم اپنی مشہور تصنیف "سوانح مولانا روم" میں لکھتے
ہیں کہ وحدت وجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ اور اہل ظاہر کے نزدیک
تو اس کے قائل کا وہی صلہ ہے جو منصور کو دار پر ملا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے
کہ وحدت وجود کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے مقدمات
ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہیئے۔

(۱) خدا قدیم ہے۔

(۲) قدیم حادث کی علت نہیں ہو سکتا ...... کیونکہ علت اور معلول کا
وجود ایک ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر علت قدیم ہو تو معلول بھی قدیم ہوگا۔

(۳) یہ عالم حادث ہے۔ اب نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا عالم کی علت نہیں ہو سکتا۔
کیونکہ خدا قدیم ہے۔ اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قدیم، حادث کی علت نہیں ہو سکتا۔

اس اعتراض سے بچنے کے لئے علمائے ظاہر نے یہ پہلو اختیار کیا کہ خدا کا ارادہ یا
ارادہ کا تعلق حادث ہے۔ اس لئے وہ عالم کی علت ہے۔ لیکن سوال پھر پیدا ہوتا
ہے کہ خدا کے ارادے یا ارادہ کے تعلق کی علت کیا ہے؟ کیونکہ جب ارادہ یا اس کا
تعلق حادث ہے تو وہ علت کا محتاج ہوگا اور ضرور ہے کہ یہ علت بھی حادث ہو کیونکہ
حادث کی علت، حادث ہی ہوتی ہے اور چونکہ علت حادث ہے تو اس کے لئے بھی
علت کی ضرورت ہوگی۔ اب اگر یہ سلسلہ الی غیر النہایہ چلا جائے (یعنی اگر اس سلسلہ
کی کہیں نہایت یا حد نہ ہو) تو غیر متناہی کا وجود لازم آتا ہے۔ جو متکلمین اور ارباب
ظاہر دونوں کے نزدیک محال ہے۔ اور اگر یہ سلسلہ کسی علت پر ختم ہو جائے تو ضرور
ہے کہ وہ علت قدیم ہو کیونکہ حادث ہوگی تو پھر سلسلہ آگے بڑھے گا۔ لیکن قدیم
ہونے کی صورت میں لازم آئے گا کہ قدیم حادث کی علت ہو جائے۔ اور یہ
صورت پہلے ہی باطل ثابت ہو چکی ہے۔ اس لئے تین صورتوں میں سے چارہ نہیں

(۱) یا تو یہ تسلیم کرو کہ عالم قدیم اور ازلی ہے اور اس کے باوجود خدا
کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن جب خدا بھی قدیم اور ازلی ہے تو ازلی چیز علت میں ہے

کسی ایک کو علت اور دوسری کو معلول کہنا ترجیح بلا مرجح ہے اور یہ محال ہے۔

(ب) یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عالم قدیم ہے اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔ لیکن یہ تو ملحدیوں اور دہریوں کا مسلک ہے جسے متکلمین قبول نہیں کر سکتے۔

(ج) لہٰذا تیسری صورت تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہ عالم قدیم ہے لیکن ذاتِ باری سے علیحدہ نہیں ہے بلکہ ذاتِ باری ہی کے مظاہر کا نام عالم ہے[۱]۔ حضراتِ صوفیہ کا یہی مذہب ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا، کیونکہ تمام مشکلات کی بنیاد اس پر ہے کہ عالم اور اس کا خالق دو جدا گانہ چیزیں ہیں اور ان میں معلول اور علت کا رشتہ ہے۔ غرض فلسفہ کی رو سے تو صوفیہ کے مذہب کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ البتہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوصِ قرآنی اس کے خلاف ہیں۔ لیکن یہ شبہ بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی آیتیں بکثرت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن، اول و آخر جو کچھ ہے خدا ہی ہے۔ مثلاً[۲]:-

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

(سوانح مولانا روم ص۲۰۴ تا ص۲۰۶)

(ذ) اب ہم عالم ربانی حضرت مجددِ الف ثانیؒ کے مکتوبات سے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ چونکہ حضرتِ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے دین کی تجدید و اصلاح کے لئے مامور فرمایا تھا۔ اس لئے ان کے قلم سے کوئی بات ایسی نہیں نکل سکتی

---

[۱] چنانچہ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں "وَاِنَّ الْعَالَمَ لَيْسَ اِلَّا تَجَلِّيَهٗ فِيْ صُوَرِ اَعْيَانِهِمُ الثَّابِتَةِ الَّتِيْ يَسْتَحِيْلُ وُجُوْدُهَا بِدُوْنِهٖ (خصوص الحکم۔ فص ابراہیمی) اور بلاشبہ یہ عالم نہیں ہے کوئی شی مگر تجلی ہے حق تعالیٰ کی اعیان ثابتہ کی ان صورتوں میں جن کا وجود تجلی کے بغیر محال ہے" گویا مولانا شبلیؒ مرحوم نے شیخ کی اس عبارت کا ترجمہ یا مفہوم بیان کر دیا ہے فافہم ۱۲

[۲] شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ نے اس مضمون کی گیارہ آیتیں اپنے جواب میں درج کر دی ہیں۔ ناظرین ان گیارہ آیتوں کو مدِ نظر رکھیں ۱۲۔

جو شریعت حقہ کے خلاف ہو۔ چنانچہ حضرت موصوف نے اس مسئلہ کی تعبیر اس انداز سے کی ہے جو شریعت کے مطابق ہے۔

(۱) مکتوب اوّل جلد دوم صہ ۴ پر لکھتے ہیں:۔

" وجود، مبدا ہر خیر و کمال ہے اور عدم، منشاء ہر نقص و شرارت ہے پس وجود صرف واجب کے لئے ثابت ہے اور عدم، نصیب ہر ممکن ہے تاکہ تمام خیر و کمال، واجب کی طرف عائد ہو اور تمام نقص و شرارت ممکن کی طرف راجع ہو ممکن کے لئے وجود ثابت کرنا اور اس سے خیر و کمال منسوب کرنا فی الحقیقت اسے حق تعہ کے مُلک اور مِلک میں شریک کرنا ہے۔ اگر علماء ظاہر اس نکتہ سے آگاہ ہوتے تو ممکن کے لئے وجود ثابت نہ کرتے۔"

(۲) مکتوب چہل و چہارم جلد دوم صہ ۸۰ پر لکھتے ہیں:۔

" حضرات صوفیہ جو وحدتِ وجود کے قائل ہیں تو اس سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ اشیاء حق تعہ سے متحد ہیں یا واجب (حق تعہ) ممکن ہو گیا ہے یا حق تعہ اشیاء میں حلول کر گیا ہے۔ یہ سب باتیں کفر اور الحاد ہیں[1] بلکہ ہمہ اوست کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء موجود نہیں ہیں، صرف حق تعہ موجود ہے۔ چنانچہ منصور نے جب انا الحق کہا تو اُس کی مراد یہ نہیں تھی کہ میں حق ہوں۔ یا حق کے ساتھ متحد ہو گیا ہوں بلکہ من نیستم، موجود حق است۔"

" اگرچہ صوفیہ کائنات کے وجودِ خارجی کو وہمی قرار دیتے ہیں۔ مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وجود وہمی، جس نے خارج میں نمود پیدا کر لیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ارتفاع وہم سے مرتفع ہو جائے بلکہ یہ وجود وہمی اور نمودِ خیالی چونکہ مصنوعِ حق ہے۔ اور اس کی قدرتِ کاملہ کا نقش ہے اس لئے زوال سے محفوظ ہے۔"

---

[1] حلول و اتحاد ایں جا محال است     کہ در وحدت دوئی عین ضلال است

مثنوی گلشنِ راز مؤلفہ علامہ محمود شبستری

نوٹ :۔ مطلب حضرت مجددِ الف ثانیؒ کا یہ ہے کہ خارج میں دراصل صرف حق تعالیٰ موجود ہے۔ کائنات بھی موجود نظر آتی ہے مگر اس کا وجود خارجی حقیقی نہیں ہے بلکہ وہمی ہے یعنی صرف وہم کے درجہ میں ہے۔ ہماری عقل اشیاء کو خارج میں موجود سمجھتی ہے جیسے کوئی بچہ آئینہ میں کسی صورت کو دیکھ کر یہ یقین کرلے کہ وہ صورت درحقیقت آئینہ میں موجود ہے۔

اسی مضمون کو مرزا بیدلؔ نے یوں ادا کیا ہے :۔

صورتِ وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ برطاقِ عدم داریم ما

یہاں ایک شبہ وارد ہوتا ہے جس کا ازالہ ازبس ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر کائنات کا وجود وہمی ہے تو پھر شریعت بالکل عبث ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معترض نے لفظ "وہمی" کا مفہوم دریافت نہیں کیا اس لئے یہ شبہ لاحق ہوگیا۔ واضح ہو کہ یہ لفظ دو معنوں میں مستعمل ہے :۔

(ا) وہمی اختراعی جس کا مطلب ہے ایک بے سروپا یا من گھڑت بات جس کا منشا خارج میں کہیں موجود نہ ہو۔ مثلاً گدھے کے سینگ یا گھوڑے کے پر وغیرہ وغیرہ، بالفاظِ دگر، موہوم بمعنی معدوم مستعمل ہے۔

کوئی صوفی کائنات کو اس معنی میں موہوم نہیں کہتا۔

(ب) وہمی واقعی یعنی وہ شئے جو اگرچہ خارج میں کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی مگر اس کا منشاء خارج میں موجود ہے جس سے اس کو منتزع کرلیتے ہیں۔ مثلاً فوقیت کہ اس کا منشاء (آسمان) خارج میں موجود ہے۔

صوفیہ جب کائنات کو وہمی کہتے ہیں تو لفظ وہمی سے ان کی مراد، واقع ہوتی ہے یعنی کائنات کا منشاء خارج میں موجود ہے اور وہ منشار یا مصدر، ذاتِ حق ہے۔ جیسے شعلۂ جوالہ کو گردش دو تو دائرۂ آتش نظر آتا ہے۔ اس دائرہ کا وجود وہمی واقعی ہے۔ یعنی دیکھو تو ہے، غور کرو تو معدوم ہے۔ چنانچہ جب گردش

رک جاتی ہے تو دائرہ غائب ہو جاتا ہے ؎

ہمہ از وہم تست ایں صورت غیر
کہ نقطہ دائرہ است از سُرعتِ سیر
(گلشنِ راز)

(۳) مکتوب پنجاہ وسیوم جلد دوم صـ۹۶ میں فرماتے ہیں:۔

"عالم مرتبہ، وہم وحس میں ہے یعنی موہوم اور محسوس تو ہے مگر خارج میں اس کا کوئی نام یا نشان نہیں ہے۔ خارج میں صرف ذاتِ حق موجود ہے۔ اس کی مثال نقطۂ جوالہ اور دائرۂ موہوم ہے کہ دراصل صرف نقطۂ جوالہ موجود ہے دائرہ کا وجود وہمی ہے۔ یعنی خارج میں معدوم ہے۔ نامے ونشانے در خارج ندارد۔ کوئی شئ غیراز حق جل وعلا خارج میں موجود نہیں ہے۔"

(۴) مکتوب شصت وہفتم جلد سوم صـ۱۱۰ میں فرماتے ہیں:۔

"اس فقیر کا اعتقاد یہ ہے کہ یہ کائنات وہمی ہے اور جو صورتیں اور شکلیں اس کائنات میں نظر آتی ہیں یہ صور واشکالِ ممکنات ہیں جنہوں نے صنعتِ خداوندی کی بدولت، مرتبۂ حس اور وہم میں ثبوت حاصل کر لیا ہے۔"

(۵) مکتوب شصت وہشتم جلد سوم صـ۱۱۱ میں فرماتے ہیں:۔

"میں جو اس عالم کو موہوم کہتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ عالم مجعول وہم ہے (ہمارے وہم کی تخلیق ہے) بلکہ اس سے میری مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کو مرتبۂ وہم میں خلق کیا ہے۔"

(۶) مکتوب صد ونہم جلد سوم صـ۱۹۸ میں فرماتے ہیں:۔

"ایجادِ عالم، مرتبۂ وہم میں ہے۔ مرتبۂ وہم سے مراد ہے "نمود بے بود" یعنی یہ عالم نظر آتا ہے مگر درحقیقت موجود نہیں ہے، جیسے آئینہ میں کسی شخص کا عکس کہ محسوس ومشہود تو ہے مگر درحقیقت معدوم ہے۔ کشف صحیح اور شہودِ صادق دونوں سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ نے کمالِ قدرت سے عالم کو نمودِ

بے بود عطا فرمائی ہے۔ چونکہ عالم اس مرتبہ میں مخلوق ہوا ہے اس لئے اسے نمودِ بے بود حاصل ہوگئی ہے۔ حق تعؔ میں یہ قوت ہے کہ وہ نمود کو بود (وجودِ حسّی) عطا کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ عالم وہمی نفس الامری ہے اور اسی لئے اس پر احکام آثار بھی مرتب ہو گئے درحقیقت ذاتِ احدیت کے سوا اور کوئی شئی موجود نہیں ہے۔"

(ح) علامہ حکیم سید برکات احمد صاحب ٹونکی مرحوم نے اس مسئلہ کی وضاحت میں ایک رسالہ فارسی زبان میں لکھا تھا جو طبع نہ ہو سکا۔ ہم اس رسالہ کے بعض مباحث ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ناظرین کی آگاہی کے لئے یہ صراحت لازمی ہے کہ حکیم صاحب شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی مرحوم کے جانشین تھے اور معقولات (منطق، فلسفہ اور کلام) میں عدیم المثال تھے۔ جس پر انکی تصنیف حجۃ البازغہ شاہد ہے۔ فی الجملہ حکیم صاحب فرماتے ہیں۔

"پہلے وحدتِ وجود کا مفہوم بیان کرتا ہوں، اس کے بعد اس پر براہین مرتب کروں گا۔ واضح ہو کہ حق تعؔ وجود مطلق ہے اور اس کے علاوہ اور کسی کو وجود حقیقی حاصل نہیں ہے۔ یہ کائنات، اسم کی صفات اور اس کے اسماء کا ظل اور عکس ہے۔ عالم کا وجود ظلی ہے ممکنات اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہیں۔ ان کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ وہمی ہے۔ یعنی انہیں وجودِ حقیقی کے ساتھ ایک گونہ نسبت حاصل ہوگئی ہے۔ مثلاً سایۂ شجر کہ اگرچہ بظاہر موجود ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود سایہ کے ساتھ کچھ احکام و آثار مخصوص ہیں جن کا تعلق شجر سے نہیں ہے۔ مثلاً کہ سایہ حرکت کرتا ہے۔ لیکن شجر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ اسی طرح ممکنات کے لئے کچھ احکام و آثار ہیں جو ذاتِ واجب کے لئے ثابت نہیں ہو سکتے پس تمام ممکنات معدوم الذوات و متلونۃ الآثار ہیں۔ اور وجودِ ظلی کا یہی معنی ہے کہ وہ معدوم الذات اور معلوم الآثار ہوتا ہے۔

حق تعؔ چونکہ محض وجود خارجی ہے۔ اس لئے خارج میں موجود ہے اور ممکنات

(اشیاء) نہ وجودِ خارجی رکھتی ہیں اور نہ وجودِ ذہنی لیکن ثبوتِ علمی کے مقابلہ میں ان کو خارج میں وجودِ باہمی حاصل ہے۔ یعنی وجودِ اصلی وحقیقی جو وجودِ مطلق ہے۔ ان سے ایک گونہ نسبت رکھتا ہے جس کی وجہ سے ان ماہیاتِ علمیہ کو موجود فی الخارج کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی اعتبار سے اظلال کو موجود فی الخارج کہہ سکتے ہیں۔

ان اظلال کو مظاہر بھی کہتے ہیں۔ وجودِ مطلق بحیثیتِ اطلاق غیب میں ہے اور کسی پر ظاہر نہیں ہو سکتا مگر وہ تعینات میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ وجودِ مطلق اپنی قدرتِ کاملہ سے اپنے ظلِ اسمی کو ثبوتِ علمی سے وجودِ خارجی میں لے آتا ہے۔ یعنی اس پر اپنا پرتوِ مجہول الکیفیۃ ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظل اپنی معدومیتِ ذاتی کے باوجود ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس ترتیبِ آثار کی وجہ سے اسے موجود کہہ دیتے ہیں۔ ان کی موجودیت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اس پر وجودِ حقیقی کا پرتو پڑ جاتا ہے۔ پس اس تعین میں وجودِ حقیقی کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وجودِ حقیقی، ممکن کے لباس میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

یہیں سے یہ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور ممکنات اس کے اظلال اور تعینات ہیں اور یہ دونوں باعتبارِ ذات متغائر ہیں نہ تو اصل کو ظل کہہ سکتے ہیں اور نہ ظل کو اصل کہہ سکتے ہیں اور جس کسی نے ممکن کو لباسِ واجب کہا ہے تو اسی معنوں میں کہا ہے کہ مرتبۂ احدیت غیب میں ہے۔ ہاں اس کا ظہور اظلال و مظاہر میں ہوا ہے۔ چونکہ اہلِ وحدۃ الوجود ظہورِ واجب کی تعبیر لباسِ ممکن سے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ خود واجب، ممکنات میں ظاہر ہوا ہے بایں معنی کہ باطن میں واجب ہے ظاہر میں ممکن ہے۔ اس لئے ظاہر بیں حضرات ان پر معترض ہوتے ہیں جب ظاہر بیں حضرات جو اہلِ وحدۃ الوجود کی اصطلاحوں سے بیگانہ ہیں حسبِ ذیل اشعار پڑھتے ہیں:-

زبے چونی برنگِ چوں برآمد ز دریا موج گوناگوں برآمد
گہے در کسوتِ لیلیٰ فرو شد گہے در صورتِ مجنوں برآمد

تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وجودیوں کا عقیدہ یہ ہے (اَعوذُ باللہ) کہ خود واجب تعالیٰ ممکن کے لباس میں پوشیدہ ہے حالانکہ یہ کفرِ صریح ہے. ظاہر بینوں کی غلطی کا منبٰی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قائلینِ وحدتِ الوجود، واجب کے علاوہ ممکن کو بھی موجود سمجھتے ہیں اور ممکن کا مستقل وجود تسلیم کرنے کے بعد پھر یہ کہتے ہیں کہ واجب ممکن میں پوشیدہ ہے چونکہ یہ عقیدہ "حلول" پر دلالت کرتا ہے اور عقیدۂ حلول کفر ہے اس لئے وہ اہلِ وحدۃ الوجود کو کافر قرار دیتے ہیں.

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ کوئی وجودی، ممکن کو موجود تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ ممکن بذاتہ معدوم ہے.

حلول و اتحاد ایں جا محال است
کہ در وحدت. دوئی عین ضلال است

وجودی حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ ممکن بذاتہ معدوم ہے. لیکن پرتو ہے واجب کا. یعنی ممکن کچھ نہیں مگر واجب کا ظہور ہے. اس کی نہ کوئی اصل ہے نہ حقیقت ہے. اگر ہم ممکن کو بھی موجود تسلیم کریں تو یہ شرک فی الوجود ہے اور شرک فی الوجود اسی طرح کفر ہے جس طرح شرک فی الذات یا شرک فی الصفات یا شرک فی الحکم غالبؔ نے کیا خوب لکھا ہے.

جاروب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
با گردِ فرش و سینہ بالیواں برابر است

پس ثابت ہوا کہ من حیث الذات، ممکن، واجب کا غیر ہے اور یہ غیریت دو اعتبار سے ہے. اول یہ کہ واجب ذات رکھتا ہے اور ممکن ذات نہیں رکھتا دوسرا یہ کہ واجب وجود مطلق ہے اور ممکن اپنی ذات سے معدوم ہے البتہ نسبت کے اعتبار سے ممکن کو بھی موجود کہہ دیتے ہیں ورنہ فی نفسہٖ اس کا وجود نہیں ہے.

اسی لئے وجودی حضرات یہ کہتے ہیں کہ واجب اور ممکن میں ذات کے اعتبار سے غیریت ہے لیکن وجود کے اعتبار سے عینیت ہے. یعنی ذات کا

اعتبار کرو تو ممکن، واجب کا غیر ہے اور وجود کا اعتبار کرو تو وہی ممکن واجب عین ہے۔ چنانچہ سعدیؒ کہتے ہیں:۔

دوست نزدیک تر از من بمن است     ویں عجب تر کہ من از وے دورم

یعنی از روئے ظہور یا وجود، حق تعالیٰ مجھ سے میری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے[1]۔ لیکن از روئے ذات، میں اس سے دور ہوں یعنی اس کا غیر ہوں۔ یعنی وہ موجود ہے میں معدوم ہوں۔ پھر کہتے ہیں:۔

چہ کنم؟ با کہ تواں گفت کہ دوست     در کنارِ من و من مہجورم

یعنی ظہور یا وجود کے اعتبار سے وہ ہر وقت میری آغوش میں ہے۔ مگر اس کا ظہور اس کے لئے حجاب بن گیا ہے اس لئے میں اس سے دور ہوں۔

اب ہم عقیدۂ وحدۃ الوجود پر براہین مرتب کرتے ہیں:۔

## مقدمۂ اوّل

تمام عرفاء، علماء و جمیع اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حق تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ اس کی ذات میں ہر قسم کی شرکت مستحیل ہے۔ خواہ شرکت فی الذات ہو یا فی الصفات یا فی الافعال، کیونکہ شرکت مطلقاً افتقار و احتیاج سے پیدا ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں منافیٔ وجوبِ ذاتی ہیں۔ یعنی واجب الوجود کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

## مقدمۂ دوم

وجودِ حقیقی اور واجب تعالیٰ میں عینیت کی نسبت ہے۔ بایں معنی کہ واجب نفسِ وجودِ حقیقی ہے۔ یعنی واجب تعالیٰ بذاتِ خود، وجودِ مطلق حقیقی ہے اور اس کے سوا دوسرا موجود نہیں ہے، وجودِ مطلق کی طبیعت ہی قابل اشتراک نہیں ہے۔ اگر اشتراک فرض کیا جائے تو واجب کا وجوب برقرار نہیں رہ سکتا۔

---

[1] نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ

البتہ غیر کو اس اعتبار سے موجود کہہ سکتے ہیں کہ اسے وجودِ حقیقی سے نسبت حاصل ہو گئی ہے۔

## مقدمۂ سوم

وجود مطلق سے کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کوئی شئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔ وجودِ مطلق، واجب وجود میں منحصر ہے۔ اور اس کے ماسوا جو کچھ متصوّر ہے معدوم ہے۔ اسی لئے وجودِ حقیقی کو عین واجب تعالیٰ کہتے ہیں اور وہ تمام قیود سے بری ہے۔

## مقدمۂ چہارم

چونکہ واجب تعالیٰ وجود حقیقی ہے اور موجود حقیقی بھی ہے۔ اور وجودِ مطلق، واجب تعالیٰ میں منحصر ہے اس لئے تمام ممکنات، معدومۃ الذوات ہیں۔ ممکنات کا ثبوت، مرتبۂ علم میں ہے اسی لئے ان کو اعیان ثابتہ کہتے ہیں۔ صوفیہ وجودِ ظلی کو وجود نہیں کہتے بلکہ ثبوت کہتے ہیں۔ اور اعیانِ ثابتہ نے وجود کی خوشبو بھی نہیں سونگھی ہے۔

## مقدمۂ پنجم

ظاہر اور مظہر میں مغایرت ضروری ہے۔ چنانچہ جب حق نے درخت پر تجلی فرمائی تو نہ یہ ہوا کہ واجب تعالیٰ درخت ہو گیا اور نہ یہ ہوا کہ درخت واجب تعالیٰ ہو گیا۔ بلکہ درخت اپنی حالتِ اصلی پر رہا۔ مگر اس پر ایسی حالت طاری ہو گئی کہ اس سے اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ کی آواز پیدا ہو گئی۔ اور کہنے والا اس کلمہ کا حق تعالیٰ تھا بلا حلول و سریان۔

## مقدمۂ ششم

حق تعالیٰ جب اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی ماہیت پر تجلی فرماتا ہے تو وجودِ مطلق کے آثار اس ماہیت میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ماہیت خانۂ علمی سے باہر آجاتی ہے۔ اور جب وہ ماہیت موجود ہو جاتی ہے تو اس کو

وجود اضافی کہتے ہیں۔ ماہیت فی نفسہا موجود نہیں ہوتی بلکہ وجودِ حقیقی سے نسبت کی بناء پر اسے موجود کہہ دیتے ہیں۔

مقدمہ ہفتم وجود حقیقی جو ان مظاہر میں ظاہر ہوتا ہے۔ مظاہر سے مغائر بالذات ہوتا ہے کیونکہ ظاہر (حق) ذات رکھتا ہے اور مظاہر ذات نہیں رکھتے مگر بحیثیت وجود و ظہور عینیت رکھتے ہیں ہاں معنی کہ مظاہر کا وجود بعینہٖ ظاہر کا وجود ہے۔ اسی لئے صوفیہ فرماتے ہیں۔ واجب اور ممکن دونوں من حیث الذات متغائر ہیں مگر من حیث الوجود والظہور عین یکدگر ہیں۔

مقدمہ ہشتم

وجودِ حقیقی نے اپنا پرتو تمام ممکنات پر ڈالا ہے۔ اور اس طرح انہیں لباس وجود عطا فرمایا ہے۔ پس وجود مطلق ممکنات میں ظاہر ہوا ہے اور اسی لئے عرفا کہتے ہیں کہ " واجب تعالیٰ ممکن کے لباس میں ظاہر ہوا " مراد ان کی اس قول سے وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ وہ جو ظاہر بیں سمجھتے ہیں کہ واجب اور ممکن ایک ہو گئے، اور دونوں میں کوئی فرق نہیں رہے۔ یہ خیال کفرِ صریح ہے۔ ممکن کا وجود ہی کہاں ہے جو دونوں کے ایک یا متحد ہو جانے پر حکم لگایا جائے۔ صوفیہ یہ نہیں کہتے کہ کائنات جلوۂ ذات ہے۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جلوۂ ذات، کائنات ہے۔ پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں موجود ہیں اور پھر دونوں ایک ہو گئیں۔ مگر یہ قول تو کفرِ صریح ہے۔ دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک ذات (حق) موجود ہے۔ اور جسے تم کائنات کہتے ہو، یہ بذاتِ خود کچھ نہیں ہے، محض اس کا جلوۂ ذات ہے یعنی وہ خود ظاہر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:-

"هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ"۔

مقدمہ نہم

پس تمام موجودات، مظاہرِ اسمائے حسنیٰ ہیں۔ جب حق تعالیٰ بحکم " کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ" اپنی صفات کمال میں سے کسی صفت کو ظاہر فرماتا ہے

تو اس صفت سے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس اسم سے اس کی صورت علمیہ پیدا ہوتی ہے۔ پس صفت مربّی اسم ہے اور اسم مربّی صورت علمیہ ہے۔ جسے اصطلاح میں عین ثابت کہتے ہیں۔ اور صورت علمیہ سے وجود اضافی پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ ہے تقریر مذہب صوفیہ کی۔ اب جاننا چاہیئے کہ اس طائفہ مقدسہ کے مذہب کی بنیاد تین مقدمات پر ہے:۔

## مقدمۂ اولیٰ

واجب تعالیٰ وجود مطلق حقیقی ہے۔ وجود میں نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ شرکت کا امکان ہی نہیں ہے۔

## مقدمۂ ثانیہ

تمام ممکنات معدومات عینیہ ہیں۔ کیونکہ وہ ماہیات ہیں اور ماہیات کے لیے وجود عینی ممکن ہی نہیں ہے۔

## مقدمۂ ثالثہ

تمام موجودات، مظاہر اسمائے حسنیٰ ہیں۔ حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا ظہور ان مظاہر میں ہوا ہے۔

یہ مقدمات محض عقلی نہیں ہیں۔ نقل (قرآن) سے بھی ثابت ہیں لہٰذا ذیل میں نصوص قرآنی بھی درج کی جاتی ہیں:۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ وجود مطلق حقیقی ہے اور وجود میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس مقدمہ کے دو جزو ہیں۔ پہلا جزو اس آیت سے ثابت ہے:۔

اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُورِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ

فَاِذَا نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ (۲۴-۳۵)

اس آیت کی ابتدا اس بات پر نص ہے کہ اللہ تعا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

نور، اللہ تعا کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور اس کا اطلاق ضوٗ (روشنی) علم اور وجودِ اضافی پر ہوتا ہے۔ کیونکہ نور کا لغوی حقیقی معنیٰ یہ ہے کہ نور خود ظاہر ہوتا ہے اور دوسرے کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ ضوٗ اور علم اور وجودِ اضافی، معنیٔ حقیقت سے نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے نور کا اطلاق ان اشیاء پر بھی کیا جاتا ہے۔ ضوٗ پر اس لئے کہ اگر ضوٗ نہ ہوتی تو تمام محسوسات ظلمت میں مستور رہتیں۔ اور علم پر اس لئے کہ اگر علم نہ ہوتا تو کسی چیز کا ادراک نہ ہوتا۔ اور وجودِ اضافی پر اس لئے کہ اگر وجودِ اضافی نہ ہوتو تمام اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے ظلمتِ عدم میں ہوتیں لیکن ظاہر ہے کہ تینوں معانی یہاں مستقیم نہیں ہیں۔

معنیٔ اوّل :- ظاہر ہے کہ ضوٗ ایک مادّی کیفیت ہے جو اجسامِ مادّی میں پائی جاتی ہے اور واجب تعا مادہ سے منزّہ ہے۔

معنیٔ دوم :- سیاقِ کلام اس سے انکار کرتا ہے۔

معنیٔ سوم :- واجب تعا وجود حقیقی ہے نہ کہ اضافی۔

پس نور اس آیت میں لغوی معنیٰ میں مستعمل ہے یعنی ظاہر لذاتہ اور مظہر لغیرہ۔ اور چونکہ یہاں معنیٔ حقیقی صحیح ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ لغوی حقیقی معنیٰ چھوڑکر مجازی معنی لئے جائیں اور جس کا وجود لذاتہ ہے اس کا ظہور لذاتہ ہوگا۔ اور چونکہ واجب تعا وجود لذاتہ ہے اور تمام اشیاء اعدام ہیں۔ اس لئے واجب تعا بذاتِ خود ظہورِ سمٰوات والارض ہے یعنی تمادیات، علویات اور سفلیات میں ظاہر ہوا ہے۔

نور کی اس مثال کے بعد اللہ تعا نے خود بیان فرمایا کہ ایک طاق فرض کرو جس میں ایک زجاج ہے اور اس میں مصباح ہے اور وہ مصباح روشن ہے زیتون کے اس مبارک درخت کے تیل سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ غور سے دیکھو تو صرف ایک نور ہے جو شجرِ مبارکہ سے فائض ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ مصباح سے متعلق ہے اس لئے اس کا نام

نورِ مصباحی ہو گیا اور چونکہ زجاج تک راہ پا گیا اس لئے نور زجاجی نام ہو گیا اور جب طاق میں پہونچا تو نورِ مشکوٰۃ نام ہو گیا۔ اگرچہ ظاہر میں تو کئی نور نظر آتے ہیں مگر دراصل وہ ایک ہی نور ہے۔ جو متعدد ہو گیا ہے۔ یعنی اشیا نے مختلفہ سے متعلق ہو جانے کی وجہ سے اُس کے نام مختلف ہو گئے ہیں۔ اسی طرح سے ھذا تمام ایک ہی نور اور ایک ہی وجود ہے جو مضاف الیہ کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو گیا ہے۔ اور قرینہ اس بات پر کہ حق تعالیٰ نے شجر مبارکہ سے اپنی ذات مراد لی ہے۔ یہ جملہ ہے :-

"وَلَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ" یعنی وہ وجودِ مطلق جہات میں سے کسی جہت میں مقید نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام علویات و سفلیات کا نور ہے اور ان میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سمٰوات اور ارض (کائنات) کو بذاتِ خویش نور حاصل نہیں ہے۔ وہی واحدِ حقیقی ساری کائنات کو منوّر کر رہا ہے۔ البتہ مضاف الیہ کے تعدد سے تعدد اضافی راہ پا گیا ہے جو وحدتِ حقیقی میں مخل نہیں ہو سکتا۔ پس مقدمۂ اولیٰ کا پہلا جزو قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور اسی کو وجودِ حقیقی حاصل ہے۔ عالم کا وجود اضافی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ توحید اسرارِ الٰہی میں سے ایسا سِرّ ہے جس کی صراحت نہیں ہو سکتی۔ صرف مثال سے سمجھا سکتے ہیں۔

مقدمۂ اولیٰ کا دوسرا جزو "مرتبۂ احدیت" "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" سے ثابت ہے۔ احدیت اسی وقت ثابت ہو سکتی ہے جب کثرت کا شائبہ نہ ہو خواہ کثرتِ شانیہ ہو یا اسمائیہ یا صفاتیہ۔ کیونکہ مرتبۂ احدیت میں شئون و اسماء و صفات قہرِ احدیت کی وجہ سے مرتبۂ احدیت میں مستہلک اور مندرج ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ شیخ اکبر نے قل ہو اللہ احد کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ہویت عین احدیت ہے کوئی دوسرا احد نہیں ہے۔ کیونکہ ہویت میں شرکت محال ہے۔ اس کے بعد فرمایا "اَللّٰهُ الصَّمَدُ" یعنی اللہ کی طرف استناد کی حیثیت

سے، غیر اللہ جو کچھ بھی ہے، سب اس کی طرف مستند ہے۔ ظہورِ کثرت اس واحدِ حقیقی کے ظہور کی وجہ سے ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شئی نہیں جس سے کثرت منسوب کی جاتے۔

اس کے بعد ولایت اور ولدیت کی نفی کے لئے فرمایا " لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ " یعنی کسی شخص کو اللہ تعالیٰ سے بواسطۂ والدیت یا ولدیت کوئی نسبت حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو امکان کی خصوصیات میں سے ہے۔ واجب تعالیٰ ان تمام مادی جسمانی نسبتوں سے پاک ہے۔ بلکہ واجب اور ممکن میں نمایاں ترین فرق یہی ہے کہ واجب " لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُولَدْ " کا مصداق ہے اور ممکن (انسان) کسی کا باپ ہے اور کسی کا بیٹا ہے۔

آخر میں فرماتا ہے: " وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ " یعنی ہر شخص کسی نہ کسی کا ہمسر یا شریک کار یا مدِّمقابل ہوتا ہے، مگر کوئی ہستی اس کی مدِّ مقابل یا ہمسر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ واجب ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ از قبیلِ ممکن ہے۔

## مقدمۂ ثانیہ کا ثبوت

اس کے لئے قرآنِ حکیم کی اس آیت میں غور کرنا چاہیئے " کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ " یعنی حق تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہر شئی ہالک ہے۔ ہالک کا مفہوم یہ نہیں کہ اشیاء زمانہ مستقبل میں ہلاک (معدوم) ہوں گی، بلکہ تمام اشیاء بالفعل معدوم ہیں۔ کیونکہ علمِ صرف کا قاعدہ یہ ہے جو علومِ عربیہ میں مسلّم ہے کہ مشتقات معنیٔ حال میں حقیقت ہیں اور معنیٔ استقبال میں مجاز ہیں۔ پس ہالک کا یہ معنی لینا کہ اشیاء آئندہ زمانہ میں ہلاک ہوں گی، مجاز کی طرف جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقی معنی لینے میں کوئی استحالہ لازم نہیں آتا۔ پس آیۂ شریفہ کا معنی یہ ہے کہ ہر شئی بالفعل معدوم ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

"أَصدَقُ كلمةٍ قالها العرب اَلَا كُلُّ شيئٍ مَا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلٌ" یعنی سب سے زیادہ سچی بات جو کسی عرب کی زبان سے نکلی یہ ہے کہ خبردار ہوجاؤ کہ اللہ کے سوا ہر شیئ باطل ہے اور بطلان کا معنی عدم الذات ہے یعنی اللہ کے سوا ہر شیئ فی ذاتہٖ معدوم اور فی نفسہٖ باطل ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَیْسَ دُوْنَکَ شَیْئٌ اور شئ عرف متشرعہ میں بمعنیٰ وجود ہے۔ یعنی اے اللہ! تیرے سوا کوئی شیئ موجود نہیں ہے۔

## مقدمۂ ثالثہ کا ثبوت

یہ اس حدیث سے ثابت ہے:-

ان اللّٰہ خلق اٰدمَ علیٰ صُوْرتِہٖ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ لیکن یہاں صورت سے شکل مراد نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ مادّی نہیں ہے۔ لہٰذا صورت سے وجود مراد لی جائے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو مظہر صفات خود بنایا ہے۔ اور اصحاب کشف شہود نے اس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ عالم عبارت ہے تجلیات حق سے مظاہر ممکنہ میں اور تمام عرفا کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ کے سوا کوئی شئ حقیقی معنیٰ میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رح کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے معدوم ہے۔ حضرت موصوف نے شیخ اکبر رح سے صرف ماہیات ممکنات میں اختلاف کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

(۱) شیخ اکبر رح فرماتے ہیں کہ حقائق ممکنات، اسماء و صفات ہیں۔ اگر اسماء کی تجلی نہ ہوتی تو حقائقِ ممکنات، مخفی رہتے۔

(۲) حضرت مجددؒ یہ فرماتے ہیں کہ حقائق ممکنات، اسماء و صفات کے عکوس و اظلال ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ وحدت وجود میں دونوں متفق ہیں۔ اگر اختلاف

ہے تو ممکن کی ماہیت میں ہے یعنی جس کو حضرتِ مجددؒ اعدام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کو شیخ اکبرؒ اعیانِ ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا اہلِ وجود اور اہلِ شہود میں فقط نزاعِ لفظی ہے۔

شیخ اکبرؒ کہتے ہیں کہ اعیانِ ثابتہ پر اسماء و صفات کی تجلی ہوئی تو عالم موجود ہو گیا۔ حضرت مجددؒ کہتے ہیں کہ اعدام متقابلہ پر اسماء و صفات کی تجلی ہوئی عالم موجود ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے۔ نفسِ مسئلۂ وحدتِ وجود میں دونوں متفق ہیں۔

میں نے وحدۃ الوجود کی تشریح اس لئے سپردِ قلم کی ہے کہ قارئین کرام کو یہ معلوم ہو جائے کہ اقبالؔ نے جو اپنی تمام تصانیف میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے، تو یہ تعلیم بقول شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ عین اسلام ہے۔ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے اور اُمتِ اسلامیہ کے تمام عرفاء کا اس پر اجماع ہے۔

یہ تصریح اس لئے بھی ضروری ہے کہ آجکل بعض مسلمان اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کی تعلیم غیر اسلامی ہے۔ ان لوگوں کو یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ غیر مسلموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یونان، ہندوستان، ایران اور یورپ کے بعض حکماء نے بھی وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے مگر اس کی جو تعبیر انہوں نے پیش کی ہے وہ غیر اسلامی ہے۔ بعض مسلمان اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ یا حضرت مجددؒ یا شاہ ولی اللہؒ یا رومیؒ یا جامیؒ یا شیخ اکبرؒ نے غیر مسلموں کے خیالات سے استفادہ کیا ہے یا انہی کی تعبیر اختیار کر لی ہے۔ لیکن حقیقتِ حال اس کے خلاف ہے۔ حضرات صوفیہؒ نے اس کی وہ تعبیر پیش کی ہے جو قرآن اور حدیث پر مبنی ہے اس لئے عینِ اسلام ہے اور اقبالؔ نے انہی اکابرِ اُمت کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

شنیدم آنچہ از پاکانِ اُمت

ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔
واضح ہو کہ اس فصل کے پہلے پانچ اشعار کا مطلب تمہید کے آغاز میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں ربطِ کلام کے لئے اس کا خلاصہ بیان کئے دیتا ہوں:۔
کہتے ہیں کہ اے افغان! تو اپنی حقیقت سے بے خبر ہے۔ اس لئے تیرا فرض یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہچان یعنی اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کر۔ ضرب کلیم میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔ ؏

اپنی خودی پہچان! او غافل افغان!

تعلیماتِ اسلام کی روح یہ ہے کہ جو شخص اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ دنیا میں حکمران ہو جاتا ہے۔ دینِ اسلام نام ہی ہے اپنی "خودی" کی پوشیدہ طاقتوں سے آگاہی حاصل کرنے کا۔ جو شخص اپنی خودی سے واقف نہیں وہ دراصل مُردہ ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رُو سے اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔
جو مسلمان اپنی خودی سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل صفات پیدا ہو جاتی ہیں:۔
(۱) اس میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ میں خلیفتہ اللہ یعنی اشرف المخلوقات ہوں۔ یعنی کائنات میں مجھ سے برتر ہستی کوئی نہیں ہے۔
(۲) وہ کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کائنات اس قابل نہیں ہے کہ اسے مقصودِ حیات بنایا جائے۔ بالفاظِ دیگر، چونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی شئے حقیقی معنی میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے صرف اللہ ہی میرا مقصودِ حیات ہے۔ یعنی جب ایک مسلمان پر یہ صداقت آشکار ہو جاتی ہے کہ

لَا مَوجُودَ اِلَّا اللہ

تو وہ ماسوی اللہ سے قطع نظر کر کے اللہ ہی کو اپنا مطلوب اور مقصود بنا لیتا ہے۔ یعنی حقیقی معنی میں موحد بن جاتا ہے۔ سعدیؒ نے اس شعر میں اسی مضمون کو باندازِ دگر بیان کیا ہے:۔

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست
برِ عاشقاں جز خدا ہیچ نیست

(۳) اس کی شہرت ساری کائنات میں ہو جاتی ہے اور یہ وسیع کائنات اس کے قلب کے ایک گوشہ میں سما جاتی ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس شعر کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے مثلاً شیخ شیوخِ عالم حضرت اقدس بابا فریدالدین گنج شکر چشتی اجودھنیؒ کی زندگی کا مطالعہ کرو۔

(ا) حضرت کے وصال کو سات سو برس گزر چکے ہیں مگر آنجناب کا نامِ نامی آج بھی چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔

(ب) جب سلطان غیاث الدین بلبن نے چار گاؤں کی معافی کا پروانہ ان کی خدمت میں بھجوایا تو انہوں نے اس کاغذ کے پرزے کو چاک کر کے ایلچی کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا " بادشاہ سے کہہ دینا کہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس کی وجہ یہ تھی کہ "بہ سپہر در پہنائے او، آوارہ بود"۔ ان کے قدموں میں تو ساری کائنات سربسجود تھی وہ چار گاؤں لیکر کیا کرتے؟

(۴) اس کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں کہ بندۂ حق (آں مسلمانے کہ کہ بیند خویش را) تو پیغمبروں کا وارث ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں رہتا۔ وہ تو اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔

(۵) وہ غیر حق سے بکلی قطع نظر کر لیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ غیر حق کا وجود ہی نہیں ہے تو اس سے رابطہ یعنی چہ؟

(۶) عجم پائے او محکم بہ رزمِ خیر و شر الخ

اس دنیا میں شروع سے خیر و شر میں جنگ ہو رہی ہے یعنی انبیاء انسانو کو نیکی کی طرف بُلاتے ہیں اور ابلیس اُن کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر بندۂ حق ذکر اور فکر کی بدولت ابلیس کا مقابلہ کرتا ہے اور کسی موقع پر بھی اُس کے قدموں کو لغزش نہیں ہوتی۔

وہ ذکر کی تلوار سے ابلیس پر حملہ کرتا ہے اور فکر کی ڈھال پر اس کے حملوں کو روکتا ہے۔ یعنی ذکر الہی سے اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ابلیس پر حملہ کرتا ہے اور فکر کی بدولت اس کے پیدا کردہ وساوس کو دفع کرتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کے نظامِ فکر میں ذکر اور فکر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ انہی دو قوتوں کے اختلاط سے مسلمان میں شانِ فقر پیدا ہوتی ہے اور فقر کی تعلیم اقبالؔ کے فلسفہ کی روح ہے۔ یعنی اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ :-

(ا) مسلمان کا مقصدِ حیات، اعلائے کلمۃ الحق ہے یعنی دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا تاکہ بنی آدم، اللہ کے قانون کی اتباع کر سکیں۔

(ب) حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا کریں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کے اندر یہی شانِ فقر پیدا کر دی تھی۔ اور خلفائے راشدینؓ اس شان کے بہترین مظہر ہیں۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صفت پر فخر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"الفقر فخری" یعنی میں اپنی زندگی میں جس بات پر فخر کر سکتا ہوں وہ فقر ہے۔ اس سے فقر کی عظمت اور قدر و قیمت واضح ہو سکتی ہے۔

(ج) یہ شانِ فقر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مسلمان اپنی زندگی میں ذکر اور فکر کا صحیح اختلاط پیدا کر لیں۔ چنانچہ اقبالؔ کہتے ہیں:-

جز بقرآں ضیغمی روباہی است　　فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

فقرِ قرآں؛ اختلاطِ ذکر و فکر! فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

(جاوید نامہ)

چونکہ مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اقبالؔ نے فقر پر ایک مستقل باب باندھا ہے اور میں اس مقام کی شرح میں فقر کی پوری تشریح درج کروں گا اس لئے یہاں تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں کہ مومن ذکر اور فکر کی بدولت ابلیس کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرسکتا ہے اور کسی مرحلہ پر اس کا قدم صراطِ مستقیم سے نہیں ڈگمگاتا۔

(۷) ساتویں صفت "بندۂ حق" میں یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ زمان و مکان پر غالب آجاتا ہے اور یہ ساری کائنات اس کا طواف کرنے لگتی ہے۔ یعنی اس کی مطیع ہوجاتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے بندۂ حق یا مومن کی جو صفات بیان کی ہیں وہ اس قدر فوق العادات اور محیّر العقول ہیں کہ اس دورِ مادیت میں ان کی صداقت پر یقین لانا بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر ایک شخص بزرگانِ دین کی صحبت[1] اختیار کرے اور ان بزرگوں کی ہدایت پر عمل بھی کرے تو بفضلِ خدا اس کے اندر کم و بیش یہ تمام صفات پیدا ہوسکتی ہیں۔

بندۂ حق (عارفِ کامل) کی صفات بیان کرنے کے بعد اپنے دعاوی کی صداقت پر قرآنِ حکیم سے استشہاد کرتے ہیں:۔

ع شاہد آمد بر عروج او کتاب

---

[1] اسی لئے اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف میں بزرگانِ دین (اولیاء اللہ) کی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

یعنی اے مخاطب! میں نے بندۂ حق (آنکہ خود را دیدہ است) کی جو کیفیت بیان کی ہے بالفاظِ دیگر اس کے روحانی عروج کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی صداقت پر خود قرآنِ عظیم گواہی دے رہا ہے۔ ذیل میں چند آیات لکھتا ہوں:-

(۱) اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں، بندگانِ حق، کو نہ تو (آئندہ زندگی کے متعلق) خوف ہوگا اور نہ (گذشتہ زندگی پر) افسوس ہوگا۔

قرآنِ حکیم نے بندگانِ حق کی یہ شناخت بتائی ہے کہ وہ خوف اور غم دونوں سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عام طور پر ہر شخص انہی دو آفتوں میں مبتلا ہے:-

(۱) چونکہ وہ اللہ کے قانون سے منحرف رہتا ہے اور نفسِ امارہ کی پیروی کرتا رہتا ہے۔ اس لئے تحت الشعور میں اسے ہر وقت عاقبت کا خوف دامنگیر رہتا ہے کہ مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے جانا ہوگا تو کیا جواب دوں گا؟

(۲) چونکہ وہ اپنے آپ کو فاعلِ حقیقی اور مدبر الامور سمجھتا ہے اس لئے جب کبھی اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا اسے مالی نقصان پہونچتا ہے تو محزون اور ملول ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر بندۂ دنیا ہر وقت دو بلاؤں میں گرفتار رہتا ہے۔ زمانۂ گذشتہ کے مصائب اور نقصانات پر حزن اور زمانۂ آئندہ میں بازپرس کا خوف۔ لیکن بندۂ حق (آں مسلمانے کہ خویش را دیدہ است) کو امرِ ربانی پر یقین کامل ہوتا ہے کہ

(۱) عزت اور ذلت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:-

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ

(۳ - [illegible])

آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تو یہ تعلیم دی گئی ہے :- اے اللہ تو ملک (کائنات) کا مالک ہے تو جسے چاہتا ہے حکومت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے۔ تو عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ذلت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سب بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے یعنی مدبر الامور اور منتظم کائنات صرف تو ہے۔

(۲) اللہ جسے چاہتا ہے با فراغت رزق دیتا ہے۔ یعنی فارغ البالی اور آسائشِ دنیوی عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپی تلی روزی دیتا ہے۔ یعنی اسباب معیشت کی فراخی اور تنگی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان لاکھ کوشش کرے مقدر سے زیادہ نہیں مل سکتا۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ (۲۹-۶۲)

اللہ ہی کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لئے چاہے، اپنے بندوں میں سے اور کم کرتا ہے (روزی) جس کے لئے چاہے۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والوں کے دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے مثلاً ۲۶، ۱۷، ۳۰، ۳۰-۳۷، ۳۴-۳۶، ۳۹-۵۲۔

(۳) یہ تمام نظامِ عالم اس کے قبضۂ قدرت اور حیطۂ اقتدار میں ہے!

(ا) لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (۹-۳۵)

اگر اللہ چاہتا تو سب انسانوں کو ہدایت پر جمع کر دیتا (مگر اس نے ایسا نہیں چاہا بلکہ یہ آزمانا چاہا کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا)

(ب) لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ ... فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۵-۴۸)

اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک مذہب پر جمع کر دیتا مگر اس لئے نہیں کیا کہ وہ تمہیں آزمائے ان چیزوں میں جو اس نے خلق کی ہیں۔ پس تم نیک کاموں کی طرف سبقت کرو۔

(ج) يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ ۝ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ۝ (۴۲-۴۹، ۵۰)

اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں دونوں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بیشک علیم اور قدیر ہے۔

(۴) اللہ جسے چاہے حکمت دے جسے چاہے اپنی رحمت سے نوازے اور جسکے چاہے درجات بلند کر دے اور جس پر چاہے اپنا فضل کرے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ (۲-۲۶۹)

نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ (۶-۸۴)

يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ (۷۶-۱۳)

ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ (۵-۴)

(۵) دنیا میں جس فرد یا جماعت پر کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے وہ اللہ کے حکم اور اس کی مشیت سے آتی ہے۔ لہٰذا بندۂ حق ہر مصیبت پر سر تسلیم خم کرتا ہے اور زبانِ حال سے کہتا ہے۔

ع آنچہ از دوست می رسد نیکوست

اس لئے وہ واقعات ماضی پر کبھی حزن و ملال کا اظہار نہیں کرتا

(۶) مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ (۵۷-۲۲، ۲۳)

خشک سالی، قحط، وبا یا سیلاب کی وجہ سے جو مصیبت زمین میں رونما ہوتی ہے اور افلاس، نقصان جان و مال، امراض، جدائی کے صدمات، زوالِ عزت و جاہ، حوادثِ روزگار اور ناگہانی واقعات یا غیر متوقع انقلاب کی بناء پر جو مصیبت

تمہاری جانوں میں واقع ہوتی ہے (مختصر یہ کہ جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے، خواہ اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہو یا کائنات سے) یہ سب امور اور حوادث اپنے ظہور سے مدتوں قبل ایک کتاب میں مندرج (علم الٰہی میں مقدر) ہو چکے ہیں (یعنی قبل تخلیقِ عالم، تمام حوادث اور واقعات کو مقدر کر دینا، ہمارے لئے آسان ہے۔ (کیونکہ ہم عالم الغیب والشہادۃ بھی ہیں اور علیم و حکیم بھی۔ ہماری ذات کی طرح ہمارا علم بھی ازلی ہے۔ اس لئے ہم پہلے جانتے ہیں پھر پیدا کرتے ہیں) (ہم نے یہ بات اس لئے کھول کر بیان کر دی) تاکہ تم غم نہ کرو ان چیزوں پر جو تم سے جاتی رہیں۔ مثلاً دولت، عزت، ثروت، حکومت، جائداد، باغات، محلات، انبار سیم و زر، وغیرہ وغیرہ، اور جو نعماء اللہ تمہیں اپنی مشیئت کے مطابق عطا فرمائے ان پر فخر نہ کرو (کہ یہ ہماری دانائی یا ہماری ذاتی قابلیت سے ہمیں حاصل ہوئی ہیں) خلاصۂ کلام اینکہ جس چیز کا تم سے فوت ہو جانا یا زائل ہو جانا مقدر ہے وہ بہرحال جا کے رہیگی اور جس چیز کا ملنا مقدر ہے وہ بہر صورت تمہیں مل کے رہے گی۔ لہٰذا ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کو قربان کرو۔

(ب) قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ج هُوَ مَوْلٰنَا ج (۶-۵۲)

(اگر آپؐ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو منافقین یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو دور اندیشی سے کام لیکر پہلے ہی سے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا تھا) آپؐ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ ہم پر ہرگز کوئی مصیبت وارد نہیں ہوگی مگر وہی (مصیبت) جو اللہ نے ہمارے لئے مقدر کر دی ہے، وہی ہمارا کارساز ہے۔

(ج) قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ (۳-۱۵۴)

(منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہمارا مشورہ مان لیا جاتا۔ یعنی کہ دامنِ احد کے میں صف آرا ہونے کے بجائے مدینہ ہی میں رہ کر جنگ کی جاتی تو جو لوگ جنگِ احد میں شہید ہو گئے وہ ہرگز شہید نہ ہوتے) آپؐ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے

اپنے گھروں میں رہتے تو بھی جن لوگوں کی تقدیر میں قتل ہونا لکھا جا چکا تھا، وہ لوگ یقیناً اپنے گھروں سے نکل کر اپنی قتل گاہوں میں پہنچ جاتے۔

ان نصوصِ صریحہ کی روشنی میں بندۂ حق ہمیشہ حق تعالیٰ کی مشیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور کسی مصیبت یا نقصان پر محزون نہیں ہوتا اور چونکہ وہ کوئی کام حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہیں کرتا اس لئے اسے قیامت میں باز پرس کا بھی کوئی خوف نہیں ہوتا۔

یہ ثابت ہو چکا کہ بندۂ حق خوف اور حزن دونوں سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

اب دوسری آیت لکھتا ہوں:-

(ب) یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ (۸۵-۳۰)

اے وہ شخص جس نے ہماری مشیتِ کاملہ پر ایمان لا کر اپنے دل میں اطمینان کی کیفیت پیدا کر لی، اپنے رب کی طرف واپس آ جا اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے پس میرے بندوں میں شامل ہو جا (اور زمرۂ عباد اللہ میں شامل ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ) میری جنت میں داخل ہو جا (جو میں نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہے۔)

غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ آیتِ شریفہ کتنے واضح الفاظ میں مومن (بندۂ حق) کے روحانی عروج کا اعلان کر رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کونسا عروج متصور ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندے سے راضی ہو جائے اور اسے اپنی جنت میں داخل کر کے اپنا قرب عطا فرما دے؟

ایک آیت اور درج کئے دیتا ہوں:-

(ج) اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ (۱۶-۱۲۸)

بیشک اللہ ساتھ ہے ان لوگوں کے جو متقی ہیں اور محسن ہیں۔

بندۂ حق، متقی بھی ہوتا ہے اور محسن بھی۔ اس لئے اسے اللہ تعالیٰ کی معیت

نصیب ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جائے تو اس کے عروج میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ جس شخص کو دنیاوی بادشاہوں کی معیت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ بادشاہوں کی سی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ مثلاً:۔

(ا) وہ تمام لوگ جو اس بادشاہ سے ڈرتے ہیں یا اس کی عزت کرتے ہیں. اس شخص سے بھی ڈرتے ہیں یا اس کی عزت کرتے ہیں۔

(ب) بادشاہ جس قصرِ رفیع میں رہتا ہے یہ شخص بھی وہیں رہتا ہے اور جو کچھ وہ کھاتا ہے وہی اس شخص کے بھی حصے میں آتا ہے۔

اسی پر قیاس کر لیا جائے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہو جائیگی کیا وہ زمان و مکان پر حکمراں نہیں ہو جائے گا؟[1] کیا دریائے نیل اس کی اطاعت نہیں کرے گا؟[2] کیا پادشاہانِ عالم اس کی تحریر پڑھ کر لرزہ براندام نہیں ہو جائینگے؟[3]

---

[1] اشارہ ہے حضرت علی مرتضیٰ رضی کی طرف۔ ایک مرتبہ ان کی نمازِ عصر قضا ہو گئی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وقتِ عصر واپس آجائے چنانچہ ان کی دعا قبول ہوئی اور انہوں نے اپنی نماز ادا کی۔ ۱۲

[2] اشارہ ہے حضرت فاروقِ اعظم رضی کی طرف. انہوں نے اہل مصر کی استدعا پر ایک کاغذ پر یہ لکھا کہ اے دریا! اگر تو اللہ کے حکم سے بہتا ہے تو میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو بدستور بہتا رہ تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ چنانچہ دریا جاری ہو گیا۔۱۲

[3] اشارہ ہے حضرت بوعلی شاہ قلندر رح پانی پتی کی طرف۔ حضرت موصوف نے سلطان علاؤ الدین خلجی کو لکھا تھا کہ پانی پت کے عامل کو فوراً یہاں سے ہٹا دو ورنہ ہم تمہیں تختِ سلطنت سے ہٹا دینگے اور تمہارے بجائے دوسرے آدمی کو بادشاہ بنا دینگے۔

باز گیر ایں عاملِ، بدگوہرے
ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے

جس کے لئے اس کی زبان سے بادشاہ کا لفظ نکل جائیگا کیا وہ بادشاہ نہیں ہو جائے گا؟[1] جس کے سر پر وہ اپنا عمامہ باندھ دیگا کیا وہ تخت و تاج کا مالک نہیں بن جائے گا؟[2]

بندۂ حق کے صفات بیان کرنے کے بعد پھر اس قوم کے افراد سے خطاب کرتے ہیں:-

اند کے گم شو بقرآں و خبر
باز اے ناداں بخویش اندر نگر

اے سرحدی مسلمان! قرآن اور حدیث کا مطالعہ کر کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے کیا تعلیم دی ہے اور اس کے بعد اپنی حالتِ زار کو دیکھ کہ تو اس دنیا میں کس قدر آشفتہ حال (آوارہ) اور بے چارہ ہے۔!

---

[1] اشارہ ہے سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی طرف۔ ایک دن ان کی مجلس میں ایک شخص آیا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ رخصت ہوا تو دوسرا آدمی آیا۔ انہوں نے حاضرینِ مجلس سے کہا "بادشاہے رفت و بادشاہے آمد" چنانچہ آگے چل کر یہ دونوں شخص بادشاہ ہو گئے۔

[2] اشارہ ہے حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ کی طرف جن کا مزار گلبرگہ (دکن) میں ہے۔ ایک دن سلطان فیروز بہمنی ان کی خدمت میں آیا کہ میرے لڑکے کے لئے دعا فرمایئے کہ میرے بعد وہ تخت نشین ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ تیرے بعد تیرا بھائی احمد خاں تخت نشین ہوگا۔ جب سلطان کے جانے کے بعد احمد خاں حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے اپنا عمامہ اس کے سر پر باندھ دیا اور بادشاہت کی خوشخبری دے دی چنانچہ فیروز کی وفات کے بعد احمد خاں ہی تخت نشین ہوا۔ اور اس کی تخت نشینی کے تین ہفتے بعد حضرت کا وصال ہو گیا۔ !!

چونکہ تو نے وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا ہے اس لئے تو غیر اللہ کا غلام ہو گیا ہے۔ تیری پیشانی پر غلامی کا داغ دیکھ کر میرے دل میں داغ پڑ گئے ہیں۔ اس لئے میں تجھے مرشد رومیؒ کی تعلیمات سے آگاہ کرتا ہوں، شاید تیرے دل میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ مرشد رومیؒ فرماتے ہیں:۔

(۱) اے مسلمان! انسانوں کے بجائے خدا سے رزق طلب کر۔ تو اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ رزق انسانوں کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ رازقِ حقیقی اللہ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے:۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (۶۵-۳)

اور جو شخص اللہ کی نافرمانی سے ڈرے، اللہ اس کے لئے دنیا اور آخرت کے غم سے مخلصی کی صورت پیدا کر دے گا اور رزق دے گا اس کو جہاں سے رزق ملنے کا اسے گمان بھی نہ ہوگا۔ اور جو شخص اللہ کے رازق ہونے پر بھروسہ رکھے گا یعنی یہ یقین رکھے گا کہ میرا رازق اللہ ہے نہ کہ زید و عمرو، تو بلاشبہ اللہ اسے کافی ہے۔

اور اگر تو مستی کا طالب ہے تو بھنگ یا شراب سے مستی مت طلب کر کیونکہ جو مستی ان مسکرات سے حاصل ہوتی ہے وہ عارضی بھی ہے اور مضرت رساں بھی۔ بلکہ حق تعالیٰ کی محبت اختیار کر۔ اس محبت سے جو مستی پیدا ہوگی وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور اس سے کسی نقصان یا مضرت کا اندیشہ نہیں ہے۔

(۲) مادی اشیاء کے حصول کی طرف مائل مت ہو، مادی لذات کو مقصود مت بنا اور مادیات کی طلب میں اپنی زندگی برباد مت کر کیونکہ دنیا اور اس کی تمام لذات فانی ہیں اور ان کا طالب ہمیشہ ذلیل و خوار رہتا ہے۔

(۳) بخلاف ایں، روحانیت پیدا کر تاکہ ہمیشہ جوان رہے اور تجھ پر تجلیاتِ باری تعالیٰ کا نزول ہو جس کی بدولت تیرا چہرہ پُر نور ہو جائے گا۔

دولتمند افراد اگرچہ بہترین غذا کھاتے ہیں مگر مختلف عوارضِ جسمانی میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کے چہروں پر زردی چھائی رہتی ہے۔ برعکس این، بندگانِ حق، نانِ جویں پر اکتفا کرتے ہیں مگر ان کے چہروں پر نور برستا رہتا ہے۔

(۴) عاجزی اور فروتنی پر اعتبار کر! اللہ کی زمین پر اس طرح چل جس طرح گھوڑا چلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھوڑا خود اپنے پاؤں سے چلتا ہے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن تو ہوادار یا پالکی میں چلتا ہے جسے چار آدمی اس طرح اٹھاتے ہیں جیسے کوئی جنازہ آدمیوں کے کاندھوں پر جا رہا ہو۔

اس کے بعد پھر اقوامِ سرحد سے خطاب شروع ہوتا ہے، یہ تمام اشعار نصائح سے لبریز ہیں اور ان کا بنیادی تصوّر یہ ہے کہ ماسوی اللہ کے بجائے اللہ کو مقصودِ حیات بناؤ۔

کہتے ہیں کہ تقدیر (فلک یا سپہر لاجورد) کا شکوہ مت کرو اور دوسروں سے امداد کی توقع کے بجائے خود اپنی ذات پر بھروسہ رکھو۔

اپنے اندر محبتِ الٰہی کا رنگ پیدا کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگرچہ بظاہر تم ذرّہ کی طرح حقیر اور ضعیف ہو، لیکن محبتِ الٰہی کی بدولت تم میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ کائنات پر حکومت کر سکو گے۔

اس کائنات کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کائنات تمہاری خادم ہے لہٰذا اس پر حکمران ہو کر اپنے لئے عزت کا مقام حاصل کرو۔ اس کے حصول کی صورت یہ ہے کہ اپنے اندر وحدت کا رنگ پیدا کرو۔ یاد رکھو کہ اس دنیا میں عزت اور حکمرانی، وحدتِ ملّی پر موقوف ہے جو قوم اپنے اندر وحدت کا رنگ نہیں پیدا کرتی وہ زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔

مصرع — اندریں عالم حیات از وحدت است

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ حیات، وحدت

پر موقوف ہے مگر حیات کا مطلب یہ ہے کہ جو قوم حکمراں نہیں ہے (محکوم غیر ہے) وہ دراصل زندہ نہیں ہے۔ اقبالؔ کے فلسفہ میں زندگی سے حیوانوں کی سی زندگی مراد نہیں ہے بلکہ عزت کی زندگی مراد ہے اور یہ زندگی صرف حکومت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ کی رائے میں غلام زندہ نہیں ہے بلکہ مُردہ ہے۔

اس زندگی کو زندگی مت سمجھو۔ یہ غلامی کی زندگی بالکل بیکار اور بے قیمت ہے۔ یاد رکھو زندگی کی بنیاد عشق پر ہے۔ اگر اپنی شناخت درکار ہے تو اپنی آرزو پر غور کرو۔ اگر تمہاری آرزو اشرف اور اعلیٰ ہے تو تم بھی اشرف اور اعلیٰ ہو۔

عشق کی بدولت تمام انسانی قوتیں (چشم و گوش و ہوش) بیدار اور فعال ہو جاتی ہیں۔ اور انسان اپنی شخصیت سے پورا پورا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

جو شخص عشق سے بے بہرہ ہے وہ دوسروں کا غلام ہو جاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز انسان کو دیگر حیوانات سے متمیز کرتی ہے وہ عشق ہی ہے۔ اگر عشق نہ ہو تو انسان مٹی کا ڈھیر ہے[۱]۔

عشق ہی انسان کو اس کی مخفی استعدادوں سے آگاہ کرتا ہے جو شخص عشق الہٰی اختیار نہیں کرتا وہ کبھی اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا عشق ہماری شخصیت سے چنگاری کی طرح سرزد ہوتا ہے اور عاشق کے اندر اس قدر طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ساری کائنات پر چھا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ (پورِ آزر) نے توحید کی اشاعت کیلئے کعبہ تعمیر کیا اور اپنی نگاہ (روحانی طاقت) کے فیض سے اپنے پیرووں میں یہ طاقت پیدا کر دی کہ انہوں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

---

۱؎ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے (بالِ جبریل)

اے مسلمان ! اگر تو حضرت ابراہیمؑ کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی شخصیت کو مرتبۂ کمال تک پہونچا دے تو تیرے اندر بھی یہ طاقت پیدا ہو جائیگی، کہ تو دنیا میں انقلاب برپا کر دے، اور تیری شخصیت میں وہی تاثیر پیدا ہو جائیگی، جو اکسیر میں پائی جاتی ہے۔ اس کی بدولت مٹی، سونا بن جاتی ہے۔ تیری بدولت بُت پرست (مٹی) خدا پرست (سونا) بن جائیں گے۔

*
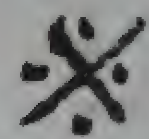
# فصل سوم

## مسافر کابل پہونچکر اعلیحضرت شہید کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے

شہرِ کابل خطۂ جنّت نظیر
آبِ حیواں از رگِ تاکش بگیر!

چشمِ صائب[۱] از سوادش سرمہ چیں
روشن و پایندہ باد آں سرزمیں

در ظلامِ شب سمن زارش نگر
بر بساطِ سبزہ می غلطد سحر!

آں دیارِ خوش سواد آں پاک بوم
بادِ او خوشتر ز بادِ شام و روم

آبِ او برّاق و خاکش تابناک
زندہ از موجِ نسیمش مردہ خاک

ناید اندر حرف و صوت اسرارِ او
آفتاباں خفتہ در کہسارِ او

ساکنانش سیر چشم و خوش گہر
مثلِ تیغ از جوہرِ خود بے خبر!

قصرِ سلطانی کہ نامش دلکشاست
زائراں را گردِ راہش کیمیاست

شاہ را دیدم دراں کاخِ بلند
پیشِ سلطانے فقیرے دردمند!

---

[۱] مرزا صائب تبریزی در مدح کابل گوید:-
"خوشا دفنے کہ چشم از سوادش سرمہ چیں گردد"

خلقِ او اقلیمِ دلہا را کشود     رسم و آئینِ ملوک آنجا نبود
من حضورِ آں شہِ والا گہر     بے نوا مردے بدربارِ عمر
جانم از سوزِ کلامش در گداز     دستِ او بوسیدم از راہِ نیاز
پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش     سخت کوش و نرم خوئے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار     دین و دولت از وجودش استوار
خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر     از مقامِ فقر و شاہی باخبر
در نگاہش روزگارِ شرق و غرب     حکمتِ او رازدارِ شرق و غرب
شہریارے چوں حکیماں نکتہ داں     رازدانِ مدّ و جزرِ اُمتاں
پردہ ہا از طلعتِ معنی کشود     نکتہ ہائے ملک و دین را وانمود
گفت "از آں آتش کہ داری در بدن     من ترا دانم عزیزِ خویشتن
ہر کہ او را از محبت رنگ و بوست     در نگاہم ہاشم و محمود اوست"
در حضورِ آں مسلمانِ کریم     ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
گفتم "این سرمایۂ اہلِ حق است     در ضمیرِ او حیاتِ مطلق است
اندرو ہر ابتدا را انتہاست     حیدر از نیروئے او خیبر کشاست"
نشۂ حرفم بخونِ او دوید     دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت "نادر در جہاں بیچارہ بود     از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر     از غمانِ بے حسابم بے خبر
نالہ با بانگِ ہزار آمیختم     اشک با جوئے بہار آمیختم

غیرِ قرآں غمگسارِ من نبود
قوتش ہر باب را بر من کشود"

گفتگوئے خسروِ والا نژاد     باز با من جذبۂ سرشار داد
وقتِ عصر آمد صدائے الصلوٰت     آں کہ مومن را کند پاک از جہات
انتہائے عاشقاں سوز و گداز     کردم اندر اقتدائے او نماز

## راز ہائے آں قیام و آں سجود
## جز بہ بزمِ محرمان نتواں کشود

---

(۱) اس فصل کے پہلے سات شعروں میں اقبالؔ نے کابل اور ساکنانِ کابل کا ذکر کیا ہے۔ اندازِ بیان شاعرانہ ہے۔ اس لئے ہر شعر میں مبالغہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان اشعار کا مطلب ذیل میں درج کرتا ہوں:-

کہتے ہیں کہ شہر کابل نہایت حسین اور دلکش ہے۔ یہاں کے انگوروں میں آبِ حیات کی تاثیر پائی جاتی ہے۔

کابل جیسا کہ معلوم ہے افغانستان کا دارالحکومت ہے اور ایشیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اشوکؔ کے زمانہ میں بودھ دھرم کا بہت بڑا مرکز تھا ۱۹۳۲ء میں نادرشاہ نے علومِ جدید کی ترویج کے لئے یونیورسٹی قائم کی اور ۱۹۳۳ء میں نصابِ تعلیم کے سلسلہ میں مشورہ کرنے کے لئے اقبال کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں کے قالین بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ آبادی اندازاً سوا لاکھ ہے۔

(۲) اس شہر کی دلکشی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرزا صائبؔ نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کا ایک مصرع یہ ہے ؎

خوشا وقتے کہ چشمم از سوادش سرمہ چیں گردد

خدا کرے یہ شہر ہمیشہ بارونق اور آباد رہے۔

مرزا صائب کی ولادت تبریز میں ہوئی مگر تعلیم اصفہان میں پائی۔ حکیم کاشی، اور حکیم شفائی سے شعر و ادب کی تکمیل کی۔ چونکہ دین سے لگاؤ تھا اس لئے عالمِ شباب میں حج کی سعادت حاصل کی۔ واپسی کے بعد ہندوستان کا رخ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں تمام

ایران، مغل بادشاہوں کی علم دوستی کے غلغلہ سے گونج رہا تھا۔ اس کے ایک شعر سے ایک بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

ہمچو عزمِ سفرِ ہند کہ در ہر دل ہست
رقصِ سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

کابل پہنچ کر ظفر خاں صوبہ دار کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ یہ امیر بہت علم دوست اور ادب نواز تھا۔ اس نے صائب کی بہت قدر و منزلت کی۔ ۱۰۳۹ھ شاہجہاں دکن گیا۔ چونکہ ظفر خاں بھی ساتھ تھا۔ اس لئے صائب کو بھی بادشاہ کی خدمت میں باریابی کا موقع مل گیا۔

۱۰۴۱ھ میں شاہجہاں کے ساتھ کشمیر گیا۔ ۱۰۴۲ھ میں اس کا باپ اُسے لینے آیا۔ اس لئے اس کے ساتھ وطن واپس چلا گیا۔ شاہ عباس ثانی نے اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی۔

---

شہر کابل کی توصیف کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں کہ قصرِ سلطانی میں پہونچکر مجھے نادر سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے ازراہِ نیاز اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

سات شعر شاہ موصوف کی مدح میں لکھے ہیں جن میں کوئی بات شرح طلب نہیں ہے۔

ان اشعار کے بعد لکھتے ہیں کہ نادر شاہ نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کی اسلام دوستی (آتشِ) کی وجہ سے میں آپ کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جسے اسلام سے محبت ہے۔ میری نگاہ میں ہاشمؔ اور محمودؔ ہے یعنی حقیقی بھائیوں کی طرح محبوب ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے قرآن حکیم کا ایک نسخہ بادشاہ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا اور کہا کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اس سے زیادہ قیمتی

کوئی شئی نہیں ہے اس پاک کتاب میں اللہ تعالیٰ نے کامیاب زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ نیز اس میں زندگی کے ہر شعبہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا پروگرام درج ہے۔ اسی کتاب کی تعلیمات پر عمل کرنے سے حضرت علیؓ میں اسقدر طاقت پیدا ہوگئی تھی کہ اُنہوں نے خیبر کا قلعہ فتح کرلیا۔

میری یہ باتیں سن کر بادشاہ پر رقت طاری ہوگئی اور انہوں نے کہا کہ کابل فتح کرنے سے پہلے جب میں اپنے وطن سے دور، یورپ میں زندگی بسر کررہا تھا تو بہت پریشان تھا۔ دین اور وطن کے غم میں گھلا جارہا تھا اس وقت قرآن عزیز کے سوا کوئی میرا غمگسار اور ہمدرد نہ تھا۔ اور بلاشبہ اسی کتاب کی برکت سے مجھے کامیابی نصیب ہوئی۔

اس گفتگو کے بعد میں نے شاہِ موصوف کی اقتداء میں عصر کی نماز پڑھی اور اس نماز میں مجھے وہ لذت حاصل ہوئی جس کا بیان لفظوں میں نہیں ہوسکتا۔ صرف اربابِ ذوق اس کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

# فصل چہارم

## بر مزارِ شہنشاہ بابر خلد آشیانی

بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است
درونِ پردۂ او نغمہ نیست فریاد است!
زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نہ گذشتم کہ پختہ بنیاد است
درفشِ ملتِ عثمانیاں دوبارہ بلند
چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است!
خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید اینجا
کہ ایں زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است!
ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دلی است
کہ آں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است
درونِ دیدہ نگہ دارم اشکِ خونیں را
کہ من فقیرم و ایں دولتِ خدا داد است
اگرچہ پیرِ حرم وردِ لا الٰہ دارد
کجا نگاہ کہ بُرّندہ تر ز پولاد است!

قیامِ کابل کے دوران اقبالؔ کو بابرؔ کے مزار پر جانے کا موقع ملا۔ وہاں پہونچ کر جو جذبات اُن پر طاری ہوئے، ان کو انہوں نے اس غزل کی صورت میں بیان کیا ہے۔

ع۔ بیا کہ سازِ فرنگ از نوا برافتاد است

اس مصرع میں لفظ "بیا" سے اقبالؔ، عالمِ تصور میں بابرؔ[1] سے خطاب کرتے ہیں کہ اُٹھ اور دوبارہ ہندوستان فتح کر۔ مطلب یہ ہے کہ کاش اس زمانے میں بھی کوئی بابر پیدا ہو جائے اور ہندوستان میں دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم کر دے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت متزلزل ہو چکی ہے اور ان کے عیش کا زمانہ ختم ہو چکا ہے

دوسرا شعر:۔

اے بابرؔ! دنیا اس وقت وطنیت کے بُت کی پوجا کر رہی ہے مگر میں اسلام (حرم) کی تعلیمات سے وابستہ ہوں کیونکہ ان کی بنیاد پختہ ہے۔ یعنی اسلام ایک ابدی صداقت ہے۔

تیسرا شعر:۔

ترکانِ عثمانی نے دنیا میں دوبارہ سربلندی حاصل کر لی، مگر افسوس

---

[1] بابرؔ ۱۴۸۳ء میں بمقامِ فرغانہ پیدا ہوا اور ۱۴۹۵ء میں اپنے باپ عمر شیخ مرزا کی وفات کے بعد ریاستِ فرغانہ کا وارث ہوا۔ ۱۵۰۴ء میں کابل فتح کیا اور ۱۵۱۹ء میں پنجاب فتح کیا۔ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر آگرہ اور دلّی پر قبضہ کیا۔ ۱۵۲۷ء میں راناسنگرام والیِ میواڑ کو شکست دی۔ ۱۵۲۷ء میں چندیری (مالوہ) کا قلعہ فتح کیا۔ ۱۵۳۰ء میں وفات پائی۔

کہ تیمؔ نسل (ترکانِ تیموری) کے افراد ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ اسی خیال کو اقبالؔ نے بالِ جبریل میں یوں ادا کیا ہے:-

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

**چوتھا شعر:-** اے بابر! تو خوش نصیب ہے کہ بعد وفات تیرا جسم اس سرزمین میں مدفون ہوا جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہے! اس شعر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ کو غلامی سے کس قدر نفرت تھی اور وہ مسلمانانِ ہند کی آزادی کے کس قدر متمنّی تھے۔

**پانچواں شعر:-** اسی جذبہ کو بالفاظِ دگر یوں بیان کیا ہے کہ میری نگاہ میں کابل دہلی سے ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ

ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

اس بوڑھی عورت نے ہزاروں شوہروں کا منہ دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلّی کو متعدد بادشاہوں نے فتح کیا ہے اور مختلف خاندانوں نے اس پر حکومت کی ہے۔

**چھٹا شعر:-** ملّتِ اسلامیہ کے زوال سے میری آنکھیں ہر وقت اشک آلود رہتی ہیں، مگر میں اپنے اشکوں کو آنکھ سے ٹپکنے نہیں دیتا۔ یعنی غمِ ملّت میں ہر وقت خونِ جگر پیتا رہتا ہوں، میں درویش ہوں اور میری دولت یہی اشکِ خونیں ہیں۔ اس لئے میں ان کو ضائع نہیں کرتا۔

**ساتواں شعر:-** یہ سچ ہے کہ اس زمانے کے مذہبی پیشوا (علماء اور صوفیا) زبان سے کلمۂ توحید کا ورد کرتے ہیں۔ مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جس کی نگاہ تلوار سے بھی زیادہ تیز ہو۔ یعنی جس کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ موجزن ہو۔

⁂

# فصل پنجم

## سفر به غزنی و زیارتِ مزارِ حکیم سنائیؒ

از نوازشہائے سلطانِ شہید / صبح و شامم صبح و شامِ روزِ عید
نکتہ سنجِ خاوران ہندی فقیر / میہمانِ خسروِ کیوان سریر!
تا ز شہرِ خسروی کردم سفر / شد سفر بر من سبک تر از حضر
سینہ بکشادم بر آن بادے کہ بار / لالہ رُست از فیضِ او در کہسار
آہ! غزنی آن حریمِ علم و فن / مرغزارِ شیر مردانِ کہن
دولتِ محمود را زیبا عروس / از حنا بندانِ او دانائے طوس!
خفتہ در خاکش حکیمِ غزنوی / از نوائے او دلِ مردان قوی
آن حکیمِ غیب، آن صاحب مقام / ترکِ جوشِ رومی از ذکرش تمام
من ز پیدا، او ز پنہان در سرود / ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
او نقاب از چہرۂ ایمان کشود / فکرِ من تقدیرِ مومن وانمود
ہر دو را از حکمتِ قرآن سبق / او ز حق گوید، من از مردانِ حق
در فضائے مرقدِ او سوختم / تا متاعِ نالہ اندوختم
گفتم اے بینندۂ اسرارِ جان / بر تو روشن این جہان و آن جہان
عصرِ ما وارفتۂ آب و گل است / اہلِ حق را مشکل اندر مشکل است
مومن از افرنگیان دید آنچہ دید / فتنہ ہا اندر حرم آمد پدید

چشمِ او راجلوۂ افرنگ برد     تا نگاہِ او ادب از دل نخورد
پختہ از فیضِ تو خامِ عارفان     اے حکیمِ غیب، امامِ عارفان
آنچہ اندر پردۂ غیب است گوئے
بوکہ آبِ رفتہ باز آید بجوئے

اس سفر میں اقبالؔ نے غزنی کے سفر اور حکیم سنائیؒ کے مزار کی زیارت کا تذکرہ کیا ہے۔ شرح لکھنے سے پہلے ہم غزنی اور حکیم موصوف کا مختصر حال سپردِ قلم کرتے ہیں۔

## غزنی

کابل سے ۸۰ میل کے فاصلے پر سلطان محمود کے عہدِ حکومت میں عظیم الشان شہر تھا اور علم و فن کا مرکز تھا۔ مگر اب اس کی آبادی صرف پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ سلطان محمود سومناتھ کا دروازہ فتح کی یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور اس وقت سے یہ دروازہ یہیں محفوظ تھا۔ مگر ۱۸۴۲ء میں جب انگریزوں نے غزنی فتح کیا تو یہ دروازہ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

## حکیم سنائیؒ کے سوانح حیات

مجدد نام، ابوالمجد کنیت، سنائی تخلص، اور غزنی وطن تھا۔ تاریخِ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے۔ توبہ کا واقعہ تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ایک رات حکیم سنائی شراب خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مجذوب لائے خور نامی وہاں آیا اور اس نے ساقی سے کہا کہ جامِ شراب دو تاکہ

"بکوریٔ حکیم سنائی" نوش کروں۔ ساقی نے اس کی وجہ دریافت کی تو کہا کہ اس کی نادانی میں شک کیا ہے؟ باوجود علم وفضل اپنی زندگی بادشاہوں کی جھوٹی تعریف کرنے میں ضائع کر رہا ہے! جب حکیم موصوف نے یہ بات سنی تو اسی وقت توبہ کی اور شیخ یوسف ہمدانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلوک طے کیا اور عزلت اختیار کی۔ کچھ عرصہ کے بعد حکیم موصوف کے زہد اور پارسائی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ خود بہرام شاہ نے اپنی بہن ان کے نکاح میں دینی چاہی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اور یہ دو شعر لکھ کر بھیج دیئے:۔

من نہ مردِ زن و زر و جاہم　　　بخدا اگر کنم وگر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم　　　بر سرِ تو کہ تاج نستانم

تاریخِ وفات میں اختلاف ہے۔ لیکن اکثر تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ ۵۴۶ھ میں وفات پائی۔ بوقتِ وفات یہ شعر وردِ زبان تھا:۔

باز گشتم ز آنچہ گفتم زانکہ نیست
در سخن معنی و در معنی سخن

سات مثنویاں اور ایک دیوان ان کی یادگار باقی ہے۔ مثنویوں میں "حدیقۃ الحقیقۃ" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بلکہ اسی پر ان کی شہرت کا دارو مدار ہے۔ حدیقہ میں گیارہ ہزار اشعار ہیں اور دس ابواب ہیں۔ پہلے باب میں حسبِ ذیل عنوانات ہیں:۔

فی التوحید، فی الاخلاص، فی التوکل، مجاھدہ اسبِ دنیا، صبر شکر، حضور القلب فی الصلوٰۃ، اعجاز القرآن، احلاوۃ القرآن وغیرہ۔

حکیم سنائیؒ پہلے فارسی شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کو تصوف کے مسائل سے روشناس کیا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:۔

کس نگفت این چنیں سخن بجہاں

در کسے گفت گو بیار و بخواں

چوں ز قرآں گزشتی و اخبار
نیست کس را ازیں نمط گفتار

اسی اوّلیت کی بناء پر مرشد رومیؒ نے یہ شعر کہا ہے:۔

عطارؒ روح بود و سنائیؒ دو چشم او
ما از پئے سنائیؒ و عطار آمدیم

اس فصل کے پہلے چار اشعار میں اقبالؔ نے یہ لکھا ہے کہ سلطان شہید (نادر شاہ) سے رخصت ہو کر غزنی گیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آہ! وہ غزنی جو سلطان محمود کے زمانہ میں علم و فن کا مرکز تھا اور یہی شہر سلطان موصوف کا پایہ تخت تھا۔ اور فردوسی جیسا شاعر اس کے دربار سے وابستہ تھا۔ فردوسی کے مختصر حالات درج ذیل ہیں:۔

اس کا نام ابوالقاسم حسن بن علی تھا۔ غالباً ۹۲۵ء میں بمقام طوس پیدا ہوا۔ شاہنامہ کا آغاز دقیقی نے کیا تھا مگر اس کی وفات ہو گئی اس لئے فردوسی نے ۳۰ سال کی محنت کے بعد غالباً ۱۰۱۰ء میں اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ چونکہ اس کو حسب توقع انعام نہ ملا اس لئے سلطان سے ناراض ہو کر اپنے وطن کو واپس چلا گیا اور وہیں غالباً ۱۰۲۵ء میں وفات پائی۔

اس کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں کہ حکیم سنائیؒ اسی شہر میں مدفون ہیں جن کے کلام کے مطالعہ سے دل کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

کون سنائی؟ وہ، جن کو مرشد رومیؒ نے "حکیم غیب" کا لقب دیا ہے واضح ہو کہ رومیؔ نے ان کی شان میں یہ شعر لکھا ہے:۔

در الٰہی نامہ گوید شرح ایں
آں حکیم غیب و فخر العارفین

کون سنائی؟ وہ جن کے ذکر سے رومیؔ کا "ترک جوش" مکمل ہوا۔

اس شعر میں رومیؔ کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام
از حکیم غزنوی بشنو تمام

مرشد رومیؒ ازراہِ انکسار فرماتے ہیں کہ میں چونکہ نیم خام یعنی اسرارِ تصوّف بیان کرنے میں ناقص ہوں۔ اس لئے میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی نیم پختہ یعنی ناقص ہے اس لئے طالبانِ حق کو حکیم سنائیؒ کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے اقبالؒ نے رومیؒ کے اس شعر سے حکیم سنائیؒ کی عظمت پر استشہاد کیا ہے کہ حکیم موصوف اس قدر بلند پایہ ہیں کہ ان کے سامنے رومیؒ بھی، اپنے آپ کو ناقص قرار دے رہے ہیں۔

ترک جوشی کی ترکیب غور طلب ہے۔ یہ ترکیب "ترک جوش" سے ماخوذ ہے۔ ترکوں (تاتاریوں) کا طریقہ یہ تھا کہ وہ گوشت کو نیم پختہ کھاتے تھے۔ یہاں سے یہ ترکیب فارسی زبان میں وضع ہوئی کہ ناقص شئے کو "ترک جوش" کہنے لگے [1]

اس کے بعد اقبالؒ اپنا موازنہ حکیم موصوف کے ساتھ کرتے ہیں :۔

کہتے ہیں کہ میں صفات (پیدا) کے مشاہدہ سے سرور حاصل کرتا ہوں، مگر حکیم سنائی، ذات (پنہاں) کے مشاہدہ میں مست ہیں۔ بالفاظِ دگر میری نظر صرف ظاہر (پیدا) پر ہے۔ مگر حکیم موصوف، باطن (پنہاں) کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بہرحال ہم دونوں کی زندگی کا سرمایہ "ذوق حضور" ہے۔ یعنی میں بھی سنائیؒ کی طرح حضوری (دیدار خداوندی) کا طالب ہوں۔

سنائی کا مرتبہ یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کی حقیقت واضح کی ہے۔ اور میں نے مومن کی تقدیر (اس کے انتہائی عروج) کو بیان کیا ہے۔ یعنی

---

[1] ماخوذ از شرح مثنوی مؤلفہ پروفیسر نکلسن ۱۲

انہوں نے یہ بتایا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ میں نے یہ بتایا کہ اگر کسی کو دولتِ ایمان حاصل ہو جائے تو وہ کہاں پہونچ جاتا ہے۔

ہم دونوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قرآنِ حکیم کی حکمت واضح کی ہے، فرق یہ ہے کہ انہوں نے حق یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کو بیان کیا ہے۔ (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں حق کی معرفت حاصل تھی) اور میں نے مردانِ حق کی شان واضح کی ہے۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ میں صرف مردانِ حق سے واقف ہوں۔)

حکیم سنائی کا مرتبہ واضح کرنے کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب میں ان کے مزار پر حاضر ہوا تو مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور میں نے عالمِ خیال میں حکیم موصوف کو مخاطب کر کے یہ کہا:-

"آپ روحانی حقائق سے آگاہ ہیں اور دونوں جہان کے حالات آپ پر عیاں ہیں۔ آجکل ہم مسلمان "دورِ مادیت" میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس لئے خدا پرستوں کو ہر قدم پر مشکلات درپیش ہیں۔ اس کے علاوہ اقوامِ یورپ بھی مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلی ہوئی ہیں چنانچہ ان کی حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام اسلامی ممالک میں فتنے برپا ہو رہے ہیں۔

چونکہ مسلمانوں کے قلوب عشقِ رسول ؐ سے خالی ہو چکے ہیں۔ اس لئے وہ یورپین تہذیب و تمدن کو اپنے مرض کی دوا سمجھ بیٹھے ہیں۔

---

۔ ؎ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جب اقبالؔ حکیم سنائی کے مزار پر پہونچے تو فاتحہ پڑھنے کے بعد ان پر رقت طاری ہو گئی اور بڑی دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے سید صاحب مرحوم کے بیان کی تصدیق اقبالؔ کے اس مصرع سے ہو سکتی ہے۔ ع

تا ختارع نالۂ اندوختم

اندریں حالات میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی قوم کو اسرارِ غیب سے آگاہ کریں۔ شاید اُن کے اندر دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

نوٹ:- ع

بوکہ آب رفتہ باز آید بجوئے۔

اس مصرع میں آب رفتہ کنایہ ہے عظمتِ ماضیہ سے اور "جو" کنایہ ہے ملّتِ اسلامیہ سے۔ ۱۲

※

# فصل ششم

## حکیم سنائیؒ کی رُوح بہشتِ بریں سے جواب دیتی ہے

راز دانِ خیر و شر گشتم ز فقر
زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر

یعنی آں فقرے کہ داند راہ را
بیند از نور خودی اللہ را

اندرونِ خویش جوید لا الٰہ
در تہ شمشیر گوید لا الٰہ

فکرِ جاں کن چوں زناں برتن متن
ہمچو مرداں گوئے در میداں فگن

سلطنت اندر جہانِ آب و گِل
قیمتِ او قطرۂ از خونِ دل

مومناں زیرِ سپہرِ لاجورد
زندہ از عشق اند و نے از خواب و خورد

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفےٰ است

زندۂ تا سوزِ او در جانِ تست
ایں نگہ دارندۂ ایمانِ تست

باخبر شو از رموزِ آب و گل
پس بزن بر آب و گل اکسیرِ دل

دل ز دیں سرچشمۂ ہر قوت است
دیں ہمہ از معجزاتِ صحبت است

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

بو علی دانندۂ آب و گل است
بے خبر از خستگیہائے دل است

نیش و نوشِ بوعلی سینا بہل
چارہ سازیہائے دل از اہلِ دل

مصطفےٰ بحر است و موجِ او بلند
خیز و این دریا بجوئے خویش بند

مدّتے بر ساحلش پیچیدۂ
لطمہ ہائے موجِ او نادیدۂ!

یک زمان خود را بدریا در فگن
تا روانِ رفتہ باز آید ز تن

اے مسلمان جز براہِ حق مرو
نا اُمید از رحمتِ عامے مشو

پردہ بگذار آشکارائی گزین
تا بلرزد از سجودِ تو زمین

دوش دیدم فطرتِ بیتاب را
روحِ آن ہنگامۂ اسباب را

چشمِ او بر زشت و خوبِ کائنات
در نگاہِ او غیوبِ کائنات

دستِ او با آب و خاک اندر ستیز
آن بہم پیوستہ و این ریز ریز

گفتمش در جستجوئے کیستی؟
در تلاشِ تار پوئے کیستی؟

گفت از حکمِ خدائے ذوالمنن
آدمے نو سازم از خاکِ کہن

مشتِ خاکے را بصد رنگ آزمود
پے بہ پے تابید و سنجید و فزود

آخرا و را آب و رنگِ لالہ داد
لاالٰہ اندر ضمیرِ او نہاد

باش تا بینی بہارِ دیگرے
از بہارِ باستان رنگین ترے

ہر زمان تدبیر ہا دارد رقیب
تا نگیری از بہارِ خود نصیب

بر درونِ شاخ و گل دارم نظر
غنچہ ہا را دیدہ ام اندر سفر

لالہ را در وادی و کوہ و دمن
از دمیدن باز نتوان داشتن

بشنود مردے کہ صاحب جستجو است
نغمہ را کو ہنوز اندر گلو است

---

حکیم موصوف نے جواب دیا کہ:-

(۱) فقر کی بدولت میں رازدانِ خیر و شر بھی ہو گیا اور مجھے زندگی اور نظر بھی حاصل ہو گئی۔ لہٰذا اگر مسلمان ان صفات سے متصف ہونا چاہتے

ہیں تو انہیں بھی اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرنی لازم ہے

جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے۔ اقبال نے فقر کا فلسفہ سب سے پہلے جاوید نامہ میں پیش کیا ہے اس کے بعد اس مختصر کتاب میں کچھ اشارات کئے اور پوری وضاحت "مثنوئ پس چہ باید کرد" میں کی ہے۔ میں چونکہ فقر کی پوری تشریح اسی مثنوی کی شرح میں درج کروں گا۔ اس لئے اس جگہ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جب ایک مسلمان عشقِ رسولؐ کی بدولت اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیتا ہے تو اس میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا فقر نام ہے اپنے آپ کو سرورِ دو عالم صلعم کے رنگ میں رنگین کر لینے کا۔ اسی کو اصطلاح میں "فنا فی الرسول" کہتے ہیں۔

(۱) سنائی کہتے ہیں کہ فقر کی بدولت انسان "رازدانِ خیر و شر" ہو جاتا ہے۔ اس کے دو معنیٰ ہیں۔ پہلا معنیٰ یہ ہے کہ جب ایک مسلمان فنا فی الرسولؐ ہو جاتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ "خیر" نام ہے حضور انور صلعم کی اتباع کا، اور "شر" نام ہے حضورؐ کے احکام سے انحراف کا۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ جب ایک مسلمان کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ (اور یہ معرفت فنا فی الرسول ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے) تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حق تعالیٰ وجودِ مطلق ہے اور وجودِ مطلق سے خیر ہی صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ بذاتِ خود خیر محض ہے۔ شر جو کچھ نظر آتا ہے یہ امر اضافی ہے، یعنی جب ہم قوانینِ الٰہیہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو ہمارے فعل سے شر پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً زید ایک بیکس آدمی کو قتل سے بچانے کے لئے حملہ آور کو قتل کر دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خیر ہے۔ لیکن اگر وہ اسی تلوار سے خود کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو اس کا یہ فعل شر ہو جائے گا۔ زید بھی وہی ہے اس کی تلوار بھی وہی ہے اور اس کا ہاتھ بھی وہی ہے مگر پہلا فعل خیر ہے، دوسرا شر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خدا نے جو اختیار زید کو عطا کیا ہے اس کے صحیح استعمال سے خیر اور غلط استعمال سے شر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:۔

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ط (۴-۷۹)

جو پہونچے تجھ کو کوئی بھلائی، تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو پہونچے تجھ کو کوئی برائی (مصیبت) تو وہ خود تیرے نفس کی طرف سے ہے۔ یعنی تیرے اعمال کا نتیجہ ہے۔

ہمت، طاقت، ارادہ اور اختیار کے غلط یا صحیح استعمال کا معیار ذاتِ رسالت مآب صلعم ہے یعنی جسے حضور صلعم جائز یا حلال یا حسن قرار دیں وہ جائز یا حلال یا حسن ہے اور جس بات کو حضور ناجائز یا حرام یا قبیح قرار دیں۔ وہ ناجائز حرام یا قبیح ہے۔ اب اگر ایک شخص حضور انور صلعم کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے افعال و اعمال کا لازمی نتیجہ شر کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسی لئے اقبالؔ نے یہ لکھا ہے:-

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

(ارمغانِ حجاز)

(ب) اس کے بعد سنائی کہتے ہیں کہ فقر کی بدولت مجھے زندگی اور نظر بھی حاصل ہوگئی۔ یعنی فقر کی بدولت انسان زندہ ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ لاشۂ بے جان تھا، یعنی حیاتیاتی زاویۂ نگاہ سے مُردہ تھا، فقر کی بناء پر اس میں حرکت پیدا ہوگئی! بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقر کی بدولت انسان زندگی کے معنیٰ سے آگاہ ہو جاتا ہے اور قرآنی زاویۂ نگاہ سے زندگی کا معنیٰ (مفہوم) ہے، دنیا میں معزز، محترم اور سربلند ہوکر رہنا، کسی انسان کے سامنے سر نیاز خم نہ کرنا، کسی سے نہ ڈرنا۔ کسی میں کسی قسم کی طاقت تسلیم نہ کرنا۔ مختصر یہ کہ غیر اللہ کی غلامی

سے نکل کر صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا

جس وقت ایک شخص زندگی کے مفہوم سے آگاہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنی پوری توجہ زندگی کے مفہوم یا مقصد کے حصول پر مرکوز کر دیتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کو قرآن نے "جہاد فی سبیل اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔ خلاصۂ کلام اینکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے صرف مجاہد زندہ ہے اور جو مسلمان مجاہد نہیں ہے وہ قرآن کی رُو سے زندہ نہیں ہے بلکہ مُردہ ہے خواہ وہ دونوں وقت روٹی کیوں نہ کھاتا ہو اور دفتر میں بیٹھ کر نوشت و خواند کیوں نہ کرتا ہو۔ وقس علیٰ ہذا۔ بالفاظِ دگر، فقر کی بدولت ایک انسان غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

(ج) تیسری بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ فقر کی بدولت انسان صاحبِ نظر ہو جاتا ہے۔ "صاحبِ نظر" تصوّف کی اصطلاح میں اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا قلب مہبطِ انوارِ آلہیہ ہو جائے۔ اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو۔

(۱) اسے بصارت کے علاوہ بصیرت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کے باطن (قلب) کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں جس کی بدولت وہ ہر شئی کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ یعنی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظِ مبارکہ میں وہ شخص اللہ کے نور سے دیکھتا ہے (یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ)

(۲) اسے اللہ تعالیٰ کی معیّت نصیب ہو جاتی ہے۔ اور جب اسے یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ مخلوقات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بلکہ تمام کائنات اس کا طواف کرنے لگتی ہے۔ شاہانِ وقت اس سے ملنے کی آرزو کرتے

---

لے زندگی کا یہی مفہوم سلطان ٹیپو کے ذہن میں تھا جس کی بنا پر انہوں نے ولزلی کو یہ لکھ کر بھیجا تھا "شیر کی حیاتِ یک روزہ گیدڑ کی حیاتِ صد سالہ سے بہتر ہے"۔

ع۔ یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش (جاوید نامہ)

ہیں۔ مگر وہ ان کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات ان کو یہ کہلا بھیجتا ہے کہ" فقیر کے گھر دو[2] دروازے ہیں اگر بادشاہ مجھ سے ملنے کے لئے ایک دروازے سے آیا تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا[1]۔

(۳) اس کی ظاہری نگاہ میں یہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جسے ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔ یعنی جس پر توجہ کرتا ہے اُسے خدا رسیدہ بنا دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جو شخص اس کی صحبت میں بیٹھ جاتا ہے وہ واصل باللہ ہو جاتا ہے۔

خواجگانِ چشت رح کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے ان تینوں باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ صرف ایک واقعہ ذیل میں درج کرتا ہوں :۔

ایک مرتبہ سلطان الہند خواجہ غریب نواز رح دلی تشریف لائے تو اپنے دوست شیخ الاسلام مولانا نجم الدین سے ملنے تشریف لے گئے۔ انہوں نے حضرت سے کہا کہ آپ کے مرید (خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح) کی وجہ سے میری شیخ الاسلامی کالعدم ہو گئی ہے۔ ہر شخص انہی کا کلمہ پڑھتا ہے۔ مجھے پوچھتا بھی نہیں۔ یہ سن کر حضرت نے اپنے مرید سے کہا" بابا قطب الدین! میرے ساتھ اجمیر چلو۔" چنانچہ وہ تیار ہو گئے۔ جب پیر اور مُرید دلی سے رخصت ہوئے تو آگے آگے بادشاہ شمس الدین (التمش) اور پیچھے پیچھے ساری خلقت ان دو[2] بزرگوں کے ساتھ دلی سے نکل کھڑی ہوئی۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جس جگہ ان بزرگوں کے قدم پڑتے تھے لوگ اس جگہ کی خاک کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔ جب سلطان الہند رح نے یہ کیفیت دیکھی تو اپنے مُرید سے فرمایا۔" بابا قطب الدین! مناسب ہے کہ دلی ہی میں رہو کیونکہ مخلوقِ خدا کی

---

[1] جب سلطان علاؤ الدین خلجی نے حضرت سلطان المشائخ رح کی خدمت میں یہ کہلا کر بھیجا کہ اگر آپ مجھے حاضر خدمت ہونے کی اجازت نہیں دیں گے تو میں کسی دن بلا اجازت حاضر ہو جاؤں گا۔ اس پر آپ نے یہ جواب دیا تھا ۱۲۔

دل شکنی مجھے گوارا نہیں ہے۔"

شعر ۲، ۳:- ان دو شعروں میں حکیم سنائیؒ نے خود فقر کی وضاحت کی ہے کہ صاحبِ فقر وہ ہے جو راہ میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ اس طریق سے واقف ہوتا ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہونچ سکتا ہے۔ بلکہ بالفعل پہونچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی خودی اس درجہ منوّر ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مقصود (اللہ) کو دیکھ لیتا ہے اور ہر عاقل اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اگر ایک شخص اپنے مقصود کو بچشمِ خود دیکھ لے تو یقیناً اسے حاصل کر لے گا۔

فقر کی بدولت ایک شخص اپنی ذات میں خدا کا جلوہ دیکھ لیتا ہے یعنی اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ میں بذاتِ خود کچھ نہیں ہوں، مگر مظہر ذاتِ باری ہوں۔ باطن میں بھی وہی ہے۔ ظاہر میں بھی وہی ہے بلکہ ساری کائنات کا ظاہر و باطن وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے گویا وہ اُس آیت کی زندہ تفسیر بن جاتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔

آگاہ ہو جاؤ کہ ہر شئی کی ابتدا بھی وہی ہے اور انتہا بھی وہی ہے یا ہر شئی کے اوّل میں بھی وہی ہے اور آخر میں بھی وہی ہے، ہر شئی کا ظاہر بھی وہی ہے اور ہر شئی کا باطن بھی وہی ہے اور وہ ہر شئی کی حقیقت کا علم رکھتا ہے۔

اب ناظرین خود انصاف کریں کہ جب ہر شئی کا یا اس کائنات کا اوّل بھی وہی ہے اور آخر بھی وہی ہے، اس کا ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے تو کائنات کا وجود کہاں ہے؟ اسی لئے عرفا نے کہا ہے۔

"لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ"

جب اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے تو غیر اللہ سے ڈر کیسا؟ اس کی اطاعت یعنی چہ؟ اور اس سے کسی قسم کی توقع کیوں رکھی جائے؟ یہی وجہ ہے کہ صاحبِ فقر، زیرِ شمشیر بھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہی کہتا ہے۔ اسی لئے عرفا

نے کہا ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، کا مطلب ہے لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔
مسلمان حقیقی معنوں میں مُوحّد بننا ہی اس وقت ہے جب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنوں میں کوئی موجود ہی نہیں ہے اقبالؔ نے جو یہ کہا ہے کہ :-

لَآ اِلٰہ گوئی ؟ بگو از روئے جاں
تا زِ اندام تو آید بوئے جاں

(جاوید نامہ)

تو ان کی مراد یہی ہے کہ مؤحد اس وقت بنو گے جب تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔
چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش
ز "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ" دریاب

(ارمغانِ حجاز)

یعنی اگر تم "لَا موجُودَ اِلَّا اللّٰہ" پر عامل ہو جاؤ تو ہر شئی کا باطن تم پر فاش ہو جائیگا۔ بالفاظِ دگر، اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ مومن ذاتِ باری کو جو پوشیدہ ہے کس طرح فاش (ظاہر) کر دیتا ہے۔ تو لَا مَوجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ میں غور کرو۔ یعنی جب مومن یہ کہتا ہے کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ تو ہر شئی کا باطن ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور شئی کا باطن، اللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب ہر شئی کے مستقل وجود کی نفی ہو گئی تو اللہ ہی باقی رہ گیا اور اس طرح وہ جو تعینات کے پردوں میں پوشیدہ تھا، ان پردوں کے ہٹ جانے سے ظاہر ہو گیا۔ اسی مضمون کو خواجہ میر دردؔ نے یوں بیان کیا ہے :-

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا

اس کے بعد حکیم سنائی مسلمانوں کو عشق رسولؐ کا درس دیتے ہیں یہ درس وپیغام، اس فصل کے چھٹے شعر سے شروع ہوکر اٹھارہویں شعر پر ختم ہوتا ہے۔ چونکہ حکیم موصوف کی زبان سے اقبالؔ نے خود اپنے پیغام کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ اس لئے میں ہر شعر کا مفہوم واضح کروں گا :۔

(۱) سب سے پہلے سنائیؒ نے بنیادی نکتہ پیش کیا ہے جو یہ ہے کہ اصلی شئی روح ہے جسم (مادہ) نہیں ہے اور یہی بنیادی فرق ہے اسلام اور مادیت یا دہریت یا الحاد میں۔ مادیت کی تعلیم یہ ہے کہ صرف مادہ موجود ہے روح کا مطلق وجود نہیں ہے اس لئے انسان کو اپنی تمام تر توجہ مادیات یعنی زن، زر اور زمین کے حصول پر مرکوز کرنی چاہئیے۔ بالفاظِ دگر، مقصدِ حیات، حصولِ لذائذِ جسمانی ہے۔

اس کے برعکس اسلام یہ کہتا ہے کہ اصلی شئی روح (جان) ہے، تن (مادہ) فانی ہے اور اس لئے ہیچ ہے۔ پس مقصدِ حیات استلذاذ جسمانی نہیں ہے بلکہ تربیت روحانی ہے تاکہ روح اس جسم سے جدا ہونے کے بعد ارتقائی مدارج طے کرسکے۔ اگر دنیاوی زندگی میں روح کی تربیت نہ کی تو مقصدِ حیاتِ ارضی حاصل نہ ہوسکے۔

مادہ پرست کی نگاہ سطحی اور محدود ہوتی ہے اس کی دانست میں موت کے بعد کچھ نہیں ہے۔ لیکن خدا پرست کی نگاہ عمیق اور لامحدود ہوتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ روحانی ترقی کی کوئی حد نہیں ہے۔ مگر صرف وہ روحیں ترقی کرسکیں گی جن کی تربیت اس زندگی میں ہوچکی ہو۔ اس لئے مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر توجہ "جان" کی تربیت پر مبذول کردے یعنی جسم کو آراستہ کرنے کے بجائے روح کو آراستہ کرلے۔ ع

فکرِ جاں کن چوں زناں بر تن متن

اس مصرع کا پہلا جز اس آیت کا لفظی ترجمہ ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ۔
اے ایمان والو تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا۔

پہلے مصرع میں یہ کہا کہ اپنی روح کی تربیت کا انتظام کرو۔ دوسرے مصرع میں تربیت کا طریقہ بیان کیا کہ مردوں کی طرح جہاد کو شیوۂ زندگی بناؤ۔ بالفاظِ دگر، مصائبِ زندگی میں مشکلات کا مقابلہ کرو۔

(۲) یاد رکھو کہ اگر تم اس دنیا میں حکمرانی کے آرزومند ہو تو اپنے دل کو بذریعہ عشقِ رسولؐ زندہ کر لو۔ دلِ زندہ یا دلِ بیدار ایسی عظیم الشان شئے ہے کہ دنیاوی حکومت (سلطنت) اس دل کے ایک قطرۂ خون سے خریدی جا سکتی ہے یعنی سلطنت اور حکومت، عاشقانِ رسول ؐ کے قدموں میں سجدہ کرتی ہے۔ اقبال کا مطلب اس سے یہ ہے کہ اے مسلمانو! حصولِ سلطنت کو مقصودِ حیات مت بناؤ۔ تمہارا مقصدِ حیات حصول رضائے حق ہے، جس کا ذریعہ عشقِ رسول ؐ ہے اور جب حق تعالیٰ تم سے راضی ہو جائیگا، تو سلطنت خود بخود تمہارے قدموں میں آ جائے گی۔ جس طرح اگر کسی ملک کا بادشاہ یا آمر (ڈکٹیٹر) کسی شخص سے راضی ہو جائے تو وہ کون سی دنیاوی نعمت ہے جو اس کو خود بخود حاصل نہیں ہو جائے گی۔؟

(۳) یہ بہت غور طلب شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ مومن کی زندگی خواب و خورش پر موقوف نہیں ہے۔ وہ عشق کی بدولت زندہ رہتا ہے۔ اسے کھانے پینے اور سونے کی احتیاج نہیں ہوتی۔

عام طور سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ انسان کی زندگی ان چیزوں پر موقوف ہے (۱) کھانا پینا (۲) سونا۔ چنانچہ ہم سب ان دو چیزوں پر ہی اپنی ساری توجہ مبذول رکھتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ:۔

(۱) ہم لذیذ اور بہترین اور زیادہ سے زیادہ طاقت عطا کرنے والی غذائیں کھاتے ہیں۔ اور اب تو ہر شخص "وٹامن" کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

(ب) چونکہ اعلیٰ درجہ کی مقوی اور مرغن غذائیں بہت قیمتی ہوتی ہیں اس لئے ہم رات دن دولت کمانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے اکثر اوقات مذہب، اخلاق اور انسانیت (ضمیر) تینوں چیزوں کو قربان کر دیتے ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی، مقوی غذاؤں پر موقوف ہے اور یہ غذائیں دولت پر موقوف ہیں۔ اس لئے رفتہ رفتہ دولت ہمارا معبود بن جاتی ہے۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ زندہ رہنے یا تندرست رہنے کے لئے آٹھ گھنٹے سونا بھی بہت ضروری ہے۔ اس لئے ہماری زندگی اگر غور سے دیکھا جائے عبارت ہے کھانے پینے اور سونے سے۔ اور ہم ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم ایسا نہیں کرینگے تو مر جائیں گے۔

مگر حکیم سنائی اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ مومن کی زندگی خواب و خورش پر موقوف نہیں ہے وہ عشق کی بدولت زندہ رہتا ہے۔ اس دورِ مادیت میں جبکہ ہر شخص "ٹانک" کی تلاش میں سرگرداں ہے، اقبالؔ کا یہ اعلان کرنا کس قدر عظیم الشان خدمت ہے تصوف کی، بالفاظِ دگر، حقیقی اسلام کی!

مادہ پرستوں کی محفل میں بیٹھ کر صاف لفظوں میں مادیت کی تردید کرنا، کتنا عظیم الشان کارنامہ ہے اقبالؔ کا اور کتنا جراَت مندانہ اقدام ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سچے خادم کا جسے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے پیدا کیا تھا!

بزرگانِ دین کے سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو اقبالؔ کے اس نکتۂ عجیبہ کی بآسانی تصدیق ہو سکتی ہے۔ مثلاً حضرت میاں میر لاہوریؒ جن کی وفات ۱۰۴۵ھ میں ہوئی تھی، تیس سال تک مطلق نہیں سوئے اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی دہلویؒ نے مدتِ دراز تک جَو کی روٹی کے چند لقموں پر اکتفا کیا۔ اس کے باوجود ان دونوں بزرگوں

نے بڑی طویل عمریں پائیں۔

(۴) اب حکیم موصوف ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اُس عشق کا منبع جس کی بدولت مومن زندہ رہتا ہے، سرکارِ دو عالم کی ذاتِ بابرکات ہے۔ یعنی جو شخص حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے وہ بے خواب و خورش زندہ رہ سکتا ہے۔

(۵) حضور سے محبت کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ مومن (عاشق) کو حقیقی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آپ کی محبت، مومن کے ایمان کی محافظ ہے۔ یعنی ایمان موقوف ہے حضور سے محبت کرنے پر۔ یہ مضمون اس حدیث سے ماخوذ ہے:۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَمِنْ وَلَدِہٖ وَمِنَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ؀

یعنی اے مسلمانو! تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اُسے اُس کے والدین، اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

(۶) اے مسلمان! جسم (آب و گل) کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر، یعنی خوب سمجھ لے کہ تیرا جسم مادی فانی ہے۔ اگر تو نے اپنے دل کو بذریعہ عشقِ رسول، اکسیر نہ بنایا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موت تجھے فنا کر دے گی۔ اسی لیے دل کو اکسیر بنا لے تاکہ اس کی تاثیر سے تیرا جسم بھی غیر فانی ہو جائے۔ بالفاظِ دگر، عاشق حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

(۷) یاد رکھ! دین کی بدولت مومن کا دل ہر قوت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ یعنی دل کی قوت دین پر موقوف ہے اور دین محبت پر منحصر ہے۔

(۸) اس شعر میں پہلے شعر کی شرح کرتے ہیں کہ دین، کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کتابوں سے علم حاصل ہو سکتا ہے۔ دین تو بزرگانِ دین کی صحبت

(نظر) سے سا عمل ہوتا ہے۔

اس زمانے میں چونکہ مسلمان مغربی علوم اور مادی تہذیب سے متاثر ہو چکے ہیں اس لئے ان کے دماغوں سے صحبت کی اہمیت اور فائدیت اور ضرورت بالکل زائل ہو چکی ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ لوگ مسلمانوں کے رہنما بن گئے ہیں جو خود صحبتِ بزرگانِ دین سے محروم ہیں۔ اس لئے یہ لوگ مسلمانوں کو ساری باتیں بتاتے ہیں۔ مگر صحبت کی اہمیت سے آگاہ نہیں کرتے کیونکہ ایسا کریں تو ان کی قلعی کھل جائے۔ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ عامتہ المسلمین (الا ماشاء اللہ) اس کوچہ سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ اگر اپنی ملی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ جب تک ہندوستان میں انگریزی تعلیم عام نہیں ہوئی تھی۔ تمام تعلیم یافتہ مسلمان، صحبتِ مرشد کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ اسی لئے علماء کا یہ طریقہ تھا کہ علمِ دین حاصل کرنے کے بعد کسی شیخِ طریقت کی صحبت اختیار کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ علم

علم و حکمت از کتب دیں از نظر

مثال کے طور پر قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنے وقت کے بہت بڑے محدث اور مفسر اور فقیہہ تھے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی انہیں "بیہقیِ وقت" کہا کرتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ علم و فضل انہوں نے حضرت جانِ جاناں مظہر شہید نقشبندی دہلوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلوک طے کیا۔

ہمارے زمانے میں حضرت مولٰنا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولٰنا اشرف علی صاحب تھانوی، ان تینوں علماء نے شیخ العرب والعجم حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب چشتی مہاجر مکی کی صحبت اٹھائی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ صحبت کے بغیر دین میں رسوخ حاصل نہیں ہو سکتا۔ منطق، فلسفہ اور کلام سے عقل تیز

ہو جاتی ہے مگر دل زندہ نہیں ہو سکتا۔

۹، ۱۰۔ اب حکیم موصوف خود مثال دیتے ہیں کہ بوعلی سینا یعنی فلسفی، طبیعات اور دوسرے علوم میں تو ماہر ہوتا ہے مگر وہ امراضِ قلبی کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے فلاسفہ کے جھوٹے سچے نظریات سے قطع نظر کرو اور اپنے دل کی اصلاح کے لئے عاشقانِ الہٰی کی صحبت اختیار کرو۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے فلسفہ اور الہیات میں مقام رفیع حاصل کرنے کے بعد اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لئے بالآخر اہلِ دل کی طرف رجوع کیا۔ کیونکہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی تھی کہ ؎

چارہ سازیہائے دل از اہل دل

یعنی دل صرف اہل دل کی صحبت میں بیٹھنے سے ہی زندہ ہو سکتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ چراغ سے چراغ جل سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے چراغ کو دوسرے چراغ کی لَو سے مربوط نہیں کریگا۔ اس کا چراغ کبھی روشن نہ ہو سکے گا۔ بوعلی سینا کے مختصر سوانح حیات ذیل میں درج کرتا ہوں۔

دنیائے اسلام کا یہ مشہور فلسفی ۹۸۰ء میں شہر بخارا (ترکستان) کے نزدیک ایک قصبہ میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ مثلاً دینیات، الہیات، فلسفہ، منطق، کلام، ریاضی، ہیئت، طبیعات اور طب وغیرہ سے فارغ ہو گیا۔ اس کی تصانیف میں کتاب الشفاء (۱۸ جلدوں میں ہے)، اشارات، نجات اور قانون بہت مشہور ہیں۔ ۱۰۳۷ء میں بمقام ہمدان وفات پائی۔

شعر ۱۱ تا ۱۳:۔ ان تین اشعار میں اقبالؔ نے بحر، موج، دریا، جو، ساحل اور لطمۂ موج کا تلازمہ باندھا ہے:۔

بحر کنایہ ہے ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے، موج کنایہ ہے آپؐ کے کمالاتِ عالیہ سے، جوئے خویش کنایہ ہے ذاتِ سالک سے، دریا

رابجوئے خویشتن بستن کنایہ ہے مقامِ فناً فی الرسول ؐ سے، ساحل کنایہ ہے اقرار باللسان سے یعنی زبان سے یہ کہنا کہ میں مسلمان ہوں یا محبِ رسول ؐ ہوں۔ لطمۂ موج کنایہ ہے اُن مجاہدات یا صعوبات سے جو عاشق کو اس راہ میں پیش آتی ہیں۔ خود را بدریا در افگندن کنایہ ہے راہِ سلوک طے کرنے سے۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کمالاتِ بشری کے اعتبار سے بمنزلۂ بحرِ ناپیدا کنار ہے یعنی آپ ؐ کی ذاتِ اقدس جامع کمالات لامتناہی ہے۔ تیرا فرض یہ ہے کہ اس سمندر (ذاتِ محمدیؐ) کو اپنے اندر جذب کر لے یعنی فنا فی الرسول ہو کر اپنے اندر حضور اقدس صلعم کے تمام کمالات ظلّی طور پر پیدا کرلے۔ اس کی مثال درکار ہو تو اس لوہے پر غور کرو جو آگ میں پڑ کر آگ کے خواص اور اس کی صفات اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔

تو نے مدتوں زبان سے محبّت کا دعویٰ کیا ہے مگر اس راہ میں جو مصائب پیش آتے ہیں، اُن سے تو ہنوز بیگانہ ہے۔ اس لئے اب اپنے عمل سے اپنے دعویٰ کا ثبوت دے یعنی حضورِ انور صلعم کی ذات میں فنا ہو جا تاکہ تو از سرِ نو زندہ ہو جائے یعنی جب تک تو اپنی مرضی کو حضور ؐ کی مرضی میں فنا نہیں کر دے گا اس وقت تک تجھے حیاتِ ابدی نصیب نہیں ہو سکتی۔

ان اشعار کا مطلب تو واضح ہو گیا اتنی صراحت اور کردوں کہ دریا کو نہر میں بند کر لینا ایک فن ہے اور اور کوئی فن صاحبِ فن سے سیکھے بغیر نہیں آتا۔ کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا ہے جسے محض طب کی کتابیں پڑھ کر طبابت یا جرّاحی کا فن آگیا ہو؟ کیا آج تک کسی شخص نے محض موسیقی کی کتابوں سے راگ راگنیاں گانے میں کمال حاصل کیا ہے؟

پس اگر سرجن بننے کے لئے مدتوں سرجری کلاس میں علم حاصل کرنے کے بعد آپریشن روم میں کسی ماہرِ فن سے سرجری کا فن سیکھنا ضروری ہے اور اسی

طرح موسیقار بننے کے لئے کسی ماہر فن کی صحبت میں بیٹھنا ضروری ہے تو دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے لئے کسی ماہر فن (یعنی شیخ طریقت) کی صحبت اختیار کرنا بدرجۂ اولیٰ ضروری اور لازمی ہے۔

یہ عجیب منطق ہے جو اس زمانہ کے "ترک جوش" قسم کے مذہبی راہنما اور مصلحین قوم پیش کرتے ہیں کہ دیگر تمام فنون کے لئے تو صاحبانِ فن کی صحبت ضروری ہے مگر اصلاحِ نفس، اور تزکیۂ قلب اور تجلیۂ روح کے لئے (دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے لئے) کسی ماہر فن (مرشدِ کامل) کی صحبت ضروری نہیں ہے۔ صرف کتابیں پڑھ لینے اور اپنا لٹریچر شائع کر دینے سے ایک شخص مسلمانوں کا "امیر" اور قوم کا مصلح بن سکتا ہے! اگر مرشد کی صحبت میں بیٹھنے کے بغیر ہی انسان اپنے نفس کی اصلاح کر سکتا تو بعثتِ انبیا کی کیا ضرورت تھی؟ صرف کتاب آسمان سے نازل ہو جاتی، لوگ اس کو پڑھ کر خود ہی اپنا تزکیہ کر لیا کرتے۔!

لیکن قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اغراض چہارگانہ میں سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ بنی آدم آپ کی صحبت میں رہ کر تزکیۂ نفس کے مدارج طے کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص خود اپنا تزکیۂ نفس نہیں کر سکتا۔ اور جب تک معرفت نصیب نہ ہو، مقصودِ حیات حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب میں ان تمام دعاوی کو قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔

(ا) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝

اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔ مفسرین نے عبادت سے معرفت مراد لی ہے۔ یعنی غایتِ تخلیقِ انسانی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔

(ب) وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۝

اور جو لوگ ہم تک پہنچنے (ہماری معرفت حاصل کرنے) کے لئے کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے ملنے کے راستوں کی طرف ہدایت کر دیتے ہیں۔
یعنی حصولِ معرفتِ باری کے لئے مجاہدہ (تزکیۂ نفس) شرط ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جدوجہد اور مجاہدہ (تزکیہ) کے بغیر کوئی شخص خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ خدا خود کسی کو اپنی طرف کھینچ لے، یہ اس کی مہربانی ہے۔ مگر عام قاعدہ یہی ہے کہ جب تک تزکیہ نہ ہو، خدا نہیں مل سکتا۔ اس کی مثال درکار ہو تو آئینہ پر غور کر لو۔ جب تک آئینہ پر صیقل نہ ہو اس میں صورت منعکس نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جب تک آئینۂ قلب مصفا نہ ہو اس میں عکسِ رُخِ یار[1] جلوہ گر نہیں ہو سکتا۔

مرشد رومیؒ فرماتے ہیں ؎

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک
نقشہا بینی بروں از آب و خاک

(ج) هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۝

اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا جو انہی میں سے ہے (انہی کی طرح بشر ہے) جو ان کو کلام اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے (قلب کو رذائل اخلاق سے پاک کرتا ہے)، اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اپنا تزکیہ خود نہیں کر سکتا، اور جب تک تزکیہ نہ ہو کوئی شخص دین کی حقیقت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے

---

[1] ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذّتِ شربِ مدام ما (حافظؒ)

اقبالؔ نے صاف لفظوں میں یہ تعلیم دی ہے :-

دل ز دیں سرمایۂ مہر قوت است
دیں ہمہ از معجزات صحبت است

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر

آج خواجگانِ چشت رحؒ کے اسمائے گرامی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ کون مسلمان ہے جو حضرات سیّد گیسو دراز گلبرگہ (دکن) خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی دہلویؒ، قطب الاقطاب قطب جمال ہانسویؒ، مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ۔ شیخ شیوخِ عالم بابا فرید الدین اجودھنیؒ، قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، سلطان الہند خواجۂ خواجگان عالم خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کے نامِ نامی سے واقف نہیں ہے؟ ان حضرات کے وصال کو صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی ان کی آرام گاہیں مرجعِ خلائق بنی ہوئی ہیں۔ آج بھی ان میں سے ہر ایک بزرگ کا نام لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمانوں کے لئے باعثِ آرامِ جاں ہے۔ اور آج بھی ان کا روحانی فیض اسی طرح جاری ہے جس طرح زندگی میں جاری تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات پر موت تو ضرور وارد ہوئی۔ کیونکہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" نصِّ صریح ہے۔

لیکن موت ان کو مار نہ سکی، یہ اس لئے کہ یہ حضرات نفس کو تو پہلے ہی مار چکے تھے۔ یعنی فنا فی الرسول ہو چکے تھے۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ حضور انور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں، اور بلاشبہ زندہ ہیں تو یہ تمام حضرات بھی بطفیلِ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے فنا فی الرسول ہو کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات سے حصّہ پا لیا ہے۔ فنا فی الرسول کا معنیٰ ہی یہ ہے کہ سالک میں سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات کا عکس جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
(حافظ)

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
(اقبال)

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقام اوست مرگ
(اقبال)

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عشق میں معشوق کی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ عشق نام ہی ہے معشوق کو اپنے اندر جذب کر لینے کے طریق کار کا۔ اب چونکہ سرکارِ دوجہاں پیشوائے انس و جاں صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو حضورؐ کے عشاق کیسے مر سکتے ہیں؟ خلاصۂ کلام اینکہ موت سے وہ لوگ مرتے ہیں جو عاشق نہیں ہوتے۔ لیکن عشق، انسانی خودی کو پختہ کر دیتا ہے۔ اور ع

خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است
(اقبال)

آخری نکتہ بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔
اقبال نے اسی فصل میں یہ شعر لکھا ہے:۔

با خبر شو از مقامِ آب و گِل
پس بزن بر آب و گِل اکسیرِ دل

اس کا مطلب قبل ازیں بیان کر چکا ہوں کہ تیرا جسم جو عناصر اربعہ (آب و خاک و آتش و باد) سے مرکب ہے، فانی ہے۔ اگر تو بذریعۂ عشقِ رسولؐ

اپنے دل کو زندہ کرنے یعنی اکسیر بنالے تو اس کی تاثیر سے تیرا جسم بھی غیر فانی ہو جائے گا۔ چونکہ اولیاء اللہ اپنے دل کو عشق رسولؐ کے ذریعہ سے غیر فانی بنا لیتے ہیں اس لئے ان کا جسم بھی غیر فانی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تمام بزرگانِ دین اپنے کشفِ صحیح کی بنا پر شہادت دیتے ہیں کہ اولیاء اللہ کا جسم مرنے کے بعد بھی محفوظ رہتا ہے۔

اس کے بعد حکیم سنائی یہ تلقین کرتے ہیں کہ اے مسلمان! حق تعٰ کے احکام کی پابندی کر اور اس کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ اپنی خودی کی مخفی طاقتوں کو آشکار کر تاکہ یہ کائنات تیری مطیع ہو جائے۔

آخر میں حکیم موصوف نے فطرت (روحِ کائنات) سے اپنا فرضی مکالمہ بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کل میں نے فطرت کو دیکھا کہ وہ عناصر کائنات سے برسرپیکار ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو کس کی تلاش میں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بحکم خدا میں نیا آدم پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ چنانچہ اس نے مشتِ خاک سے نیا آدم بنایا اور اس کے دل میں جذبۂ عشق ودیعت کیا۔ (گلِ لالہ کا آب و رنگ کیا) یعنی اس کے ضمیر میں توحید الٰہی کا عقیدہ مستحکم کر دیا۔ اور اس سے کہا کہ اب تو اس دنیا میں ایسا انقلاب (بہارِ دیگر) برپا کر سکے گا جو گذشتہ انقلاب سے زیادہ کامیاب ہوگا۔ لیکن یاد رکھو! دشمنانِ دین اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ تو اس انقلاب کے ثمرات سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ اس لئے ان کی کوششوں کو خاک میں ملا دے۔

میری نظر، قوم (شاخِ گل) کی باطنی حالت پر مرکوز ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ قوم کے نونہالوں (غنچہ ہا) میں انقلاب پیدا کرنے (اسلام کو سربلند کرنے) کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب کوئی طاقت مسلمانوں کو سربلندی حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ چنانچہ جو شخص "صاحبِ جستجو" ہے۔ یعنی مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کر رہا ہے وہ ان کامیابیوں کا (غنچہ ہا) کا ابھی سے اندازہ کر سکتا ہے جو مسلمانوں کو آئندہ زمانہ میں حاصل

ہونیوالی ہیں۔

اس تمثیلی مکالمہ کا مطلب یہ ہے کہ اقبالؔ نے حکیم سنائی کی زبان سے قوم کو اس عروج کا مژدہ سنایا ہے جو بفضلِ خدا آئندہ زمانہ میں حاصل ہونے والا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انشاء اللہ اسلام ساری دنیا پر غالب آجائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی پسندیدہ دین ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ہ

※

# فصل ہفتم

## تذکرۂ زیارتِ مزارِ سلطان محمود غزنوی

خیزد از دل نالہ ہا بے اختیار
آہ! آں شہرے کہ اینجا بود پار!

آں دیار و کاخ و کو ویرانہ ایست
آں شکوہ و فال و فر افسانہ ایست

گنبدے! در طوف او چرخ بریں
تربتِ سلطان محمود است ایں!

آں کہ چوں کودک لب از کوثر بشست
گفت در گہوارہ نام او نخست

برقِ سوزاں تیغِ بے زنہارِ او
دشت و در لرزندہ از یلغار او

زیرِ گردوں آیت اللہ رایتش
قدسیان قرآں سرا بر تربتش

شوخیٔ فکرم مرا از من ربود
تا نبودم در جہاں دیروز و زود

رخ نمود از سینہ ام آں آفتاب
پردگیہا از خرد غش بے حجاب

مہرِ گردوں از جلالش در رکوع
از شعاعش دوش می گردد طلوع!

دارہیدم جہان چشم و گوش
فاش چوں امروز دیدم صبح دوش

شہرِ غزنی یک بہشتِ رنگ و بو
آبجو ہا نغمہ خواں در کاخ و کو

قصر ہائے او قطار اندر قطار
آسماں با قبّہ ہالش ہم کنار

نکتہ سنجِ طوس را دیدم بہ بزم
لشکرِ محمود را دیدم بہ رزم

روحِ سیرِ عالمِ اسرار کرد
تا مرا شوریدۂ بیدار کرد

آن ہمہ مشتاقی و سوز و سرور | در سخن چون رندِ بے پروا جسور
تخمِ اشکے اندر آن ویرانہ کاشت | گفتگو ہا با خدائے خویش داشت

تا نبودم بے خبر از رازِ او
سوختم از گرمیِ آوازِ او

---

اس فصل میں اقبالؔ نے سلطان محمود غزنوی کے مزار کی زیارت کا حال بیان کیا ہے۔ ذیل میں سلطان موصوف کے مختصر سوانح حیات درج کرتا ہوں۔

سلطان موصوف ۹۷۰ء میں پیدا ہوا اور اپنے باپ سبکتگین کی وفات کے بعد ۹۹۷ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے ۱۰۰۱ء سے لیکر ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور ہر معرکہ میں کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ ۱۰۰۹ء میں نگر کوٹ (کانگڑہ) فتح کیا۔ یہ قلعہ اس زمانے میں ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ ۱۰۱۴ء میں تھانیسر کے میدان میں ہندوؤں کو زبردست شکست دی۔ ۱۰۱۸ء میں متھرا اور ۱۰۱۹ء میں قنوج فتح کیا۔ لیکن سومنات کا معرکہ جو ۱۰۲۵ء میں واقع ہوا، اس کی زندگی کا سب سے بڑا جنگی کارنامہ ہے۔ ہندوستان پر آخری حملہ ۱۰۲۷ء میں کیا۔ ان فتوحات کے علاوہ اس نے خوارزم اور ترکستان کو بھی زیر نگیں کیا اور غیر معمولی کامیابی کے بعد ۱۰۳۰ء میں وفات پائی۔ بغداد کے عباسی خلیفہ نے اسے "امین الملۃ یمین الدولہ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ سلطان محمود اپنی فتوحات کے اعتبار سے بلاشبہ دنیا کے سب سے بڑے فوجی قائدین میں سے گزرا ہے۔ اس کی عدیم المثال شجاعت جنگی مہارت، پیش بینی اور حوصلہ مندی محتاج بیان نہیں ہے۔ حربی قابلیت کے علاوہ، وہ علوم و فنون کا بھی بہت بڑا سرپرست اور قدردان تھا۔ یعنی ہمہ صفت موصوف بادشاہ گزرا ہے۔

چونکہ اس فصل میں کوئی شعر مشکل نہیں ہے اس لئے میں اس کا مطلب

مجموعی طور پر لکھے دیتا ہوں :-

کہتے ہیں کہ جب میں نے اس شہر کی موجودہ حالت پر نظر ڈالی تو بہت غمگین ہوا کیونکہ سلطان موصوف کے عہد میں یہ شہر بہت عظیم الشان تھا۔ اس زمانہ میں اس کی گذشتہ عظمت محض افسانہ ہو کر رہ گئی ہے۔

جب میں سلطان موصوف کے مزار پر پہونچا تو دل نے مجھ سے کہا کہ یہ اسی سلطان کی قبر ہے جس کی شان یہ تھی کہ جب کوئی بچہ بولنے کے قابل ہوتا تھا تو سب سے پہلے اس کی زبان پر اس بادشاہ کا نام آتا تھا۔

اقبال کا یہ شعر

ع آنکہ چوں کودک لب از کوثر بشست

فردوسی کے اس شعر سے ماخوذ ہے :-

چو کودک لب از شیر مادر بشست
بگہوارہ محمود گوید نخست

اس کی تلوار دشمنوں کو فنا کرنے میں "برق سوزاں" تھی اور جب وہ یلغار کرتا تھا تو دشت اور شہر (سارے ہندوستان) میں لرزہ پڑ جاتا تھا۔ اس کا جنگی علم گویا اللہ کی قدرت کا ایک نشان تھا یہی وجہ ہے کہ فرشتے اس کی قبر پر قرآن خوانی کرتے رہتے ہیں۔

اگلے شعر ع

شوخی فکرم مرا از من ربود الخ

سے اقبال نے عالم خیال میں اسی زمانہ کا نقشہ کھینچا ہے جب سلطان زندہ تھا اور غزنی ایک عظیم الشان شہر تھا۔ سلطان کے محلات قطار در قطار دور تک پھیلے ہوتے تھے۔ اور اس کی بزم میں فردوسی جیسے شاعر نغمہ سرائی کرتے تھے اور سلطان لشکر کشی میں مصروف رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ میں تصور میں سلطان کی بزم اور اسی کی لشکر آرائی کا

تماشا دیکھ رہا تھا کہ ایک مردِ شوریدہ سر کی مناجات نے مجھے چونکا دیا۔ واضح ہو کہ یہ مردِ شوریدہ سر، اقبالؔ کے تخیل کی پیداوار ہے۔ آئندہ فصل میں انہوں نے اسی کی زبان سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مردِ شوریدہ سر اپنے خدا سے مصروفِ گفتگو تھا۔ چونکہ وہ میرے ہی خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

※
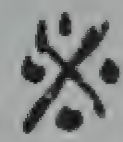
# فصل ہشتم

## مناجاتِ مردِ شوریدہ در ویرانۂ غزنی

لالہ بہر یک شرارِ آفتاب
دارد اندر شاخ چندیں پیچ و تاب

چوں بہار او را کند عریاں و فاش
گویدش جز یک نفس اینجا مباش!

ہر دو آمد یک دگر را ساز و برگ
من ندانم زندگی خوشتر کہ مرگ!

زندگی پیہم مصافِ نیش و نوش
رنگ و نم امروز را از خونِ دوش!

الاماں از سحرِ ایام الاماں
الاماں از صبح و از شام الاماں

اے خدا اے نقشبندِ جان و تن
با تو ایں شوریدہ دارد یک سخن

فتنہ ہا بینم دریں دیرِ کہن
فتنہ ہا در خلوت و در انجمن

عالم از تقدیرِ تو آمد پدید
یا خدائے دیگر او را آفرید!

ظاہرش صلح و صفا باطن ستیز
اہلِ دل را شیشۂ دل ریز ریز!

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند
آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

چشمِ تو بر لالہ رویانِ فرنگ
آدم از افسونِ شاں بے آب و رنگ

از کہ گیرد ربط و ضبط ایں کائنات؟
اے شہیدِ عشوۂ لات و منات!

مردِ حق آں بندۂ روشن نفس
نائبِ تو در جہاں او بود و بس

او بہ بندِ نقرہ و فرزند و زن
گر نوائی سومناتِ او شکن
این مسلماں از پرستارانِ کیست؟
در گریبانش یکے ہنگامہ نیست!
سینہ اش بے سوز و جانش بے خروش
او سرافیل است و صورِ او خموش!
قلبِ او نامحکم و جانش نژند
در جہاں کالائے او نا ارجمند
در مصافِ زندگانی بے ثبات
دارد اندر آستیں لات و منات
مرگ را چوں کافراں داند ہلاک
آتشِ او کم بہا مانندِ خاک!
شعلۂ از خاکِ او باز آفریں
آں طلب آں جستجو باز آفریں
باز جذبِ اندروں او را بدہ
آں جنون ذو فنوں او را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار
صبحِ فردا از گریبانش برار!
بحرِ احمر را بچوبِ او شگاف
از شکوہش لرزہ افگن بقاف!

---

مناجات سے پہلے اقبال نے ایک مختصر تمہید باندھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شی چند روزہ ہے۔ کسی کو ثبات نہیں ہے مثلاً گلِ لالہ پر غور کرو! آفتاب کی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے لالہ کا پودا کس قدر جد و جہد کرتا ہے۔ اس کی تفصیل لکھی جائے تو بلا مبالغہ ایک مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ ماہرینِ علم نباتات نے اس موضوع پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ لیکن جب موسم بہار میں لالہ کا پھول کھلتا ہے تو بہار زبانِ حال سے اس سے کہتی ہے کہ تیری عمر دو دن سے زیادہ نہیں ہے۔ گویا موت زندگی کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں موت بھی ہے۔ غور سے دیکھو تو زندگی، رنج و راحت میں مسلسل جنگ کا نام ہے۔ ہر راحت (نوش) میں کلفت (نیش) پوشیدہ ہے۔ جب تک دوش فنا نہ ہو، امروز پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسی صبح اور ایسی شام سے خدا محفوظ ہی رکھے۔ نہ اس کو قیام ہے نہ اس کو

قرار ہے۔

دوسرے بند سے مناجات شروع ہوتی ہے۔ مردِ شوریدہ خدا سے کہتا ہے (دراصل اقبالؔ خدا سے کہتے ہیں) کہ اے خدا! اس دنیا میں ہر طرف فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہے! نہ خلوت میں دل کو سکون مل سکتا ہے نہ انجمن میں۔

اے خدا! میں بڑے ادب کے ساتھ تجھ سے پوچھتا ہوں کہ یہ دنیا تیری تقدیر (مشیّت) کا نتیجہ ہے یا اسے کسی اور نے پیدا کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ تو ہی اس کا خالق ہے، تو یہ کیا بات ہے کہ اس دنیا کے لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ ظاہر میں تو ہر شخص دوسروں سے ہمدردی (صلح وصفا) کا دعویٰ کرتا ہے مگر باطن میں ہر شخص دوسروں کو تباہ کرنے پر آمادہ ہے؟ چونکہ ہر طرف منافقت اور فریب کا بازار گرم ہے۔ اس لئے جو لوگ حق پرست ہیں وہ دنیا والوں کے ظلم وستم کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ جو شخص صداقت کو شعارِ زندگی بناتا ہے وہ ہر قسم کی آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تیرے بندوں کے لئے تو یہ دنیا سراسر جہنم بن گئی ہے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ نکوکاروں اور حق پرستوں کو عزت اور سروری نصیب ہوتی، مگر ہو یہ رہا ہے کہ یورپ کے باشندے (لالہ رویانِ فرنگ) تیرے لطف وکرم سے حصّہ وافر پا رہے ہیں۔ تیری نگاہِ عنایت ان لوگوں پر ہے جو ظلم وستم کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، جو رات دن تیرے بندوں کو اپنا غلام بنا رہے ہیں اور بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔

اندریں حالات یہ کائنات جو تیری پیدا کردہ ہے۔ ربط وضبط حاصل کرنے کے لئے کس کی بارگاہ کا رُخ کرے؟ یعنی تیرے بندے کس کے پاس جائیں؟ تو ہی ان کا آقا اور مولیٰ ہے مگر تیری عنایت تو بُت پرستوں پر مبذول ہو رہی ہے۔!

اے خدا! دراصل مسلمان (شہرۂ حق) اس دنیا میں تیرا نائب تھا۔

وہ تیرے قانون کو دنیا میں نافذ کر کے تیرے بندوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلا سکتا تھا مگر وہ " نقرہ و فرزند و زن " دنیا کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔ اس لئے میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ اگر ہو سکے تو اس کے دل سے دنیا کی محبت نکال دے (سومنات او شکن)

اے خدا! میں حیران ہوں کہ موجودہ زمانہ کا مسلمان کس خدا کا پرستار ہے؟ اگر تیرا بندہ ہوتا یعنی اگر قرآن کا پیرو ہوتا تو پھر اس کی زندگی میں یہ جمود و سکون ہرگز نہ ہوتا کیونکہ قرآن تو سراسر جدوجہد، عملِ صالح اور سعیِ پیہم کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کا ثبوت صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے بخوبی مل سکتا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے مسلمان کی حالت یہ ہے کہ اس کا سینہ سوز و گداز سے بالکل خالی ہے اور اس کی زندگی سراسر جمود اور سکون ہے۔ تو نے اسے اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ مردہ دلوں کو زندہ کر دے۔ لیکن وہ خود مردہ ہو گیا ہے۔ اس کا دل یقین سے بیگانہ ہے اور اس کی زندگی ذلت و خواری کی تصویر ہے۔ آج دنیا میں اس کے وجود کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ وہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اس کی آستین میں بت پوشیدہ ہیں۔ یعنی وہ غیر اللہ کا پرستار ہے۔ اور کافروں کی طرح موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتا ہے اس لئے مرنے سے ڈرتا ہے۔

اے خدا! اس کے دل کو دوبارہ سوزِ یقین سے گرما دے اور اس کے اندر پھر وہی طلب اور جستجو پیدا کر دے جو اس کے اسلاف کا طغرائے امتیاز تھی۔ (طلب اور جستجو سے مراد ہے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ)

اے خدا! مسلمان کو پھر عشقِ رسولؐ کی نعمت عطا کر (جنون ذو فنون سے مراد ہے ایسا عشق جو اس کو حصولِ مقصد کی راہوں سے آگاہ کر دے)۔

اے خدا! اسے ایسی طاقت عطا کر کہ وہ مشرقی ممالک (ممالکِ اسلام) کو فرنگیوں کے تسلط سے آزاد کر سکے اور مشرق میں نئے دور کا آغاز کر سکے۔ اس کو ایسی طاقت عطا کر کہ وہ فرنگ

وقت کو مغلوب کر سکے اور دشمنانِ دین پر اپنی دھاک بٹھا سکے۔

عہ ۰ بحر احمر را بچوبِ او شگاف الخ

میں تلمیح ہے حضرتِ موسیٰؑ کے واقعہ کی طرف۔ یعنی جب انہوں نے اپنا عصا پانی پر مارا تو سمندر پایاب ہو گیا اور وہ اپنے ساتھیوں کو لیکر پار اُتر گئے۔ لیکن فرعون ڈوب گیا۔

⁂

# فصل نہم

## قندہار و زیارت خرقہ مبارک

قندھار آں کشورِ مینوسواد | اہلِ دل را خاکِ او خاکِ مراد
رنگ ہا بو ہا ہوا ہا آب ہا | آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا
لالہ ہا در خلوتِ کہسار ہا | نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا
کوئے آں شہر است ما را کوئے دوست! | ساربان بربند محمل سوئے دوست

می سرایم دیگر از یاران نجد
از نوائے ناقہ را آرم بہ وجد!

---

اس فصل میں اقبال نے اپنے سفر قندہار کا حال بیان کیا ہے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خرقہ مبارک کی زیارت کی اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے۔

اولاً پانچ اشعار میں قندہار کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد ایک مناسب حال غزل لکھی ہے، آخر میں خرقہ مبارک کی زیارت کا حال بیان کیا ہے۔

قندہار بہت پرانا شہر ہے۔ روایت یہ ہے کہ سکندر نے اسے آباد کیا تھا۔ اشوک کے زمانہ میں بودھ دھرم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ کابل سے

٢٨٠ میل کے فاصلہ پر ہے اور افغانستان کا مشہور تجارتی مرکز ہے۔ آبادی ٦٠ ہزار نفوس ہے۔

---

کہتے ہیں کہ قندہار بہت دلکش اور حسین شہر ہے۔ یہاں کی آب وہوا پھولوں کی کثرت کی وجہ سے خوشبو دار ہے۔ اور پانی بہت شفاف ہے یہاں کے کوہساروں میں گل لالہ بکثرت اُگتا ہے اور یہاں کے انار یعنی ان کے دانے اس قدر سرخ ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے آگ کو یخ بستہ کردیا ہے۔ (اوّل الذکر نار سے آگ اور آخر الذکر نار سے انار مراد ہے)۔

اس شہر کا وہ کوچہ جس میں خرقہ مبارک محفوظ ہے، میری نگاہوں میں کوئے دوست سے کم نہیں ہے۔ اس لئے میں ساربان سے کہتا ہوں کہ مجھے کوئے دوست کی طرف لے چل، اور میں ارباب عشق ومحبت کی یاد میں نغمہ سرائی کرتا ہوں تاکہ ناقہ وجد میں آکر تیزی کے ساتھ چل سکے۔

## غزل

از دیرِ مغاں آیم بے گردشِ صہبا مست!
در منزلِ لَا بودم از بادۂ اِلّا مست!
دانم کہ نگاہِ او ظرفِ ہمہ کس بیند
کرد است مرا ساقی از عشوہ و ایما مست!
وقت است کہ بکشایم میخانۂ رومی باز
پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست!
ایں کارِ حکیمے نیست، دامانِ کلیمے گیر

دل را بچمن بردم از باد چمن افسرد
میرد بنجبا بانها این لالهٔ صحرا مست!
از حرف دل آویزش اسرار حرم پیدا
دی کافرکے دیدم در وادیٔ بطحا مست!
سیناست که فاران است؟ یا رب چه مقام است این؟
هر ذرهٔ خاک من چشمے است تماشا مست!

خرقهٔ آن "برزخٌ لا یبغیان"[1] | دیدمش در نکتهٔ "لی خرقتان"[2]
دینِ او آئینِ او تفسیر کل | در جبینِ او خطِ تقدیرِ کل
عقل را او صاحبِ اسرار کرد | عشق را او تیغِ جوهر دار کرد
کاروانِ شوق را او منزل است | ما همه یک مشت خاکیم او دل است
آشکارا دیدنش اسرائے[3] ماست | در ضمیرش مسجدِ اقصائے ماست
آمد از پیراهنِ او بوئے او | داد مارا نعرهٔ الله هو
با دلِ من شوقِ بے پروا چه کرد | بادهٔ پر زور با مینا چه کرد
رقصد اندر سینه از زورِ جنون | تا ز راهِ دیده می آید برون!
گفت، من جبریلم و نورِ مبین | پیش ازین او را ندیدم این چنین!
شعر رومی خواند خندید و گریست | یا رب این دیوانهٔ فرزانه کیست!
در حرم با من سخن رندانه گفت | از مے و مُغ زاده و پیمانه گفت!
گفتمش این حرف بیباکانه چیست | لب فرو بند این مقامِ خامشی است
من ز خونِ خویش پروردم ترا | صاحبِ آهِ سحر کردم ترا

---

[1]: بَرْزَخٌ لا یَبْغِیَان: تلمیح به آیهٔ قرآنی.
[2]: لِیْ خَرْقَتَانِ اَلْفَقْرُ وَ الْجِهَاد: (حدیث)
[3]: اسرائے: تلمیح به آیایهٔ قرآنی.

بازیاب این نکتہ را اے نکتہ رس | عشق مرداں ضبطِ احوال است و بس
گفت عقل و ہوش آزارِ دل است! | مستی و وارفتگی کارِ دل است!

نعرہ ہا زد تا فتاد اندر سجود
شعلۂ آوازِ او بود، او نبود!

---

اقبالؔ نے اس موقعہ پر یہ عاشقانہ غزل اس لئے لکھی ہے کہ وہ خرقۂ مبارک کا ذکر کرنے والے ہیں اور یہ خرقہ اس ذاتِ قدسی صفات (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے جو تمام مسلمانوں کی محبوب ہے، لہٰذا غزل کے ذریعہ سے وہ پڑھنے والوں کے دلوں میں آتشِ شوق بھڑکانا چاہتے ہیں۔

**پہلا شعر:۔** دیرِ مغاں کنایہ ہے خانقاہِ مرشد سے۔ اصطلاحِ تصوف میں منزلِ لاؔ سے مقامِ فنا بھی مراد ہے اور یہ عالمِ محسوس بھی۔ اور منزلِ الاّؔ سے مقامِ بقا مراد ہے۔ سالک جب لا الٰہ کہتا ہے تو وہ اس عالمِ محسوس (عالمِ شہادت) کی نفی کر دیتا ہے۔ یعنی کوئی شئے بذاتِ خود موجود نہیں ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مجھے عالمِ شہادت میں بھی ہر طرف خدا ہی خدا نظر آتا تھا (یہی مقام الاّ ہے) یعنی مقامِ بقا حاصل ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے (دیرِ مغاں : خانقاہ) میں کسی صہبا (توجہ مرشد) کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ میں منزلِ لا ہی میں بادۂ الاّ سے مست ہو چکا تھا۔ مطلب یہ کہ عموماً سالک کو جو مقام منزلِ الاّ کے بعد حاصل ہوتا ہے وہ مجھے منزلِ لا ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔ اس لئے من از دیرِ مغاں، بے گردشِ صہبا، مست می آیم۔

**دوسرا شعر:۔** میں جانتا ہوں کہ ساقی ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق پلاتا ہے۔ چونکہ مجھے شراب مست نہیں کر سکتی (اپنے ظرف کی وسعت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اس نے مجھے اپنے عشوہ اور ایما سے مست بنا دیا یعنی میری طرف ایسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھا کہ میں بے پئے

مست ہو گیا۔ واضح ہو کہ محبوب کی محبت بھری نگاہوں سے جو کیفیت (مستی) عاشق کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ جام شراب سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔

تیسرا شعر:۔ چونکہ مسلمانوں کے رہنما (پیرانِ حرم) ان کو انگریزوں سے وفاداری کا درس دے رہے ہیں اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ انہیں مرشد رومیؒ کی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے یعنی انہیں عشق رسولؐ کا سبق پڑھایا جائے۔ واضح ہو کہ مرشد رومیؒ نے مثنوی میں مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ ہی کا پیغام دیا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو اللہ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنی چاہتا ہے تو حکما کی صحبت کی بجائے عاشقانِ الٰہی کی صحبت اختیار کر۔ یاد رکھ کہ صد بندگانِ ساحل مست پر ایک بندۂ دریا مست بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ بندۂ ساحل مست سے مراد ہے فلسفی یا عالمِ دین جو عقلی دلائل سے خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اربابِ علم جانتے ہیں کہ عقلی دلائل سے وہ یقین پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو جہاد یا سرفروشی پر آمادہ کر سکے۔ بندۂ دریا مست سے مراد ہے عارف یا عاشق جس کو دل کے آئینہ میں تصویر یار نظر آجاتی ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ دیکھنے کے بعد یقینِ کامل پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر شک یا شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح "لالۂ صحرا" کو جنگل ہی کی آب و ہوا راس آتی ہے اسی طرح عاشق کو خلوت ہی میں راحت نصیب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں ان لوگوں کی صحبت (چمن) میں بیٹھا ہوں تو میرا دل ان کی باتوں (بادِ چمن) سے افسردہ اور ملول ہو گیا۔

چھٹا شعر:۔ کل میں نے ایک عاشق (کافر) کو دیکھا کہ وادی بطحا میں بحالتِ مستی اپنے دل سے گفتگو کر رہا تھا۔ جب میں نے اس کی گفتگو سنی تو میں بہت حیران ہوا کہ یہ شخص دیکھنے میں تو دین سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے مگر

اس کی باتیں اسلام کے حقائق و معارف سے لبریز تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص عشقِ رسول اختیار کرلے تو اس پر دین کے اسرار عیاں ہوجاتے ہیں۔

**ساتواں شعر:-** یارب! یہ مقام (جہاں خرقہ مبارک رکھا ہوا ہے) سینا ہے یا فاران ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ میری خاک (میرے جسم) کا ہر ذرہ، شوق دیدار میں آنکھ بن گیا ہے۔

**آخری شعر:-** خرقہ مبارک کے ذکر کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اقبال نے خرقہ مبارک کا ذکر شروع کردیا ہے۔ اس کے متعلق صرف ایک شعر لکھا ہے، اس کے بعد حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں چار شعر لکھے ہیں۔ پھر اپنے جذباتِ قلبی کا تمثیلی رنگ میں اظہار کیا ہے۔

خرقہ آں "برزخٌ لا یبغیان"
دیدمش در نکتہ "لی خرقتان"

"برزخٌ لا یبغیان" میں تلمیح ہے اس آیت کی طرف:-

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ۙ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۵۵-۲)

خدا نے چلائے دو دریا ملکر چلنے والے، ان دونوں میں ہے ایک پردہ تاکہ ایک دریا دوسرے دریا پر زیادتی نہ کرے۔

لی خرقتان' میں تلمیح ہے اس حدیث کی طرف:-

لی خرقتانِ الفقرُ والجھاد۔ یعنی میرے دو خرقے (دو شانیں) ہیں۔ ایک فقر اور دوسرا جہاد۔ مطلب یہ ہے کہ میری زندگی میں دو شانیں ہیں یا میری شخصیت کے دو پہلو (رُخ) ہیں اور یہ دو شانیں میری پوری زندگی کی نمائندہ ہیں۔

پہلی شان کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالے سے وابستہ ہیں اور اس دنیا سے بے تعلق ہیں۔ دنیا کی کوئی شی آپ کو اپنی طرف مائل نہیں کرسکتی۔ مال و دولت، زن و فرزند، محلات و باغات، حکومت و سلطنت

سب آپؐ کی نظر میں ہیچ ہیں۔ آپؐ صرف اللہ کے لئے جیتے ہیں یا ـــــ وہی آپؐ کا مقصود ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

آپؐ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور جملہ رسوم دینی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لئے ہے۔

شانِ فقر کا یہی مفہوم ہے کہ صاحبِ فقر دنیا سے ناطہ توڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔

دوسری شان کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے قانون کو دنیا میں نافذ کرنے کے لئے ہر وقت مصروفِ جہاد ہیں اور اس بنا پر آپؐ بظاہر تمام دنیاوی معاملات میں حصّہ لیتے ہیں۔ یعنی باطن میں دنیا سے بے تعلق ہیں مگر ظاہر میں اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ تعلق ظاہری بھی محض اللہ کے لئے ہے۔ مثلاً اگر آپؐ جہاد کر کے کوئی خطّۂ زمین فتح کرتے ہیں تو اپنے لئے نہیں بلکہ اس لئے فتح کرتے ہیں کہ اس میں اللہ کا قانون جاری ہوسکے یا اگر آپؐ صحابہ کرامؓ سے مال و دولت طلب فرماتے ہیں تو اپنے لئے نہیں بلکہ جہاد کی تیاری کے لئے۔ حد یہ ہے کہ اگر آپ کھانا بھی کھاتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ لذّتِ کام و دہن مطلوب ہے بلکہ اس لئے کہ جہاد میں شرکت کے لئے جسم میں طاقت قائم رہے۔ وقس علیٰ ھٰذا۔

چنانچہ آپؐ نے بفضلِ خدا سارا عرب مسخر فرمالیا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ آپ نے "بادشاہ" ہوجانے کے بعد بھی اپنے لئے نہ کوئی محل تعمیر کرایا۔ نہ دو وقت شکم سیر ہوکر کھانا کھایا، نہ سونا چاندی اپنے پاس جمع کیا اور نہ راحت کا کوئی سامان مہیّا کیا۔ شانِ فقر کا مفہوم یہی ہے کہ ساری دنیا قدموں میں ہو مگر اس کی طرف التفات نہ ہو۔

یہاں اقبالؒ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات کو

برزخ سے تعبیر کیا ہے اور یہ لفظ سورۂ رحمٰن کی آیت مذکورہ بالا سے مستعار لیا ہے۔ برزخ کے لغوی معنی ہیں "اَلْحَاجِزُ وَ الْحَدُّ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ"۔ یعنی دو چیزوں میں فصل اور حد یعنی برزخ وہ ہے جو دو چیزوں کے مابین حائل یا فاصل ہو کر انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ یہیں سے اس لفظ کے معنیٰ، پردہ، حجاب، آڑ، یا روک کے ہوگئے۔

اقبال نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برزخ اس لئے لکھا ہے کہ آپؐ واجب اور ممکن (خالق اور مخلوق) کے درمیان، حدِ فاصل ہیں، اور اربابِ علم سے یہ نکتہ پوشیدہ نہیں ہے کہ حدِ فاصل (برزخ) میں دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا آپ میں بھی وجوب اور امکان یہ دونوں شانیں جمع ہوگئی ہیں۔ اس کو ذیل کی مثال سے واضح کرتا ہوں۔

تین نقطے فرض کرو الف، ب اور ج اور انہیں برابر برابر رکھو۔ اب نقطہ ب، الف اور ج کے مابین حدِ فاصل ہے اور اس نقطہ کا دایاں پہلو الف سے متصل ہے اور بایاں پہلو جیم سے۔ جو شخص اول الذکر پہلو کو دیکھے گا اسے نقطہ ب، الف سے مربوط نظر آئے گا اور جو شخص آخر الذکر پہلو پر نظر کرے گا اسے نقطہ ب جیم سے وابستہ محسوس ہوگا۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک طرف سے واجب سے مربوط ہے دوسری طرف سے ممکن سے۔ اگر آپؐ کے بشری پہلو کو دیکھو تو آپؐ بلاشبہ انسان یا بشر ہیں جس پر "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" شاہد ہے یعنی اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔

لیکن آپؐ کے روحانی پہلو (حقیقتِ محمدیؐ) کو دیکھو تو آپؐ حق تعالیٰ سے واصل ہیں۔ کیونکہ آپ "نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰہِ" ہیں جس پر "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" ناطق ہے۔ یعنی اے رسول! جب آپ نے وہ کنکریاں (دشمنوں) کی طرف پھینکیں تو آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ

نے پھینکی تھیں۔"

اسی مضمون کی دوسری آیت یہ ہے :-

یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ( یعنی جب آپؐ نے صحابہ رضؓ سے بیعت لی تھی تو ان کے ہاتھوں پر آپؐ کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ ) ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے آپؐ کے فعل کو اپنا فعل اور دوسری آیت میں آپ کے دستِ مبارک کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپؐ کو اللہ سے وہ رابطہ حاصل ہے جو کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے سوا نہ کسی مخلوق کے فعل کو اپنا فعل قرار دیا ہے اور نہ کسی بشر کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔ ؎

اِدھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل
خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدّد کا

(محسن کاکوری مرحوم)

ان تصریحاتِ ضروریہ کے بعد اب شعر کا مطلب لکھتا ہوں :-

کہتے ہیں کہ جب میں نے حضورؐ کا خرقۂ مبارک دیکھا تو معاً میرا ذہن حضورؐ کے اس ارشاد کی طرف منتقل ہوا کہ آپؐ فرماتے ہیں کہ میری زندگی (شخصیت) کی دو شانیں ہیں، ایک شانِ فقر ہے، دوسری جہاد ہے۔

واضح ہو کہ فقر اور جہاد میں منطقی لزوم پایا جاتا ہے یعنی جس شخص میں شانِ فقر پیدا ہو جائے گی وہ لازمی طور پر جہاد فی سبیل اللہ کرے گا اور جو شخص مجاہد فی سبیل اللہ ہے وہ لازمی طور پر شانِ فقر کا مالک ہوگا۔ فقر کا تقاضا جہاد ہے۔ صاحبِ فقر اسی طرح جہاد کی طرف مائل ہو جاتا ہے جس طرح بلوغ کے بعد انسان کے اندر نکاح کی طرف میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ :-

(ا) ذکر اور فکر کے امتزاج سے شانِ فقر پیدا ہوتی ہے۔
(ب) فقر انسان کو جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔
(ج) جہاد فی سبیل اللہ، مقصدِ حیاتِ مسلم ہے
حضورؐ نے فقر اور جہاد کو اپنی زندگی میں جمع کر کے اسلام کی عملی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ یعنی اسلام نام ہے فقر اور جہاد کا۔ اسی لئے اقبالؔ نے آئندہ اشعار میں خود اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ
آپؐ کا دین، جو دراصل آئینِ حیات ہے اس ساری کائنات کی تفسیر ہے۔ یعنی کائنات پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ مومن اسے تسخیر کرے اور تسخیر کے بعد اس میں دین اسلام (آئین حیات) نافذ کرے۔ اسلام صرف مذہب نہیں ہے بلکہ وہ پوری زندگی کا دستور العمل (ضابطۂ حیات) بھی ہے یعنی اسلام، دوسرے مذاہبِ عالم کی طرح محض پوجا پاٹ اور چند رسوم کا نام نہیں ہے بلکہ دین یا آئین ہے یعنی حیاتِ اجتماعیہ کا مکمل ضابطہ اور دستور العمل ہے۔

دوسرے مصرع میں یہ نکتۂ عجیبہ بیان کیا ہے:۔

مصرع در جبینِ اوؐ خطِ تقدیرِ کل

اس مصرع کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ آپؐ کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کی تقدیر مندرج کر دی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ ساری کائنات کے آقا اور رہنما ہیں۔ کائنات کی تقدیر سے مراد یہ ہے کہ یہ کائنات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کی ہر شئی آپؐ کی اتباع (اطاعت) کرے۔ جس طرح شبنم کی تقدیر افتادگی ہے، دریا کی تقدیر ہر وقت بہنا ہے، ہوا کی تقدیر چلنا ہے، آگ کی تقدیر جلانا ہے۔ اسی طرح کائنات کی تقدیر (غائتِ تخلیق) حضورؐ کی اتباع اور اطاعت ہے۔ اس کائنات میں جو شئے آپؐ کی اطاعت نہیں کرے گی۔ وہ عبث اور بیکار قرار پائے گی۔ خدا کی نگاہ میں اس کی کوئی

قیمت نہ ہوگی جس طرح آقا کی نظر میں نافرمان خادم کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ بادل کی تقدیر برسنا اور زمین کو سیراب کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں، اسی طرح جو شخص آپؐ کی اطاعت نہیں کرتا، اس کا وجود، عدم دونوں یکساں ہیں۔

دوسرا شعر :- آپؐ کی بدولت عقل صاحبِ اسرار ہوئی اور آپؐ ہی کے طفیل سے عشق میں تاثیر پیدا ہوئی یعنی آپؐ کا اتباع کرنے سے انسان کی عقل صاحبِ اسرار ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دگر، انسان صاحبِ اسرار یا کائنات کے رموز سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ جب تک کوئی شخص آپؐ کی اتباع نہ کرے اس کی عقل کامل نہیں ہو سکتی اور جب تک آپؐ سے محبت نہ کرے اس میں جوہر پیدا نہیں ہو سکتا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انسان میں دو بنیادی قوتیں ہیں، عقل اور عشق، اور یہ دونوں قوتیں آپؐ کی اطاعت ہی سے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکتی ہیں۔

تیسرا شعر :- آپؐ کی ذاتِ پاک، عشق (عاشقوں) کی منزل مقصود ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر یہ صفت اس لئے رکھی ہے کہ ہم آپؐ کو اپنا محبوب بنائیں۔ آپؐ ہی محبوب حقیقی ہیں۔ جب تک آپؐ کی محبت ساری محبتوں پر غالب نہ ہو کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا۔ بلکہ آپؐ کی محبت کی بدولت انسان خود محبوبِ خدا بن جاتا ہے۔ جو شخص آپؐ سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ عظیم میں وارد ہے :-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اے رسولؐ! آپ مسلمانوں کو آگاہ کر دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنی چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

دوسرے مصرع میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تمام انسان بمنزلہ "مشتِ خاک" ہیں۔ یعنی ہیچ اور ناکارہ، بے قدر و قیمت۔ ہاں جب ان کے اندر

آپؐ کی محبّت جلوہ گر ہوجاتی ہے تو وہ زندہ ہوجاتے ہیں۔ بالفاظِ دگر آپؐ کو بنی آدم سے وہی نسبت ہے جو دل کو جسدِ انسانی سے ہے۔ جس طرح دل کے بغیر جسم مردہ ہے۔ اسی طرح آپؐ کی محبّت کے بغیر انسان مُردہ ہے۔ خلاصۂ کلام ایں کہ آپؐ کی ذاتِ بابرکات، مرکزِ حیات ہے۔

**چوتھا شعر:۔** جس طرح حضورؐ کی معراج یہ تھی کہ آپؐ نے خدا کو دیکھا اسی طرح ہماری معراج (انتہائی روحانی بلندی) یہ ہے کہ ہم آپؐ کو دیکھ لیں یعنی آپ کی حقیقت (حقیقتِ محمدیؐ) سے آگاہ ہوجائیں۔ اور یہ بات فنافی الرسولؐ ہونے سے حاصل ہوسکتی ہے۔

واضح ہو کہ کسی شی کو دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ناظر خود منظور بن جائے۔ یعنی جسے دیکھنا چاہتا ہے خود وہی بن جائے۔ چنانچہ رومیؒ فرماتے ہیں ؎

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

پس حضور کو دیکھنا چاہتے ہو تو حضور کے تمام کمالات کا عکس اپنے اندر پیدا کرلو۔ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں مقام فنافی الرسولؐ کہتے ہیں فنا سے مراد یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو فنا کردو اور حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلو۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو تقلید یا اتباعِ رسولؐ کہتے ہیں۔ اتباعِ کاملہ سے مومن میں کمالاتِ نبوت منعکس ہوجاتے ہیں۔ جس طرح لوہا اگر کچھ عرصہ تک بھٹی میں پڑا رہے تو اس میں بھی آگ کے خواص پیدا ہوجاتے ہیں۔

دوسرے مصرع میں یہ کہتے ہیں کہ ہماری مسجدِ اقصیٰ یا ہمارا انتہائی روحانی عروج آپؐ کی ذات میں پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر ہم آپؐ تک پہنچ جائیں تو گویا مقصدِ حیات حاصل ہوگیا۔

اس کے بعد اقبال نے اپنے جذبات کا تمثیلی رنگ میں اظہار کیا ہے۔ اس لئے میں ان تمام اشعار کا مطلب مجموعی طور پر لکھتا ہوں :۔

کہتے ہیں کہ آپؐ کے خرقۂ مبارک سے مجھے آپؐ کے جسمِ اطہر کی خوشبو آئی تو اس خوشبو نے مجھے مست کر دیا اور میرے دل میں عشقِ رسولؐ کا بے پناہ جذبہ موجزن ہو گیا۔

ع بادۂ پرزور با مینا چہ کرد

اس مصرع میں "بادہ" سے شوقِ بے پروا اور "مینا" سے دلِ عاشق مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ جوشِ جنوں کی بنا پر میرا دل سینہ میں رقص کرنے لگا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عنقریب میرا دل آنسو بن کر آنکھوں کی راہ سے ٹپکنے لگے گا۔

میرے دل نے کہا کہ میں جبرائیل اور نورِ مبین ہوں! اقبالؔ دراصل اس پردے میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مومنِ کامل کا دل، پاکی اور قرب کے لحاظ سے بمنزلۂ جبرئیلؑ اور نورِ مبین (قرآن) ہو جاتا ہے۔ جبرئیلؑ اور قرآن، دونوں کو حق تعا سے ایک خاص نسبت اور قرب حاصل ہے۔ قرآن، اللہ کا کلام ہے اور جبرئیلؑ اس کلام کے حامل ہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا، مومنِ کامل کو بھی بمتابعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکالمات و مخاطبات سے مشرف فرماتا ہے چنانچہ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ، مجددِ الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ، ان تینوں بزرگوں نے اپنی تصانیف میں اس بات کی صراحت کی ہے۔ (دیکھو فتوحاتِ مکیہ، مکتوبات اور فیوض الحرمین)۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پہلے اپنے قلب کی یہ حالت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میرا دل اس وقت رومیؒ کے اشعار پڑھ رہا تھا اور کبھی ہنستا تھا، کبھی روتا تھا! میں حیران تھا کہ یہ دیوانۂ فرزانہ کون ہے؟ جو حرم میں مجھ سے ایسی رندانہ گفتگو کر رہا ہے اور شراب، مُغ زادہ اور پیمانہ کا تذکرہ سنا رہا ہے! یعنی معرفت کے رموز بیان کر رہا ہے۔!

میں نے دل سے کہا کہ یہ بے باکانہ گفتگو کیسی ہے! خاموش ہو جا! یہ تو بڑے ادب (خاموشی) کا مقام ہے! اے دل! میں نے اپنے خونِ جگر سے تیری پرورش کی ہے اور بڑے مجاہدوں کے بعد تجھے صاحبِ آہِ سحر (عاشقِ رسولؐ) بنایا ہے۔ اے دل! اس نکتہ کو ملحوظ رکھ کہ مردانِ خدا کا عشق ضبط احوال کا نام ہے۔ یعنی عاشقانِ صادق اپنے حالات کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ یہ سنکر دل نے کہا کہ اے اقبالؔ! عقل و ہوش تو دل (عاشق) کے لئے باعثِ آزار ہوتے ہیں۔ یعنی عاشق میں ضبط کی تاب کہاں! عشق کا کام تو مستگی اور وارفتگی ہے۔ یہ کہہ کر میرے دل پر عالمِ مستی طاری ہو گیا اور وہ محبت کی آگ میں جل کر فنا ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ اس شاعرانہ انداز میں اقبالؔ نے ان کیفیات کا نقشہ کھینچا ہے جو خرقۂ مبارک کو دیکھ کر ان کے قلب پر طاری ہوئیں۔

※
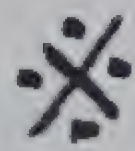
# فصل دہم

## زیارت مزار احمد شاہ بابا (ابدالی) موسّسِ ملّتِ افغانیہ

تربتِ آں خسروِ روشن ضمیر — از ضمیرش ملتے صورت پذیر
گنبدِ او را حرم داند سپہر — با فروغ از طوفِ او سیمائے مہر
مثلِ فاتح[1] آں امیرِ صف شکن — سکّہ زد ہم باقلیمِ سخن
ملتے را داد ذوقِ جستجو — قدسیاں تسبیح خواں بر خاکِ او
از دل و دستش گہر ریزے کہ داشت — سلطنت ہا بردو بے پروا گذاشت
نکتہ سنج و عارف و شمشیر زن — روحِ پاکش با من آمد در سخن
گفت می دانم مقامِ تو کجاست — نغمۂ تو خاکیاں را کیمیاست
خشت و سنگ از فیضِ تو دارائے دل — روشن از گفتارِ تو سینائے دل
پیشِ ما اے آشنائے کوئے دوست — یک نفس بنشین کہ داری بوئے دوست

---

[1] سلطان محمد فاتح، فاتحِ قسطنطنیہ۔

اے خوش آں کو از خودی آئینہ ساخت ‌ ‌ ‌ وندر ان آئینہ عالم را شناخت
پیر گردید ایں زمین و ایں سپہر ‌ ‌ ‌ ماہ کور از کور چشمیہائے مہر
گرمیٔ ہنگامۂ می بایدش ‌ ‌ ‌ تا شخستین رنگ و بو باز آیدش
بندۂ مومن سرافیلی کند ‌ ‌ ‌ بانگِ او ہر کہنہ را برہم زند
اے ترا حق داد جانِ ناشکیب ‌ ‌ ‌ تو ز سرِّ ملک و دیں داری نصیب

فاش گو با پورِ نادر فاش گو
باطنِ خود را بہ ظاہر فاش گو

---

اس فصل میں اقبالؔ نے احمد شاہ ابدالی کے مزار کی زیارت کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے اسے "مؤسّسِ ملّتِ افغانیہ" قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس نے افغانوں کو ایرانی حکومت کی غلامی سے آزاد کر کے ایک مستقل قوم بنا دیا۔

## ابدالی کے سوانح حیات

اس کا نام احمد خاں تھا۔ اس کا باپ زماں خاں، سدّوزئی قبیلہ سے تھا۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ ایک شخص ترینؔ نامی تھا جسے اس کے شیخ طریقت حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتیؒ نے ابدال کا لقب دیا تھا، اس لئے احمد خاں نے بادشاہ ہو کر اپنا نام احمد شاہ ابدالی رکھا۔

سیاسی وجوہ کی بنا پر زماں خاں ترکِ وطن کر کے ملتان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ یہیں احمد خاں پیدا ہوا۔ مگر ۱۷۳۷ء میں زماں خاں، نادر شاہ کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ مگر اسے شکست ہوئی۔ لیکن نادر شاہ نے ذوالفقار خاں کو اپنی طرف سے ہرات کا صوبہ دار بنا دیا اور احمد خاں کو اپنے باڈی گارڈ میں ایک ہزار سواروں پر افسر مقرر کر دیا۔

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانوں نے احمد خاں کو اپنا

بادشاہ تسلیم کر لیا اور اس کے روحانی مشیر صابر شاہ نے اسے دُرّانی بادشاہ کا لقب دیا۔ اسی لئے اسے مورخین احمد شاہ درّانی بھی لکھتے ہیں۔

احمد شاہ نے شاہ ولی خاں کو وزیر اور شاہ پسند خاں کو سپہ سالار مقرر کیا۔ مگر اس کے پاس روپیہ بالکل نہ تھا۔ چونکہ اسے خدا نے بادشاہ بنایا تھا۔ اس لئے روپیہ کا انتظام بھی کر دیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ جون ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کا گماشتہ تقی خاں ۳۵ لاکھ روپیہ پشاور سے وصول کر کے قندھار پہنچا۔ اور یہ ساری رقم بلا کوشش احمد شاہ کو مل گئی۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا کسی پر مہربان ہوتا ہے تو سارے انتظامات خود کر دیتا ہے۔

فی الجملہ احمد شاہ نے ۶ ماہ کے قلیل عرصہ میں تمام ملک فتح کر لیا۔ اور ۱۷۴۷ء سے ۱۷۷۲ء تادمِ وفات مسلسل فتوحات حاصل کرتا رہا۔

**ہندوستان پر پہلا حملہ:۔** ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ نے پہلا حملہ کیا اور پنجاب فتح کر کے معین الملک عرف میر منّو کو اپنا گورنر مقرر کیا۔

**دوسرا حملہ:۔** ۱۷۵۰ء میں دوسری بار حملہ آور ہوا۔

**تیسرا حملہ:۔** ۱۷۵۲ء میں تیسری مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا اور اس مرتبہ پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد کشمیر بھی فتح کیا۔

**چوتھا حملہ:۔** ۱۷۵۶ء میں چوتھی مرتبہ حملہ کیا اور دہلی فتح کر کے نجیب خاں کو نجیب الدولہ کا لقب عطا کیا اور متھرا اور آگرہ فتح کرنے بھیجا۔ چلتے وقت نجیب الدولہ کو اپنی طرف سے دلّی میں اپنا وکیل اور مختارِ مطلق مقرر کیا۔ احمد شاہ اس مرتبہ دلّی سے بے شمار دولت اپنے ساتھ لے گیا۔

**پانچواں حملہ:۔** چونکہ ۱۷۵۷ء میں مرہٹوں نے دلّی پر قبضہ کر کے نجیب الدولہ کو برطرف کر دیا۔ اس لئے اس نے احمد شاہ کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ چنانچہ احمد شاہ ۱۷۵۹ء میں پانچویں بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔

یہ حملہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ کیونکہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی واقع ہوئی جس میں مرہٹوں کو زبردست شکست ہوئی۔ اس لئے ہم اس حملہ کا حال قدرے تفصیل سے لکھتے ہیں:۔

۱۷۵۸ء میں غدارِ قوم آدینہ بیگ نے مرہٹوں کو پنجاب آنے کی دعوت دی تاکہ افغانوں کو پنجاب سے نکالا جا سکے۔ چنانچہ مرہٹوں نے آدینہ بیگ کی مدد سے پنجاب فتح کر لیا اور دلی پر بھی قابض ہو گئے۔ چونکہ اس کامیابی سے مرہٹے از اٹک (پشاور) تا کٹک (اڑیسہ) سارے ہندوستان کے مالک ہو گئے تھے اور دلی بھی ان کے قبضہ میں آگئی تھی اس لئے وہ سارے ہندوستان پر حکومت کا خواب دیکھنے لگے اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لال قلعہ میں باقاعدہ وشواس راؤ کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا جائے اور مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

نجیب الدولہ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مشورہ اور ان کے ایما سے احمد شاہ ابدالی کو ان تمام حالات سے مطلع کیا۔ چنانچہ احمد شاہ نے پانچویں مرتبہ فوج کشی کی پہلے پنجاب سے مرہٹوں کو نکالا اس کے بعد ان سے ایک فیصلہ کن جنگ کا انصرام کیا۔ نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ، حافظ رحمت خاں نواب دوندے خاں، نواب علی محمد خاں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کو احمد شاہ ابدالی کے زیرِ علم جمع کیا اور اس کے بعد دلی، آگرہ اور دوآبہ سے مرہٹوں کے اقتدار کا خاتمہ کیا، اور اس طرح ۱۷۵۹ء فیصلہ کن جنگ کی تیاریوں میں ختم ہو گیا۔

ادھر مرہٹے بھی غافل نہیں تھے۔ پیشوا نے افغانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری تیاری کی اور ایک عظیم الشان لشکر اپنے بیٹے وشواس راؤ کی سرکردگی میں پونا سے دلی بھیجا۔ چونکہ وشواس راؤ ایک ۱۷-۱۸ سالہ ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ اس لئے سداشو راؤ المعروف بہ بھاؤ کو اس کا مشیر خاص بنایا۔

مرہٹوں نے اپنے آپ کو مغلیہ سلطنت کا محافظ مشہور کر کے مسلمانوں

کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ شجاع الدولہ کو لکھا کہ آپ اور ہم دونوں ہندوستانی ہیں اور مغلیہ سلطنت کے ہوا خواہ بلکہ خادم ہیں۔ اس لئے آپ ہمارا ساتھ دیں۔ مگر شجاع الدولہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

فی الجملہ بھاؤ اپنا لشکر لیکر دکن سے چلا۔ ۲۵ رمارچ ۱۷۶۰ء کو برہانپور پہنچا، ۶ رمئی کو سرونج، ۲ رجون کو گوالیار، اور ۸ رکو دھولپور۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شجاع الدولہ اس کا ساتھ نہیں دیگا۔ بہرکیف وہ آگے بڑھا۔ اور ۳ راگست کو لال قلعہ پر قابض ہوگیا۔ ۶ راگست کو اس کے حکم سے دیوانِ خاص کی چاندی کی چھت اکھاڑی گئی اور اس چاندی سے نولاکھ روپے ڈھالے گئے۔

۱۰ راکتوبر کو بھاؤ نے شاہجہاں ثانی کو معزول کیا اور اس کی جگہ شاہزادہ عالی گوہر کی بادشاہت کا اعلان کیا اور چونکہ یہ شہزادہ دلّی میں موجود نہ تھا اس لئے اس کے بڑے بیٹے کو جس کا نام مرزا جواں بخت تھا، اس کی جگہ تخت نشین کیا یہ رسمی کارروائی سیاسی مصلحت کی بناپر کی گئی۔

اس کام سے فارغ ہوکر بھاؤ نے کنج پورہ فتح کیا اور وہاں سے چل کر ۲۹ راکتوبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت پہنچا جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ مقدر تھا۔ یکم نومبر کو احمد شاہ ابدالی بھی پانی پت پہنچا اور دونوں فوجیں لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوگئیں لیکن دسمبر میں مرہٹوں کے حالات اس قدر خراب ہوگئے کہ بھاؤ نے جنوری ۱۷۶۱ء کے پہلے ہفتہ میں احمد شاہ کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔

بادشاہ کے وزیر شاہ ولی خاں نے صلح کا مشورہ دیا مگر نجیب الدولہ نے شدید مخالفت کی اور روہیلہ فوج کے قاضی محمد ادریس نے بادشاہ سے کہا کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔ اس کے بعد اس نے جہاد کی فضیلت پر خطبہ دیا جس کا یہ اثر ہوا کہ ابدالی کی فوج کے تمام افسروں نے یک زبان ہوکر بادشاہ سے جہاد کی التجا کی۔ چنانچہ بادشاہ نے صلح کا پیغام رد کردیا۔

چونکہ بھاؤ کی فوج دو ماہ سے فاقے کررہی تھی اس لئے ۱۳ رجنوری کو

بھاؤ کے افسروں نے کہا کہ ہرچہ بادا باد۔ آج سپاہیوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دیجئے کل ہم لوگ میدانِ جنگ کی طرف چلیں گے۔

چنانچہ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو دن نکلنے سے پہلے دونوں فوجوں نے میدانِ جنگ کی طرف کوچ کیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے ابراہیم خاں گارڈی نے ابدالی کے میمنہ پر حملہ کیا۔ لیکن نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں نے ابراہیم گارڈی کی تربیت یافتہ پیدل فوج کا بالکل صفایا کر دیا۔

جب بھاؤ نے دیکھا کہ گارڈی کی فوج تباہ ہو چکی ہے تو اُس نے اپنی فوج کے ۱۳ ہزار سواروں کو لے کر ابدالی کے قلبِ لشکر پر حملہ کیا جس کی کمان شاہ ولی خاں کے ہاتھ میں تھی۔ پہلے حملہ میں ابدالی کی فوج سراسیمہ ہو گئی مگر شاہ ولی خاں نے فوراً ان کے قدم جما دیئے اور بادشاہ نے بھی عین وقت پر کمک روانہ کی۔ چنانچہ دس ہزار سواروں نے ایسا حملہ کیا کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ تاہم بھاؤ نے ہمت سے کام لیا اور ایک گھنٹہ تک مقابلہ کرتا رہا۔ وشواس راؤ بھی اپنی فوج کو لے کر آگے بڑھا اور بڑی شدّت سے حملہ کیا، مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

جب ابدالی نے دیکھا کہ دشمن کا حوصلہ پست ہو چلا ہے تو اُس نے اپنی فوجی قابلیت کے ترکش سے آخری تیر نکالا اور خاصہ کے غلاموں کو جو بندوقوں سے مسلح تھے حکم دیا کہ مرہٹوں کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ چنانچہ اس فوج نے چاروں طرف سے مرہٹوں پر آگ برسانی شروع کی۔

دن کے دو بجے وشواس راؤ گولی کھا کر گرا۔ مرہٹہ فوج کی ہمت پست ہو گئی۔ جب بھاؤ کو یہ خبر پہنچی تو اُس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ آؤ آخری بار حملہ کریں۔ چنانچہ اس نے ایک گھنٹہ تک مزید مقابلہ کیا۔ دن کے ۳ بجے

تو لقبیۃ السیف سپاہیوں کے ساتھ وہ بھی بھاگ نکلا مگر افغان سواروں نے جو بھاگنے والوں کا تعاقب کر رہے تھے، اسے نرغے میں لیکر قتل کر دیا اور اس کا سر کاٹ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔

جب مرہٹوں کا قلب لشکر اور میسرہ تباہ ہو گیا تو نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے ان کے میمنہ پر حملہ کیا۔ نجیب الدولہ کی فوج مرہٹوں کے میمنہ سے ڈیڑھ کوس فاصلہ پر تھی۔ مگر ۶ گھنٹے مسلسل پیشقدمی کر کے نجیب الدولہ سندھیا اور ہلکر کی فوج (مرہٹہ فوج کے دائیں بازو) کے مقابل آگیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس شیر دل روہیلہ نے اپنے ۶ ہزار سواروں کو حکم دیا کہ حافظ رحمت خاں کی ۹ ہزار پیدل فوج کے ساتھ گھوڑوں سے اتر کر حملہ کرو۔ چنانچہ آگے آگے نجیب الدولہ تھا اور اس کے پیچھے ۱۵ ہزار جانباز سپاہی تھے۔ جب دشمن کے نزدیک پہونچا تو سپاہیوں کو بندوقیں داغنے کا حکم دیا اور عقاب کی طرح مرہٹوں پر جا گرا۔ یہ حملہ اس شدت سے ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں ہلکر اور سندھیا دونوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

سب سے پہلے ملہار راؤ ہلکر بھاگا۔ اس کے بعد جنکوجی سندھیا نے اس کی تقلید کی۔ سرداروں کے بھاگ جانے کے بعد فوج کیا مقابلہ کرتی۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر پورے میمنہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد افغانوں نے مرہٹوں کا قتل عام شروع کر دیا۔

دوسرے دن جب مقتولوں کا شمار کیا گیا تو صرف میدان جنگ میں ۲۸ ہزار سے زیادہ مرہٹے مقتول پڑے تھے۔ اسی قدر گرفتار ہوئے جن کو افغانی سپاہیوں نے قتل کر کے مرہٹوں کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

زندگی میں سب سے بڑی فتح حاصل کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتیؒ کے مزار پر حاضر ہوا اور درگاہ کی مسجد میں دوگانہ فتح ادا کیا۔ چند روز کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو دھلی

پہونچا اور پندرہ ماہ کی مسلسل جد وجہد کے بعد کچھ عرصہ لال قلعہ میں آرام کیا اور اپریل ۱۷۶۱ء میں نجیب الدولہ کو وکیلِ مطلق مقرر کر کے وطن واپس چلا گیا۔

چھٹا حملہ ۱۷۶۲ء میں کیا، ساتواں حملہ ۱۷۶۴ء میں، آٹھواں حملہ ۱۷۶۵ء میں، نواں حملہ ۱۷۶۹ء میں اور آخری حملہ ۱۷۷۰ء میں کیا۔ ان حملوں کی تفصیل بخوفِ طوالت قلم انداز کرتا ہوں۔ ابدالی نے ۱۷۷۲ء میں وفات پائی۔

تمام مورخین متفق ہیں کہ ابدالی ایشیا کے عظیم الشان فاتحین میں سے تھا۔ سلطان محمود غزنوی کی طرح اسے بھی کسی میدان میں شکست نہیں ہوئی۔

یہ بات بھی قدرت کے عجائبات میں سے ہے کہ ۱۷۶۱ء میں سارا ہندوستان پنجاب سے لیکر دریائے چنبل تک اس کے قدموں میں تھا مگر اس نے ہندوستان کے تخت پر جلوس کرنے کے بجائے قندھار کی راہ اختیار کی۔ اقبال نے اس شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ازدل و دستے گہر ریزے کہ داشت
سلطنت ہا برد و بے پروا گذاشت

اس کے بعد اب ہم اس فصل کا مطلب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

کہتے ہیں کہ یہ اس بادشاہِ دین پناہ کی تربت ہے جس نے افغانوں کو ایران کی غلامی سے نجات دے کر ایک مستقل قوم بنا دیا۔ اس کی قبر کا گنبد آسمان کی نگاہ میں بہت محترم ہے اور آفتاب اس کے طواف کی بدولت روشنی حاصل کرتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ شعر محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی قبر بہت معزز ہے۔

سلطان محمد فاتح کی طرح یہ بادشاہ بھی علوم وفنون خصوصاً شعر و شاعری کا بہت قدردان تھا۔ اور خود بھی شعر کہتا تھا۔

سلطان محمد فاتح، سلاطینِ عثمانیہ میں بہت نامور سلطان گزرا ہے۔ ۱۴۳۰ء میں اورنہ (ایڈریانوپل) میں پیدا ہوا اور اپنے باپ مراد ثانی کی وفات

کے بعد ۱۴۵۱ء میں تخت نشین ہوا۔ ۱۴۵۳ء میں اس نے قسطنطنیہ فتح کر کے مشرقی رومن ایمپائر کا خاتمہ کر دیا اور اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ چونکہ قسطنطنیہ کی فتح مسلمانوں کی ملی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے اس لئے تاریخ میں اس کا لقب "فاتح" ہو گیا۔

فتح قسطنطنیہ کے بعد ترکوں کی عظمت سارے یورپ میں مسلّم ہو گئی اور اس کے بعد سلطان نے ملک یونان اور جزیرہ نمائے بلقان کی بہت سی ریاستوں کو فتح کیا اور بحری قوت میں اس قدر اضافہ کیا کہ تمام جنوبی یورپ اس کی طاقت سے لرزہ براندام رہتا تھا۔ آخر میں اس نے عراق و عجم پر فوج کشی کی۔ مگر اس مہم کو سر کرنے سے پہلے پیامِ اجل آگیا۔ یعنی ۱۴۸۱ء میں وفات پا گیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ سلطان ابدالی اس قدر وسیع القلب تھا کہ اس نے ملک فتح کئے مگر ان پر قبضہ نہ کیا (اشارہ ہے جنگِ پانی پت کی طرف)

یہ بادشاہ بہت عقلمند، علم دوست اور پابندِ مذہب تھا۔ اس کی روح نے مجھ سے اس طرح خطاب کیا۔

یہاں سے آخری شعر تک اقبال نے عالمِ خیال میں ابدالی سے گفتگو کی ہے۔ یعنی جو کچھ ابدالی نے ان سے کہا ہے وہ سب ان کے تخیل کی کارفرمائی ہے۔

کہتے ہیں کہ ابدالی کی روح نے مجھ سے کہا کہ اے اقبال! میں تیرے مقام سے آگاہ ہوں۔ تیرا کلام بنی آدم کے لئے زندگی کا پیغام ہے۔ تیری شاعری مُردوں کو زندہ کر سکتی ہے اور دلوں کو منوّر کر سکتی ہے۔ چونکہ تو بھی دینِ اسلام کا عاشق ہے اس لئے میرے پاس بیٹھ! میں تجھ سے رازِ دل بیان کرنا چاہتا ہوں۔

بلا شبہ وہ قوم بہت مبارک ہے جو اپنی خودی کو پختہ کر کے
اس دنیا میں ہنگامہ برپا کر دے۔ بندۂ مومن کی شان، ازروئے قرآن
یہی ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دے۔ اور نئی دنیا پیدا کر دے۔

خدا نے تجھے عشق کی دولت سے نوازا ہے اور تو دین اور سیاست کے رموز سے
بھی باخبر ہے۔ اس لئے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اپنے خیالات (اسرار ملک و دین)
بے کم و کاست نادر شاہ کے فرزند کی خدمت میں پیش کر دے۔

*
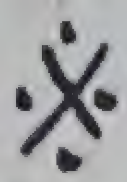
# فصل یازدہم

## خطاب بہ ظاہر شاہ والئی افغانستان

## اَیَّدَہُ اللّٰہُ بِنَصرِہٖ

اے قبائے پادشاہی بر تو راست — سایۂ تو خاک ما را کیمیاست

خسروی را از وجودِ تو عیار — سطوتِ تو ملک و دولت را حصار

از تو اے سرمایۂ فتح و ظفر — تختِ احمد شاہ را شانے دگر

سینہ ہا بے مہرِ تو ویرانہ بہ — از دل و از آرزو بیگانہ بہ

آبِ گوں تیغے کہ داری در کمر — نیم شب از تابِ او گردد سحر

نیک می دانم کہ تیغِ نادر است — من چہ گویم باطنِ او ظاہر است

حرفِ شوقے آوردہ ام از من پذیر

از فقیرے رمزِ سلطانی بگیر

اے نگاہِ تو ز شاہیں تیز تر — گردِ ایں ملکِ خدا داد اے نگر

ایں کہ می بینیم از تقدیر کیست؟ — چیست آں چیزے کہ می بایست و نیست؟

روز و شب آئینۂ تدبیرِ ماست — روز و شب آئینۂ تقدیرِ ماست

با تو گویم اے جوانِ سخت کوش ‏ ‏ ‏ چیست فردا؟ دخترِ امروز و دوش!

ہر کہ خود را صاحبِ امروز کرد ‏ ‏ ‏ گردِ او گردد سپہرِ گرد گرد

او جہانِ رنگ و بو را آبروست ‏ ‏ ‏ دوش از امروزِ او، فردا ازوست!

مردِ حق سرمایۂ روز و شب است ‏ ‏ ‏ زانکہ او تقدیرِ خود را کوکب است

بندۂ صاحب نظر پیرِ اُمم ‏ ‏ ‏ چشمِ او بینائے تقدیرِ اُمم

از نگاہش تیز تر شمشیر نیست ‏ ‏ ‏ ما ہمہ نخچیر، او نخچیر نیست!

لرزد از اندیشۂ آں پختہ کار ‏ ‏ ‏ حادثات اندر بطونِ روزگار!

چوں پدر اہلِ ہنر را دوست دار ‏ ‏ ‏ بندۂ صاحب نظر را دوست دار

ہمچو آں خلد آشیاں بیدار زی ‏ ‏ ‏ سخت کوش و پُردم و کرّار زی

می شناسی معنیِ کرّار چیست؟ ‏ ‏ ‏ ایں مقامے از مقاماتِ علیؓ ست

امتاں را در جہانِ بے ثبات ‏ ‏ ‏ نیست ممکن جز بہ کرّاری حیات

سرگذشتِ آلِ عثماں را نگر ‏ ‏ ‏ از فریبِ غربیانِ خونیں جگر

تا ز کرّاری نصیبے داشتند ‏ ‏ ‏ در جہانِ دیگر علم افراشتند

مسلمِ ہندی چرا میداں گذاشت؟ ‏ ‏ ‏ ہمتِ او بوئے کرّاری نداشت!

مُشتِ خاکش آنچناں گردیدہ سرد ‏ ‏ ‏ گرمیِ آوازِ من کارے نہ کرد!

ذکر و فکرِ نادری در خونِ تست ‏ ‏ ‏ قاہری با دلبری در خونِ تست

اے فروغِ دیدۂ برنا و پیر ‏ ‏ ‏ سرِّ کار از ہاشم و محمود گیر

ہم ازاں مردے کہ اندر کوہ و دشت ‏ ‏ ‏ حق ز تیغِ او بلند آوازہ گشت

روزہا شب ہا تپیدن می تواں ‏ ‏ ‏ عصرِ دیگر آفریدن می تواں

صد جہاں باقی است در قرآں ہنوز ‏ ‏ ‏ اندر آیاتش یکے خود را بسوز

بار افغاں را ازاں سوزے بدہ ‏ ‏ ‏ عصرِ او را صبحِ نو روزے بدہ

---

[1] والاحضرت شاہ ولی خاں۔

ملتے گم گشتۂ کوہ و کمر
از جبینش دیدہ ام چیزے دگر

زانکہ بود اندر دلِ من سوز و درد
حق ز تقدیرش مرا آگاہ کرد

کاروبارش را نکو سنجیدہ ام
آنچہ پنہان است پیدا دیدہ ام

مردِ میداں زندہ از اللہ ھوست
زیرِ پائے او جہانِ چار سوست!

بندۂ کو دل بغیر اللہ نہ بست
می تواں سنگ از زجاجِ او شکست

او نہ گنجد در جہانِ چون و چند
تہمتِ سائل باین دریا مبند

چوں ز روئے خویش برگیرد حجاب
او حساب است او ثواب است او عذاب!

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است
این دو قوت اعتبارِ ملت است

آن فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق
این فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق

ہر دو انعامِ خدائے لایزال
مومناں را آن جمال است این جلال!

حکمتِ اشیا فرنگی زاد نیست
اصلِ او جز لذتِ ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلمان زادہ است
این گہر از دستِ ما افتادہ است

چوں عرب اندر اروپا پر کشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آن صحرا نشینان کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند

این پری از شیشۂ اسلاف ماست
باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

لیکن از تہذیبِ لادینے گریز
زانکہ او با اہلِ حق دارد ستیز

فتنہ ہا این فتنہ پرداز آورد
لات و عزیٰ در حرم باز آورد

از فسونش دیدۂ دل نابصیر
روح از بے آبیِ او تشنہ میر!

لذتِ بیتابی از دل می برد
بلکہ دل زین پیکرِ گل می برد

کہنہ دزدے غارتِ او برملاست
لالہ می نالد کہ داغِ من کجاست!

حق نصیبِ تو کند ذوقِ حضور
باز گویم آنچہ گفتم در زبور

"مُردن دہم زیستن اے نکتہ رس
ایں ہمہ از اعتبارات است و بس
مرد کر سوزِ نوا را مردہ
لذّت صوت و صدا را مردہ
پیش چنگے مست و مسرور است کور
پیشِ رنگے زندہ در گور است کور
روحِ با حق زندہ و پائندہ است
ورنہ این را مردہ آں را زندہ است
آنکہ حیّ لَا یَمُوت آمد حق است
زیستن با حق حیاتِ مطلق است
ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست
گرچہ کس در ماتمِ او زار نیست

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لَا تَخَف
می رساند بر مقامِ لَا تَخَف
قوّتِ سلطان و میر از لَا اِلٰہ
ہیبتِ مردِ فقیر از لَا اِلٰہ
تا دو تیغ لَا و اِلَّا داشتیم
مَاسِوَا اللہ را نشاں نگذاشتیم!
خاوراں از شعلۂ من روشن است
اے خنک مردے کہ در عصرِ من است
از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر!
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صِبْغَةَ اللّٰه گفتہ ام
با مسلماناں غمے بخشیدہ ام
کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
عشقِ من از زندگی دارد سراغ
عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟
با مسلماں حرفِ پُر سوزے کہ گفت؟
ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت
تا مقامِ خویش بر من فاش گشت

حرف شوق آموختم واسوختم — آتشِ افسردہ باز افروختم!

با من آہِ صبح گاہے دادہ اند — سطوتِ کوہے بہ کاہے دادہ اند

دارم اندر سینہ نورِ لَا اِلٰہ — در شرابِ من سرورِ لَا اِلٰہ

فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست — جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام

تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام

---

## تمہید

مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں کی طرح اقبالؔ کو ظاہر شاہ سے بھی کچھ توقعات تھیں مگر افسوس کہ ان میں سے کسی نے بھی ان کی توقعات کو پورا نہ کیا اگر مرحوم اس زمانہ میں زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر ان کو بہت رنج ہوتا کہ افغانستان نے پاکستان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس کے باوجود ہمیں حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے شاید حالات بہتر ہو جائیں۔

یہ اس مختصر کتاب کی طویل ترین فصل ہے اور اس میں پانچ بند ہیں۔

پہلے بند میں بطور تمہید چند اشعار لکھے ہیں۔

دوسرے بند میں چند بیش قیمت نصائح درج کی ہیں۔

تیسرے بند میں افغانوں کو علومِ جدیدہ کی تحصیل و ترویج پر راغب کیا ہے،

چوتھے بند میں "زبورِ عجم" سے موت و حیات کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

پانچویں بند میں قرآنِ حکیم کے مطالعہ کی دعوت دی ہے اور آخری ارشاد میں اپنا منصب اور مقام واضح کیا ہے۔

### پہلا بند

اس بند کے اشعار میں قصیدے کا رنگ ہے۔ یعنی یہ بند ظاہر شاہ کی طرح

میں لکھا ہے۔ آخری شعر میں کہتے ہیں کہ اے بادشاہ! میں تجھے حکومت کے رموز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں:-

ع ازفقیرے رمزِ سلطانی بگیر

## دوسرا بند

اے بادشاہ! اپنے ملک کی حالت پر غور کر! خدا نے تجھے اتنا بڑا ملک دیا ہے۔ تیرا فرض یہ ہے کہ تو یہ غور کرے کہ اس ملک کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

ع چیست آں چیزے کہ می بائست و نیست

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس میں اقبال نے تمام ضروریاتِ مُلکی کی طرف اشارہ کر دیا ہے یعنی بادشاہ کا فرض ہے کہ افغانوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرے اور موجودہ زمانے میں دوسری قوموں کے دوش بدوش چلنے کے لئے جن جن باتوں کی ضرورت ہے ان سب کی طرف توجہ کرے۔

(۲) دوسرا نکتہ۔ یہ بیان کیا ہے کہ

ہر کہ خود را صاحبِ امروز کرد
گردِ او گردد سپہر گرد گرد

یعنی ہر روز جو عالمِ وجود میں آتا ہے قوموں کے لئے بمنزلۂ آئینہ ہے جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتی ہیں۔ ہم جیسی تدبیر (کوشش) کریں گے ویسی ہی ہماری تقدیر ہوگی۔ جو شخص امروز کو ضائع کرے گا وہ فردا سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔ جو قوم زمانۂ حال میں ترقی کی کوشش نہیں کرے گی۔ اُس کا مُستقبل تاریک ہو جائے گا۔

اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ ہمارا مستقبل کیسا ہے؟ تو امروز کو دیکھو کہ تم آئندہ کے لئے آج کیا تیاری کر رہے ہو؟ فردا (مستقبل) تو امروز و دوش

(ماضی وحال) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر تم آج ترقی کی کوشش کروگے تو کل دنیا پر حکمران ہوجاؤگے۔ جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے اس کی تقدیر میں مستقبل بھی نہیں ہے۔

(۳) مردِ حق (مومن) زمانہ کے لئے بمنزلہ سرمایہ ہے کیونکہ وہ اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا بھی اسی قوم کو سرفرازی عطا کرتا ہے جو اس کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔

مردِ حق (بندۂ صاحبِ نظر) قوموں کے لئے بمنزلہ رہنما ہوتا ہے کیونکہ وہ اُن کی تقدیر سے آگاہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ جانتا ہے کہ جو قوم اپنا وقت (امروز) عیش وعشرت میں ضائع کردیتی ہے وہ مستقبل میں دوسروں کی غلام ہوجاتی ہے۔

(۴) اے بادشاہ! اپنے باپ کی طرح اہل ہنر کی قدر کر! اور صاحبانِ نظر (دانشمند افراد) کو اپنا مشیرِ کار بنا! اپنے مرحوم باپ کی طرح جدوجہد، بیداری ہمت و حوصلہ اور کرّاری کو شعارِ زندگی بنا!

اے بادشاہ! کیا تو "کرّاری" کے مفہوم سے آگاہ ہے؟ سُن! یہ جناب علی مرتضیٰؓ کے مقاماتِ عالیہ میں سے ایک مقام ہے۔ یعنی یہ وہ صفت ہے جس نے جنابِ موصوف کو "شیرِ خدا" بنا دیا۔

کرّار کے لغوی معنیٰ ہیں بار بار پلٹ کر حملہ کرنے والا یعنی وہ شخص جو کثرتِ اعدا سے مطلق نہ گھبرائے اور انتہائی مایوسی کے وقت بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئے۔

واضح ہو کہ کرّاری جناب مرتضیٰؓ کا مخصوص وصف ہے جس طرح صدیقیت حضرت ابوبکرؓ کا، فاروقیت حضرت عمرؓ کا اور بذلِ اموال حضرت عثمانؓ کا مخصوص وصف ہے۔ بعض دیگر صحابہؓ مثلاً حضرات ابودجانہؓ سیّد الشہدا حمزہؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد ابن ابی وقاصؓ اور خالد ابن ولیدؓ

بھی شجاعت کے لحاظ سے مشہور ہیں مگر حضرت علیؓ ان سب میں ممتاز ہیں۔

(۵) اس کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں:۔

اُمتاں را در جہانِ بے ثبات
نیست ممکن جز بکرّاری حیات

یعنی میدانِ جنگ میں اور ہر مصیبت اور خطرہ کے وقت ثابت قدم رہنا اور بار بار حملہ کرنا، یہ صفت، بنیاد ہے قوموں کی زندگی اور سربلندی کی بیشک یہ جہانِ بے ثبات ہے یعنی ہر شخص فانی ہے مگر اس جہانِ بے ثبات میں جو شخص ثبات کا طالب ہو اُسے میدانِ جنگ میں ثباتِ قدم کا اظہار کرنا لازمی ہے۔

اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے اگلے تین شعروں میں اقبالؔ نے مسلمانوں کی تاریخ سے دو مثالیں درج کی ہیں:۔

کہتے ہیں کہ اگر تجھے میرے قول کی تصدیق مطلوب ہے تو آلِ عثمانؓ اور ترکانِ تیموری پر نظر کر۔

(۱) اگرچہ ترکانِ عثمانی نے گذشتہ جنگِ عظیم میں اقوامِ مغرب کے ہاتھوں شکست کھائی مگر چونکہ ان کے اندر کرّاری کی صفت موجود تھی۔ اس لئے ۱۹۲۲ء میں دوبارہ کامیابی حاصل کرلی۔

(ب) لیکن ترکانِ تیموری اصلی صفت سے محروم ہو چکے تھے اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمان انگریزوں کے غلام ہو گئے، اور موجودہ زمانہ میں ان کی ہمّت اس درجہ پست ہو گئی ہے کہ میرا پیغام بھی صدا بصحرا ثابت ہوا۔

واضح ہو کہ حضرت عالمگیرؒ کے بعد جس قدر بادشاہ تخت نشین ہوئے بلا استثنا سب کے سب عیاشی اور راحت کوشی میں مبتلا تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی تمام امراء اسی لعنت میں گرفتار ہو گئے۔ مثال کے طور پر صرف جہاندار شاہ

کا تذکرہ کافی ہوگا۔ عالمگیرؒ جیسے بادشاہ کا یہ پوتا ۱۷۱۲ء میں تخت نشین ہؤا اور تخت نشینی کے بعد اس نے دلی کی ایک رقاصہ لال کنور کو ملکۂ ہندوستان بنایا اور اس کے رشتہ داروں کو ہفت ہزاری منصب دیکر سیاہ و سفید کا مالک کر دیا۔ اب ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ سلطنت کیسے قائم رہ سکتی ہے جس میں ایسے ذلیل اور بدقماش لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جائے۔ تفصیل کے لئے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ میں بخوفِ طوالت اس المناک داستان سے قطع نظر کرتا ہوں۔

(۶) اے بادشاہ! تیری رگوں میں نادر شاہ کا خون ہے اس لئے تو اپنے نامور باپ کے نقشِ قدم پر چل اور سردار ہاشم خاں، سردار محمود خاں اور سردار شاہ ولی خاں (برادران نادر شاہ) کو اپنا مشیر بنا۔

(۷) اگر تو کوشش کرے تو افغانستان میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو اپنا رہنما بنا کیونکہ

صد جہاں باقی است در قرآں ہنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز

یعنی قرآنِ حکیم زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور ہر زمانہ میں بنی آدم کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرع بہت بلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں سربلندی حاصل کرنے کے ایسے پختہ اُصول بیان کئے گئے ہیں کہ جس وقت بھی کوئی قوم ان پر عمل پیرا ہوگی، کامیابی اُس کے قدم چومے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم عالمگیر ہے اور اس کے پیش کردہ اصول اٹل ہیں۔ مرورِ ایام سے فرسودہ اور بیکار نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی تعلیمات (آیات) میں تدبر (غور و خوص) کیا جائے۔ اور اس کے بعد ان پر عمل کیا جائے۔ "سوختن" کنایہ ہے عمل کرنے سے۔

لہٰذا اے بادشاہ! پہلے تو خود قرآنی تعلیمات پر عمل کر۔ اس کے بعد اپنی

قوم کو اس پر عامل ہونے کی دعوت دے۔ یقیناً تیری قوم کی زندگی میں انقلابِ عظیم رونما ہو جائے گا۔

چونکہ میرے دل میں تیری قوم کا درد ہے اس لئے حق تعالیٰ نے مجھے اُن کی تقدیر سے آگاہ کر دیا ہے۔ یعنی یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے کہ اگر ملّتِ افغانیہ، قرآن عزیز کو اپنا رہنما بنائے تو دنیا میں سربلند ہو سکتی ہے۔

(۸) یاد رکھ کہ مسلمان، جسے خدا نے جہاد کے لئے پیدا کیا ہے۔ عقیدۂ توحید (اللہ ہو) کی بدولت زندہ اور پائندہ ہو سکتا ہے اور اگر وہ توحیدِ الٰہی کو اپنا مدارِ کار اور محورِ حیات بنائے تو یہ ساری کائنات اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہو سکتی ہے۔

(۹) یاد رکھ کہ جو شخص ماسویٰ اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے یعنی اللہ کو اپنا مقصودِ حیات بنا لیتا ہے اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ

مصرع ـــــ می تواں سنگ از زجاج او شکست

اس کے ہاتھ میں آکر شیشہ (ضعیف شی) اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے کہ اس سے پتھر (دشمن قوی) کو توڑ (مغلوب کر) سکتے ہیں۔

(۱۰) حقیقت یہ ہے کہ مردِ حق اس کائنات میں نہیں سما سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ غیر محدود طاقتوں کا مالک ہو جاتا ہے۔ وہ بمنزلۂ دریا ہو جاتا ہے۔ اسے محدود (ساحل) سمجھنا گویا اس پر اتہام لگانا ہے۔ جب وہ اپنی پوری شان کے ساتھ میدانِ جہاد میں آتا ہے تو قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کر دیتا ہے وہ قوموں کے اعمال کا حساب کرتا ہے اور جو قوم حق تعالیٰ کے احکام کی پابند ہوتی ہے اسے ثواب (عزّت) عطا کرتا ہے اور جو قوم نافرمان ثابت ہوتی ہے اسے عذاب (ذلّت) میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس شعر کا مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اے مسلمانو! تم بہترین امت (قوم یا جماعت) ہو جو لوگوں (کے حالات کی اصلاح) کے لئے پیدا کی گئی ہے (تمہارا مقام یہ ہے کہ) تم لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور انہیں برائی (بُرے کاموں) سے روکتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ تم اقوام عالم کے سردار ہو۔ (ہم نے تمہیں اپنا نائب مقرر کیا ہے)۔ ظاہر ہے کہ سرداری کے لئے طاقت، حکومت اور سطوت لازمی شرط ہے مسلمان دوسری قوموں کو اسی وقت حکم دے سکتے ہیں جب وہ خود صاحب اقتدار ہوں اور دنیا ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر سکے۔ یعنی اگر مسلمان، اقوام عالم کو برائی سے نہ روک سکیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ منشائے ایزدی کی تکمیل یا تعمیل سے قاصر ہیں۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہم دوسروں کو حکم دینے کے بجائے خود دوسروں کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اور یہ ہماری حالتِ زار، نتیجہ ہے قرآن سے روگردانی کا۔ جب تک ہم قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائیں گے دنیا میں سربلند نہیں ہو سکتے۔

## تیسرا بند

اس بند میں اقبال نے دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ چنانچہ ظاہر شاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ وہ ساز و سامان جس کی بدولت ہم دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتے ہیں، کتاب اور حکمت ہے۔ یہی وہ دو قوتیں ہیں جن کی بنا پر ملتِ اسلامیہ دنیا میں اعتبار (عزت) حاصل کر سکتی ہے۔

کتاب سے قرآن حکیم اور حکمت سے سائنس اور فلسفہ مراد ہے اور یہ دونوں لفظ اس آیت سے مقتبس ہیں:-

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۴۔۱۱۳)

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی۔

حکمت کی فضیلت اس آیت سے ثابت ہے :۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (۲-۲۶۹ب)

اور جسے حکمت دی گئی بلاشبہ اسے خیر کثیر (نعمتِ عظمیٰ) عطا کی گئی۔

لفظ حکمت کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ مفسرین نے اس لفظ سے دانائی بھی مراد لی ہے اور سُنّتِ نبوی بھی، اور عقل و دانش بھی اور علوم بھی۔۔۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ الخ

یعنی علم و حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اس لئے جہاں کہیں اُسے یہ چیز ملے اس پر اس کا سب سے زیادہ حق ہے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے لفظ حکمت کے مفہوم کی وسعت ثابت ہو گئی۔ یعنی اس سے عقل و فہم، علم و حکمت، دانائی اور سائنس یا علومِ عصر یہ تمام باتیں مراد لی جا سکتی ہیں۔ اقبال نے جیسا کہ اگلے دو شعروں سے ظاہر ہے حکمت سے سائنس مراد لیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :۔

کتاب کی بدولت یا اس پر عمل کر کے ہم عالمِ ذوق و شوق میں فتوحات (کامیابی) حاصل کر سکتے ہیں یعنی اللہ سے محبت کر کے روحانیت میں بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

اور حکمت کی بدولت ہم عالمِ تحت و فوق یعنی مادیت کی دنیا فتح کر سکتے ہیں۔ اور سب جانتے ہیں کہ مادیات کی تسخیر، سائنس ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ اس لئے یہاں حکمت سے سائنس مراد ہے۔

مزید وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن اور سائنس دونوں خدائے لایزال کا انعام ہیں۔ قرآن سے مومن کے اندر شانِ جمال (محبت الٰہی) کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اور سائنس سے اس میں شانِ جلال (قوت اور حکومت) پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن، انسان کو بنی آدم پر رحمت اور شفقت کرنا سکھاتا ہے۔ اور سائنس،

انسان کو تسخیرِ کائنات کا طریقہ بتاتا ہے اور جب تک انسان میں یہ دونوں شانیں جلوہ گر نہ ہوں وہ اپنی شخصیت کو مرتبہ کمال تک نہیں پہونچا سکتا۔

اس کے بعد اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ حکمتِ اشیا یعنی سائنس فرنگی زاد (یورپ کا پیدا کردہ) نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بنیاد لذّتِ ایجاد اور ذوقِ تحقیق پر ہے۔ جس قوم کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے وہ سائنس میں ترقی کر سکتی ہے۔

اگر تو غور سے دیکھے یعنی تاریخ کا مطالعہ کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ سائنس (طبعیات، کیمیا، علم الحیات وغیرہ) مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے۔ کسی زمانے میں یہ گوہر ہمارے پاس تھا، ہم نے کھو دیا، یورپ نے اٹھا لیا۔

جب مسلمانوں نے ہسپانیہ فتح کیا تو قرطبہ اور غرناطہ میں سائنس اور فلسفہ کی عظیم الشان درس گاہیں قائم کیں جن میں فرانس، انگلستان اور اطالیہ کے طالبانِ علم نے مسلمانوں سے یہ علوم حاصل کئے۔ تخم ریزی تو مسلمانوں نے کی لیکن فصل اہلِ یورپ نے کاٹی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے قرآن حکیم میں تدبر کیا تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس کتاب نے جابجا مسلمانوں کو **فطرت کے مطالعہ** کی دعوت دی ہے۔ مثلاً

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝

(۸۸ - ۱۷ تا ۲۰)

پس کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں کی طرف کہ کیسے بنائے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا اسے بلند کیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے کھڑے کر دیئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کیسی صاف بچھائی ہے؟

ان آیتوں میں اونٹ تمام حیوانات کا نمائندہ ہے۔ گویا اس آیت میں اشارہ ہے علم الحیوان کی طرف۔ آسمانوں کی بناوٹ کا مطالعہ کرنے میں اشارہ

ہے علم الآفاق کی طرف، پہاڑوں کی بناوٹ کا مطالعہ کرنے میں اشارہ ہے علم معدنیات اور جغرافیات کی طرف اور زمین کی بناوٹ کا مطالعہ کرنے میں اشارہ ہے علم الارض کی طرف۔
قرآنِ حکیم میں اس قسم کی آیات سات سو سے زائد ہیں جن میں انسانوں کو فطرت کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کائنات میں جس قدر مخلوقات ہیں سب میں ہماری قدرت کی نشانیاں موجود ہیں۔ مگر ان سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو عقل سے کام لیں یعنی غور و خوض کریں اور تدبر، تفکر اور تفقہ کو کام میں لائیں۔
نیز قرآن نے انسانوں کو بار بار اس انداز سے مخاطب کیا ہے کہ اے لوگو! تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے۔
فی الجملہ جب مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ قرآن حکیم، مطالعہ فطرت کا حکم دیتا ہے اور اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ عقل سے کام لو اور غور و فکر کرو، تو مسلمانوں نے عقل سے کام لیکر فطرت کا مطالعہ شروع کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس طریقۂ کار کا نتیجہ سائنس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یعنی مسلمانوں نے مختلف علوم و فنون مدون کئے۔
مسلمانوں کے عہد سے پہلے دنیا میں استخراجی طریقہ مروج تھا جسے DEDUCTIVE METHOD کہتے ہیں۔ مثلاً:-

انسان فانی ہے۔
زید انسان ہے۔
لہٰذا زید فانی ہے۔

لیکن مسلمانوں نے اس طریقہ کے علاوہ استقرائی طریق بھی ایجاد کیا جسے INDUCTIVE METHOD کہتے ہیں مثلاً

زید فانی ہے، خالد فانی ہے، بکر فانی ہے۔ وقس علیٰ ھذا
اس لئے ثابت ہوا کہ انسان فانی ہے۔

بیکن کو اہلِ یورپ، استقرائی طریق کا موجد کہتے ہیں۔ لیکن حقیقتِ حال

یہ ہے بیکن سے صدیوں پہلے مسلمان اس طریق کو ایجاد کر چکے تھے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس طریق کی طرف رہنمائی کی ہے۔ کیونکہ وہ بار بار مطالعۂ فطرت یعنی استقرا کی دعوت دیتا ہے۔

یہ شرح مسلمانوں کے علمی کارناموں کی تاریخ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جن حضرات کو تفصیل مطلوب ہو وہ ڈاکٹر ڈریپر کی تصنیف "یورپ کی ذہنی ترقی کی تاریخ" یا بریفالٹ کی "تعمیرِ انسانیت" کا مطالعہ کر لیں۔

باز آمدم بر سرِ مطلب، مسلمان کئی صدیوں تک دنیا کو فلسفہ اور سائنس کا درس دیتے رہے یعنی سولھویں صدی تک یورپ مسلمانوں سے جملہ علوم و فنون حاصل کرتا رہا ہے

سترھویں صدی سے ایک طرف تو مسلمانوں کا سیاسی زوال شروع ہو گیا دوسری طرف یورپ کی اقوام نے مسلمانوں سے علوم و فنون حاصل کر کے مادی عروج حاصل کرنا شروع کر دیا۔

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند

میں اس شرح میں نہ تو مسلمانوں کے زوال کے اسباب سے بحث کر سکتا ہوں اور نہ یورپ کے عروج کی داستان بیان کر سکتا ہوں۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ

(۱) سلاطین اور اُمرا عیش و عشرت میں منہمک ہو گئے۔
(۲) علما اور حکما میں تقلیدِ کور کا مرض پیدا ہو گیا۔
(۳) سیاسی زوال سے خانہ جنگی، اقتصادی بدحالی اور انجام کار غلامی مسلط ہو گئی۔

(۴) غلامی سب سے بڑی لعنت ہے۔ ذوقِ تحقیق کے لئے سکونِ قلب اور فارغ البالی شرطِ اولین ہے اور غلام قوم ان دونوں بلکہ ساری نعمائے سے

محروم ہو جاتی ہے۔

(۵) خواص اور عوام دونوں کی توجہ قرآن کے بجائے فنونِ لطیفہ یعنی شاعری، مصوری اور موسیقی پر مبذول ہو گئی۔ بالفاظِ دیگر

آنچہ کو بتا دوں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

مسلمانوں کے مقابلہ میں اقوام یورپ نے سائنس کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے اپنی اجتماعی ترقی کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اندر تسخیرِ کائنات کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا۔

مسلمانوں نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے ہی دوڑائے تھے۔ اہلِ یورپ نے بحرِ ظلمات کو عبور کر کے نئی دنیا دریافت کر لی اور اپنی بحری طاقت کو اس قدر فروغ دیا کہ تجارت کرتے کرتے مشرقی ممالک پر قابض ہو گئے۔ حکومت سے دولت حاصل ہوئی تو عیش و عشرت میں غرق ہونے کے بجائے اپنی زندگی میں توازن قائم کیا۔ یعنی اگر رات کو بزمِ عیش منعقد کی تو دن میں سامانِ حرب تیار کیا۔

اُنیسویں صدی میں اور خصوصاً عصرِ حاضر میں جس قدر ایجادات سائنس کی بدولت ان اقوام کے ہاتھوں وجود میں آئیں ان کی بدولت آج یہ اقوام ساری دنیا پر حکمراں ہیں۔ اور ساری دنیا کے مسلمان یا ان کے غلام ہیں یا دست نگر اور محتاج ہیں۔ جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ عرب، عراق اور ایران کے مسلمان اپنے ملکوں کے قدرتی ذخائر سے خود مستفید نہیں ہو سکتے۔ مثلاً تیل کے چشموں سے خود تیل نہیں نکال سکتے۔ یہ کام انگریز اور امریکن کمپنیاں انجام دے رہی ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الالباب ۱۲

اقوامِ مغرب سے سائنس اور دیگر علوم و فنون سیکھنے کی ترغیب دینے کے بعد اقبال مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ :-

لیکن از تہذیب لادینی گریز
زانکہ او با اہلِ حق دارد ستیز

یعنی جس طرح تم سے اہلِ یورپ نے علوم و فنون حاصل کئے تھے اسی طرح اب تم ان سے وہ تمام علوم سیکھ لو جن کی بنا پر وہ عناصر کائنات پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ مگر ان کی تہذیب سے اجتناب کرو کیونکہ اس کی بنیاد انکارِ خدا پر ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے حق میں سمِ قاتل ہے۔ آئندہ چار شعروں میں تہذیبِ مغرب پر تنقید کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ

(ا) یہ تہذیب سراسر پُر فتن ہے اور اس تہذیب کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ انسانوں (مسلمانوں) کو خدا پرستی سے باز رکھتی ہے۔ خدا کی جگہ وطن، قوم یا مملکت کو معبود اور مقصودِ حیات بناتی ہے۔

(ب) اس تہذیب سے دل کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ یعنی دل مُردہ ہو جاتا ہے اور اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا دل زندہ ہو جائے۔ لہٰذا یہ تہذیب مسلمانوں کے حق میں سراسر مُضر ہے بلکہ اسلام کی ضد ہے۔

(ج) یہ تہذیب مسلمانوں کو خدا کی محبّت سے بیگانہ بنا دیتی ہے بلکہ روحانیت اور اخلاقِ حسنہ کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس کی بنا پر انسان مادّیت میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ تہذیب مسلمانوں کو کافر بنا دیتی ہے۔

(د) مسلمانوں کا سرمایۂ حیات محبّت (داغ) ہے لیکن یہ تہذیب اسی سرمایہ کو برباد کر دیتی ہے۔ یعنی تہذیب غارت گرِ دین و ایمان ہے۔

ع لالہ می نالد کہ داغِ من کجاست

بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس میں لالہ کنایہ ہے مسلمان سے اور داغ کنایہ ہے جذبۂ عشق سے جو مسلمان کا حقیقی سرمایۂ حیات ہے اور یہ تہذیب اسی سرمایہ کو غارت کر دیتی ہے۔

اقبالؔ نے تہذیبِ مغرب کی مذمت میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے

تمام تصانیف میں اس کی خرابیوں کو واضح کیا ہے۔ تہذیب مغرب سے مراد، اہل یورپ کی وضع یا طرزِ زندگی یا لباس نہیں ہے بلکہ وہ رجحانِ طبع یا اندازِ فکر ہے جس کی بنا پر انسان، خدا اور آخرت، وحی اور رسالت، ضمیر اور اخلاقِ حسنہ، آدمیت اور ہمدردی، عشق اور روحانیت سے بیگانہ ہوجاتا ہے اور دنیا اور اس کی لذتوں کو مقصودِ حیات بنا لیتا ہے۔ اسلام، اس کے برعکس، آخرت کو مقصودِ حیات قرار دیتا ہے۔ اس لئے کوئی مسلمان تہذیبِ مغرب کو اختیار کرنے کے بعد مسلمان نہیں رہ سکتا۔ خدا پرستی اور مادہ پرستی کسی آدمی میں بیک وقت جمع نہیں ہوسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے مسلمانوں کو اس تہذیب سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔

## چوتھا بند

اس بند میں اقبالؔ نے زندگی اور موت کا مفہوم واضح کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اے بادشاہ! میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تجھے "ذوقِ حضور" عطا فرمائے، کیونکہ اس کے بغیر زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں، چونکہ یہ نکتہ اہم ہے اس لئے زبورِ عجم سے وہ اشعار تجھے سناتا ہوں جن میں زندگی اور موت کا فلسفہ (مفہوم) بیان کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ تعلیماتِ اسلام کی غائت یہ ہے کہ مسلمان میں "ذوقِ حضور" پیدا ہوجائے۔ "ذوقِ حضور" تصوفِ اسلام کی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ لذت یا کیفیت جو سالک کو حضوری کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ حضور یا حضوری سے مراد ہے سالک کا ہر وقت یہ محسوس کرنا کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ یا خدا میرے ساتھ ہے۔

قرآنِ حکیم نے "حضور" کے بجائے معیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں معیت کا اثبات کیا ہے:۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ

اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ (خدا) تمہارے ساتھ ہے۔

چونکہ اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس لئے ارباب تصوف نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اب تمہارا فرض یہ ہے کہ اس معیت حق کا احساس کامل اپنے اندر پیدا کرو، یعنی ایسی کوشش کرو کہ اس آیت کی صداقت تم پر آشکار ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے وہ طریقہ بتایا جس پر عمل کرنے سے یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ کو "تصحیح الخیال" کہتے ہیں۔ اور درحقیقت تصوف اسی تصحیح الخیال کا دوسرا نام ہے۔ ذکر و شغل نوافل، تہجد، مراقبہ، مجاہدہ اور خلوت سب کا مقصد یہی ہے کہ خیال صحیح ہو جائے یعنی یکسوئی پیدا ہو جائے۔ خدا کے سوائے دوسرے کا خیال دل میں نہ آنے پائے۔

جب یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے تو نماز میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

"اپنے رب کی عبادت اس طرح کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔"[1]

مطلب یہ ہے کہ جب نماز پڑھو تو تمہیں یہ احساس ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ یعنی اس کے سامنے ہو۔ بالفاظ دیگر اس کی معیت کا احساس ہو جائے اسی کو حضور بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ حالت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب خیال صحیح ہو جائے اور اسی تصحیح خیال کے لئے مرشد کی صحبت اختیار کی جاتی ہے کیونکہ

---

[1] اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ۱۲

شریعت کی اصطلاح میں اس کیفیت کو 'احسان' سے تعبیر کیا گیا ہے اور تصوف اسلام اسی صفت احسان کا دوسرا نام ہے۔ صحابہ کرامؓ اسے احسان کہتے زمانہ ما بعد کے مسلمان اسے تصوف کہنے لگے ۱۲

یہ بات ازخود پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس کی مشق و مزاولت نہ کی جائے
اور مشق و مزاولت کا طریقہ مرشد کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔

الغرض جب حضور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو انسان ہر قسم کے گناہوں
سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی نماز کے لئے قرآن میں آیا ہے:۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۵

بیشک نماز (اگر حضورِ قلب کے ساتھ پڑھی جائے تو) انسان کو بے حیائی
اور ناپسندیدہ امور اور نافرمانی سے روک دیتی ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جب انسان کو یہ احساس ہر وقت دامنگیر رہے گا
کہ میں خدا کے سامنے ہوں یا خدا مجھے دیکھ رہا ہے یا خدا میرے ساتھ ہے تو
وہ گناہ پر قادر نہیں ہو سکتا۔

قرآن و حدیث کی رُو سے حقیقی زندگی یہی ہے کہ انسان کو ہر وقت معیتِ
حق کا احساس ہوتا رہے۔ یعنی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان
یہ محسوس کرے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ لہٰذا جو شخص حضور یا معیتِ حق سے
محروم ہے، قرآن کی رُو سے وہ زندہ نہیں ہے بلکہ مُردہ ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر وہ
انسان ہے مگر دراصل حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ
زندگی سے محروم ہے۔

اس کے بعد اقبالؔ نے زبورِ عجم سے اقتباس پیش کیا ہے۔ یہ اشعار
انہوں نے "مذہب غلاماں" کے ذیل میں لکھے ہیں۔

اس فصل میں انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے
کا غلام ہو جاتا ہے تو اگرچہ بظاہر وہ زندہ ہوتا ہے مگر درحقیقت مر جاتا ہے۔

زندہ و بے جاں چہ راز است ایں نگر
با تو گویم معنئ رنگیں نگر

یعنی انسان جس شخص کا غلام ہوتا ہے وہ شخص اس کا خدا بن جاتا ہے

اور اسے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ غلام بظاہر زندہ ہوتا ہے مگر اس میں روح نہیں ہوتی۔ اس کی تفصیل انہوں نے آئندہ اشعار میں بیان کی ہے اور یہی اشعار اقبال نے اس جگہ درج کئے ہیں۔ اب ہم ان کی تشریح کرتے ہیں:-

کہتے ہیں کہ مرنا اور جینا یہ دونوں اعتباری امور ہیں۔ مثلاً مچھلی کے لئے کوہ اور دریا کا کوئی وجود نہیں ہے اور پرندوں کے زاویۂ نگاہ سے قعرِ دریا کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اسی طرح بہرے آدمی کی نگاہ میں آواز کا کوئی وجود نہیں ہے اور اندھے آدمی سے پوچھو تو رنگ کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی روح کو اگر معیتِ حق نصیب ہے تو زندہ ہے ورنہ مُردہ ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کی نگاہ میں صرف وہ انسان زندہ ہے جسے حضوری کی دولت حاصل ہے۔ صرف حق تعالیٰ حقیقی معنوں میں زندہ ہے۔ کیونکہ اسے موت نہیں آسکتی۔ اس لئے حقیقی حیات اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو خدا کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو شخص حضور (معیت) سے محروم ہے وہ در اصل مُردہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دنیا والے اس کی موت کا ماتم نہیں کرتے۔ یعنی اگرچہ دنیا والوں کی نظر میں وہ شخص زندہ ہے مگر خدا کی نظر میں مُردہ ہے۔

## آخری بند

اے بادشاہ! اگر تو ثبات کا طالب ہے۔ یعنی اگر تو حیاتِ ابدی کا آرزو مند ہے تو قرآنِ حکیم کو اپنا رہنما بنا اور اس سے استفادہ کر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم انسان کو حقیقی زندگی عطا کر سکتا ہے۔ جو شخص اس کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے، موت سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

قرآنِ عزیز کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیں "لا تخف" کا مژدہ سناتا ہے یعنی

جو شخص اس کتاب کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے وہ کائنات میں کسی شی سے خوف نہیں کھاتا۔ کیونکہ خدا کے سوا کسی میں یہ طاقت ہی نہیں کہ کسی کو نفع یا نقصان پہونچا سکے۔

"لا تخف" اس آیت سے مقتبس ہے:۔

"قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ (۲۰-۲۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! پکڑ لے (اس سانپ کو) اور مت ڈر۔

نیز دوسری آیت میں ہے:۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ (۲۰-۶۸)

ہم نے موسیٰ سے کہا مت ڈر، بلاشبہ تو ہی ان جادوگروں پر غالب رہے گا۔

کہتے ہیں کہ کلمۂ توحید (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ) میں یہ تاثیر ہے کہ بادشاہ اور فقیر دونوں کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

اے بادشاہ! جب تک ہمارے ہاتھ میں لا الٰہ الا اللہ کی تلوار رہی ہم ماسوی اللہ (کائنات) پر غالب رہے۔ اگر ہم یہ تلوار دوبارہ حاصل کرلیں تو ہمارے اندر وہی طاقت پیدا ہو سکتی ہے جو ہمارے اسلاف میں تھی۔

---

یہاں خطاب ختم ہو گیا۔ اب آخر میں اقبالؔ اپنا منصب اور مقام واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

میرے کلام نے مشرق کو منور کر دیا ہے۔ وہ شخص بہت خوش نصیب ہے، جو میرے زمانہ میں ہے اور میرے کلام کا مطالعہ کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں نے اپنی شاعری میں قرآنی حقائق و معارف پیش کئے ہیں اور رمزِ صِبْغَةَ اللّٰہ کی تشریح کی ہے۔ یعنی مسلمانوں کو وہ طریقہ بتا دیا ہے جس کی بدولت وہ اپنے آپکو خدا کے رنگ میں رنگین کر سکتے ہیں یعنی اپنے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کر سکتے ہیں۔ جملہ "صِبْغَةَ اللّٰہ" اس آیت میں وارد ہوا ہے:۔

صِبْغَةَ اللّٰہِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً ہ (۲-۱۳۸)

(آپ کہہ دیجیے کہ ہم نے قبول کر لیا) رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے ؟ (اللہ کے رنگ سے اللہ کا پسندیدہ دین مراد ہے)۔

میں نے مسلمانوں کو عشقِ رسول ؐ کا پیغام دیا ہے اور عشقِ رسول ؐ مسلمانوں کو اسی طرح زندہ رکھ سکتا ہے جس طرح نمی (پانی) سے پرانی (سوکھی ہوئی) شاخ ہری ہو جاتی ہے۔

میں نے جس عشق کا پیغام مسلمانوں کو سنایا ہے وہ ان کی زندگی کا ضامن ہے اس عشق کی بدولت عقلِ انسانی منور ہو جاتی ہے۔ یعنی عقل بذاتِ خود انسان کو خدا تک پہونچانے کے بجائے اس سے دور کر دیتی ہے۔ کیونکہ عقل کا خاصہ یہ ہے کہ وہ دل میں شکوک پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر عقل کو عشق کے تابع کر دیا جائے تو وہ خدا رسی میں معاونت کر سکتی ہے۔

اقبال نے اس نکتہ کو کہ کوئی شخص محض عقل کی بدولت خدا تک نہیں پہونچ سکتا، اپنی ہر تصنیف میں واضح کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت

یعنی فلسفی شکوک کے غبار میں راہِ راست سے بھٹک گیا مگر عاشق اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اس زمانہ میں میرے سوا کسی شاعر نے دینِ اسلام کے حقائق و معارف اس قدر وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کئے اور نہ کسی نے مسلمانوں کو میری طرح عشقِ رسول ؐ کا پیغام سنایا۔

میں نے مدتوں خلوت میں دینِ اسلام کے اسرار و رموز پر غور کیا تب کہیں جاکر میرا مقام مجھ پر واضح ہوا یعنی آیاتِ قرآنی میں تدبر کرنے سے مجھے یہ منصب حاصل ہوا کہ میں قوم کو پیغام دے سکوں۔

میں نے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے اپنے اندر عشق رسولؐ کا رنگ پیدا کیا اور اپنی ہستی کو عشق کی آگ میں جلا کر خاک کر دیا تب میرے اندر قوم کو درسِ عشق دینے کا ولولہ پیدا ہوا۔

خدا نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عشق رسولؐ کی دولت اور نعمت عطا فرمائی (آہِ صبحگاہی کنایہ ہے عشق رسولؐ سے) اور اس عشق کی بدولت میری شخصیت، جو بذاتِ خود بہت حقیر (کاہ) تھی بہت وقیع اور محترم (کوہ) ہو گئی۔

چونکہ میرا سینہ نورِ توحید سے منور ہے اسی لئے میری شاعری (شراب) میں توحید کا سرور پایا جاتا ہے۔ اسی توحید کی بدولت میرے افکار میں آسمان کی سی بلندی اور سمندر کی سی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

لہٰذا اے مخاطب! تو بھی میری شرابِ توحید کے دو ایک جام پی لے تاکہ تجھ میں باطل کے فنا کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے۔

⁂

# ضمیمہ

## سیاحت افغانستان کے مختصر حالات

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم نے واپسی پر اپنے سفر کے حالات رسالہ معارف میں شائع کئے تھے۔ ان میں ضمناً اقبال مرحوم کا تذکرہ بھی کئی جگہ آیا ہے ناظرین کی آگاہی کے لئے اس کا اقتباس ذیل میں درج کرتا ہوں:-

۱- ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال مرحوم اپنے رفقا کی معیت میں پشاور سے روانہ ہوئے۔ رات کو آٹھ بجے جلال آباد پہونچے۔ دوسرے دن صبح ۸ بجے یہاں سے روانہ ہو کر رات کو آٹھ بجے کابل پہونچے اور شاہی مہمان خانہ میں مقیم ہوئے دوسرے دن رات کے وقت سید صاحب کابل پہونچے۔

۲- نو بجے شب کو سردار ہاشم خاں صدر اعظم کے یہاں تمام مہمانوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے فلسفہ اور سیاست کے بہت سے نکات بیان فرمائے۔

۳- دوسرے دن جمعہ کا روز تھا۔ اقبال نے اپنے رفقا کے ساتھ جامع مسجد میں نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے سید صاحب سے کہا کہ "آج میں سمجھا کہ دارالحرب میں جمعہ کی نماز کیوں نہیں ہے۔

۴۔ واپسی پر مہمان خانہ میں کھانا کھایا اور ۴ بجے اقبال اور سید صاحب حضرت نور المشائخ (ملّائے شور بازار) سے ملنے گئے۔

۵۔ ان سے رخصت ہو کر ڈاکٹر صاحب، اللہ نواز خاں وزیر امور نافعہ کے یہاں چائے کی دعوت میں شریک ہوئے۔ چائے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر تقریر کی۔

۶۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب شاہ محمود خاں وزیر جنگ کے ساتھ چائے کی دعوت میں شریک ہوئے۔

۷۔ رات کے وقت انجمن ادبی کابل کی اعزازی دعوت میں شرکت کی۔ پہلے انجمن کے ایک رکن نے سپاسنامہ پڑھا، اس کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر عبداللہ خاں صاحب نے "خیر مقدم" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

عزیزان ہندوستاں آمدند ۔۔۔ در افغانستان میہمان آمدند

در آناں یکے دکتر اقبال ہند ۔۔۔ سخن پرور و واقف از حال ہند

ادیب سخن گستر و نکتہ سنج ۔۔۔ کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج

کلامش چو اوج بلندی گرفت ۔۔۔ سخن زیں ارجمندی گرفت

زند طعنہ آہنگ او برق را ۔۔۔ کہ خواہاں بود نہضت شرق را

سخن را بیامیخت بھول با علوم ۔۔۔ ازو زندہ شد طرز مولائے روم

چو فکرش پے فیلسوفی گرفت

طراز سخن طرز صوفی گرفت

اس نظم کے بعد سید راس مسعود نے جوابی تقریر کی۔ ان کے بعد سید صاحب نے اظہارِ خیالات کیا۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور اپنے فلسفیانہ رنگ میں حسبِ ذیل تقریر کی جو بہت مؤثر ثابت ہوئی۔

"اگرچہ سید راس مسعود اور سید سلیمان صاحب ندوی کی تقریروں کے بعد اب

کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے جسے میں بیان کروں لیکن انجمن ادبی کابل کے ارکان مجھ سے بھی توقع رکھتے ہوں گے کہ خیر مقدم کے جواب میں، میں بھی کچھ عرض کروں میں انجمن کا بہت ممنون ہوں اس نے میرے متعلق نظم و نثر میں بہت اچھے خیالات اور پُر احساس جذبات ظاہر کئے ہیں۔

میں بھی خواہش رکھتا ہوں کہ انجمن کے نوجوان ارکان کے عملی پہلو سے بحث کروں۔ میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمتگار ہے۔ اسی بنا پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح۔ شاعر، قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے۔ اور برباد بھی۔ اس وقت جبکہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ، ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعرا پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں۔ کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے، اُس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے اور جو حُسن، قوت سے خالی ہو وہ محض پیام موت ہے:-

دلبری بے قاہری جادو گری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطہ کی طرف مبذول کروں۔ حیاتِ نبوی صلعم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کے حضور میں عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے کچھ اشعار پڑھے گئے۔ ارشاد ہوا

اشعر الشعراء و قائدهم الی النار

یعنی تمام شاعروں میں بہترین شاعر اور ان کو دوزخ کی طرف لے جانے والا۔
اس ارشاد سراسر ارشاد سے واضح ہے کہ شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر بُرا

اثر مرتب کرتا ہے۔ کسی قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل وصورت نہیں ہے بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ "تخیل" ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قومیں شعرا کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہلِ سیاست کی پامردی سے نشوونما پاکر مر جاتی ہیں۔ پس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعرا اور انشاپرداز اپنے ہمعصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔ جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے۔ اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔ پس اس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے افکار کو ادبیات کے ذریعہ سے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی خودی کو پاکر اور قابلیت بہم پہونچا کر پکار اُٹھیں:۔

| | |
|---|---|
| دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا | فساں کشیدہ بروے زمانہ آخت مرا |
| من آں جہانِ خیالم کہ فطرتِ ازلی | جہانِ بلبل و گل را شکست و ساخت مرا |
| نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم | تواں ز گرمیٔ آوازِ من شناخت مرا |

میں ایک نکتہ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ مسولینی نے ایک اچھا نظریہ ظاہر کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیئے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لئے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلوسیکسن اقوام کے قرضہ سے نجات دلاسکے یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کر جو نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتہ لگاسکے۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدتِ ملی کی زندگی سے آشنا کر سکے اور مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مرد مل گیا ہے جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شخصیت کو اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا میں ایک نئی قوم بناکر دنیا سے متعارف کریں۔ اس ملک کے نوجوانوں کو چاہیئے کہ اس بزرگ رہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا

معلّم سمجھیں کیونکہ ان کی زندگی ایثار، اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے۔"

۸۔ ۳۰ر اکتوبر کو ڈاکٹر صاحب غزنی پہونچے چونکہ انہیں حکیم سنائی کے مزار پر حاضر ہونے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا اس لئے ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ پیادہ حکیم موصوف کے مزار کی طرف روانہ ہوئے۔

حکیم سنائی کا مزار ایک چھوٹے سے احاطے کے اندر ہے۔ ان کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں ہے ہم سب اس منظر سے متاثر تھے۔ مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر صاحب پر تھا۔ وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بیقرار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔

اس کے بعد سلطان محمود غزنوی کے مزار پر پہونچے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کو لاہور کی مناسبت سے حضرت داتا گنج بخش غزنوی ثم لاہوری رح کے والدِ ماجد کے مزار کی تلاش ہوئی۔ ہمارے رفقاء میں سے ایک صاحب نے جن کا نام مُلّا قربان تھا، کہا کہ میں اس مزار سے واقف ہوں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب ان کے ساتھ اس مزار پر گئے۔

۹۔ غزنی سے روانہ ہو کر ہم لوگ قندہار پہونچے۔ چونکہ خرقۂ مبارک کی زیارت گاہ اور احمد شاہ درّانی کا مقبرہ جہان خانہ سے قریب تھا اس لئے ہم لوگ پیدل روانہ ہوئے اور اس عمارت میں پہونچے جہاں آنحضرت صلعم کا ملبوسِ مبارک رکھا ہوا ہے۔ یہ تبرک احمد شاہ ابدالی کو شاید بخارا سے ہاتھ آیا تھا۔ زیارت کے بعد ہم لوگ احمد شاہ ابدالی کے مزار پر گئے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے بڑا کوئی ہیرو نہیں ہے۔ شاہ موصوف کی قبر کے سرہانے بلندی پر وہ قرآن مجید رکھا ہوا تھا جو خاص اس کی تلاوت کا تھا۔

۱۰۔ قندہار سے روانہ ہو کر ہم لوگ کوئٹہ پہونچے۔ راستے میں ڈاکٹر صاحب نے روحانیت کے ذاتی مشاہدات اور ایک سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی اور اس

سلسلہ میں انہوں نے اپنے طالبعلمانہ عہد کا ذکر چھیڑا۔ پھر اپنے والد صاحب مرحوم کا تذکرہ کیا کہ وہ ایک صاحبِ دل صوفی تھے۔ اس ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حیّاتِ خفتہ کے تاروں کو جس مضراب نے چھیڑا وہ خود ان کے والدِ ماجد کی ذات تھی۔

اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والدِ مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بے حد اثر کیا۔ فرمایا کہ میں اپنے وطن سیالکوٹ میں نمازِ فجر کے بعد قرآنِ حکیم کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک دن نماز کے بعد حسبِ دستور تلاوت میں مشغول تھا کہ والدِ مرحوم میرے پاس آئے اور پوچھا کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کیا کرتا ہوں۔ فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ یہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح نازل ہوا ہے جس طرح آنحضرت صلعم کے قلبِ مبارک پر نازل ہوا تھا تلاوت کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا۔ جب بی۔ اے پاس کر لو گے تو بتا دونگا۔ جب میں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی۔ مرحوم نے مجھے کچھ طریقے اور دعائیں تلقین کیں اور مجھ سے عہد لیا کہ ہمیشہ اپنے قلم اور اپنی زبان سے اسلام کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان کے والدِ مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی۔ ایک عالم ان کے نغموں سے سرشار ہو رہا تھا۔ اور ان کی شاعری مسلمانوں میں قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہی تھی۔ بالآخر باپ اپنے بیٹے کی اس علیلی نفسی سے مسرور ہو کر دنیا سے سدھارا[۱]

(اقتباس ختم ہوا)

---

[۱] راقم الحروف کو ۱۹۲۸ء میں حضرت مولنا میر حسن سیالکوٹی مرحوم کی معیت میں

بقیہ حاشیہ ص ۱۵۸

ڈاکٹر صاحب کے والد مرحوم سے ملاقات کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز تھی مگر جسمانی صحت قابلِ رشک تھی اور رخسار تو ایسے سرخ تھے کہ نوجوانوں کو شرماتے تھے۔ میں نے زبورِ عجم سے ایک غزل پڑھ کر سنائی اور ڈاکٹر صاحب سے اپنی عقیدت کا ذکر کیا۔ سنکر بہت خوش ہوئے اور مجھے دعائیں دیں۔ غالباً ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حصّہ دوم

# مثنوی

# "پس چہ باید کرد"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مقدمہ

یہ کتاب علامہ اقبالؒ کی وفات سے دو سال پہلے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن میں مثنوی "مسافر" بھی اس کے ساتھ شامل کردی گئی۔

اس کتاب کا مرکزی تصور جیسا کہ "بخوانندہ کتاب" کے پہلے مصرع

مصرع: سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق

سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغامِ عشق ہے، کیونکہ اقبالؒ کی رائے میں مسلمانوں کی سربلندی اسی مسلک پر گامزن ہونے میں منحصر ہے۔ انہیں اس بات پر کامل یقین تھا کہ صدرِ اسلام میں مسلمانوں کو جو غیر معمولی بلکہ محیر العقول کامیابی حاصل ہوئی اس کا باعث محض عشقِ رسول تھا، لہٰذا اس مثنوی کی وساطت سے انہوں نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے اپنی ساری عمر کے غور و فکر کا نچوڑ یا خلاصہ پیش کردیا ہے۔ الٰہ آباد کے مشہور خطبۂ صدارت کی تمہید میں انہوں نے خود اس بات کی صراحت کی ہے کہ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسلام کے حقائق و معارف پر غور و فکر میں بسر کیا ہے اور اس کتاب میں انہوں نے اپنی غور و فکر کے

نتائج نہایت جامعیت اور بلاغت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

اسی نکتہ کو مدِّ نظر رکھ کر محترمی سید نواب علی صاحب ایم۔ اے، سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) نے اس مثنوی پر تبصرہ کے ضمن میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ مثنوی اقبالؔ کی تمام تصانیف میں وہی مرتبہ رکھتی ہے جو دل کو جسمِ انسانی میں حاصل ہے، اور میں سیّد صاحب کے اس خیال سے بکلّی متفق ہوں۔

اقبالؔ کی نظر میں دینِ اسلام، مذہب اور سیاست دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسلام کی یہی خصوصیت اسے تمام مذاہبِ عالم سے متمیّز اور ممتاز کرتی ہے کہ اس میں دین اور سیاست کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے روح اور مادّہ دو جداگانہ حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ بقول اقبالؔ

"مادّہ بھی روح ہی ہے جو بتقیدِ زمان و مکان اپنی ذات کا تحقیق کر رہا ہے۔"

الحق۔ چونکہ انسان ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے اس کی روحانی زندگی اس کی مادّی زندگی سے جدا نہیں ہو سکتی لہٰذا دین اور دنیا یا مذہب یا سیاست میں کسی تفریق کا تصوّر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے یوں واضح کیا ہے کہ اسلام بیک وقت ایک اخلاقی نصب العین (مذہب) بھی ہے اور ایک مخصوص قسم کا عمرانی نظام بھی ہے۔"

چونکہ اس مثنوی میں اقبالؔ نے دین اور سیاست کے اسرار واضح کیے ہیں جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔ ؎

معنیٔ دین و سیاست باز گوئے
اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوئے

اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی اقبالؔ کے تمام دینی افکار کا خلاصہ یا نچوڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی کی نوعیت، دوسری تصانیف

سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس میں نہ غزلیں ہیں نہ نظمیں، نہ کسی شعر پہ تضمین ہے نہ کسی فلسفی پر تنقید ہے۔ نہ مناظرِ فطرت کا بیان ہے نہ کسی فرد کی داستان ہے بلکہ دین اور سیاست کے وہ اسرار و رموز واضح کئے گئے ہیں جن سے آگاہ ہو کر قومیں دنیا میں سربلندی بھی حاصل کر سکتی ہیں اور منشائے ایزدی کی تکمیل بھی کر سکتی ہیں۔ غالباً اس کی وضاحت چنداں ضروری نہیں کہ یہ حقائق تمام تر قرآنِ حکیم سے ماخوذ اور مقتبس ہیں۔

مضامین مثنوی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(ا) پہلے حصے میں تین عنوانات ہیں:-

پہلے عنوان کے ذیل میں انہوں نے اس مثنوی کے پڑھنے والوں سے خطاب کیا ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کو عشق کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے ایک تمہید باندھی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیرِ رومیؒ انہیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ:-

معنیٔ دین و سیاست باز گوئے

اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوئے

آخر میں انہوں نے مہرِ عالمتاب سے خطاب کیا ہے۔

(ب) دوسرے حصے میں چھ عنوانات ہیں جن کے تحت انہوں نے دین کی تفسیر کی ہے۔

(ج) تیسرے حصہ میں چار عنوانات ہیں۔ ان کے ذیل میں انہوں نے سیاستِ حاضرہ کی تشریح کی ہے۔ اور اقوامِ مشرق کو صحیح طریق کار سے آگاہ کیا ہے۔

خطاب بہ مہرِ عالمتاب میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ میں "فکرِ شرق"

کو فرنگ کے تسلط سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ گویا اس مثنوی کا مقصد یہ ہے کہ اقوام مشرق فرنگیوں کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور چونکہ سیاسی آزادی کا حصول ذہنی غلامی سے آزادی پر موقوف ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :۔

ع پس نخستیں بایدش تطہیر فکر

اس لئے وہ سب سے پہلے فکرِ مشرق کو آزاد کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

فکرِ مشرق آزاد گردد از فرنگ
از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اس لئے اس حصّہ کے آخر میں انہوں نے خود یہ سوال کیا ہے

ع پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

چونکہ یہ مثنوی اسی سوال کا جواب ہے اس لئے انہوں نے مثنوی کا نام ہی "پس چہ باید کرد" رکھ دیا۔ گویا اس مثنوی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انہوں نے اقوامِ مشرق کو اس طریقِ کار سے آگاہ کیا ہے جس کی بدولت وہ فرنگ کے تسلط سے رہائی حاصل کر سکتی ہیں۔

(ح) یہ کتاب عنوان ۱۲ سے شروع ہو کر عنوان ۱۳ پر ختم ہو جاتی ہے۔ آخری حصّہ میں انہوں نے حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے۔ خلوص، محبّت، سوز و گداز اور تاثیر کے اعتبار سے یہ حصّہ اقبال کی پوری شاعری میں بے مثال ہے۔

# حرفِ آخر

اس مثنوی کی زبان نہایت آسان اور شیریں ہے۔ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کی فراوانی کے باوجود سلاست اور روانی کا رنگ از ابتدا تا انتہا قائم رہتا ہے۔ دشواری جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ نہایت عمیق افکار بہت

جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر یہ خیال رہا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعہ سے مسلمان ان کے تمام بنیادی افکار سے آگاہ ہو جائیں۔ اور میں اس کتاب کے لبِ لبابِ مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جن لوگوں کے پاس اقبالؔ کی تمام تصانیف کے مطالعہ کے لئے وقت نہیں ہے۔ وہ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ان کے تمام بنیادی افکار سے واقف ہو سکتے ہیں۔

یہ کتاب بلاشبہ اس لائق ہے کہ پاکستان کے تمام کالجوں میں بطور نصابِ تعلیم داخل کی جائے۔ کاش یہ حقیقت الضابِ تعلیم مدون کرنے والوں پر بھی منکشف ہو جائے تاکہ اقبالؔ کی یہ آرزو پوری ہو سکے:

ع فکرِ مشرق آزاد گردد از فرنگ

*

# فصل اوّل

## بخوانندۂ کتاب
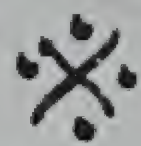
سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را
جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است

بہ آں مقام رسیدم چو در برش کردم
طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

گماں مبر کہ خرد در حساب و میزاں نیست
نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

---

پہلا شعر:-
اس شعر کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں حرم کو خرد کی بغاوت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس لئے میں مملکتِ عشق سے سپاہِ تازہ مرتب کر کے لا رہا ہوں تاکہ اس بغاوت کا قلع قمع کیا جا سکے۔

مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی عقل، عشق کی گرفت سے آزاد ہو گئی ہے اور چونکہ یہ صورتِ حال قوم کے حق میں انتہائی خطرناک ہے اس لئے میں انہیں از سرِ نو، عشق کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔

واضح ہو کہ اقبال کی رائے میں وہ عقل جو عشق کی مطیع نہ ہو انسان کو انجام کار تشکیک اور الحاد میں مبتلا کر دیتی ہے اور جب خدا کی ہستی کا یقین اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے تو اوہام باطلہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:- ؎

نقشے کہ بستہ ام ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

شعر کی وضاحت سے پہلے اس شبہ کا ازالہ ضروری ہے کہ کیا اقبال عقل کو بیکار اور مہمل سمجھتے ہیں؟

واضح ہو کہ وہ عقل کو بیکار یا مہمل نہیں سمجھتے۔ لیکن وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ مجرد عقل نہ انسان کو خدا تک پہونچا سکتی ہے اور نہ زندگی کی پیچیدہ راہوں میں اس کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

---

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

---

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل یہ بتا سکتی ہے کہ اس کائنات کا خالق کوئی نہ کوئی ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ یہ کائنات حادث ہے اور ہر حادث اپنے وجود کے لئے قدیم کا محتاج ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ قدیم (واجب الوجود) کون ہے؟

چونکہ وہ مادیات سے آگے نہیں بڑھ سکتی اس لئے لامحالہ مادہ ہی کو خالقِ کائنات تسلیم کر لیتی ہے یعنی مجرد عقل کی پیروی انسان کو مادہ پرست بنا دیتی ہے اور یہ مادہ پرستی اسے حیوانات کی صف میں شامل کر دیتی ہے۔

؎ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فلسفی کانٹ بھی اسی نتیجہ پر پہونچا۔ چنانچہ وہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقید عقلِ خالص" میں لکھتا ہے کہ عقلِ خالص اثباتِ واجب الوجود سے قاصر ہے۔

عقل بوہلۂ اول، انسان کو مادیت کی جانب مائل کر دیتی ہے۔ مگر اس مسلک سے بھی اسے تسلی نہیں ہوتی کیونکہ وہ خود ہی یہ سوال قائم کرتی ہے کہ مادہ کیا ہے؟ اور جب وہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ماہیت بھی میری دسترس سے باہر ہے۔ اس لئے وہ تشکیک کے دامن میں پناہ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن حکما نے محض اپنی عقل کی مدد سے حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "لاادری" یعنی میں نہیں جانتا۔ اسی کو مسلکِ لاادریت یا تشکیک کہتے ہیں۔ اور ہیوم اس مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

خدا تو بہرحال عقل کی دسترس سے بالاتر ہے۔ کیونکہ وہ بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ "وراء الوراء ثم وراء الوراء" ہے۔ وہ بیچاری تو مادہ کی

حقیقت دریافت کرنے سے بھی قاصر ہے جو محسوس بھی ہے اور مشہود بھی ہے! اسی لئے عارف شیرازؒ نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے :-

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی مرحوم نے یوں بیان کیا ہے :-

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی بیاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

فی الجملہ عقل انسانی، زندگی کی پُر پیچ راہوں میں ہماری رہنمائی نہیں کر سکتی کیونکہ جب انسان بذریعۂ عقل زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے تو اکثر و بیشتر موقعوں پر اس کی عقل، جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط فیصلے صادر کرتا ہے۔ بظاہر عقل حکمران معلوم ہوتی ہے لیکن اگر انسان غور سے دیکھے تو معلوم ہو گا کہ وہ اپنی زندگی جذبات کے تحت بسر کرتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ عقل کچھ کہتی ہے مگر جذبات، عقل پر غالب آجاتے ہیں اور ان سے مغلوب ہو کر عقل، جذبات کی تائید کرنے لگتی ہے بلکہ ان کے فیصلوں کی صحت اور صداقت پر دلائل مرتب کر دیتی ہے۔ انسان اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں نے یہ فیصلہ عقل کی روشنی میں کیا ہے۔ حالانکہ دراصل وہ فیصلہ جذبات کی شدت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مثلاً ہم جانتے ہیں کہ فلاں قوم حق پر ہے۔ مگر جذبۂ وطنیت ہماری عقل پر غالب آجاتا ہے اور وہ حق سے منحرف ہو کر جذبۂ مذکورہ کی صحت پر دلائل قائم کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم باطل کو حق سمجھ لیتے ہیں۔ اور جادۂ راستی سے منحرف ہو کر باطل کے پیرو بن جاتے ہیں۔ موجودہ سیاست اسی باطل پرستی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اس لئے اقبالؒ کی تعلیم یہ ہے کہ عقل کو اس کی حدود سے متجاوز نہ ہونے دو۔

اس سے کام تو بیشک لو مگر اسے رہنما مت بناؤ، بلکہ اسے عشق (وحی الٰہی) کے تحت رکھو۔ زندگی کی اساس عقل نہیں بلکہ عشق ہے۔ یورپ کی موجودہ تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس نے عقل کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپین اقوام کا زاویۂ نگاہ ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ہو گیا۔ اور اس زاویۂ نگاہ نے انسان کو حیوان سے بھی بدتر بنا دیا۔

چونکہ مسلمان اپنے دین کی حقیقت سے بیگانہ ہو چکے ہیں اور یورپ کی مادّی ترقی نے ان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے اس لئے وہ اہلِ یورپ کی تقلید پر کمربستہ ہو گئے ہیں چونکہ اہلِ یورپ کی زندگی سراسر مادّہ پرستانہ ہے۔ اس لئے ان کی تقلید کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان بھی اسی لعنت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لہٰذا اقبالؔ ان کو عشق کا درس دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ مسلمان رہ کر دنیا میں ترقی کر سکیں۔

واضح ہو کہ قرآن نے انسان کی زندگی کی بنیاد عشق پر رکھی ہے جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

اور جو لوگ مومن ہیں اُن کی شناخت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ کی محبت سب محبتوں پر غالب ہوتی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ غیر محسوس ہے اس لئے اس نے انسان کو آگاہ فرمایا کہ مجھ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے:-

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اے رسول! مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ میری اتباع (پیروی) کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔

چونکہ اتباع، بدونِ محبت محال ہے اس لئے مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد

محبتِ رسول قرار پائی۔ اسی لئے اقبالؔ نے یہ کہا:۔

طبع مسلم از محبت قاہر است

مسلم از عاشق نباشد کافر است

یعنی جو مسلمان، عاشقِ رسول نہیں وہ مسلمان نہیں، کافر ہے۔ اسی لئے خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں متنبہ فرما دیا ہے۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدَیْهِ وَمِنْ وَّلَدِهٖ وَمِنَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ٥ (متفق علیہ)

اے مسلمانو! تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کی نگاہوں میں اس کے والدین، اس کی اولاد اور سب انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اس آیت اور اس حدیث کی روشنی میں ہر مسلمان اس حقیقت کو واضح طور پر دیکھ سکتا ہے کہ اسلام نام ہے عشقِ رسول کا۔ اسی لئے اقبالؔ نے ہمیں اپنی ہر تصنیف میں عشقِ رسول کا درس دیا ہے۔

اب پڑھیئے اس شعر کو:۔

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق

کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

خرد بہت اچھی چیز ہے۔ اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے مگر ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے عشق کے تحت رکھیں۔ یعنی عقل کی اتباع کے بجائے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں۔ اگر ہماری عقل اتباعِ رسول سے منحرف ہونے کا مشورہ دے تو اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیں۔ کیوں۔؟ اس لئے کہ مسلمان عقل کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ سرکارِ دو عالم کا غلام ہے۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

فی الجملہ یہ شعر وہ کنجی ہے جس کی مدد سے ناظرین اس مثنوی کے تمام حقائق و معارف کے دروازوں کو کھول سکتے ہیں۔ بالفاظِ دگر، یہ مثنوی اسی شعر کی تفسیر ہے اور سچ پوچھو تو اقبالؔ نے اپنی تمام تصانیف میں اسی صداقت عظمیٰ کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ دنیا والے عشق کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عشق اور عقل میں تضاد ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یعنی عشق وہ قبا ہے جو عقل کی قامت پر بالکل موزوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق اور عقل میں مطابقت ہے اس لئے ایک شخص عقل و خرد کے ساتھ ساتھ عاشق بھی ہو سکتا ہے۔ عشق کا مطالبہ انسان سے یہ نہیں ہے کہ عقل کو خیرباد کہہ دے۔ بلکہ یہ دونوں خوبیاں ایک شخص میں بیک وقت جمع ہو سکتی ہیں۔ بایں طور کہ عشق، انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اپنی عقل کو میری تابع فرمان بنا دو، تاکہ وہ تمہیں غلط راستوں پر نہ لے جائے۔

ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کی جاتی ہے:۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں کسی جگہ یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ عاشق (مسلمان) کو لازم ہے کہ اپنی عقل سے دستبردار ہو جائے۔ بخلاف ایں، قرآن اور حدیث دونوں نے عقل کی قدر و قیمت اور فضیلت و اہمیت کو واضح کیا ہے۔

تعقل، تفکر، تدبّر اور تفقہ یہ سب عقل کی فعلیت ACTIVITY کی مختلف صورتیں ہیں اور قرآن حکیم نے ان سب سے کام لینے کی ہدایت کی ہے مثلاً (ا) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (۱۶ - ۶۷)

بیشک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

(ب) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۱۶ - ۶۹)

بیشک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

(ج) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ
(۳۸ - ۲۹)

یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے اور جو بڑی برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبّر کریں۔

(د) قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ٥ (۶ - ۹۸)

ہم نے بلاشبہ آیات کھول کر بیان کردی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

ان آیتوں سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی آیات میں تعقل، تفکر، تدبّر اور تفقہہ کا حکم دیا ہے۔ اگر عقل اور عشق میں تضاد ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی ایسا حکم نہ دیتا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ قرآن حکیم مومن کی ذات میں عشق اور عقل دونوں کو جمع کرتا ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ٥ (۳ - ۱۹۱)

(صاحبانِ عقل و فہم وہ لوگ ہیں) جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (یعنی ہر حالت میں) اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو صدقِ دل سے پکار اٹھتے ہیں کہ (اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو عبث پیدا نہیں کیا ۱۲۔

واضح ہو کہ "ذکر" محبت کا اور "فکر" عقل کی نمائندہ اور مظہر ہے اور قرآن نے ذکر و فکر دونوں کو بیک وقت مومنین کی ذات میں جمع کر دیا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تَفَكَّرُوْا فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ

اے مسلمانو! غور و فکر کرو اللہ کی نشانیوں میں مگر اللہ کی ذات میں غور

فکر مت کرو۔ یعنی کائنات کی بناوٹ اور اشیائے کائنات کے خواص اور ان کی ترکیب میں حتی المقدور غور وفکر کرو کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارے اندر یقینی طور پر یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس کائنات کو کسی قدیر، علیم اور حکیم ہستی نے بنایا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تم اشیائے کائنات کے خواص سے آگاہ ہو کر ان سے تمتع کر سکو گے۔ اور اس طرح دنیا میں سائنس (حکمت) کی شمع روشن ہوگی اور تم رفتہ رفتہ عناصرِ کائنات پر حکمراں ہو جاؤ گے۔

مگر اللہ کی ذات میں غور و فکر مت کرنا کیونکہ ذاتِ ایزدی، عقلِ انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے جو ناقص بھی ہے اور محدود بھی۔ اگر ایسا کرو گے تو تشکیک یا انکار میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

دوسرا نقصان یہ ہوگا کہ بے سود اور لاطائل منطقی موشگافیوں میں منہمک ہو کر عمل (جہاد فی سبیل اللہ) سے بیگانہ ہو جاؤ گے اور جو قوم عمل یعنی جد وجہد ترک کر دیتی ہے وہ دوسروں کی غلام ہو جاتی ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ

(ا) عقل بہت مفید اور کار آمد شی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

(ب) مگر اس کی ایک حد ہے جس سے آگے جانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یعنی وہ مادیات میں تو چل سکتی ہے مگر ورا المادیات نہیں جا سکتی۔ وہ اس حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے کہ کائنات اور اشیائے کائنات کی بناوٹ میں فکر کر کے یہ فیصلہ صادر کر دے کہ

نظامِ عالم بتا رہا ہے کہ ہے اک اس کا بنانے والا (اکبر الہ آبادی)

یعنی کائنات کی ساخت بتا رہی ہے کہ کوئی قدیر، علیم اور حکیم ہستی موجود ہے جس نے اسے بنایا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کائنات کا کوئی "خالق ہونا چاہیئے۔ لیکن وہ حتمی اور اذعانی طور پر یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ خالق فی الحقیقت موجود ہے۔ اور ارباب علم جانتے ہیں کہ "ہونا چاہیئے" اور "فی الحقیقت موجود ہے"

ہیں بہت فرق ہے۔
عقل یہ کہہ کر "کوئی خالق ہونا چاہیئے" خاموش ہو جاتی ہے۔

ع جلوۂ ارض وسما دکھلا کے ہے نیچر بھی چپ (اکبر الہ آبادی)

گویا عقل کا وظیفہ FUNCTION ختم ہو گیا اب عشق کی باری آتی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات فی الحقیقت موجود ہے۔ تمہیں اس کا مشاہدہ کرا سکتا ہوں۔

جب بوعلی سینا (فلسفی) سلطان ابو سعید ابوالخیرؒ سے مل کر رخصت ہوا تو اس کے جانے کے بعد حضرتؒ نے حاضرین مجلس سے ارشاد فرمایا۔

"آنچہ آدمی داند ماحی بینیم"
عقل کا وظیفہ ہے دانستن
عشق کا کرشمہ ہے دیدن

اب ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ اگر اشیائے کائنات میں غور و فکر کیا جائے تو ہر سلیم الطبع انسان اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ
(ا) یہ کائنات قدیم نہیں ہے بلکہ حادث ہے۔
(ب) چونکہ حادث ہے اس لئے کوئی قدیم ہستی ضرور موجود ہے۔
(ج) اور یہ ہستی قدیر و علیم و حکیم ہے۔

مثلاً علم نباتات کی فزیالوجی میں تمام سبز پودوں کے لئے PHTOSYNHESIS یا CARBON ASSIMILATION ایک حیاتی وظیفہ VITALFUNCTION ہے۔ اگر یہ فعل نہ ہو تو سبز پودے زندہ نہیں رہ سکتے۔ کسی سبز پودے کی ساخت یہ ہے کہ وہ بیشمار خلیات CELLS سے مرکب ہوتا ہے اور ہر خلیت میں مرکز NECLEUS کے قریب کلوروفل کے بے شمار دانے سبز ہوتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کی طاقتور خوردبین ہی کی مدد سے نظر آسکتے ہیں انہی سبز دانوں کی وجہ سے پودوں میں سبز رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اگر کلوروفل نہ ہو تو

سبز پتہ کاربن جذب نہیں کر سکتا۔

جب لیبارٹری میں کلوروفل کا کیمیاوی تجربہ کیا گیا تو اس میں لوہے مینگانیز کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کے اس قدر پیچیدہ مرکبات دریافت ہوئے کہ مدتوں کے مسلسل تجربوں کے بعد ان کی ترکیب سمجھ میں آئی۔

تجربات سے معلوم ہوا کہ سبز پودوں میں PHOTOSYNTHESIS یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے انجذاب کا عمل، کلوروفل کے بغیر ناممکن ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس عمل کے لئے روشنی بھی لازمی ہے، اسی لئے اس کو PHOTO - SYNTHESIS - کا نام دیا گیا۔ رات کے وقت یہ عمل نہیں ہوتا۔ اس وقت اس عمل کے بجائے RESPIRATION ہوتا ہے۔ یعنی پودے پتوں کے ذریعہ سے سانس لیتے ہیں اور اس صورت میں پودوں کے سبز خلیات حیوانات کی طرح آکسیجن جذب کر کے کاربن خارج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت گھنے درختوں کے نیچے سونا صحت کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ کاربن انسان کو بیہوش کر سکتا ہے۔

تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اگر PHOTO SYNTHESIS کا عمل نہ ہو اور سبز پودوں کو مستقل طور سے تاریکی میں رکھ دیا جائے تو ان کا سبز رنگ زردی میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ اس تبدیلی کو ETOLATION کہتے ہیں۔ اس کے بعد سبز پودے میں نشاستہ بنتا ہے نہ شکر۔ اس لئے رفتہ رفتہ پودا کمزور ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

مدتوں سے سائنسدانوں کو یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ پودے کے اس چھوٹے سے خلیہ میں جو بذات خود ایک عالم ہے، کونسے کیمیاوی تغیرات

---

لہ خلیہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آسکتا۔ لیکن اس کی ترکیب یہ ہے کہ اس کے وسط میں NUCLEUS ہوتا ہے اس کے گرداگرد سبز دانہ ہوتا ہے۔ اس میں کلوروفل کے دانے منتشر ہوتے ہیں اور اس کے گرداگرد سبز رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے گرداگرد خلیہ کی دیواریں ہوتی ہیں۔ ۱۲

رونما ہوتے ہیں۔ جو کاربن ڈائی آکسائڈ جیسی سادہ شی کو ایک طرف تو شکر اور نشاستہ میں تبدیل کر دیتے ہیں، دوسری طرف کلوروفل کے دانوں میں؟ ہزاروں کوششوں کے باوجود یہ راز اب تک کسی سائنسداں کو معلوم نہ ہو سکا۔ کیونکہ جب کبھی انہوں نے کاربن ڈائی آکسائڈ سے شکر اور نشاستہ بنایا تو سب سے پہلے انہیں کاربن اور پانی کے مرکب کو FORMALDEHYDE میں تبدیل کرنا پڑتا ہے، اور یہ ایسا کیمیاوی مرکب ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ مرکب پودوں میں پیدا ہوتا ہے تو عقل اس مفروضہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی کیونکہ یہ مرکب، پودوں کے حق میں سم قاتل ہے۔ اگر یہ مرکب کسی پودے پر ڈال دیا جائے تو اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔

آج تک یہ راز کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ فارم ایلڈی ہائڈ کی منزل سے گزرے بغیر خلیات میں کاربن ڈائی آکسائڈ، شکر اور نشاستہ میں کیسے اور کیونکر تبدیل ہو جاتا ہے؟ کوئی سائنسدان آج تک کاربن ڈائی آکسائڈ کو فارم ایلڈی ہائڈ میں تبدیل کئے بغیر نشاستہ میں تبدیل نہیں کر سکا۔ تو عقدۂ لاینحل یہ ہے کہ خلیات میں کونسی لیبارٹری ایسی موجود ہے جس میں ڈائی آکسائڈ براہِ راست شکر اور نشاستہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس طریقِ عمل میں کبھی کوئی غلطی کیوں نہیں ہوتی؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ تجربہ گاہوں میں مرکبات کی تیاری کے لئے مناسب حال حرارت اور اعتدالِ عناصر اشد ضروری ہے۔ چنانچہ ماہرین فن ان دونوں باتوں کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ اگر حرارت میں کمی یا بیشی ہو جائے یا عناصر میں اعتدال نہ ہو تو مرکب تیار نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ مرکب کی تیاری کے لئے ایک ذی عقل ہستی (MIND) لازمی ہے۔ جو

(۱) ہر مرکب کے لئے مناسب حال حرارت متعین کرے اور اسے برقرار رکھے۔

(ب) ہر مرکب کے عناصر میں اعتدال پیدا کرے یعنی ان کے اوزان کا تعین کرے۔

(ج) مناسب حال وقفہ یا مدت (DURATION OF REACTION) کو بھی ملحوظِ خاطر رکھے۔ یعنی کسی مرکب کو کتنی دیر تک حرارت پہونچائی جائے۔

سوال یہ ہے کہ خلیات کی لیبارٹری میں کون عقلمند، مدبّر، حکیم اور ماہر فن ان باتوں کی نگرانی کرتا ہے؟

اس مثال سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

پہلی بات یہ کہ یہ کائنات قدیم نہیں حادث ہے۔ کیونکہ یہاں ہر شی میں ہر لحظہ تغیر رونما ہو رہا ہے۔ اور ہر متغیر شے حادث ہوتی ہے۔

دوسری یہ کہ کوئی قدیر، علیم اور مدبّر ہستی اس کائنات کی خالق ہے۔ مادہ میں نہ شعور ہے نہ ادراک بلکہ جدید سائنس کی رو سے وہ خود حادث ہے۔

تیسری یہ کہ عقل کائنات کے معمّے کو حل نہیں کر سکتی۔ یعنی وہ ناقص ہے اور اس لئے زندگی کے معاملات میں انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتی۔ ذیل میں ہم تیسری بات کی وضاحت کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر تک سائنسدانوں کا یہ خیال تھا کہ مادہ قدیم ہے اور زندگی یا شعور اسی مادہ سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن اب تمام بڑے بڑے سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی، مادہ کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ جداگانہ مستقل وجود رکھتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر J. S. NELDONE نے اپنی تالیف "علم الحیات کی فلسفیانہ بنیاد" میں اس حقیقت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اوسپلکی نے اپنی کتاب TERTIUM ORGANUM میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ سائنس، زندگی کی ماہیت سمجھانے سے قاصر ہے۔ یہ معمّہ ہے جو عقل کی مدد سے حل نہیں ہو سکتا۔ مادہ پرستوں کا یہ دعویٰ بالکل

غلط ہے کہ زندگی، مادّہ سے پیدا ہوئی ہے۔

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
(فانی بدایونی)

سمپس اپنی تصنیف "مفہوم ارتقا" میں لکھتا ہے کہ ہمیں اس بات کا مطلق علم نہیں ہے کہ زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب سائنس (عقل) کی دسترس سے بالاتر ہے۔

ہیکل اپنی تالیف "معمائے کائنات" میں اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ نیچر کی حقیقت، عقل کی مدد سے دریافت نہیں ہوسکتی۔

اسی حقیقت کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:-

کیا ہے جس نے اس عالم کو پیدا اسکو کیا کہیئے
خرد خاموش ہے پر دل یہ کہتا ہے خدا کہیئے

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہے کہ عقل ایک حدتک ہماری رہنمائی کرسکتی ہے یعنی یہ تو بتا سکتی ہے کہ اس کائنات کو کسی نے پیدا کیا ہے۔ مگر وہ ہے کون یہ بتانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ:-

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

یعنی اپنی عقل کو دل (عشق) کا خادم بناؤ۔ اسی نکتہ کو مرشد رومیؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

یعنی اگر عقل (علم)، کو دل کا خادم بناؤ گے تو وہ تمہاری دوست بنجائیگی ورنہ تمہیں گمراہ کردے گی۔ لہٰذا عقل اور عشق (خرد اور جنون) میں کوئی تضاد نہیں ہے (جیسا کہ کوتاہ بیں سائنسداں سمجھتے ہیں) بلکہ

؏ جنوں بفاست کہ موزوں بقامتِ خرد است

یعنی انسان خرد اور جنوں دونوں کو بیک وقت اپنی ذات میں جمع کرسکتا ہے عقل کی مدد سے قوانینِ فطرت کا مطالعہ کرو۔ لیکن خالقِ فطرت کا صحیح علم صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بتکدۂ تصورات

(بالِ جبریل)

تیسرا شعر:- یہ شعر پہلے شعر سے مربوط ہے۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے مسلکِ عشق اختیار کر لیا تو میں اس مقام پہ پہونچ گیا جہاں

؏ طوافِ بام و درِ من، سعادتِ خرد است

یعنی عشق کے احکام کی تعمیل خرد کے لئے موجبِ سعادت ہے۔ بالفاظِ دیگر عقل کی معراج یہ ہے کہ وہ عشق کی مطیع اور فرمانبردار ہو جائے۔ کیونکہ پھر وہ گمراہی سے محفوظ ہو جائیگی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان صرف اپنی عقل کی پیروی کریگا تو یقیناً تشکیک اور الحاد میں گرفتار ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہ پہونچ سکے گا۔ لیکن اگر وہ عشق کو اپنا رہنما بنائیگا۔ اور عقل کو عشق کی اطاعت کا حکم دیگا تو مقصدِ حیات حاصل کر لیگا۔

مقصدِ حیات یہ ہے کہ انسان اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرے تاکہ تسخیرِ کائنات کے بعد اس میں قانونِ حق جاری کر سکے۔ جس کا نتیجہ امنِ عامہ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور یہ بات صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں:-

اس دنیا میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دکھ سے بچے سکھ سے رہے۔ لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ جسے دیکھو دکھی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے عشق کے بجائے عقل کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ اس دعوے پر دلیل یہ ہے:-

(ا) عقل انسان کو یہ سمجھاتی ہے کہ اس دنیا کا کوئی خالق نہیں ہے، اور نہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے، اس لئے جس طرح ممکن ہو، اپنے عیش کا سامان بہم پہونچاؤ۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

(ب) جب انسان اس قانون پر عمل کرتا ہے تو دوسروں کو دکھ پہونچا کر اپنے سکھ کا سامان مہیا کرتا ہے اور چونکہ ہر شخص اپنا سکھ مدِ نظر رکھتا ہے اس لئے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص دکھی نظر آتا ہے۔

گوتم بدھ کے سامنے انسانی زندگی کا یہی پہلو تھا جو اس نے کہا "سرودم دکھم" یعنی یہ دنیا سراسر دکھ ہے۔ اس دکھ سے نجات پانے کا طریقہ اس نے یہ بتایا کہ چونکہ زندگی دکھ ہے اس لئے زندگی کا خاتمہ کر دو۔ لیکن زندگی دکھ نہیں ہے۔ انسانوں نے اپنی حماقت کی وجہ سے زندگی کو دکھی بنا دیا ہے۔ اس لئے اسلام نے یہ تعلیم دی کہ،

(ا) دکھ اس لئے رونما ہوتا ہے کہ انسان خدا کے قانون کے بجائے اپنے قانون کو نافذ کرتا ہے اور چونکہ ہر شخص ایسا کرتا ہے اس لئے تصادم لازمی ہے۔

(ب) اس دکھ سے نجات پانے کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص دنیا میں خدا کا قانون نافذ کرے

(ج) خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو دوسرے پر حکومت کا حق حاصل نہیں ہے۔ کوئی شخص دوسروں کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ سب کو اللہ کی غلامی کرنی چاہیئے۔ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور صرف اللہ کے قانون کی اطاعت کرینگے۔

(د) خدا کا قانون وہ لوگ دنیا میں نافذ کر سکتے ہیں جو اپنے اندر اس کی صفات پیدا کریں یعنی عدل و انصاف، رحمدلی، مہربانی، ہمدردی، غمگساری، جود و کرم، بذل و عطا، ظلم و ستم سے اجتناب، اللہ کے دشمنوں پر قہار لیکن

اللہ کے دوستوں پر کریم، بالفاظِ دگر وہ لوگ متقی ہوں۔

(۷)، خدائی صفات صرف عشق کی بدولت پیدا ہو سکتی ہیں۔ عشق کا خاصہ ہے کہ وہ عاشق میں معشوق کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔

(د) لہٰذا مسلکِ عشق پر گامزن ہو کر انسان، خدا کا قانون دنیا میں نافذ کر سکتا ہے۔ اور چونکہ خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو اس لئے کوئی شخص کسی دوسرے پر ظلم نہیں کر سکتا۔

(ہ) نتیجہ اس کا یہ نکلے گا کہ دنیا میں کوئی شخص دکھی نہیں رہ سکتا۔ موجودہ مصائب کا واحد سبب یہ ہے کہ دنیا عشق کے بجائے عقل کی پیروی کر رہی ہے۔

چوتھا شعر:- یہ خیال مت کرو کہ خرد کے لیے کوئی حساب اور میزان نہیں ہے۔ بندۂ مومن کی نگاہ خرد کے حق میں بمنزلہ قیامت ہے مطلب یہ ہے کہ عقل رہنمائے کامل یا حاکم علی الاطلاق ALTIMATE AUTHORITY نہیں ہے۔ بلکہ بندۂ مومن (عاشق) کی نگاہ، اس کے حسن و قبح کا معیار ہے یعنی عقل کا وہ فیصلہ صحیح ہے جسے عشق صحیح قرار دے۔ بالفاظِ دگر، قرآنِ حکیم، عقل کی صحت یا سقم کا معیار ہے۔

آجکل لوگ عقل کو حسن و قبح کا معیار سمجھتے ہیں۔ یعنی جسے عقل صحیح قرار دے وہ بات صحیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں عقل سے بالاتر یا برتر کوئی شئی نہیں ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ حقیقی اور اصلی معیار عشق ہے جس پر تمام امور کی صحت پرکھی جائیگی۔

عقل کے فیصلوں میں غلطی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے کیونکہ عقل کا دارو مدار حواس پر ہے اور حواس اکثر غلطی کرتے ہیں۔ خود سائنس کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عقل جس بات کو مدتوں تک صحیح سمجھتی رہی وہ آگے چل کر غلط ثابت ہوئی۔ مثلاً انیسویں صدی تک مادّہ کو قدیم اور ناقابلِ فنا یقین کیا جاتا تھا، مگر موجودہ صدی میں مادّہ حادث اور فنا پذیر ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن

عشق کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس کا دارومدار حواس پر نہیں ہے بلکہ وجدان پر ہے۔ اور وجدان میں غلطی نہیں ہوسکتی۔

فلسفی جو کچھ کہتا ہے وہ اپنے قیاس کی بنا پر کہتا ہے اور قیاس میں ہر وقت غلطی کا احتمال رہتا ہے بلکہ عاشق (مومن) جو کچھ کہتا ہے وہ دیدار کی بنا پر کہتا ہے اور دیدار میں غلطی نہیں ہوتی۔ دید اور شنید میں جو فرق ہے اسے ہر شخص بخوبی سمجھتا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

فلسفی بھی کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ مگر اسے اپنے قول پر یقین حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ محض قیاس کی بنا پر ایسا کہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نبی بھی یہی کہتا ہے کہ خدا موجود ہے مگر اسے اپنے قول پر حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھنے کے بعد ایسا کہتا ہے۔

حاصلِ کلام اینکہ مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی یا دوسروں کی عقل کے فیصلوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں پرکھیں۔ نگاہِ بندۂ مومن سے مراد وہ بصیرت ہے جو قرآنِ حکیم کی بدولت پیدا ہوتی ہے اور یہی نگاہ معیارِ حسن و قبح ہے۔ پیروِ عقل غلام ہے۔ اور متبع عشق، حر ہے۔ اور بات وہی صحیح ہے جسے عاشق یا مردِ حر۔ صحیح قرار دے۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

※

# تبصرہ

جس طرح یہ مثنوی اقبال کی تمام تصانیف کا خلاصہ ہے اسی طرح یہ چار شعر اس مثنوی کا خلاصہ ہیں۔ اس لئے میں ناظرین کی توجہ خصوصیت کے ساتھ ان اشعار پر مبذول کرنی چاہتا ہوں۔ ان اشعار کی روح یہ ہے کہ:
اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ اس دور مادیت میں مسلمان مغربی سائنس سے مرعوب ہو کر عقل کی پیروی کرنے لگے ہیں۔ اور اقوام مغرب کی تقلید میں عقل صرف ایک حد تک رہنمائی کر سکتی ہے، کامل رہنما نہیں ہے۔ یہ مقام صرف عشق کو حاصل ہے۔ اس لئے انہیں لازم ہے کہ عشق کو اپنا رہنما بنائیں۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

عقل بلا شبہ بہت قیمتی شی ہے اور ایک حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔ یعنی مادیت میں اس پر اعتماد کر سکتے ہیں مگر اس میں جرأتِ رندانہ نہیں ہے یہی اس کا سب سے بڑا نقص ہے۔ وہ ہمیں قوانینِ فطرت سے آگاہ کر سکتی ہے۔ مگر تسخیر کائنات اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمیں جرأتِ رندانہ درکار ہے۔ اور یہ نعمت صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال نے اپنے کلام میں عقل کی تنقیص نہیں کی ہے صرف یہ کہا ہے
کہ عقل مرشدِ کامل یا رہنمائے حقیقی نہیں ہے۔ اس میں بہت خوبیاں
ہیں۔ مگر ایک بڑا نقص یہ ہے کہ جرأت رندانہ سے محروم ہے۔

عقل ہم عشق است واز ذوق نگہ بیگانہ نیست
لیکن آں بیچارہ را ایں جرأتِ رندانہ نیست
(زبورِ عجم)

اس لئے مومن کا فرض ہے کہ عقل کے ساتھ ساتھ عشق کو بھی اپنا
رہنما بنائے اور ان دونوں کی مدد سے اپنا مقصد حیات حاصل کرے محض
عقل انسان کو گمراہ کردیتی ہے۔ مگر جب وہ عشق کے تابع ہوجاتی ہے
تو انسان حقیقی معنی میں کامیاب اور فائز المرام ہوجاتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

یعنی مجرد عقل انسان کو طاغوت کا پیرو (کافر) بنا دیتی ہے مگر
جب وہ عشق کے تابع ہوجاتی ہے تو انسان لاہوتی (مومن) بن جاتا ہے۔

دانہ ایں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است
(رومی)

جب عقل انسانی تابع عشق ہوجاتی ہے تو عیوب سے پاک ہو کر
انسان کے حق میں رحمت بن جاتی ہے لیکن اگر وہ عشق کے حکم سے آزاد
ہوجائے تو وہی عقل بنی آدم کے حق میں زحمت ہوجاتی ہے۔ [۱]
اس کی مثال درکار ہو تو صحابہ کرام کی زندگیوں کا اقوام مغرب کی زندگیوں

---

[۱] عقل اندر حکم دل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

سے مقابلہ کر لیا جائے۔ جب فاروق اعظمؓ نے دمشق فتح کیا تو نصاریٰ کے گرجے میں اس لئے نماز نہیں پڑھی کہ مبادا آئندہ مسلمان اسے مسجد قرار دیکر نصاریٰ کو ان کے معبد سے محروم نہ کردیں۔ اس کے مقابلہ میں جب کچنر (علیہ ما علیہ) نے خرطوم فتح کیا تو مہدی سوڈانی کی قبر کھدوا کر اس بندۂ مومن کی ہڈیاں سربازار نذرِ آتش کردیں۔

فاتح دونوں ہیں، مگر طرزِ عمل بالکل مختلف ہے۔ فاروقِ اعظمؓ کا طرزِ عمل لاہوتی ہے۔ کچنر کا طریق کار طاغوتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اوّل الذکر کی عقل، عشق کی غلام تھی اور آخر الذکر کی عقل، عشق کی غلامی سے آزاد تھی۔

آخری شعر میں اقبالؔ نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ

نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

یعنی قرآنِ حکیم، عقل کی صحت و سقم اور اس کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ ۱۲

⁂

# فصل دوم

## تمہید

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

منزلش برتر ز ماہ و آفتاب
خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

نورِ قرآن درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندۂ از آئینہ اش

از نئے آں نے نوازِ پاک زاد
باز شورے در نہادِ من فتاد

گفت جانہا محرمِ اسرار شد
خاور از خوابِ گراں بیدار شد

جذبہ ہائے تازہ اورا دادہ اند
بند ہائے کہنہ را بکشادہ اند

جز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ
کس نکو ننشست در نارِ فرنگ

باش مانندِ خلیل اللہ مست
ہر کہن بتخانہ را باید شکست

امتاں را زندگی جذبِ درون
کم نظر ایں جذب را گوید جنوں

هیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد — بے جنونِ ذو فنون کارے نکرد

مومن از عزم و توکل قاهر است — گر ندارد این دو جوهر کافر است

شیر را او باز مبید اندر شر — از نگاهش عالمے زیر و زبر

کوهسار از ضربتِ او ریز ریز — در گریبانش هزار آن رستخیز

ناے از میخانۂ من خوردهٔ — کهنگی را از تماشا بردهٔ

در چمن زی مثلِ بو مستور و فاش — در میانِ رنگ پاک از رنگ باش

عصرِ تو از رمزِ جان آگاه نیست — دین او جز حُبِّ غیر اللّٰه نیست

فلسفی این رمز کم فهمیده است — فکرِ او بر آب و گِل پیچیده است

دیده از قندیلِ دل روشن نکرد — پس ندید الّا کبود و سرخ و زرد

اے خوش آن مردے که دل با کس نداد
بندِ غیر اللّٰه را از پا کشاد

سرِّ شیری را نه فهمد گاو و میش — جز به شیران کم بگو اسرارِ خویش

با حریفِ سفله نتوان خورد مے — گرچه باشد پادشاهِ روم و رے

یوسفِ ما را اگر گرگے برد — به که مردے ناکسے او را خرد

اهلِ دنیا بے تخیّل بے قیاس — بوریا بافانِ اطلس ناشناس

انجمی مردے چہ خوش شعرے سرود ‌ ‌ ‌ سوزد از تاثیرِ او جان در وجود

نالۂ عاشق بگوشِ مردمِ دنیا

بانگِ مسلمانی و دیارِ فرنگ است

معنی دین و سیاست باز گوئے ‌ ‌ ‌ اہلِ حق را زین دو حکمت باز گوئے

"غم خورود نانِ غم افزایاں مخور (رومی) زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر"

خرقہ خود بار است بر دوشِ فقیر ‌ ‌ ‌ چون صبا جز بوئے گل ساماں مگیر

قلزمی ؟ با دشت و در بہم ستنیز

شبنمی ؟ خود را بہ گل برگے بریز

سرِّ حق بر مردِ حق پوشیدہ نیست ‌ ‌ ‌ روح مومن ہیچ می دانی کہ چیست

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود ‌ ‌ ‌ عقدۂ خود را بدستِ خود کشود

از خودی اندر ضمیرِ خود نشست ‌ ‌ ‌ رختِ خویش از خلوتِ افلاک بست

رخ سوئے دریائے بے پایاں نکرد ‌ ‌ ‌ خویشتن را در صدف پنہاں نکرد

اندر آغوشِ سحر یک دم تپید

تا بکامِ غنچۂ نورس چکید

---

## خلاصہ

تمہید میں اقبال نے چار بند لکھے ہیں اور اپنے خیالات مرشد رومی کی زبان سے ادا کئے ہیں۔ ناظرین کی سہولت کے لئے ذیل میں ہر بند کا خلاصہ درج کرتے ہیں :-

پہلے بند میں اوّلاً مرشد رومیؒ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ بعد ازاں وہ اقبال سے یہ کہتے ہیں کہ اقوام مشرق، خوابِ گراں سے بیدار ہو چکی ہیں اس لئے تم ان کو توحید کا درس دو تاکہ وہ فرنگ کی غلامی سے رہائی حاصل کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے چند حقائق بیان کئے ہیں مثلاً:-

(ا) ؏ امتال راز ندگی جذبِ دروں

(ب) ؏ مومن از عزم و توکل قاہر است

(ج) عصرِ حاضر رمزِ جاں سے آگاہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہے۔

(د) چونکہ فلسفی رمزِ جاں کو نہیں سمجھ سکتا، اس لئے وہ مادیات میں منہمک ہے۔

(ہ) مبارک ہے وہ شخص جو غیر اللہ سے قطع تعلق کر لے۔

دوسرے بند میں رومیؒ نے یہ تلقین کی ہے کہ دنیا پرست رموزِ عشق و محبت نہیں سمجھ سکتے، اس لئے ان کو مخاطب مت کرو۔

؏ جز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش

تیسرے بند میں انہوں نے اقبال کو یہ مشورہ دیا ہے کہ جو لوگ ـــــ در اصل آزادی کے طلب گار ہیں انہیں دین و سیاست کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کرو۔

چوتھے بند میں مرشد رومیؒ نے مومن کی حقیقت واضح کی ہے کہ وہ

ہمیشہ دوسروں کے لئے جیتا ہے۔ اس کا مقصدِ حیات دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

## مرشد رومیؒ کے مختصر سوانح حیات

مولانا ۶۰۴ھ ۱۲۰۷ء میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیقِ اکبرؓ سے ملتا ہے۔ ۶۰۷ھ میں ان کے والد ان کو نیشاپور لے گئے اور حصولِ برکت کی غرض سے ان کو خواجہ فرید الدین عطارؒ کے قدموں میں ڈال دیا۔ انہوں نے سر پر دستِ شفقت رکھا اور دعائیں دیں۔

وطن آنے کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد خواجہ بہاالدین کا بادشاہِ وقت خوارزم شاہ سے اختلاف ہوگیا جس کی وجہ سے انہوں نے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اور مختلف شہروں کی سیاحت کے بعد آخر کار قونیہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور ۶۲۸ھ میں وفات پائی۔

والد کی وفات کے بعد مولینا ان کی جگہ مسندِ درس و افتاء پر بیٹھے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کے علم و فضل کی شہرت دور دور پھیل گئی مگر مشیت کو انہیں مرشد رومیؒ بنانا تھا اس لئے ایک واقعہ ایسا رونما ہوا جس نے ان کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اس کی تفصیل اقبال ہی کے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔

حضرت شیخ کمال الدین جنیدیؒ نے حضرت شمس تبریزؒ کو حکم دیا کہ ملا جلال الدین کے درس میں جاکر ان کو "قال کے بحرات" نکال کر "حال" کی وادی میں داخل کردو۔ چنانچہ شمس تبریزیؒ مولٰنا کے درس میں آئے اور ان سے کہا یہ غوغا، یہ قیاس و استدلال، یہ قیل و قال سب بیکار ہے۔ ان باتوں سے (منطق اور فلسفہ سے) خدا نہیں مل سکتا۔ اس لئے اس راہ کو ترک کردو۔ مولینا نے یہ سن کر کہا تم بہت نادان ہو جو حکماء پر زبان طعن دراز

کر رہے ہو!

پائے خویش از میکنم بیروں گلاّ

قیل و قال است ایں ترا بادے چہ کار؟

میری فلسفیانہ تقریر تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی، جاؤ اپنی راہ لو!

قال ما از فہم تو بالا تر است

شیشۂ ادراک را روشنگر است

یہ سنکر شمس تبریزی نے ایک آہ کھینچی جس کے اثر سے کمرے میں آگ لگ گئی اور مولینا کی کتابیں جل کر خاک سیاہ ہو گئیں۔ یہ حال دیکھ کر انہوں نے کہا کہ تم نے علم و حکمت کے اس گراں بہا ذخیرے کو کیوں ضائع کر دیا؟ تو مردِ عارف نے کہا :-

| | |
|---|---|
| گفت شیخ اے مسلم زنار دار | ذوق و حال است ایں شما بادے چہ کار؟ |
| حال ما از فکر تو بالا تر است | شعلہ بر ما کیمیائے احمر است |

(اسرارِ خودی) ص۷۵ تا ص۷۶

فی الجملہ شمس تبریزیؒ سے مولینا کی ملاقات ۱۲۴۴ء میں ہوئی اور یہ سلسلہ ۱۲۴۷ء تک جاری رہا۔ ان کی صحبت میں مولینا نے سلوک کے تمام منازل طے کیں اور بقیہ زندگی اسی رنگ میں بسر کی۔

شمس کی شہادت یا غیبوبت کے بعد مولینا نے شیخ صلاح الدین زرکوب کے ساتھ رشتۂ مودت استوار کیا اور ان کی وفات کے بعد مولینا نے اپنے خاص مرید شیخ حسام الدین کو اپنا ہمدم و ہمراز بنایا اور انہی کی استدعا پر اپنی غیر فانی مثنوی لکھنی شروع کی۔ مولانا ۶۷۲ھ میں وفات پا گئے۔

**تصانیف :-**

(۱) فیہ ما فیہ - یہ کتاب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولینا نے معین الدین

پروآنہ کے نام لکھے تھے۔

(۲) دیوان۔ یہ دیوان بہت ضخیم ہے۔ اس میں ۲۵۰۰۰ سے زائد غزلیں ہیں۔ چونکہ اس کا نام دیوانِ شمس تبریز ہے اس لئے لوگ غلطی سے اس کو انہی کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ لیکن در اصل یہ مولینا ہی کا کلام ہے۔

(۳) مثنوی۔ اسی کتاب نے مولینا کے نام کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ اور فارسی زبان میں اس سے بڑھ کر مقبول کتاب کوئی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب تمام اسلامی علوم مثلاً الٰہیات، اخلاق، اصول دین، عقائد، کلام اور تصوف کی سائیکلوپیڈیا ہے۔ ان کے علاوہ اس میں فلسفہ (مابعد الطبیعات) کے تمام بنیادی مراحل بھی مذکور ہیں۔

مثنوی کا اصلی موضوع تصوف ہے یعنی اس کتاب میں مولینا نے شریعت کے اسرار اور طریقت کے رموز بیان کئے ہیں اور تصوف کی بنیادی تعلیم وحدت الوجود ہے۔

رومیؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اور یہ عقیدہ انہوں نے شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ سے سیکھا ہے، اور شیخ اکبرؒ نے یہ تعلیم قرآن و حدیث سے اخذ کی ہے۔ مولینا فرماتے ہیں کہ جسے تم کائنات کہتے ہو اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ وجودِ مطلق کا جلوہ ہے۔ وحدت اصلی اور حقیقی ہے کثرت محض وہمی اور اعتباری ہے۔ ملاحظہ ہو:-

گر ہزاراں اندیک تن بیش نیست ‌‌ ‌ ‌ جز خیالاتِ عدد اندیش نیست

(دفترِ سوم)

---

بحرِ وحدانیت جفت و زوج نیست ‌ ‌ ‌ گوہر و ماہیش غیر موج نیست

(دفترِ ششم)

اے محال و اے محال اشراکِ او ‌ ‌ ‌ دور ازاں دریا موجِ پاکِ او

(حاشیہ صفحہ ۱۹۶ پر)

نیست اندر بحر شرک و پیچ پیچ  لیک با احوال چہ گویم ہیچ ہیچ

(دفتر ششم)

چونکہ صفت احوالائیم اے شمن  لازم آمد مشترکانہ دم زدن

(دفتر ششم)

اصل بیند دیدہ چوں اکمل بود  فرع بیند چونکہ مرد احوال بود

(دفتر پنجم)

ایں دوئی اوصاف دیدہ احوال آن  ورنہ اول آخر آخر اول است

(دفتر ششم)

کُل شئٍ ماخلا اللہ باطلٌ  اِنَّ فضل اللہِ غَمٌّ ھاطلٌ

(دفتر اول)

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ  زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

(دفتر اول)

در من و ما سخت کردستی تو دست  ہست ایں جملہ خرابی از دو ہست

(دفتر اول)

کُل شی ھالکٌ جز وجہ او  چوں نۂ در وجہ او ہستی مجو

(دفتر اول)

میں نے یہ چند اشعار بطور مثال درج کر دیئے ہیں۔ ورنہ مثنوی کا ہر دفتر وحدت الوجود کی تلقین سے معمور ہے۔ چونکہ اقبال نے اس مسئلہ کے علاوہ اپنے تمام بنیادی تصورات، مثنوی ہی سے اخذ کئے ہیں۔ اس لئے انہوں

---

لہ اقبال نے بھی اپنی مایۂ ناز تصنیف "تشکیلِ جدید" (خطبات مدراس) میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "یہ کائنات حالات مادی کی حرکت سے لیکر فکر کی حرکت تک تمام انائے کبیر (وجود حقیقی) کا جلوۂ ذات ہے۔"

نے کمال دیانت داری کے ساتھ۔ اپنی ہر تصنیف میں مرشد رومیؒ کے فیضان کا اعتراف کیا ہے اور "ارمغانِ حجاز" میں تو انہوں نے اپنے آپ کو مثیلِ رومیؒ قرار دیا ہے۔

چو رومی در حرم دادم اذان من ۔۔۔ ازو آموختم اسرار جان من

بدورِ فتنہ عصرِ کہن او ۔۔۔ بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من

یعنی میں نے رومیؒ کے نقش قدم پر چلکر مسلمانوں کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور روح کے تمام اسرار انہی سے سیکھے ہیں۔ جس طرح انہوں نے اپنے زمانہ میں عقلیت (RATIONALISM) کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس کے مقابلہ میں عشق کا پیغام دنیا کو دیا تھا۔ اسی طرح اس زمانہ میں میں نے اس تحریک کے خلاف جہاد کیا اور دنیا کو عشق کا نغمہ سنایا۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم تمہید کی شرح لکھتے ہیں:۔

کہتے ہیں کہ پیرِ رومیؒ بلاشبہ مرشدِ روشن ضمیر اور مسلکِ عشق کے علمبردار ہیں۔ مثنوی کے مطالعہ سے ان کی بلندیٔ افکار کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کا سینہ نورِ قرآن سے معمور ہے اور ان کے کلام کے مطالعہ کی بدولت میرے قلب میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔

جب میں نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا تو عالمِ خیال میں ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اے اقبالؔ! اقوامِ مشرق مدتوں کے بعد بیدار ہوئی ہیں۔ (ان میں حصولِ آزادی کا جذبہ پیدا ہوا ہے) یعنی وہ اقوام فرنگ کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔

چونکہ اس زمانے میں تجھ سے بڑھ کر کوئی شخص "دانائے اسرارِ فرنگ" نہیں ہے۔ تو نے اقوامِ مغرب کی حکمتِ عملی (ڈپلومیسی) عیاری اور فریبکاری کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ اسلئے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو ان کی مکاریوں کا پردہ چاک کر دے۔ اور اقوامِ مشرق کو ان کے تسلط سے

آزاد ہونے کا طریقہ بتا دے۔

اس کے بعد رومیؒ نے حسبِ ذیل معارف بیان کئے ہیں :-

امتاں را زندگی جذبِ دروں (۱) کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد بے جنونِ ذو فنوں کارے نکرد

یعنی سب سے پہلے اقبالؔ نے رومی کی زبان سے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ قوموں کی زندگی کی بنیاد عقل نہیں ہے بلکہ جذبِ دروں (عشق) ہے۔ جو لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں بالفاظِ دگر، عقل کے پرستار ہیں، وہ اسی جذبِ دروں کو جنون کہتے ہیں۔ یعنی خلافِ عقل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قوموں کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ دنیا میں کسی قوم نے اس "جنون ذو فنون" کے بغیر کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔

چونکہ لفظ جنوں مبہم ہے (اس کا عرفی مفہوم مذموم ہے) اس لئے انہوں نے اس کا مفہوم متعین کرنے کے لئے "ذو فنون" کا اضافہ کر دیا ہے۔ یعنی جنون کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جنون وہ ہے جس کو دماغی اختلال یا مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ مذموم ہے۔ اور اقبال کی مراد یہ نہیں ہے۔ دوسرا جنون وہ ہے جس پر ساری دنیا کی عقل نثار کر سکتے ہیں۔ یہ وہ جنون ہے جس کی بدولت کولمبسؔ نے امریکہ دریافت کیا۔ عربوں نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے۔ بابرؔ نے ہندوستان فتح کر لیا۔ ترکوں نے خشکی میں جہاز چلا دیئے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ نے اجمیر کو رشد و ہدایت کا مرکز بنا دیا۔ اور صحابۂ کرامؓ نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے۔

اب ہم ان دونوں شعروں کی وضاحت کرتے ہیں :-

پہلی بات اقبال نے یہ بیان کی ہے کہ قوموں کی زندگی، جذبِ دروں پر موقوف ہے۔ یعنی دنیا میں وہی قوم سربلندی حاصل کر سکتی ہے جس کے افراد سربلندی حاصل کرنے کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے

کہ عقل انسان کو جان دینے سے باز رکھتی ہے۔ فلسفی یا منطقی بحث کر سکتا ہے تقریریں کر سکتا ہے کتابیں لکھ سکتا ہے مگر میدانِ جنگ میں جا کر موت سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا۔ اور جان دیئے بغیر کوئی قوم سر بلندی حاصل نہیں کر سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جو افراد (قوم) کو جان دینے پر آمادہ کر سکتی ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جب تک ان کے دل میں کامیابی کا بے پناہ جذبہ موجزن نہ ہو۔ وہ سر سے کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں نہیں جا سکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جذبِ دروں (جنون ذو فنون) کے بغیر آج تک قوم کوئی قابلِ فخر کارنامہ انجام نہیں دے سکی۔ اس کی صداقت پر دنیا کی تاریخ شہادت دے سکتی ہے کہ جب قوم نے راحت طلبی کو شعارِ زندگی بنایا وہ یقینی طور پر دوسروں کی غلام بن گئی۔ بلکہ جب قوم نے میدانِ جنگ سے جی چرایا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

اس لئے اگر اقوامِ مشرق آزادی کی طلبگار ہیں تو انہیں سب سے پہلے اپنے اندر حصولِ آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔

شاید کسی کو یہ شبہ لاحق ہو کہ اقبال عقل کو بالکل بیکار سمجھتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ عقل کو بیکار نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ عقل کا کام نصب العین کا تعین ہے۔ مگر اس کا حصول اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ بلکہ عشق پر موقوف ہے۔

دوسرا نکتہ:۔ عشقِ حقیقی، مومن کے اندر وہ خوبیاں پیدا کر دیتا ہے جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتا ہے۔ یعنی عزم اور توکل۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جذبِ دروں دل سے آرزو پیدا ہوتی ہے۔ اور آرزو سے ارادہ (عزم) پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عزم سے مراد ہے آرزو۔ یعنی مومن وہ

ہے جس کے دل میں اپنا جہاں آپ پیدا کرنے کی آرزو کارفرما ہو:-

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

لہٰذا عزم سے مراد ہے تخلیقِ جہانِ نو کی آرزو۔ یہ صفت اس قدر اہم ہے کہ خدا نے اقبال سے یہ کہا:-

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

اب اس شعر کو دوبارہ پڑھیے:-

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر، کافر است

ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ عزم سے مراد نئی دنیا پیدا کرنے کی آرزو ہے۔

مومن کی دوسری صفت توکل ہے۔ توکل کا معنی ہے

(ا) عزم کر کے میدانِ عمل میں کود پڑنا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس سے معلوم ہوا کہ عزم دراصل جذبِ دروں (عشق) کی شکلِ بروں کا نام ہے۔

(ب) اور کامیابی کے لئے اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرنا (یا نتیجہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دینا) اس لئے ہر وقت اس کو یاد کرتے رہنا اور یہ کہنا کہ اے خدا! میں کامیابی کے لئے تیرے فضل و کرم کا محتاج ہوں۔ اگر تو نہ چاہے تو میں محض اپنی کوشش سے کبھی ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

عزم وہ صفت ہے جس کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ لیکن

توکل وہ صفت ہے جس کی وجہ سے اس کا تعلق خدا کی ذات سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جب انسان عزم کرتا ہے تو وہ اپنی ذات پر بھروسہ کرتا ہے، مگر جب وہ توکل کرتا ہے تو خدا کی ذات پر بھروسہ کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر، مومن کا عزم اپنی ذات پر اعتماد (اعتماد علی النفس) کا نام ہے اور اس کا توکل خدا پر اعتماد (اعتماد علی اللہ) کا نام ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اعتماد علی اللہ اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب اعتماد علی النفس پہلے سے موجود ہو۔ اگر ایک انسان اپنی "خودی" پر اعتماد نہیں رکھتا۔ یعنی جدوجہد نہیں کرتا تو محض اعتماد علی اللہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ خدا کا فضل صرف مجاہدین پر نازل ہوتا ہے، قاعدین (بیٹھے رہنے والے) اس نعمت سے محروم ہیں۔

اس حقیقت کو حسبِ ذیل آیات سے مبرہن کرتا ہوں:-

(ا) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
(ظفر علی خاں مرحوم)

(ب) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ہَاجَرُوْا وَجٰہَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰہِ ط

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ امید کریں اللہ کی رحمت کی۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ اسلام، انسان کے اندر یہ دونوں خوبیاں پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی مومن وہ ہے جو

(ا) یہ یقین رکھتا ہے کہ میں دنیا میں خدا کا نائب (خلیفہ) ہوں۔ اور چونکہ نیابت کے لئے اقتدار شرط ہے۔ اس لئے مجھ میں تسخیر کائنات کی صلاحیت

موجود ہے۔ یہ یقین اس کے اندر بے پناہ طاقت پیدا کر دیتا ہے۔

یقین پیدا کر اے غافل، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

یعنی اس یقین کی بدولت اس کے اندر اعتماد علی النفس پیدا ہو جاتا ہے۔

(ب) یہ یقین رکھتا ہے کہ طاقت، قوت اور کامیابی کا سرچشمہ در اصل اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اگر میں ایمان لا کر اس کی راہ میں جہاد کروں گا تو وہ مجھ پر رحمت نازل فرمائے گا۔ اسی یقین کا دوسرا (اصطلاحی) نام توکل (اعتماد علی اللہ) ہے۔

گویا اسلام کی رو سے مومن کی پوری زندگی عزم اور توکل کے محور پر گردش کرتی ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے یہ بلیغ مصرع موزوں کیا کہ

ع مومن از عزم و توکل قاہر است

یعنی انہی دو صفتوں کی بدولت اس کے اندر قہاری (تسخیر کائنات) کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نکتہ عجیبہ اقبالؔ نے اس آیت سے اخذ کیا ہے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۵ (۳-۱۵۹)

پس جب آپؐ پختہ ارادہ کر لیں تو اس کے بعد اللہ (کی رحمت) پر توکل (اعتماد) کیجئے۔

اب دوسرے مصرع کے مفہوم کو واضح کرتا ہوں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ

ع گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

یعنی اگر ایک شخص میں جو ایمان کا مدعی ہو، یہ دو "جوہر" نہ ہوں تو در اصل وہ کافر ہے۔ بظاہر یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ جو اقبالؔ نے کیا ہے اور بادی النظر میں شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو بالکل صحیح ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے ان دو صفات کے لئے "جوہر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جوہر کہتے ہیں روح ESSENCE یا قوام شی کو یعنی وہ اصل جس پر کسی شئے کی ہستی موقوف ہو۔ "جوہر" کسی شی کے خلاصہ کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی عزم و توکل، اسلامی زندگی کی روح بھی ہے اور تعلیماتِ اسلام کا خلاصہ بھی ہے۔
ذیل میں اس اجمال کی تفصیل ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے:۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

الایمان بین الجبر والاختیار

اسی حدیث کو اقبالؔ نے گلشن راز جدید میں یوں بیان کیا ہے:۔

چنیں فرمودہ سلطانِ بدر است
کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است

یعنی مومن وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھے کہ میں مجبور بھی ہوں مختار بھی ہوں۔

(ا) مجبور اس لئے ہوں کہ میں از خود موجود نہیں ہوں بلکہ مخلوق ہوں یعنی اللہ تعالےٰ نے، جو خالقِ کائنات ہے، مجھے اپنی مشیئت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ جب چاہا اس وقت پیدا کیا، جہاں چاہا وہاں پیدا کیا۔ جیسا چاہا ویسا پیدا کیا۔ عزت، ذلت، صحت، مرض، رزق، عمر، نفع نقصان سب اس کے ہاتھ میں ہے نہ میں نظامِ کائنات میں کوئی تبدیلی کر سکتا ہوں اور نہ قوانین فطرت میں ردّو بدل کر سکتا ہوں۔ نہ یہاں آنا میرے اختیار میں تھا اور نہ یہاں سے جانے میں میری مرضی کو کوئی دخل ہوگا۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

(ب) مختار اس لئے ہوں کہ میرے خالق نے مجھے محدود دائرہ میں اختیار عطا کیا ہے مثلاً یہ تو میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں اپنے جسم میں دو کی جگہ چار یا آٹھ آنکھیں پیدا کرلوں، آنکھیں تو دو ہی رہیں گی لیکن یہ اختیار مجھے

ضرور حاصل ہے کہ ان دو آنکھوں سے دیکھوں یا نہ دیکھوں۔ ایک جامع مثال لکھ دوں۔

جو کرنٹ (برقی رو) میرے کمرے میں آرہی ہے، اس پر مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ لیکن یہ بات میرے اختیار میں ہے کہ اپنے کمرے کو منور کر دوں یا ... کر دوں۔

اس مثال پر غور کرنے سے جبر و اختیار کا مسئلہ بآسانی اور بخوبی حل ہو سکتا ہے۔ کرنٹ کو روح تصوّر کر لو، کمرے کو جسم۔ روح پر کسی انسان ... اختیار نہیں۔ وہ تو "مِنْ أَمْرِ رَبِّي" ہے۔ مگر اس پر اختیار ہے کہ ... کی بدولت جدوجہد کرے یا نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو جو طاقتیں، ... صلاحیتیں، خوبیاں اور قابلیتیں دی ہیں ان میں وہ کوئی کمی بیشی ... تبدیلی نہیں کر سکتا۔ لیکن اسے یہ اختیار ضرور ہے کہ وہ ان کو اپنے فائدہ ... لئے استعمال کرے یا نہ کرے۔

اب اگر ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ میں تو بالکل مجبور ہوں، مجھ میں اختیار ... صفت بالکل نہیں اس لئے میں کسی بات کا عزم نہیں کر سکتا۔ تو وہ دائرہ ... اسلام سے خارج ہو جائیگا۔ کیونکہ اگر واقعی خدا نے اسے مجبور محض ہی پیدا ... ہے تو پھر شریعت کیوں نازل کی؟ اسے ذمہ دار کیوں بنایا؟ بالفاظِ دگر ... شریعت کا انکار کر رہا ہے بلکہ اعوذ باللہ وہ خدا کو موردِ الزام بنا رہا ہے کہ ... اسے مجبور بنایا۔ اور پھر خود اس سے جہاد کا مطالبہ کیا۔ خلاصۂ کلام اینکہ جبر ... کا عقیدہ انسان کو کافر بنا دیتا ہے۔

اس کے برعکس اگر وہ یہ کہتا ہے کہ میں مختارِ مطلق ہوں۔ خدا میری زندگی ... دخل نہیں دے سکتا۔ لہٰذا مجھے توکل کی ضرورت نہیں ہے تو اس نے ... معطل قرار دے دیا۔ اور یہ عقیدہ بھی اسے اسلام سے خارج کر دیگا۔ ... جب خدا نظامِ کائنات میں دخیل ہی نہیں تو اس کا وجود و عدم دونوں عملی اعتبار سے

دونوں برابر ہیں۔ جو شخص اپنے کو مختار مطلق سمجھتا ہے وہ رحمت الٰہی کا امیدوار نہیں ہو سکتا۔ خلاصۂ کلام ایں کہ

جبر کا عقیدہ شریعت کو مہمل اور بے سود بنا دیتا ہے اور قدر کا عقیدہ خدا کو زندگی سے خارج کر دیتا ہے یعنی جبری عزم نہیں کر سکتا۔ اور قدری توکل سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے یہ کہا کہ

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

اب یقیناً یہ نکتہ واضح ہو گیا ہوگا کہ عزم اور توکل، مسلمانوں کی زندگی کے لئے بمنزلہ سنگ بنیاد ہیں اور سب جانتے ہیں کہ اگر بنیاد متزلزل ہو جائے تو عمارت لامحالہ منہدم ہو جائیگی۔

اس کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ

خیر را او باز می داند ز شر

یعنی مومن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون سا فعل خیر (اچھا) ہے اور کونسا فعل برا (شر) ہے۔

واضح ہو کہ جبر و قدر کی طرح، خیر و شر کی بحث بھی قدیم زمانہ سے فلسفہ میں معرکہ آرا رہی ہے اور آج تک اس مسئلہ کا کوئی تسلی بخش حل عقل کی مدد سے دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل درحقیقت جذبات کی کنیز ہے۔ بظاہر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انسان پر عقل حکمران ہے۔ لیکن در اصل وہ جذبات کا غلام ہے۔ اور عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس جذبہ کی صحت پر دلائل قائم کرے۔ جس کے تحت ایک شخص کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ موجودہ زمانے کے اکثر ماہرین نفسیات اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

(الف) انسان اپنی زندگی جذبات کے تحت بسر کرتا ہے۔

(ب) عقل فسوں ساز، جذبات کی صحت پر دلائل مہیا کرتی ہے اور اس کو

یہ یقین دلا دیتی ہے کہ تم جو کچھ کرنے والے ہو وہ بالکل درست اور ٹھیک ہے۔
یہی وجہ ہے کہ جو بات ایک شخص کی نگاہ میں خیر ہے دوسرا اسے شر سمجھتا ہے۔ اور اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک عقلِ انسانی، خیر و شر کا کوئی مستقل معیار معین نہیں کر سکی ہے۔ یہیں سے وحی کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ یعنی خالقِ خیر و شر ہی بتا سکتا ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ مومن چونکہ وحی الٰہی پر ایمان رکھتا ہے۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ کونسا فعل میرے حق میں مفید ہے اور کون سا فعل مُضر ہے۔

مومن کی تیسری صفت اقبالؔ نے یہ بیان کی ہے کہ اس کی نگاہ (قوتِ ارادی) دنیا میں انقلاب برپا کر دیتی ہے اور جب وہ آمادۂ انقلاب ہوتا ہے تو اس کی راہ میں جس قدر دشواریاں حائل ہوتی ہیں سب کو دور کر دیتا ہے۔ یعنی

کوہسار از ضربتِ او ریزہ ریزہ

اس کے بعد رومیؒ، اقبالؔ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

ع درچمن زی مثلِ بو، مستور و فاش

یعنی دنیا میں خوشبو کی طرح زندگی بسر کرو۔ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ (مستور) ہے۔ مگر اپنی تاثیر (فعلیت) کے اعتبار سے ظاہر (فاش) ہے۔ اسی طرح مومن کو چاہیئے کہ دنیا والوں سے بے تعلق (مستور) رہے مگر افادہ (نفع رسانی) میں سرگرم رہے۔ اہلِ دنیا کو اپنی ذات سے نفع پہنچائے مگر خود ان کو مقصودِ حیات نہ بنائے۔ اسی نکتہ کو دوسرے مصرع میں یوں ادا کیا ہے:۔

درمیانِ رنگ، پاک از رنگ باش

رنگ کنایہ ہے دنیا سے یعنی دنیا میں رہو مگر دنیا سے تعلق (محبت) مت رکھو۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اس شعر میں تصوف کا خلاصہ یا اس کی روح نظم کر دی ہے۔ تصوف کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان باہمہ ہونے کے باوجود بے ہمہ ہو کر زندگی بسر کرے۔ لیکن جب تک ایک شخص مسلک تصوف اختیار نہ کرے اس

میں یہ صفت کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتی۔
مثلاً سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیأ محبوبِ الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ مبارک، زندگی کا مطالعہ کرو۔ حضرت کے دسترخوان پر روزانہ کئی ہزار نفوس کھانا کھاتے تھے، ہر وقت حاجتمندوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ لیکن آنجناب، مال و دولت کی اس نور فراوانی کے باوجود، نانِ جویں پر اکتفا فرماتے تھے اور کسی شخص سے کسی بات کے طالب نہیں تھے۔ یعنی حقیقی معنی میں باہمہ اور بے ہمہ کا مصداق تھے۔ اقبالؔ نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:-

زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو باہمہ رو

بے ہمہ ہونا کیا ہے؟ انسانوں کو حاجت روا نہ سمجھنا اس لئے کسی انسان سے دل نہ لگانا، کسی سے کوئی توقع نہ رکھنا۔
باہمہ ہونا کیا ہے؟ انسانوں کو فائدہ پہنچانا۔ اُن کے دکھ درد میں شریک ہونا۔
یہ صفت کہ انسان دنیا میں رہے مگر اس سے دل نہ لگائے۔ صرف صحبت مرشد سے پیدا ہوسکتی ہے۔ دین کی تعلیم بھی یہی ہے اور دین بقول اکبرؔ، بزرگوں کی نظر سے پیدا ہوتا ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

وائے افسوس کہ اس زمانہ کے مدعیانِ اصلاحِ قوم مسلمانوں کو بزرگوں کی نظر سے استفادہ کی تلقین کی بجائے اپنا "لٹریچر" پڑھنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ لٹریچر کے مطالعہ سے علم تو بیشک آسکتا ہے مگر تزکیۂ نفس یعنی شانِ بے ہمگی و باہمگی پیدا نہیں ہوسکتی۔
دین کی روح سے آگاہ کرنے کے بعد مرشد رومیؒ یہ کہتے ہیں کہ مومن

کی شناخت یہ ہے کہ وہ باہمہ اور بے ہمہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ کے لوگ روحانیت اور مسلکِ عشق (رمزِ جاں) سے آگاہ نہیں ہیں۔ ان کا دین حب اللہ نہیں ہے بلکہ حُبّ غیر اللہ ہے۔ یعنی چونکہ وہ دین کی روح سے آگاہ نہیں ہیں اس لئے انہوں نے اللہ کے بجائے غیر اللہ کو اپنا مقصود بنا لیا ہے۔ اس زمانہ کے لوگ چونکہ مسلکِ عشق کے بجائے عقل (فلسفہ) کے پیرو ہیں اس لئے ان کا مطمحِ نظر، دنیا (آب و گل) ہے۔ چونکہ انہوں نے دل کی قندیل سے اپنی آنکھوں کو منور نہیں کیا اس لئے انہیں ہر طرف مظاہر کائنات (کبود و سرخ و زرد) ہی نظر آتے ہیں۔ ان مظاہر کے پسِ پشت جو حقیقت کارفرما ہے اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

واضح ہو کہ عقل کی بدولت ہمیں مظاہر PHENOMENA کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ حقیقت NOUMENA کا علم عقل کی دسترس سے بالاتر ہے۔ کانٹ نے اس نکتہ کو اپنی "تنقید عقل خالص" میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ حقیقت کا علم (عرفان) عشق کی مدد سے ہو سکتا ہے۔ اسی لئے رومیؒ اور اقبالؔ نے ہمیں اس زمانہ میں ــــ اس دورِ مادیت میں عشق کا پیغام دیا ہے۔ اسی لئے اقبالؔ کہتے ہیں:-

اے خوشا آں مردے کہ دل با کس نداد
بندِ غیر اللہ را از پا کشاد

یعنی اقبالؔ کی رائے میں خوش نصیب وہ ہے جو دنیا (غیر اللہ) کی محبت اپنے دل سے نکال دے اور اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود، مطلوب اور مقصود بنا لے۔

واضح ہو کہ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے کہ انسان، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے باوجود دنیا سے دل نہ لگائے بلکہ اس کے بجائے اللہ سے لو لگائے۔

اس اعتبار سے اگر دنیا کے مذاہب پر نظر کی جاتے تو تمام مذاہب کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں :-

قسم اوّل :- وہ مذاہب جو دنیا کو مقصودِ حیات بنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ مثلاً مادیت، چارواک مت، سانکھیہ درشن، لاادریت، عقلیت، سیکولرازم، پارٹیو ازم، ایپی کیورین ازم، نیچرلزم اور اشتراکیت۔ ذیل میں ان مذاہب کی نہایت مختصر طور پر تشریح کی جاتی ہے:-

(۱) مادیت (MATERIALISM) اس مسلک کا بانی حکیم دیمقراطیس یونانی ہے، جو چوتھی صدی قبل مسیح پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ مادّہ ازلی اور ابدی ہے۔ یہ کائنات سالماتِ مادّی کے امتزاج باہمی کا نتیجہ ہے۔ نہ خدا ہے نہ روح، اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کی رو سے انسان کا مقصودِ حیات اس دنیا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

(۲) چارواک مت۔ جو تعلیم دیمقراطیس نے یونان میں دی تھی۔ وہی تعلیم چارواک نے غالباً اسی زمانہ میں ہندوستان میں دی۔ وہ کہتا ہے کہ مادّہ ازلی اور ابدی ہے۔ اور اس میں تشکّر کی طاقت بھی موجود ہے۔ موت زندگی کے خاتمہ کا نام ہے۔ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے اس لئے دولت اور لذّت کوشی مقصدِ حیات ہے

(تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ فلسفہ ہند صـ۲۷۵ تا صـ۲۸۴ مؤلفہ ڈاکٹر سر رادھاکرشنن)

(۳) سانکھ درشن۔ اس مدرسۂ فکر (درشن) کا بانی کپل ہے۔ چونکہ ہندوؤں نے فن تاریخ کی طرف مطلق توجہ نہیں دی اس لئے اس کا زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ گوتم بدھ سے پہلے گزرا ہے۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ روح اور مادّہ (پرش اور پرکرتی) دونوں ازلی اور ابدی ہیں۔

ان کے تعامل سے یہ دنیا ہی ہے۔ خدا کا وجود نہیں کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہی دنیا انسان کا مقصود حیات ہے

(۴) ایپی کیوریئنزم (EPICUREANISM) اس کا بانی ابیقورس ہے جو ۳۴۲ ق م میں بمقام ATHENS (یونان) پیدا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ لذت کوشی (PLEASURE) خیرِ اعلیٰ بھی ہے اور مقصدِ حیات بھی۔

(۵) لا ادریت (SPEKTICISM) کا بانی (PYRRHO) ہے جو ابیقورس کا ہمعصر بھی ہے اور ہم وطن بھی۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو کسی بات کا یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ صداقت کا حصول عقل (قوتِ مدرکہ) کی دسترس سے بالاتر ہے۔ اس لئے ہم نہ خدا کا اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔

موجودہ زمانہ میں اس مسلک کو AGNOSTICISM کہتے ہیں اور اس پر عامل ہو کر انسان اسی دنیا کو مقصودِ حیات بنا لیتا ہے۔

(۶) عقلیت (RATIONALISM) کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل کی رو سے نہ خدا کا وجود ثابت ہو سکتا ہے اور نہ حیات بعد الموت کا یقین پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا، وحی والہام، نبوت، حشر و نشر سب خلافِ عقل باتیں ہیں۔ اس لئے لائقِ ترک ہیں۔

(۷) سیکولرازم (SECULARISM) کا بانی ہولی اوک (HOLY CAKE) ہے (۱۸۱۷ء تا ۱۹۰۶ء) جس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ مملکت و ریاست، حکومت، سیاست، اخلاق اور نظامِ تعلیم وغیرہ کو مذہب کے اثر اور اقتدار سے آزاد (بے تعلق) رکھنا چاہیئے۔

(۸) پازیٹیوزم (POSITIVISM) کا بانی فرانساوی حکیم آگسٹے کومٹ تھا۔ (۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء) جس نے خدا کے بجائے انسانیت کو بنی آدم

کا معبود قرار دیا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ یقینی (POSITIVE) علم صرف حواس کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ چونکہ خدا اور روح دونوں ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کے وجود کا یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۹) نیچرازم (مذہب فطرت) مادیت کا دوسرا نام ہے۔

(۱۰) اشتراکیت اس مسلک کا اصلی بانی حکیم مزدک ایرانی تھا مگر موجودہ زمانہ میں کارل مارکس نے مزدکیت کو فلسفۂ مادیت پر مبنی کر کے اشتراکیت کے نام سے پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:-

رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
(جاوید نامہ)

چونکہ یہ تمام مذاہب، دہریت (ATHEISM) یا انکار خدا کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ دنیا (موجودہ مادی زندگی) ہی انسان کا مقصود ہے!

عـہ
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

قسم دوم:- دوسری قسم میں وہ مذاہب شامل ہیں جنہوں نے ترکِ دنیا (تیاگ) کی تعلیم دی ہے۔ یعنی یہ مذاہب پہلی قسم کے مذاہب کی ضد ہیں مثلاً ہندو دھرم، جین دھرم، بودھ دھرم، ناسٹی سزم (GNOSTICISM) اسے نزم (ESSENISM) نیو پلیٹانزم (NEOPLATONISM)، اور مسیحیت۔

(۱) ہندو دھرم اور جین دھرم کی تعلیم یہ ہے کہ روحِ انسانی، مادہ (جسم) کی قید میں گرفتار ہے۔ اس سے مکتی (نجات) کی صورت یہ ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کیا جائے۔

(ب) بودھ دھرم کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی دکھ ہے اور دکھ سے نجات کی صورت یہ ہے کہ ترکِ دنیا کو دستورِ حیات بنایا جائے۔

(ج) ناسٹی سزم NOSTICISM کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ مادہ ناپاک یا منبع شر (EVIL) ہے۔ اس سے قطع تعلق کئے بغیر روحانی ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے راہبانہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔

(د) اسے نزم (ESSENISM) کی تعلیم بھی یہی ہے۔

(ہ) نیو پلیٹانزم (NEOPLATONISM) نے بھی راہبانیت کی تعلیم دی۔

(و) مسیحیت چونکہ مذاہبِ مذکورہ بالا سے متاثر ہوئی اس لئے اس نے بھی رہبانیت (ترک دنیا) کو بہترین طرزِ حیات قرار دیا۔

قسم سوم:۔ اسلام دنیا کا پہلا اور آخری دین ہے جس نے ان تمام مذاہب کی تغلیط و تردید کی اور یہ تعلیم دی کہ نہ تو مادہ ناپاک یا منبع شر ہے، نہ دنیا جیل خانہ ہے۔ نہ زندگی دکھ ہے بلکہ زندگی اچھی چیز ہے اس لئے دنیا میں رہو اسے مسخر کرو، اس میں خدا کا قانون جاری کرو، خدا کی نعمتوں سے استفادہ کرو مگر اس دنیا سے دل مت لگاؤ، اسے مقصودِ حیات مت بناؤ۔ اسی لئے حضورِ انور صلعم کا ارشاد ہے:۔

لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ

## دوسرا بند

اس کے بعد رومی نے اقبال کو یہ نصیحت کی ہے:۔

دنیا پرست لوگ مسلک عشق (سِرِّ شبیری) کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ جس طرح گائے بیل وغیرہ، شیر کی زندگی کے رموز کو نہیں سمجھ سکتے۔ مثل مشہور ہے ؏ قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اس لئے تم اپنا پیغام عشق صرف ان لوگوں کو سناؤ جو اس کے اہل ہوں
" اندھوں کے آگے رونا اپنے نین کھونا ہے۔"
کم ظرف اور پست ہمت آدمی (حریفِ سفلہ) خواہ کتنا ہی دولتمند (بادشاہ روم جیسے) کیوں نہ ہو، صاحبِ ہمت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یعنی مسلکِ عشق پر صرف عالی ظرف اور حوصلہ مند انسان گامزن ہو سکتا ہے

ع یوسف مارا گر گر گئے برد

یوسف کنایہ ہے سرِّ شیری یا رموزِ عاشقی سے
گر گئے برد کنایہ ہے ضائع ہو جانے سے

مطلب یہ ہے کہ نا اہلوں کو رموزِ عشق تلقین کرنے سے یہ بہتر ہے کہ انہیں اپنے سینے ہی میں مستور رکھا جائے۔

دنیا پرست لوگ، عشق (تخیل) اور عقل (قیاس) دونوں سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ بھلا طالبِ دنیا (بوریا باف) رموزِ عشق (اطلس) کی کیا قدر کر سکتا ہے۔

ع چہ داند بوزنہ لذاتِ ادرک

ایک عجمی نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ طالبانِ دنیا کی حالت یہ ہے کہ عاشق کا نالہ ان کے کانوں کے لئے ایسا ہی بے معنیٰ اور بے کار ہے جیسے کافروں کے کانوں میں اذان کی آواز۔

واضح ہو کہ یہ مقولہ شعر نہیں ہے بلکہ نثر ہے جسے اقبال نے شعر کی صورت میں درج کر دیا ہے۔ مقصد اس سے محض اثر آفرینی ہے۔

## تیسرا بند

اس بند میں مرشد رومیؒ اقبال کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ
(۱) مسلمانوں کو دین اور سیاست کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کردو۔

(ب) تبلیغ حق یہ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک مبلغ کی راہ میں بڑی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ جو شخص دنیا پرستوں کو حق پرستی کی طرف بلاتا ہے اسے ہر قدم پر مخالفت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ایک داعی الی الحق کو "جفائے مرد ماں"[۱] برداشت کرنے اور غم کھانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

اسی لئے اقبال نے مثنوی (دفتر سوم) سے یہ شعر نقل کیا ہے جو اس جگہ بہت موزوں ہے۔

غم خورو نانِ غم افزایاں مخور — زانکہ عقل غم خورد کودک شکر

یعنی اے اقبال! راست گوئی کی پاداش میں غم خوری کا شیوہ اختیار کر مگر دنیا پرستوں کا احسان مت لینا۔ یاد رکھ! عاشق (عاقل) ہمیشہ غم کھاتا ہے۔ (مصائب برداشت کرتا ہے) اور دنیا پرست (کودک) عیش کرتے ہیں شکر خوردن کنایہ ہے لطف اندوزی اور راحت کوشی سے۔

(ج) عاشق (وہ شخص جو پیغام حق پہنچاتا ہے) علائق دنیوی سے حتی المقدور کنارہ کشی کرتا ہے۔ خرقہ بھی اس کی نگاہ میں "بار" ہوتا ہے۔

ع چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ شعر کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ صبا کی طرح بوئے گل کے علاوہ کسی سامان (شی) کی احتیاج مت رکھو، لیکن بوئے گل، صبا سے جدا نہیں ہوتی۔ جو اسے مستقل سامان قرار دیا جائے۔ یعنی صبا کے پاس کوئی سامان نہیں ہوتا، اس لئے مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ سالک کو بھی مادیات (سامان) سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنی چاہیئے

---

[۱] جب حضرت چراغ دہلیؒ نے اپنے مرشد حضرت محبوب الٰہی سے خلوت گزینی کی اجازت طلب کی تو انہوں نے فرمایا "ہمیں جا اقامت اختیار باید کرد (جفائے مرد ماں باید کشید)"

(۷) قلزمی؟ با دشت و در یہم ستیز
شبنمی؟ خود را بہ گلبر گے بریز

اس شعر میں قلزم کنایہ ہے قوت و عظمت سے اور شبنم کنایہ ہے ضعف و ناتوانی سے۔ واضح ہو کہ انسان کی یہی دو حالتیں ہیں۔ یا وہ طاقتور ہوتا ہے یا کمزور۔ رومیؒ فرماتے ہیں کہ

اگر تو طاقتور (قلزم) ہے تو باطل (کفر) کا مقابلہ کر۔
اگر تو کمزور (شبنم) ہے تو دوسروں کی خدمت کر (ان کو نفع پہنچا)۔
سمندر صاحب قوت ہے اسی لئے دشت و در سے برسرپیکار رہتا ہے۔

اسی طرح تو اگر صاحب قوت ہے تو باطل کے خلاف صف آرائی کر۔
شبنم ضعیف ہے، طاقت پیکار نہیں رکھتی مگر غنچوں کو نفع پہنچاتی ہے اسی طرح اگر تو ضعیف ہے تو بنی آدم کو راحت پہنچانے کی کوشش کر۔ یہ سچ ہے کہ کمزور آدمی، جنگ نہیں کر سکتا مگر دوسروں کی خدمت ضرور کر سکتا ہے۔

## چوتھا بند

اس بند میں اقبالؔ نے رومیؒ کی زبان سے مومن کی حقیقت واضح کی ہے۔

سرِ حق سے مراد ہے حق تعا کی صفتِ جود و کرم جس کے اظہار کے لئے اس نے یہ کائنات پیدا کی ہے۔

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

یہ نکتہ کہ حق تعا سراپا جود و کرم ہے، مردِ حق (مومن) سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یعنی مومن جانتا ہے کہ میرا مقصدِ حیات، خدمتِ خلق ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

روح مومن کو سمجھنا چاہتے ہو تو قطرۂ شبنم پر غور کرو۔

(ا) اس میں ذوقِ نمود کارفرما ہوتا ہے۔

(ب) وہ اپنے حصولِ مقصد کے لئے دوسروں کا دست نگر نہیں ہوتا۔

(ج) وہ اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت خود اپنی سیرت کی تکمیل کرتا ہے۔

(د) تکمیل کے بعد خلوتِ افلاک سے باہر نکلتا ہے۔

(ہ) اپنے آپ کو بارش کے قطرے کی طرح صدف میں پنہاں نہیں کرتا۔

(و) بلکہ وقتِ سحر کا منتظر رہتا ہے۔

(ز) اور عین وقت پر غنچۂ نو رسیدہ کو شگفتہ کر دیتا ہے

(ح) گویا اس طرح اپنا مقصدِ تخلیق حاصل کر لیتا ہے۔

بس یہی حال مومن کا ہے۔

(ا) وہ بھی اپنی "خودی" کا اثبات اور اظہار کرنا چاہتا ہے۔

مصرعہ زلیستن این گونہ تقدیر خودی است

(ب) وہ بھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔

خود فرود آ از شتر مثل عمرؓ

الحذر از منتِ غیر، الحذر

(ج) وہ بھی ذاتی جدوجہد (مجاہدہ) سے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے۔

(د) بعد ازیں خانقاہ سے باہر نکلتا ہے۔

(ہ) حجرہ نشینی اور خلوت گزینی کے بجائے خدمتِ خلق کو مقصدِ حیات بناتا ہے۔

(و) حالات اور ماحول کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

(ز) بنی آدم کے قلوب میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

(ح) اور اس طرح اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ مومن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کی بہبود کے لئے زندہ رہتا ہے۔ یہی مومن کی شناخت ہے اور یہی اس کا فرضِ منصبی ہے۔ اگر مثالی درکار ہو تو بزرگانِ دین، علی الخصوص حضرات خواجگان چشت کی مبارک زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔ یہ شرح تمام بزرگوں کے حالات کی تو متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ناظرین کی آگاہی کے لئے اس سلسلہ کے صرف ایک بزرگ یعنی شیخ العرب والعجم حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا اسم گرامی ہی کافی ہے جنکے دامن تربیت سے فیض حاصل کرکے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے ہزاروں انسانوں کو خادمانِ اسلام بنادیا۔ آج ہندوستان اور پاکستان میں ان حضرات کے ہزاروں خلفا۔ دین اسلام کی خدمت میں سرگرم ہیں اور یہ سب اسی مردِ مومن کا روحانی فیض ہے جسے دنیا شیخ العرب والعجم کے لقب سے پکارتی ہے۔ کثرہ اللہ تعالیٰ امثالہ ۱۲

※

# فصل سوم

## خطاب به مهرِ عالمتاب

ای امیرِ خاور ای مهرِ منیر — می کنی هر ذرّه را روشن ضمیر

از تو این سوز و سرور اندر وجود — از تو هر پوشیده را ذوقِ نمود

می رود روشن تر از دستِ کلیم — زورقِ زرّینِ تو در جوئے سیم

پرتوِ تو ماه را مهتاب داد — لعل را اندر دلِ سنگ آب داد

لاله را سوزِ درون از فیضِ تست — در رگِ او موجِ خوں از فیضِ تست

نرگسان[1] صد پرده را بر می درد — تا نصیبے از شعاعِ تو برد

خوش بیا صبحِ مراد آوردهٔ — هر شجر را نخلِ سینا کردهٔ

تو فروغِ صبح و من پایانِ روز — در ضمیرِ من چراغے بر فروز

تیره خاکم را سراپا نور کن — در تجلّی هائے خود مستور کن

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق — بر فروزم سینهٔ احرارِ شرق

---

[1] مزید علیہ نرگس

از نوائے پختہ سازم خام را | گردشِ دیگر دہم ایّام را
فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ | از سرودِ من بگیرد آب و رنگ
زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس | حرّیت از عفّتِ فکر است و بس
چون شود اندیشۂ قومے خراب | ناسرہ[1] گردد بدستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم | در نگاہِ او کج آید مستقیم
بر کران از حرب و ضربِ کائنات | چشمِ او اندر سکون بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند | گوہرِ او چون خزف نا ارجمند

پس نخستیں بایدش تطہیرِ[2] فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

---

## تمہید

اس فصل میں اقبالؔ نے خلافِ معمول آفتاب سے خطاب کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوامِ مشرق، آفتاب کو زندگی کا سرچشمہ خیال کرتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان اور ایران میں تو یہ خیال پرستش کی حد تک پہنچ گیا ہے چونکہ اقبالؔ نے بھی اس مثنوی میں ان اقوام کو حیاتِ تازہ کا پیغام دیا ہے

---

[1] کھوٹی [2] پاک کرنا۔

اس لئے شاعرانہ انداز میں آفتاب کو مخاطب بنایا ہے۔
پہلے سات شعروں میں آفتاب کی فیض رسانی کا تذکرہ کیا ہے۔
پھر پانچ شعروں میں اس سے خطاب کیا ہے اور اس کی وجہ بیان کی ہے:-

ع تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق

اس کے بعد طالبانِ حق کو اس نکتہ سے آگاہ کیا ہے کہ

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس
حریت از عفتِ فکر است و بس

آخری پانچ شعروں میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تطہیرِ فکر کے بغیر کوئی قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ اب ہم اس فصل کی شرح کرتے ہیں۔

## اشعار ۱ تا ۷:-

کہتے ہیں کہ اے آفتاب! تیرے فیض سے ہر ذرہ منور ہو جاتا ہے کائنات میں تیری ہی بدولت، زندگی کا رنگ، سوز و سرور پایا جاتا ہے۔ ہر پوشیدہ چیز تیرے ہی دم سے ظاہر ہوتی ہے۔ اگر تیری شعاعیں اثر انداز نہ ہوں تو بطنِ زمین سے کوئی شی نمودار نہیں ہو سکتی۔ تیری زرّیں کشتی (جرم آفتاب مراد ہے) اس فضائے منور (جوئے سیم) میں دستِ کلیم (یدِ بیضا) سے بھی زیادہ تابناک نظر آتی ہے۔

چاند میں تیرے پرتو ہی سے نور آتا ہے اور تیری شعائیں لعل و یاقوت کو (جو پہاڑوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں) آب و رنگ عطا کرتی ہیں۔ لالہ اور نرگس میں جس قدر دلکشی ہے یہ سب تیرا ہی فیضان ہے۔ میں تجھے "خوش آمدید" کہتا ہوں اور صدقِ دل سے تیرا خیر مقدم کرتا ہوں!

## اشعار ۸ تا ۱۲:-

تو سراپا نور (فروغِ صبح) ہے۔ اور تیرے سامنے میں تیرہ خاک

(پایانِ روز) ہوں۔ (پایانِ روز کنایہ ہے۔ تاریکی شام سے)۔ میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ میرے دل کو بھی منور کر دے بلکہ میرے وجود کو سراپا نور کر دے اور مجھے اپنی تجلیات میں مستور کر دے تاکہ میں اپنے کلام سے اقوامِ مشرق کے غلط (تاریک) عقائد و افکار کو صحیح افکار میں تبدیل کر سکوں۔ یعنی ان کے خیالات باطلہ کی اصلاح کر سکوں اور احرار کے سینہ کو منور کر دوں (شب کنایہ ہے تاریکی سے اور تاریکی کنایہ ہے غلط افکار سے)۔ نیز اپنے کلام سے خام طبع (ناقص العقل) افراد کو دانشمند (پختہ) بنا دوں، اور دنیا میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ

ع فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ

اقوامِ مشرق، فرنگ کے افکار و مقاصد سے متاثر ہو گئی ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ان کے افکار کی قید سے آزاد ہو جائیں تاکہ ان کی غلامی سے نکلنے کے لئے جد و جہد کر سکیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اقوامِ مشرق میرے پیغام (سرود) پر عمل پیرا ہو جائیں۔ کیونکہ ان کی نجات، فرنگ کی اتباع میں نہیں ہے۔ بلکہ میرے پیغام پر عمل کرنے میں ہے۔

اس لئے اقبالؔ ہم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:-

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس
حرّیت از عفتِ فکر است و بس

اس شعر میں اقبال نے اپنے پیغام کی روح پیش کر دی ہے اور بلا مبالغہ یہ شعر اس مثنوی کے ان اشعار میں سے ہے جن کی بدولت اس چھوٹی سی کتاب کو اقبالؔ کی تمام تصانیف میں ایک خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔

اس شعر کے دو مصرعوں میں انہوں نے دو بنیادی صداقتوں کو واضح کیا ہے۔

پہلی یہ کہ زندگی، گرمئ ذکر پر موقوف ہے۔
دوسری یہ کہ حریت، عفت فکر پر منحصر ہے۔
پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ
یہاں زندگی سے حیوانوں کی زندگی مراد نہیں ہے بلکہ حقیقی زندگی مراد ہے یعنی دنیا میں عزت اور اقتدار کی زندگی بسر کرنا اور یہ بات حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اقبال کی اصلاح میں زندہ قوم وہ ہے جو دوسروں کی غلام نہ ہو۔

ذکر سے اقبال کی مراد ہے عمل یا جدوجہد اور یہ بات عشق کے بغیر ممکن نہیں۔ جب تک کسی قوم کو کسی نصب العین (IDEAL) سے عشق نہ ہو وہ اس کے حصول کے لئے جدوجہد نہیں کر سکتی۔ مصرع کا مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! اگر دنیا میں حکمرانی کے آرزومند ہو تو مسلکِ عشق اختیار کرو۔ جس طرح حیوانی اعتبار سے زندہ رہنے کے لئے خون کی گرمی شرطِ اوّلیں ہے۔ اسی طرح باعزت زندگی عشق کی گرمی پر موقوف ہے۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ
حرّیت سے مراد محض سیاسی حرّیت نہیں ہے۔ بلکہ یہاں اس لفظ سے حقیقی آزادی مراد ہے۔ اور اس کا سرچشمہ حرّیتِ فکر و ضمیر ہے۔ یعنی حقیقی معنی میں صرف وہ قوم آزاد ہے جو ذہنی، عقلی اور علمی اعتبار سے آزاد ہو۔

اگر کوئی قوم سیاسی اعتبار سے تو آزاد ہو مگر ذہنی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی غلام ہو تو اقبال کی رائے میں وہ قوم دراصل آزاد نہیں ہے یا اگر وہ قوم غلط عقائد میں گرفتار ہو مثلاً مشرک یا ملحد ہو تو بھی وہ حقیقی آزادی سے محروم ہے۔

اگر مثال درکار ہو تو پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کافی

ہوگا۔ ہم لوگ بظاہر آزاد ہیں مگر ذہنی اعتبار سے فرنگیوں کے غلام ہیں اور علمی اعتبار سے عقائد باطلہ میں گرفتار ہیں۔ اس لئے اقبال یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر حقیقی معنوں میں حرّیت کے طلبگار ہو تو اپنے ذہن کو غلط افکار کی زنجیروں سے آزاد کرو۔ اس کے بغیر تم آزاد نہیں ہو سکتے۔

عفّتِ فکر سے مراد ہے فکر کا اوہام باطلہ اور عقائدِ فاسدہ سے محفوظ (پاک) رہنا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ

عزت کی زندگی، عشق کی گرمی پر موقوف ہے۔
حقیقی آزادی، فکر کی پاکی پر منحصر ہے۔

تبصرہ:

غور کیجیے! اس دنیا میں انسان اس کے علاوہ اور کیا چاہتا ہے کہ (ا) وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب وہ حکمراں ہو۔ غلام قوم کا کوئی فرد، اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ غلامی در اصل بدترین قسم کی ذلت ہے اور ذلت در اصل موت ہے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ اگر زندگی کے طالب ہو تو مسلک عشق اختیار کرو۔ زندگی عشق سے حاصل ہوتی ہے۔

(ب) اور اسے آزادی کی نعمت نصیب ہو۔ لیکن در اصل آزاد وہ ہے جس کی فکر (عقل) آزاد ہو۔ اگر فکر (ذہن) غلام ہے تو انسان حکمراں ہونے کے باوجود درحقیقت غلام ہے۔

ذکر (عشق جدوجہد) کی بدولت ایک قوم عزت اور اقتدار تو حاصل کر سکتی ہے۔ مگر جب تک اس کی فکر کا سرچشمہ، عقائد باطلہ کی کدورت سے پاک نہ ہو وہ حقیقی معنوں میں آزادی کی نعمت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ سیاسی اعتبار سے آزاد ہو جائیگی مگر ذہنی اعتبار سے بدستور غلام رہیگی۔ اسی لئے اسلام (قرآن) نے انسان کو وہ طریقہ بتایا ہے جس کی بدولت وہ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی کی نعمت سے بھی ہمکنار ہو سکتی ہے۔ اور وہ طریقہ اختلاطِ ذکر و فکر ہے۔

ذاکر سے سیاسی آزادی حاصل ہوسکتی ہے اور فکر سے ذہنی آزادی، اور آزادی کی ان دونوں قسموں کے امتزاج سے ہی انسان اپنی تخلیق کا مقصد حاصل کرسکتا ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :۔

فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است     جز بقرآں ضیغمی روباہی است

فکر را کامل ندیدم جز بہ فکر     فقرِ قرآں؛ اختلاطِ ذکر و فکر

یعنی اگر حقیقی معنی میں حریت (حکومت) کے طالب ہو تو ذکر اور فکر دونوں کو اپنی ذات میں جمع کرو اور ان کے امتزاج کا دوسرا نام "فقر" ہے۔ یعنی اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو۔

قرآن کی رو سے آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی قوم سیاسی اعتبار سے آزاد ہو جائے بلکہ اس کا ذہن بھی غلط عقائد کی غلامی سے آزاد ہو۔ یعنی جسم اور روح دونوں آزاد ہوں۔

قرآن، انسان کی روح اور اس کے جسم دونوں کو آزادی عطا کرتا ہے۔ اور یہ نعمت قرآن کے علاوہ اور کسی نظامِ حیات یا مدرسۂ فکر یا مذہب سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے تو اقبال نے یہ کہا:۔

ع    جز بقرآں ضیغمی روباہی است

یعنی حکومت (ضیغمی) کی ہر وہ قسم جس کا منبع قرآن نہ ہو در اصل روباہی (عیاری) ہے۔ حقیقی حکومت (جس میں حکمراں قوم کا جسم اور روح دونوں آزاد ہوں) صرف قرآنِ حکیم کے پیش کردہ پروگرام پر عامل ہو کر نصیب ہو سکتی ہے۔

قرآن حکیم فرماتا ہے کہ آزادی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ایک قوم محض سیاسی اعتبار سے آزاد ہو جائے حقیقی آزادی یہ ہے کہ وہ قوم غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو۔

یوں کہنے کو امریکہ اور روس دونوں آزاد ہیں۔ لیکن قرآن کے زاویہ نگاہ سے دونوں شدید ترین قسم کی غلامی میں مبتلا ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ سراپا مکدّر اور کثیف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی اعتبار سے آزاد ہونے کے باوجود یہ دونوں قومیں سیم وزر کی غلام ہیں بلکہ ہوا وہوس کی غلام ہیں۔

اگر یہ قومیں قرآنی نقطۂ نگاہ سے آزاد ہوتیں۔ اگر ان کو حقیقی حریت حاصل ہوتی تو ان کے افراد ضرور مطمئن ہوتے، انہیں یقینی طور پر اطمینانِ قلب حاصل ہوتا۔ مگر ان کی ساری زندگی شاہد ہے کہ وہ اطمینانِ قلب سے قطعاً محروم ہیں۔ ان کی پوری زندگی ڈپلومیسی کے محور پر گردش کر رہی ہے۔ اور ڈپلومیسی در اصل عیاری مکاری، دروغ بافی، فریب کاری، دغابازی اور بے ایمانی کا دوسرا نام ہے اور ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ جس قوم کی زندگی ان صفاتِ ذمیمہ اور اخلاقِ رذیلہ پر مبنی ہو اس قوم کو کبھی اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

آخری بات یہ ہے کہ جب تک عفّتِ فکر حاصل نہ ہو، انسان غیر اللہ کی غلامی سے نہیں نکل سکتا اور عفّتِ فکر اس وقت اور صرف اس وقت نصیب ہو سکتی ہے جب انسان حقیقی معنیٰ میں موحّد بن جائے۔

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

---

نوٹ:۔ میں نے اس شعر کی تشریح میں، ذکر اور فکر کی وضاحت اس لئے نہیں کی کہ اس کا موقع فقر کی شرح میں آنے والا ہے۔

---

اب میں اس فصل کے آخری پانچ شعروں کا مطلب ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں کہتے ہیں کہ جب کسی قوم کے افکار و خیالات غلط (خراب) ہو جاتے ہیں تو کھری چاندی بھی اس کے ہاتھ میں آکر کھوٹی ہو جاتی ہے یعنی وہ دنیا کی کسی اچھی یا مفید

بات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتی۔

مثلاً اگر اس قوم کے پاس دولت ہے تو وہ اسے مفید کاموں میں خرچ کرنے کے بجائے عیاشی، بدکاری اور عیش و عشرت میں خرچ کرے گی۔

اگر اس کے پاس طاقت ہے تو وہ اس کو دشمنوں کے مقابلہ میں استعمال کرنے کے بجائے اپنوں (بھائیوں) ہی کے خلاف استعمال کرے گی۔ اگر تفصیل کا شوق ہو تو مسلمانانِ پاکستان کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا۔

اس قوم کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ قوم روحانیت، پاکیزگی، تقویٰ اور طہارت سے بیگانہ ہو جاتی ہے اور اس کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ اچھائی کو برائی اور برائی کو اچھائی یقین کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ مسلمان اللہ اور اس کے رسولؐ کی راہ میں روپیہ خرچ نہیں کرتے لیکن ہر برے کام کے لئے دل و جان سے روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کے ملکوں میں شراب خانے بھی ہیں۔ کلب بھی، ہوٹل بھی ہیں، رقص گاہیں بھی، لیکن اگر نہیں ہے تو تبلیغ و اشاعت اسلام کا نظام۔

کبھی کسی نے سنا کہ ترکی، مصر، مراقش، طرابلس، شام، فلسطین، عراق، افغانستان، ترکستان، پاکستان یا سعودی عرب سے مبلغین اسلام کی کوئی جماعت یورپ یا امریکہ گئی ہو؟

کیا ان ممالک میں سے کسی ایک ملک میں کبھی حکومت یا عوام نے تبلیغ اسلام کا کوئی ادارہ قائم کیا ہے؟

کیا ان "اسلامی" ملکوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کوئی قدم اٹھایا ہے؟

کیا ان ملکوں کے مسلمانوں نے غیر مسلموں کو قرآنِ حکیم کے پیغام سے روشناس کرنے کے لئے کوئی جدوجہد کی ہے؟

عیسائیوں نے دنیا کی ساتسو پچاس زبانوں میں بائبل کا ترجمہ کر دیا ہے۔

مسلمانوں نے قرآنِ کریم کا ترجمہ کتنی زبانوں میں کیا؟

ہندوستان میں انگریزی حکومت کی ابتدا ۱۷۷۴ء سے ہوئی اور صرف بیس سال کے بعد اس حکومت نے بنگال میں مسیحیت کی تبلیغ کا نظام قائم کر دیا جس کے زیر اہتمام پادری ولیم کیرے نے ۱۷۹۴ء میں بنگلہ زبان میں بائبل کا ترجمہ شروع کر دیا اور آج ہندوستان و پاکستان کی تمام زبانوں میں (جن کی تعداد ۲۲۵ کے قریب ہے) بائبل یا عہد جدید یا اناجیل اربعہ کے تراجم دستیاب ہو سکتے ہیں۔

برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے از ۱۸۶۰ء تا ایندم ہندوستان میں ہر سال ہر اس شخص کو جو بی۔اے پاس کرے، بائبل کا ایک نسخہ بلاقیمت دیا جاتا ہے۔ خود اندازہ کر لیجئے! سو سال میں کتنے نسخے اس طرح ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں کو مفت دیئے گئے ہوں گے!

۱۹۴۵ء میں عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے تھے ان کی رو سے ہندوستان میں

(ا) تبلیغی کالجوں کی تعداد ۷۲ تھی۔

ان میں سے ایک درس گاہ موسومہ "ہینری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز" میں صرف وہ مبلغ تیار کئے جاتے ہیں جو مسلمانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں۔

(ب) دیہات میں مسیحیت کی منادی کرنے والے یعنی ادنی درجے کے مبلّغین تیار کرنے والے ادارے ۸۱ تھے۔

نوٹ:۔ تبلیغی کالجوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص لئے جاتے ہیں اور کم از کم ۳ سال تک باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس تہذیب المبلغین میں معمولی لیاقت کے آدمیوں کو ایک سال ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ۱۲

(ج) کرسچن آشرم ۳۱ تھے۔

ان آشرموں میں زیادہ تر ان لوگوں کو رکھا جاتا ہے جو عیسائیت قبول کرنے کے بعد "بے گھر" ہو جاتے ہیں۔

(د) دارالخواتین ۳۵ تھے۔
ان میں وہ عورتیں رہتی ہیں جو عیسائی ہوکر "بے ٹھکانے" ہوگئی ہوں مثلاً وہ عورتیں جو مشن ہسپتالوں میں جسمانی امراض کے ازالہ کے لئے جاتی ہیں اور روحانی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں!
(ہ) یتیم خانے ۱۲۹ تھے۔
(و) تبلیغی رسائل وجرائد ۳۱۱ تھے۔
(ز) پادریوں کے لئے راحت گاہیں۔ صحت بخش، پرفضا مقامات پر ۲۵ تھیں تاکہ وہ گرمیوں کا زمانہ ان HILL STATIONS پر گزار سکیں۔
(ح) دارالاطفال BABY HOLDS ۱۵ تھے۔
ان اداروں کے علاوہ ہوسٹل، نرسنگ ہوم، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے وائی ڈبلو سی اے، کانونٹ ہوم (ڈووز ہوم WIDOWS HOME) اپاہج خانے دارالمبروص تبلیغی ہسپتال MISSION HOSPITALS جو تبلیغ کے بہت موثر مرکز ہیں۔ ریڈنگ روم، انسٹڈی اسینٹر، صنعتی ادارے اور چھاپے خانے تمام بڑے شہروں میں قائم ہیں اور اسکولوں اور کالجوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے۔
نیز یہ واضح رہے کہ یہ صرف پراٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا ایک ناقص جائزہ ہے۔ رومن کیتھولک عیسائیوں کی تبلیغی جدوجہد کا دائرہ اول الذکر سے بہت وسیع ہے۔
"اب ذرا مسلمانوں کی غفلت شعاری کا مرثیہ پڑھ لیجئے:۔
ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز سنہ ۱۱۹۲ء سے ہوا اور سنہ ۱۲۰۶ء سے ان کی حکومت پنجاب، دلی، آگرہ، اجمیر، دوآبہ اور وسط ہند میں باضابطہ قائم ہوگئی۔ اگر وارن ہیسٹنگز پہلا گورنر جنرل تھا تو قطب الدین ایبک پہلا خود مختار (مطلق العنان) بادشاہ تھا۔)
اور سنہ ۱۸۰۳ء تک قائم رہی۔ گویا قدرت نے کم وبیش چھ سال تک

اس بدنصیب کوتاہ اندیش اور عیش پسند قوم کو غیر مسلموں پر حکمرانی کا موقع دیا۔ مگر اس قوم نے اس طویل مدت میں تبلیغ اسلام کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔

سلطان فیروز تغلق، سلطان سکندر لودی، سلطان سکندر بت شکن سلطان محمود بیگڑہ، سلطان عالمگیر اور سلطان ٹیپو شہید کے علاوہ اور کسی بادشاہ نے تبلیغ اسلام کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔

چھ سو سال تک دلی اور آگرہ میں مسلمانوں کی مرکزی حکومت قائم رہی غلام، خلجی، تغلق، سید، لودی اور مغل خاندانوں نے مسلسل حکومت کی۔ اس کے علاوہ پنجاب، کشمیر، سندھ۔ گجرات، مالوہ، خاندیش گولکنڈہ، بیجاپور بیدر، احمدنگر، بنگال، جونپور اور اودھ میں مختلف زمانوں میں مستقل حکومتیں قائم ہوئیں، مگر کسی حکومت کو تبلیغ اسلام کی کوشش نہ ہوئی۔

اس سے ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ تمام سلاطین ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے یا خونریزیوں ہی میں مصروف رہے۔ بقول اقبال

در نگاہِ او کج آید مستقیم

ہر بری بات انہیں اچھی نظر آتی رہی اور وہ اس کی سرپرستی کرتے رہے چنانچہ ان کے محلات، ان کے دربار اور ان کے مراکز حکومت ہر قسم کی برائیوں کے مربی اور سرپرست بلکہ منبع و مصدر بن گئے تھے۔

سلطان حسین شرقی والئ جونپور رقص و سرود کا سب سے بڑا مربی تھا۔ اور اُس نے گانے میں اس درجہ کمال حاصل کیا تھا کہ ایک نئی راگنی ایجاد کی جسے جونپوری ٹوڈی کہتے ہیں۔

باز بہادر مالوہ کا آخری بادشاہ، موسیقی کا بہت بڑا قدردان تھا اور خود بھی اس فن شریف میں کمال رکھتا تھا۔ اس کی محبوبہ رانی روپ متی بھی رقص و سرود میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔

یہی حال قطب قلی شاہ کا تھا۔ اس کی محبوبہ بھاگ متی مالوہ کی

روپ متی کا جواب باصواب تھی۔

واجد علی شاہ کے ذوق رقص وسرود کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

غیاث الدین سلطان مالوہ نے اپنے محل میں صرف پندرہ ہزار عورتیں جمع کی تھیں۔ خلاصۂ کلام اینکہ سلاطین ہند نے اپنی توجہ زیادہ تر عورت شراب اور موسیقی پر مبذول کی۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہدِ حکومت میں عیاشی اور لذت کوشی کا یہ رنگ اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گیا۔

۱۷۵۳ء سے قدرت نے مسلمانوں سے ان کی مجرمانہ غفلت کا انتقام لینا شروع کیا۔ پہلے مرہٹوں نے آفت مچائی، پھر سکھوں نے اینٹ سے اینٹ بجائی رہی سہی کسر انگریزوں نے پوری کر دی۔

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دلی فتح کر کے محمد شاہ رنگیلے کے اندھے پوتے شاہ عالم ثانی کو انگریزوں کا نمک خوار بنا دیا اور ۱۸۵۷ء میں شاہانِ بے تخت و تاج کا یہ سلسلہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

حیف ہے وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

ہندوستان کے مسلمان بادشاہ غیر مسلموں کو تو کیا مسلمان بناتے۔ انہوں نے خود مسلمانوں کو اسلام سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔

شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ (وفات بعہد اکبر مرتد) کے زمانہ سے پہلے سارے ہندوستان میں حدیث کا درس ناپید تھا۔ قرآن سے واقف ہونا تو بڑی بات ہے۔ کوئی مسلمان حدیث سے بھی آگاہ نہ تھا۔ وہ صرف فقہ پڑھ کر عالم دین بن جاتے تھے!

شاہ ولی اللہ مجدد دہلویؒ (وفات ۱۱۷۶ھ کے زمانہ سے پہلے سارے ہندوستان میں قرآن حکیم کا کوئی ترجمہ دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ ہندی میں تو ترجمہ کیا ہوتا۔ مسلمانوں نے فارسی میں یا بھاشا

میں ترجمہ کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔
چونکہ اندیشہ قوم خراب ہو چکا تھا، اس لئے اس کی نگاہ میں قرآن سمجھنے یا تدبر کرنے کی کتاب ہی نہ تھی۔ بلکہ اس سے حسبِ ذیل کام لئے جاتے تھے
(ا) مرنے والے کے سرہانے بیٹھ کر ایک خاص سورت اسے سنادی جاتی تھی۔[۱]
(ب) یا حصولِ ثواب کے لئے بغیر سمجھے اس کی تلاوت کی جاتی تھی۔
(ج) یا اس کی بعض آیات دفع امراض کے لئے زعفران میں گھول کر پی جاتی تھیں۔
اب ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ ان کاموں کے لئے ترجمہ کی کیا ضرورت ہے۔
چونکہ یہ مرثیہ کوششِ اختصار کے باوجود کافی طویل ہو گیا ہے اس لئے صرف ایک "رفت کا بند" سنا کر اسے ختم کئے دیتا ہوں۔
ہندوستان میں جس قدر تبلیغ ہوئی یہ سب صوفیائے کرام علی الخصوص حضرات خواجگانِ چشت کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر مسلمان بادشاہ بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلتے یا کم از کم تبلیغ اسلام کا باقاعدہ اور باضابطہ محکمہ ہی قائم کر دیتے تو چھ سو سال میں دنیائے اسلام کا دائرہ کہیں سے کہیں تک وسیع ہو جاتا۔

---

باز آمدم بر سرِ شرح! اقبال کہتے ہیں کہ جب کسی قوم کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ کجی (عیب یا برائی) کو راستی (خوبی یا اچھائی) سمجھنے لگتی

---

[۱] بہ بندِ صوفی و ملا اسیری | حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست | کہ از یٰسین او آساں بمیری

ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

چشم او اندر سکوں بیند حیات

یعنی حیات تو در اصل جد و جہد (حرکت) کا نام ہے مگر وہ اپنی حماقت کی وجہ سے بے عملی (سکون) کو مدارِ حیات یقین کر لیتی ہے۔ اسی لئے وہ میدان جنگ میں جانے سے جی چراتی ہے اور موت سے ڈرنے لگتی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں نے دلی اور اس کے گرد و نواح میں قیامتِ صغریٰ برپا کر رکھی تھی ان کا خون پانی سے بھی ارزاں ہو گیا تھا۔ آگرہ، دہلی، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، علی گڑھ، کرنال، پانی پت، سرہند، لاہور، قصور اور ملتان تمام بڑے بڑے شہروں میں مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ آگرہ میں جاٹ گردی، دہلی میں مرہٹہ گردی اور باقی شہروں میں سکھ گردی کے ہولناک مناظر سے تاریخوں کے صفحات بھرے پڑے ہیں جن کی تفصیل بخوفِ طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔ مگر یہی وہ زمانہ ہے جب سکھ سور ہا تو لاہور، قصور اور ملتان کی مسجدوں کو سور کے خون سے رنگین کر رہے تھے۔ لیکن مسلمان "حرب و ضرب کا نشان" سے "برگراں" ہو کر موسیقی اور شاعری کی محفلیں سجا رہے تھے اور واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے آسمان سر پر اٹھا رہے تھے! سکھ اور مرہٹے، مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کر رہے تھے مگر مسلمان شعرا نخلِ شاعری کی آبیاری کر رہے تھے اور مسلمان موسیقار نئی نئی راگنیاں ایجاد کر رہے تھے۔ ہماری تاریخ اس تلخ صداقت پر شاہد ہے کہ بہترین شعرا اور بہترین موسیقی دان اسی خون آشام صدی میں پیدا ہوئے۔

ہندی موسیقی کی وہ دلکش طرز جسے "خیال" کہتے ہیں اسی زمانہ میں ایجاد ہوئی۔ شاہ سدا رنگ، شاہ ادا رنگ، بلاس خاں (جس نے بلاس خانی ٹوڈی ایجاد کی) بہادر خاں (جس نے بہادری ٹوڈی مرتب کی)، پیار خاں

(جس نے آڑی کافی کی گت باندھی) اور دوسرے نامور کالونت اسی پُر آشوب عہد میں پیدا ہوئے۔ تنت کاروں کے نام بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

شعرا میں میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ قائمؔ چاندپوری وغیرہ یہ سب حضرات اسی منحوس صدی میں پیدا ہوئے تھے۔

ہم سدا رنگ اور سوداؔ کو معاف کر سکتے ہیں کہ ان کا پیشہ ہی موسیقی اور شاعری تھا۔ لیکن بدبخت شاہ عالم ثانی کی ذاتِ فی طبع سزاوارِ صد نکوہش و نفرین ہے کہ مرہٹوں کی غلامی سے نکلنے کی کوشش کے بجائے اس نے اپنی فرصت کے اوقات اُن گالیوں کو نظم کرنے میں صرف کئے جن کو عرفِ عام میں "سیٹھنے" کہتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں شادی کے موقعوں پر ڈومنیاں گا گا کر سمدھی اور سمدھن کو سنایا کرتی تھیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شرح کے صفحات کو فحاشی کے ان نادر الوجود نمونوں سے ملوث نہیں کر سکتا۔ یہ بات بھی دل پر جبر کر کے محض اس لئے لکھی ہے کہ ناظرین کو اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا مذاق اس درجہ مبتذل ہو گیا تھا کہ "گالیاں" ان کی تہذیب کا جزو لاینفک بن گئی تھیں۔

اب پڑھئے اس شعر کو :-

میرد اندر سینہ اش قلب سلیم
در نگاہِ او کج آید مستقیم

سچ ہے جب دل مردہ ہو جاتا ہے تو گالیاں شربت کے گھونٹ معلوم ہوتی ہیں۔

میں نے شاہ عالم ثانی کو بہت سخت الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری دانست میں دلّی کے بادشاہوں میں اس سے زیادہ قابلِ نفرت کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر اس کے اندر

ذرہ بھر بھی دینی حمیت یا سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ افغانوں کو اپنا دستِ راست بناکر مرہٹوں کی غلامی سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس بد بخت نے بالکل برعکس طرزِ عمل اختیار کیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

اس عہد میں نواب نجیب الدولہ مرحوم شمالی[1] ہندوستان میں واحد مردِ مومن تھا جس کے دل میں اپنی قوم کا درد تھا (یہ جذبہ حضرت شاہ ولی اللہ مجدّد دہلوی (متوفی ۱۷۶۳ء) کے فیضِ صحبت سے پیدا ہوا تھا) وہ دیکھ رہا تھا کہ اگر مرہٹوں کا استیصال نہ کیا گیا تو وہ بہت جلد سارے ہندوستان کو فتح کرلیں گے۔ اس لئے اس نے احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے استیصال پر آمادہ کیا۔ وہ جس طرح تلوار کا دھنی تھا اسی طرح سیاسی قابلیت بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر اس نے دشمنِ ملّت شجاع الدولہ کو مرہٹوں کے بجائے مسلمانوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کرلیا۔

قصّہ کوتاہ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں مسلمان اور مرہٹے باہم صف آرا ہوئے۔ ابدالی کی فنونِ قاہرہ کے دوش بدوش نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے بھی اپنی مردانگی اور سپہ گری کے جوہر دکھائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مرہٹوں کو ایسی شکستِ فاش نصیب ہوئی کہ اگر ابدالی قندھار واپس جانے کے بجائے تختِ دہلی پر جلوس کرتا تو ہندوستان کی تاریخ ہی بدل جاتی۔

چونکہ مشیتِ ایزدی کو یہ منظور تھا کہ دلّی کے تخت پر ملتِ اسلامیہ

---

[1] جنوبی ہندوستان میں سلطان ٹیپو شہید وہ تنہا مردِ مومن تھا جس کا دل جذبۂ ملّی سے سرشار تھا اور اسی جذبہ نے اسے ۱۷۹۹ء میں مقامِ شہادت پر فائز کیا۔

رفت سلطان زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز۔ (جاوید نامہ)

کے سب سے بڑے دشمن ـــ انگریزوں ـــ کا قبضہ ہو جاتے۔ اس لئے ابدالی نے نجیب الدولہ کو میر بخشی اور مختارِ مطلق بنا کر اپنے وطن کی راہ لی۔ نجیب الدولہ نے تا دمِ وفات (۱۷۷۰ء) دلی میں آمر مطلق کی حیثیت سے حکومت کی۔ بقول جادو ناتھ سرکار "نجیب الدولہ ہندوستان میں تمام افغانوں کا سردار اور تمام سُنّی مسلمانوں کا محافظ اور نظام الملک آصف جاہ کے بعد اپنے عہد کا سب سے بڑا ہندی سپہ سالار (جنرل) تھا"

نجیب الدولہ کی وفات کے بعد شاہ عالم ثانی نے سلطنت مغلیہ اور مسلمانوں کے دشمنوں ـــ مرہٹوں ـــ کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ اور ان کی امداد کی بدولت جنوری ۱۷۷۲ء میں تختِ دہلی پر قابض ہو گیا۔ چونکہ مرہٹوں کو قدرت نے یہ موقع عطا کیا تھا اس لئے انہوں نے اس احمق اور بزدل بادشاہ کو نجیب الدولہ مرحوم کے جانشین ضابطہ خاں کے خلاف فوجکشی پر آمادہ کیا تاکہ اس طرح پانی پت کی شکست کا انتقام لیا جا سکے۔ چونکہ بادشاہ کا وزیر نجف خاں بھی افغانوں کا دشمن تھا۔ اس لئے اس نے مرہٹوں کی اس تجویز کو بسر و چشم قبول کیا اور شاہی فوج یعنی مرہٹوں نے نجیب آباد (قلعہ موسومہ پتھر گڑھ) کا محاصرہ کر کے پندرہ دن بعد محصورین کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ اور آتشِ انتقام فرو کرنے کے لئے افغان خواتین کی آبرو ریزی کی! میں ان خواتین کی بے عزتی اور رسوائی کا ذمہ دار شاہ عالم کو قرار دیتا ہوں۔ اگر اس میں کچھ بھی غیرت، حمیّت اور سمجھ ہوتی تو وہ اپنے برادرانِ دینی کو برباد کرنے کے بجائے دین اور سلطنت کے دشمنوں ـــ جاٹوں ـــ کی سرکوبی کرتا، مگر

چوں شود اندیشۂ قومے خراب ‏ ‏ ‏ ‏ ناسرہ گردد بدستش سیم ناب

میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم ‏ ‏ ‏ ‏ در نگاہِ او کج آید، مستقیم

میں نے تاریخِ ہند سے یہ چند واقعات اس لئے درج کئے ہیں کہ

ناظرین پر اقبالؔ کے ان اشعار کا مطلب بخوبی واضح ہو جائے۔

آخر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب کسی قوم کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ نیک و بد میں امتیاز نہ کر سکے بلکہ بدی کو نیکی اور برائی کو اچھائی سمجھنے لگے تو اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی فکر کی تطہیر کی جائے۔ یعنی اس کی ذہنیت کو خیالات فاسدہ اور عقائد باطلہ سے پاک کیا جائے اس کے بعد صحیح (اسلامی) عقائد کی تلقین کی جائے۔

واضح ہو کہ تعمیر فکر سے پہلے تطہیرِ فکر، سنّتِ نبویؐ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے عربوں کے غلط عقائد کا ازالہ فرمایا، اس کے بعد انہیں صحیح عقائد سے روشناس فرما کر حق و صداقت کا علمبردار بنایا[1]

---

[1] اقبالؔ نے یہ نکتہ کہ تعمیر فکر سے پہلے تطہیر فکر لازمی ہے قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے۔

"یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ ۵

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان فرمایا کہ خود ان کی قوم میں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ ان کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ فرماتے ہیں اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔ (۳-۱۶۴)

اس آیت شریفہ میں تلاوت اور تزکیہ سے تطہیر فکر اور تعلیم کتاب و حکمت سے تعمیر فکر مراد ہے۔ ۱۲

# فصل چہارم

## حکمتِ کلیمی

تا نبوّت حکمِ حق جاری کند　　پشتِ[1] پا بر حکمِ سلطاں می زند

در نگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر　　غیرتِ او بر نتابد حکمِ غیر

پختہ سازد صحبتش ہر خام را　　تازہ غوغائے دہد ایام را

درسِ او اللہ بس باقی ہوس　　تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس

از نمِ او آتش اندر شاخِ تاک　　در کفِ خاک از دمِ او جانِ پاک

معنیٔ جبریل و قرآن است او　　فطرة اللہ را نگہبان است او

حکمتش برتر زعقلِ ذوفنون　　از ضمیرش امّتے آید بروں

حکمرانے بے نیازِ تخت و تاج　　بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

---

[1] پشت پا زدن۔ ٹھکرا دینا۔

از نگاهش فردِ دین خیزد زدے     دردِ هر خمؐ تلخ تر گردد زمے
اندر آهِ صبحگاهِ او حیات     تازه از صبحِ نمودش کائنات
بحر و بر از زورِ طوفانش خراب     در نگاهِ او پیامِ انقلاب
درسِ لاخوفٌ علیهم[1] می دهد     تا دلے در سینهٔ آدم نهد
عزم و تسلیم و رضا آموزدش     در جهاں مثلِ چراغ افروزدش
من نمی دانم چه افسون می کند     روح را در تن دگرگون می کند
صحبتِ او هر خزف را دُر کند     حکمتِ او هر تهی را پُر کند
بندهٔ درمانده را گوید که خیز     هر کهن معبود را کن ریز ریز
مردِ حق! افسونِ این دیرِ کهن     از دو حرفِ رَبّیَ الاَعلیٰ شکن
فقر خواهی از تهی دستی منال     عافیت در حال و نے در جاه و مال
صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد     نے زر و سیم و قماش و سرخ و زرد
بگذر از کاؤس و کے اے زنده مرد     طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد
از مقامِ خویش دور افتادهٔ     کرگسی کم کن که شاهین زادهٔ
مرغک اندر شاخسارِ بوستان     بر مرادِ خویش بندد آشیاں
تو که داری فکرتِ گردون مسیر     خویش را از مرغکے کمتر بگیر

---

[1] لاخوفٌ علیهم. تلمیح بآیہ قرآنی لاخوفٌ علیهم ولاهم یحزنون۔ یعنی مومن خوف و غم سے پاک ہیں

دیگر این نہ آسمان تعمیر کن — بر مرادِ خود جہان تعمیر کن

چون فنا اندر رضائے حق شود — بندۂ مومن قضائے حق شود

چار سوئے با فضائے نیلگون — از ضمیرِ پاکِ او آید برون

در رضائے حق فنا شو چون سلف — گوہرِ خود را برون آر از صدف

در ظلامِ این جہانِ سنگ و خشت — چشمِ خود روشن کن از نورِ سرشت

تا نگیری از جلالِ حق نصیب — ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

ابتدائے عشق و مستی قاہری است — انتہائے عشق و مستی دلبری است

مردِ مومن از کمالاتِ وجود — او وجود و غیرِ او ہر شے نمود

گر بگیرد سوز و تاب از لا الٰہ
جز بکامِ او نگردد مہر و مہ

---

## تمہید

اس فصل میں اقبالؔ نے ابتدائی سولہ[16] اشعار میں انبیائے کرام کے طریقِ کار اور ان کی خصوصیاتِ تعلیم کا بیان کیا ہے اور آخری سولہ اشعار میں مسلمانوں سے خطاب کیا ہے کہ اگر مقصدِ حیات حاصل کرنا چاہتے ہو تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرو۔

اس فصل کا عنوان ہے "حکمتِ کلیمی" جس سے مراد ہے تعلیم نبوی۔

اقبالؔ نے تعلیم نبویؐ کی آسان ترکیب کے بجائے حکمتِ کلیمی کی ترکیب استعمال کی ہے۔ کیونکہ اس میں بلاغت اور معنویت کی شان پائی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) "حکمت" قرآنی اصطلاح ہے اور اس کے معنیٰ میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس لفظ سے حکمت، دانائی، دانشمندی، سمجھ بوجھ، عقل، فہم، تفقہ فی الدین، ادراک، تدبر، مصلحت بصیرت، محاسن اخلاق، اخلاقی احکام اور سنتِ نبویؐ۔ یہ تمام باتیں مراد لی ہیں۔ کتاب اللہ نے یہ لفظ ان قطعی اور یقینی علوم کے لئے استعمال کیا ہے جو بواسطۂ انبیاء انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دگر "حکمت" منہاجِ نبوت کا دوسرا نام ہے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے حکمت کا اطلاق صرف علوم انبیاء پر ہوتا ہے۔ کیونکہ یقینی علم وہی ہے جو مشکوٰۃِ نبوت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض ظن و تخمین ہے۔

بیشک عرفِ عام میں فلاسفہ (حکماء) کے نتائجِ افکار کو بھی حکمت کہتے ہیں۔ مگر قرآنِ حکیم انسانی افکار کو حکمت کا لقب عطا نہیں کرتا کیونکہ وہ مفیدِ ظن تو ہو سکتے ہیں مگر مفیدِ یقین نہیں ہو سکتے۔

قرآنِ حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص حقیقی معنیٰ میں حکمت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے فلاسفہ کے بجائے انبیاء کی شاگردی اختیار کرنی چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ (۱۷-۳۹)

یہ مذکورہ بالا نصائح منجملہ ان باتوں کے ہیں جو وحی کیں آپؐ کی طرف آپؐ کے رب نے حکمت میں سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حقیقی حکمت کا منبع ذاتِ باری ہے اور وہی بذریعۂ وحی، انسانوں کو اس نعمتِ عظمیٰ بلکہ "خیرِ کثیر" سے سرفراز فرماتا ہے۔

چونکہ وحی الٰہی قطعی، یقینی، حتمی اور اذعانی ہے اس لیے جو علم اس سے حاصل ہوگا وہ بھی یقینی ہوگا اور قرآن اسی علم کو حکمت قرار دیتا ہے اور اسی حکمت کی شان ان الفاظ میں واضح کرتا ہے :-

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی بلاشبہ اسے خیر کثیر عطا کی گئی۔ (۲-۲۶۹)

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت و رسالت میں سے چوتھا فرض تعلیم حکمت قرار دیا ہے۔

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۶۲-۱)

اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو

(۱) ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے (تلاوت آیات)

(۲) اور انہیں رذائل اخلاق اور غلط عقائد سے پاک کرتا ہے (تزکیۂ نفوس)

(۳) انہیں الکتاب (قرآنی احکام) سکھاتا ہے (تعلیم کتاب)

(۴) اور حکمت سکھاتا ہے۔ (تعلیم حکمت)

خلاصۂ کلام اینکہ "حکمت" سے وہ علوم مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ انبیاء کو عطا فرماتے ہیں تاکہ وہ ان کی مدد سے قرآن کا پیغام کا فرداں تک پہنچا سکیں، اس کی صداقتوں کی تبلیغ کر سکیں، ان صداقتوں کی عظمت دلوں میں پیدا کر سکیں، اور براہین سے کام لیکر ان کو کفر کے مقابلہ میں غالب کر سکیں، اگر ضرورت لاحق ہو تو کفار سے مناظرہ بھی کر سکیں اور ہر مستفسر کے سوال کا جواب دے سکیں اور قرآن شریف کے اسرار و حکم کو دلنشیں پیرایہ میں بیان

کر سکیں، موقع اور محل کے مطابق گفتگو کر سکیں اور اپنے طرزِ عمل سے قلوب کو اپنی طرف مائل کر سکیں۔

جب کوئی شخص مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھ کر اپنا تزکیہ کر لیتا ہے یعنی بواسطۂ شیخ، فنا فی الرسول ہو جاتا ہے تو قدرتی طور پر ان علوم کا عکس اس کے دل میں جلوہ گر ہو جاتا ہے مرشد رومی فرماتے ہیں :-

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک نقشہا بینی برون از آب و خاک
بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے جدو اوستا

یعنی جب دل کا آئینہ پاک اور صاف ہو جاتا ہے۔ (یہ اس وقت ہوتا ہے جب غیر اللہ کی محبت دل سے نکل جائے اور محبت اس وقت نکلتی ہے جب یہ یقین ہو جائے کہ ماسوی اللہ کے کوئی حقیقت ہی نہیں ہے اور لاموجود الا اللہ کا مطلب یہی ہے) تو عالم ملکوت اور عالم لاہوت کے رموز و اسرار اور حقائق و معارف سالک پر واضح ہونے لگتے ہیں۔ بالفاظِ دگر اس کے اندر انبیاء کے علوم جلوہ گر ہونے لگتے ہیں۔ دوسرا مصرع بہت غور طلب ہے۔ مرشد رومیؒ فرماتے ہیں کہ سالک نہ تو کسی مدرسہ یا کالج میں جاتا ہے نہ کسی استاد سے کوئی کتاب پڑھتا ہے اور نہ کسی ہمعصر طالب علم سے اسباق کی تکرار کرتا ہے۔ اس کے باوجود تمام علوم و فنون میں ماہر ہو جاتا ہے۔!

ہمارے زمانے میں شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مرشدی و سیدی حاجی امداد اللہ صاحب چشتی صابری مہاجر مکی المتوفی ۱۳۱۷ھ کی شخصیت مبارکہ اس شعر کی صداقت پر ایک روشن دلیل ہے۔

حضرت کے خلیفۂ اعظم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے ایک مرتبہ برسبیل تذکرہ کہا: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قدر علم عطا فرمایا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو دوسرا کافیہ لکھ دیں۔ لیکن خدا کی شان دیکھو ہم نے اس شخص کے ہاتھ پر

بیعت کی جس کی ظاہری تعلیم "کافیہ" سے آگے نہیں ہے[1]

اسی طرح ایک مرتبہ حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے ایک عالم نے پوچھا کہ "حضرت آپ کے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب نے کس درس گاہ سے علوم کی سند حاصل کی ہے؟ سننے میں یہ آیا ہے کہ وہ مستند عالم نہیں ہیں۔" یہ سنکر مولانا مرحوم نے فرمایا "سبحان اللہ ہمارے حاجی صاحب عالم ہی نہیں ہیں بلکہ عالم گر بھی ہیں جسے شک ہو وہ مجھے دیکھ لے۔"

دوسری مثال:- حضرت سید احمد صاحب رائے بریلویؒ (شہادت ۱۲۴۶ھ) نے کافیہ بھی نہیں پڑھا تھا مگر مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی جیسے علماء ان کے کشف بردارو ں میں تھے۔ کثّر اللہ تعالیٰ امثالہم۔

---

لفظ حکمت کی تشریح کے بعد اب ہم لفظ "کلیم" کی معنویت واضح کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے لفظ "نبوی" کے بجائے لفظ "کلیمی" کو اس لئے ترجیح دی کہ آئندہ فصل کا عنوان "حکمت فرعونی" ہے اور فرعون کے مقابلہ میں "کلیم" کا لفظ موزوں تر ہے۔

دوسری وجہ ہے کہ نبی کا معنیٰ ہے خبر دینے والا، مگر کلیم کا معنیٰ ہے "اللہ سے کلام کرنے والا" لہٰذا کلیم کا مرتبہ نبی سے بلند تر ہے۔ ہر کلیم نبی ہے مگر ہر نبی کلیم نہیں۔ یہ لفظ صرف حضرت موسیٰؑ سے مخصوص ہے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ لفظ کلیم کو مسلمانوں کے لٹریچر میں خاص شہرت اور عظمت

---

[1] کافیہ علم نحو کی وہ مشہور ابتدائی کتاب ہے جو صدیوں سے عراق، ترکستان افغانستان اور ہندوستان کے عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ کافیہ کے بعد منطق، معانی، فلسفہ کلام، ریاضی، تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب صرف عربی گرامر پڑھے ہوئے تھے۔ علوم عقلیہ یا نقلیہ سے آشنا نہ تھے۔

حاصل ہو گئی ہے۔ شعرا نے اس لفظ پر اس قدر طبع آزمائی کی ہے کہ اب یہ لفظ سلسلہ رشد و ہدایت کا نمائندہ بن گیا ہے۔ مثلاً

چپ ہو کلیم کس لئے ؟ طور کا ماجرا کہو
یہ تو بتاؤ کیا ہوا جلوۂ یار دیکھ کر

---

فی الجملہ حکمت کلیمی سے مراد ہے انبیاء کا طریقِ کار اور ان کی تعلیمات کا انداز۔ اب ہم اس فصل کی شرح لکھتے ہیں:۔

(۱) تا نبوت حکم حق انج اس مصرع میں نبوت یا نبی مراد ہے، اور تمام کمالاتِ نبوت چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات میں پائے جاتے ہیں اس لئے یہاں در پردہ آپ ہی مراد ہیں۔

اگر اس معنیٰ پر قرینہ درکار ہو تو اس شعر پر غور کرو:۔

معنیٔ جبریل و قرآن است او
فطرۃ اللہ را نگہبان است او

پہلے شعر میں اقبال نے دینِ اسلام کی روح یا حقیقت واضح کر دی ہے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ اسی نکتۂ جاں فروز کی تفسیر ہے۔ وہ نکتہ دلنواز کیا ہے بعلتِ غائی ہے۔ ہر نبی نے بنی آدم سے یہی کہا کہ انسانوں کی اطاعت (عبادت) اور غلامی اور فرمانبرداری کے بجائے اللہ کی عبادت یعنی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ اسی لئے قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (۲ - ۲۸۵)

ہم (مسلمان) اللہ تعالیٰ کے مبعوث کردہ رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

کیوں؟ اس لئے کہ سب رسولوں کی تعلیم یکساں تھی اور جب تعلیم یکساں تھی تو سب رسول بھی یکساں ہوتے اور وہ تعلیم یہ تھی)۔

(۱) يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ط (۵ - ۷۲)

(جنابِ مسیح نے فرمایا) اے بنی اسرائیل! اطاعت کرو اللہ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔

(ب) اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (۲۳-۳۲)

پھر ہم نے ان میں ایک رسول مبعوث کیا جس نے انہیں یہ تعلیم دی کہ (اطاعت کرو اللہ کی جس) کے علاوہ کوئی اِلٰہ (واجب اطاعت ہستی) نہیں ہے۔

(ج) ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ ۚ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْہُ ۚ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ ○ (۶-۱۰۲)

یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ (یعنی کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت کی جائے (کیونکہ اللہ کے سوا جس قدر مخلوق ہے سب حادث، محتاج اور فقیر ہیں۔ لہٰذا جو خود محتاج ہے وہ دوسرے کو کیا دیگا؟ اور جو خود فقیر ہے اُسے دوسروں پر حکومت کا کیا حق ہے؟) یہی اللہ ہر شی کا خالق ہے (ہر شی مخلوق ہے اور ہر مخلوق بلاشبہ مجبور، عاجز، ناتواں، محتاج، ناقص دست نگر، فقیر، حادث، ممکن اور اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہوتی ہے) اور جس میں اتنے عیوب اور نقائص موجود ہوں وہ اس لائق کہاں کہ اس کی اطاعت کی جائے وہ تو خود کسی کا مطیع ہے۔ کیا آج تک کسی غلام نے یہ کہا ہے کہ میری اطاعت کرو؟) پس تم اسی کی اطاعت کرو اور یاد رکھو کہ وہ ہر شئے پر قدرت قائمہ اور اختیار کامل رکھتا ہے۔ کوئی شی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ [12]

(د) اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ○

(حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب فرمایا) بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں میرے سوا (اس تمام کائنات میں) کوئی اِلٰہ نہیں ہے یعنی کوئی ہستی (خود موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر صرف میرا وجود خانہ زاد ہے۔ باقی تمام مخلوقات

کا وجود مستعار، عارضی اور فانی ہے۔ اسی لئے کائنات میں کوئی ہستی اس قابل نہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے) لہٰذا تم صرف میری اطاعت کرو (اور اس پر مداومت کا طریقہ یہ ہے کہ) میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔

قرآن حکیم میں بہت سی آیات اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی اطاعت کی جائے۔ لیکن مطلب کی وضاحت کے لئے یہ چار آیات کافی ہیں۔

اجرائے حکم حق سے مراد ہے اللہ کے قانون کو دنیا میں نافذ کرنا (اور یہ قانون بصورتِ قرآن ہمارے پاس موجود ہے اور حدیثِ رسولؐ اسی قانون کی تشریح اور توضیح ہے، اس لئے حدیث کا انکار در اصل قرآن کا انکار ہے)۔

نبی کا فرضِ منصبی جس کے لئے وہ مبعوث ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کا قانون نافذ کرے اور اللہ کے بندوں سے کہے کہ تم انسانوں کے نافذ کردہ قانون کے بجائے اللہ کے قانون کی اطاعت کرو۔

اس اعلان کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہر نبی

ع    پشتِ پا بر حکم سلطاں می زند

جب ایک نبی، اللہ کے بندوں کو اللہ کے قانون کی اطاعت کا درس دیتا ہے تو لامحالہ وہ سلاطین سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر نبی سب سے پہلے ملوکیت کا ابطال کرتا ہے تاکہ حکم حق جاری ہو سکے۔ بالفاظِ دگر، نبی سب سے پہلے انسانوں کو بادشاہوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اس کا مقولہ (Motto) یہ ہوتا ہے:۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲ — ۴۰)

(حضرت یوسفؑ نے جیلخانے میں اپنے ساتھیوں سے کہا) آگاہ ہو جاؤ

کہ حکومت کرنے کا حق صرف اللہ کے لئے ثابت ہے۔

اقبالؔ نے اس شعر میں اسی آیت کا مفہوم قلمبند کیا ہے:-

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

فی الجملہ نبی، ملوکیت کے خلاف بغاوت کا درس دیتا ہے۔ یہ درسِ بغاوت اس کی تعلیمات کی ابجد ہے۔ کیونکہ جب تک ملوکیت کا ابطال اور استیصال نہ ہو جائے "حکم حق" جاری نہیں ہو سکتا۔

جس طرح نیکی اور بدی، سیاہی اور سپیدی جھوٹ اور سچ دونوں بیک وقت بیک جہت ایک مقام یا ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح حکم حق اور حکم ملوکیت دونوں بیک وقت نافذ نہیں ہو سکتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لئے رسولؐ نے انسانوں کو ملوکیت اور قیصریت کے خلاف اعلانِ جنگ کی تعلیم دی[1] (از آدم تا زمانِ خاتم المرسلین سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم)۔

دوسرا شعر اسی پہلے شعر کی وضاحت کرتا ہے یعنی نبی کی نگاہ میں قصرِ سلطاں در اصل ایک بتخانہ ہوتا ہے اور سلطان بمنزلۂ بت ہوتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رو سے موحد حقیقی وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے۔

---

[1] ہمارے زمانے میں بھی ایک مدعیٔ نبوت پیدا ہوا۔ جس نے بڑے طمطراق سے یہ کہا ؎

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے

من بعرفاں نہ کمترم ز کسے

لیکن اس کے "عرفان" کی شان یہ تھی کہ وہ ساری عمر مسلمانوں کو ملوکیتِ فرنگ کی غلامی کا سبق پڑھاتا رہا۔ اور ان کی حمایت میں اپنی جہالت کے جوہر دکھاتا رہا ۱۲

اس لیے ہر وہ شی جس کے سامنے انسان سرِ تسلیم خم کرے، بُت ہے۔ خواہ وہ بت پتھر کا بنا ہوا ہو یا کوئی انسان ہو۔ قرآن ہر قسم کی بت پرستی کا مخالف ہے یعنی ماسوی اللہ کی اطاعت بھی بت پرستی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

الف بے تے ہی سے ہیں تو یہ سمجھا
الف اللہ کا اور ماسوی بُت

(۱) ماسوی اللہ بُت ہے (صغریٰ)
(۲) بت پرستی حرام ہے (کبریٰ)
(۳) اس لئے ماسوی اللہ کے سامنے جھکنا یا اس کی اطاعت کرنا حرام ہے۔ قرآن حکیم نے اس باب میں اپنا قطعی فیصلہ کر دیا ہے

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۸-۸۸)

اور اللہ کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو الٰہ مت قرار دے۔ (کیوں؟ اس لیے کہ) اس کے سوا اور کوئی الٰہ موجود ہی نہیں ہے۔ (اور اس کی وجہ یہ ہے) کہ اس کے علاوہ ہر شی معرضِ فنا میں ہے، اور الٰہ وہ ہے جس پر فنا طاری نہ ہو سکے۔ (چونکہ اللہ کے سوا کوئی ہستی الٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے، اس لئے کوئی ہستی اس لائق بھی نہیں ہے کہ اس کائنات پر حکومت کر سکے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ لہ الحکم یعنی فرمانروائی اور حکمرانی صرف اللہ کے لئے ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ تم سبھوں کو انجام کار اسی حاکمِ مطلق اور فرمانروائے حقیقی کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

اس آیت شریفہ کا مفہوم ذہن نشین کرنے کے بعد یہ مصرع پڑھو:-

؎ غیرتِ او بر نتابد حکمِ غیر

یعنی نبی کی غیرت دینی، غیر اللہ کی حکومت کو برداشت ہی نہیں کر سکتی

کیونکہ وہ مبعوث ہی اس لئے ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی حکومت کو دنیا سے مٹا دے اس کا پہلا اور سب سے بڑا فرض ہی یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نجات دے۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کو تبلیغی خط لکھوایا تو اس کی ابتدا اس طرح فرمائی :-

من محمد رسول اللہ الی عظیم الروم الخ

اللہ کے رسولِ برحق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے رومیوں کے سردار کے نام آپؐ نے اسے قیصر یا سلطان یا ملک کے لقب سے مخاطب نہیں فرمایا۔ کیونکہ آپؐ کی نگاہ میں اللہ تعا کے علاوہ کوئی ہستی اس لقب کی مستحق ہی نہیں تھی۔ یعنی آپؐ نے عملاً ثابت کر دیا کہ اسلام کسی انسان کو بادشاہ تسلیم نہیں کرتا۔ اسی لئے اقبالؒ نے یہ تعلیم دی کہ "لا ملوکیت فی الاسلام" یعنی اسلام میں ملوکیت نہیں ہے۔ ۱۲

خلاصہ کلام اینکہ قرآن کی رو سے

(ا) اللہ تعا خالقِ کائنات ہے۔

(ب) چونکہ خالق وہ ہے اس لئے عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ رازق (رب) بھی وہی ہو۔ جب اس کے سوا کوئی خالق نہیں تو اس کے سوا کوئی رازق کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو پھر دو خدا ہو گئے؟ لہٰذا اگر خدا خلق کر سکتا ہے تو رزق بھی دے سکتا ہے۔ اگر وہ رزق نہیں دے سکتا تو عقل یہ اعتراض وارد کرتی ہے کہ پھر اس نے کائنات کو خلق کیوں کیا؟ یعنی اگر خدا کو رازق تسلیم نہ کیا جائے تو اس کی خدائی (خدا لقیت) کبھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ (ج) چونکہ وہ رازق ہے اس لئے مالک بھی ہے۔ یعنی عقلاً اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کائنات کو اپنی مِلک قرار دے اور اسمیں تصرف کر سکے۔

(د) چونکہ ہر مالک اپنی ملک میں بلا شرکتِ غیرے تصرف کا حق رکھتا ہے اس لئے اگر وہ مالک ہے تو حاکم بھی ہے۔

(۵) لہٰذا از روئے عقل، اللہ کے سوا کوئی شخص حاکم نہیں ہو سکتا۔

پھر غور کرو۔

(ا) چونکہ اللہ خالق ہے اس لئے وہی رازق بھی ہے۔

(ب) چونکہ وہی رازق ہے اس لئے وہی مالک بھی ہے۔

(ج) چونکہ وہی مالک ہے اس لئے وہی حاکم بھی ہے۔

الملک للہ والحکم للہ

غور کرو تو ان دو لفظوں میں اسلام کی ساری روح سمٹ کر آگئی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے اسی نکتۂ بلیغ کو یوں ادا کیا ہے:-

رضائے حق پہ راضی رہ! یہ حرفِ آرزو کیسا!
خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم، تو کیسا؟

حکمتِ نبوی کی دوسری خصوصیت:-

ع پختہ ساز و صحبتش با خام را الخ

"خام" کنایہ ہے اُس شخص سے جو کسی دوسرے کو اللہ کا شریک سمجھے۔ خواہ وہ شرکت ذات میں ہو یا صفات میں، عبادت میں ہو یا حکومت میں۔

مثلاً ایک شخص اللہ کے علاوہ کسی اور کو بھی اِلٰہ سمجھتا ہے تو یہ شرک فی الذات ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ہستی بھی عالم الغیب ہے تو یہ شرک فی الصفات ہے۔

اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی سجدہ کرے تو یہ شرک فی العبادت ہے۔ اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی فرمانروا سمجھے تو یہ شرک فی الحکم ہے۔

شرک کی یہ چاروں صورتیں شرکِ جلی کہلاتی ہیں۔ شرکِ خفی یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی حقیقی معنی میں موجود سمجھے عرفا کی اصطلاح میں اسے شرک فی الوجود کہتے ہیں۔ اور جب ایک مسلمان،

شرک کی ان پانچوں قسموں سے مبرّا ہو جاتا ہے تو موحّدِ کامل بن جاتا ہے۔
**غالب** نے اس شعر میں شرکِ خفی سے اجتناب کی تلقین کی ہے:-

جاروبِ لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
با گردِ فرشِ وسینہ بایوال برابر است

یعنی تیرا دل بمنزلۂ ایوان ہے اور شرک فی الوجود کا عقیدہ بمنزلۂ گردِ ہے اس لئے لاموجود الا اللہ کی جھاڑو سے فرش ایوان کی گرد کو جھاڑ دے تاکہ تو حقیقی معنیٰ میں موحّد بن جائے۔ یعنی یہ عقیدہ رکھ کہ حقیقی معنی میں اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے تاکہ تیرا دل شرک فی الوجود کی کدورت (گرد و غبار یا کثافت) سے پاک ہو جائے۔

واضح ہو کہ تصوفِ اسلام نام ہی ہے دل کو ہر قسم کے شرک سے پاک کرنے کا۔ انسان، عارف بنتا ہی اس وقت ہے جب اسے اس بات کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی شی موجود نہیں ہے۔ اقبال نے "مسافر" میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:-

آں مسلمانے کہ بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست
تیغِ "لاموجود الا اللہ" اوست

یعنی جو مسلمان اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی شی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

چنانچہ امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:-
"ممکن را وجود ثابت کردن وخیر و کمال راجع باو داشتن فی الحقیقت شرک کردن است او را در مِلک و مُلکِ حق جلّ سلطانہٗ ہمچنیں ممکن را عین واجب

گفتن تعالیٰ شانہٗ، سوادب است والحاد.... اگر علماً ظاہر ازیں دقیقہ آگاہ می گشتند، ممکن را وجود ثابت نمی کردند الخ

(مکتوب اوّل جلد ثانی ص۲ مطبوعہ نولکشور)

یعنی ممکن کائنات کے لئے وجود ثابت کرنا (یعنی یہ سمجھنا کہ ممکن بھی موجود ہے) اور نیکی اور کمال کو اس کی طرف منسوب کرنا، درحقیقت ممکن کو حق تعالیٰ نے ملک اور اس کی مِلک میں شریک قرار دینا ہے۔

یعنی یہ سمجھنا کہ جس طرح خدا بذاتِ خود موجود ہے اسی طرح انسان بھی بذاتِ خود موجود ہے۔ درحقیقت شرک فی الوجود ہے۔

تو بھی موجود اور حق بھی موجود!
ظالم یہ شرک و بت پرستی تاکے؟

اسی طرح یہ سمجھنا کہ ممکن (بندہ) عین حق ہے، سراسر کفر و الحاد ہے۔
یعنی کائنات نہ تو بذاتِ خود موجود ہے (یہ شرک ہے)
اور نہ عین حق ہے۔ (یہ الحاد ہے)
بلکہ بذاتِ خود معدوم ہے بحکم حق موجود ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی صحبت میں یہ طاقت اور تاثیر ہوتی ہے کہ کافر، ملحد اور مشرک اس کی بدولت، مومن بلکہ موحّدِ کامل بن جاتا ہے۔ اگر مثال درکار ہو تو حضرات صحابۂ کرام رضی کی زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض "الکتاب" سے انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو بعثتِ انبیاء کا سلسلہ قائم نہ ہوتا۔ حق تعالیٰ "الکتاب" آسمان سے نازل فرما دیا کرتے اور اسے پڑھ کر یا اس کی تعلیمات پر عمل کر کے انسانوں میں تبدیلی پیدا ہو جایا کرتی یعنی خام افراد، پختہ بن جایا کرتے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے (ناقص، افراد کو کامل اور خام کو پختہ بنانے کے لئے) کتاب اور

صاحب کتاب (قانونِ حق اور رسولِ برحق) دونوں کا وجود ضروری ہے اور ان میں وہی نسبت ہے جو ہاتھ اور کنجی میں ہے۔

کتاب بمنزلۂ کلید ہے۔ رسول بمنزلۂ دست ہے۔ بیشک قفل کنجی ہی سے کھل سکتا ہے۔ مگر جب تک کوئی ہاتھ کنجی کو قفل میں ڈال کر گردش نہ دے کنجی غیر موثر ہے۔ اسی طرح انقلاب بلاشبہ قرآن ہی کی بدولت برپا ہو سکتا ہے مگر جب تک کوئی اللہ کا بندہ خود مجسّم قرآن بنکر سامنے نہ آئے[1] جب تک وہ خود قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے نہ دکھائے۔ بالفاظِ دگر، جب تک وہ اپنے عمل سے اسوۂ حسنہ[2] پیش نہ کرے، اس وقت تک قرآن غیر موثر ہے۔

انسان کی فطرت ہی اس قسم کی ہے کہ وہ کتاب کے بجائے صاحبِ کتاب یعنی اُسوہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر کتابوں سے انقلاب ہو سکتا تو تمام حکماء اور فلاسفہ انقلاب برپا کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ حکماء اور فلاسفہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود عمل کر کے نہیں دکھاتے۔

لیکن نبی کا ہر قول اور فعل "اُسوۂ حسنہ" ہوتا ہے۔ جب حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کچھ لوگ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپؐ کی سیرت سے آگاہی حاصل کریں۔ تو انہوں نے دریافت

---

[1] اقبال نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے:-

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

[2] خود قرآن سے ثابت ہے کہ کتاب کے علاوہ "نمونہ" کی بھی ضرورت ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ الخ

بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی شخصیت میں بہترین نمونہ موجود ہے تاکہ تم اس کی اتباع کی بدولت کامیابی حاصل کرسکو۔

کیا "کیا تم لوگوں نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟" انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو صدیقہ رضؓ نے فرمایا کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰن یعنی آپ مجسم قرآن تھے۔

بات یہ ہے کہ خدا جسے ہدایت کے لئے مامور کرتا ہے اس کا انتخاب خود فرماتا ہے (یعنی کوئی شخص اپنی کوشش سے نبی نہیں بن سکتا) اور خود اس کی شخصیت کو منبع رشد و ہدایت بناتا ہے۔ اس میں فوق العادت طاقتیں پیدا کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر، اس کی ذات کو چراغ بنا کر مبعوث کرتا ہے تاکہ اس سے دوسرے چراغ روشن ہو سکیں۔ سب جانتے ہیں کہ چراغ چراغ ہی سے روشن ہو سکتا ہے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ تقریروں، خطبوں، کتابوں، وعظوں، باتوں، تجویزوں، مجلسوں، پوسٹروں، اشتہاروں اور ٹریکٹوں سے سب کچھ ہو سکتا ہے مگر چراغ روشن نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی شخص اپنا چراغ روشن کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے چراغ کی بتی کو کسی جلتے ہوئے چراغ کی بتی یعنی لَو سے متصل یا مربوط کر دے۔ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر چراغ روشن ہو جائیگا۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ چراغ روشن کرنے کے لئے تقریر (قول) کے بجائے صحبت (عمل) درکار ہے۔ آپ ساری عمر چراغ روشن کرنے کی ترکیب زبان سے ادا کرتے رہیں (کتابیں پڑھتے رہیں لیکچر دیتے رہیں یا سنتے رہیں) چراغ روشن نہیں ہو گا کیونکہ ایسا ہونا قانونِ قدرت یا سنۃ اللہ کے خلاف ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ (۳۵-۴۳)

---

[1] اسی لئے تو مرشد رومیؒ نے اس زمانے کے مدعیانِ اصلاح کو یہ مشورہ دیا ہے:-

قال را بگزار و مردِ حال شو　　　پیشِ مردِ کاملے پامال شو

اور اے مخاطب! تُو اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہ پائیگا۔

اسی طرح اگر آپ اپنے دل کا چراغ روشن کرنا چاہتے ہیں تو اس مردِ حق کی صحبت اختیار کیجیے جس کا دل منور ہو۔ تنویر کا یہ نظام خود خالقِ کائنات کا قائم کردہ ہے۔

حق تعالیٰ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک کو بواسطہ جبرائیل خود منور فرمایا۔ اس طرح تنویر کا وہ سلسلہ قائم ہو گیا جو قیامت تک قائم رہیگا۔ اسی کی تفصیل یہ ہے:۔

آپؐ کے چراغ سے حضرت علیؓ نے اپنا چراغ روشن کیا۔

آنجنابؓ کے چراغ سے سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے شیخ شیوخ عالم حضرت گنج شکر اجودھنیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے شیخ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ پانی پتیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے قطب الاقطاب شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے حضرت نور محمد صاحب جھنجھانویؒ نے اور

آنجنابؒ کے چراغ سے شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مرشدی وسیدی مولٰنا مولوی حافظ حاجی امداد اللہ صاحب چشتی مہاجر مکیؒ نے اپنا چراغ روشن کیا۔ اور اسی چراغ سے ہندوستان میں سینکڑوں چراغ روشن ہو گئے۔

بلاشبہ جب میں حضرت حاجی صاحب قبلہ کی ذاتِ بابرکات اور اس کے فیوضات پر غور کرتا ہوں تو یہ شعر بے ساختہ میری زبان پر جاری ہو جاتا ہے ؎

چمنے کہ تا قیامت گل او بہار بادا

صنمے کہ بر جمالش دو جہاں نثار بادا

میں نے یہ تفصیل اس لئے سپردِ قلم کی ہے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ اس قماش کے پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے اپنا چراغ تو روشن کیا نہیں مگر دوسروں کا چراغ روشن کرنے کے مدعی ہیں اور چونکہ انہوں نے خود کسی مردِ حق کی صحبت نہیں اٹھائی اس لئے وہ مسلمانوں کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اصلاح و تزکیۂ نفس کے لئے صحبتِ مرشد ضروری نہیں ہے۔ ہمارا لٹریچر پڑھ لو، اصلاح بھی ہو جائیگی اور دل بھی روشن ہو جائیگا! بلکہ پاکستان میں اسلامی حکومت بھی قائم ہو جائے گی!

چونکہ یہ فتنہ پاکستان میں رو بہ ترقی ہے اس لئے میں نے مناسب خیال کیا کہ مسلمانوں کو متنبہ کر دوں کہ صحبتِ مرشد کے بغیر کوئی خام طبع انسان پختہ نہیں ہو سکتا، اور جو لوگ اس کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ محض کتابوں سے دین سمجھ میں آسکتا ہے یا چراغ روشن ہو سکتا ہے وہ دراصل دین سے ناواقف ہیں اور مسلمانوں کے نادان دوست ہیں۔

تیسری خصوصیت:-

ع درسِ اذ اللہ بس باقی ہوس

نبی اپنے متبعین کے قلوب میں اس صداقت کو جاگزیں کر دیتا ہے کہ

"اللہ بس باقی ہوس"

یعنی مومن کا فرض یا شعارِ زندگی یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کو اپنا محبوب، مطلوب معبود اور مقصود بنائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ جلّ شانہٗ اپنے بندوں کے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے اور جب وہ اکیلا ہی اس کے لئے بس کرتا ہے (کافی ہے) تو پھر بندے کا غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونا دراصل ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ (بندہ) اُس (اللہ) کو کافی یقین نہیں کرتا۔ اگر وہ اس کو کافی یقین کرتا ہے تو غیر کی طرف کبھی ہرگز متوجہ نہ ہوتا۔ حق تعالے نے خود ہمیں صاف لفظوں میں آگاہ فرما دیا ہے:-

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ (۳۹-۳۶)

کیا اللہ (بذاتِ خود) اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے[1]

الغرض جب یہ عقیدہ دل میں راسخ ہو جاتا ہے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے۔ یعنی میری تمام حاجات پوری کر سکتا ہے تو پھر مردِ حق کسی انسان کی غلامی نہیں کر سکتا۔ وہ سب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کو اپنے لئے کافی سمجھتے تھے اس لئے ان کی نگاہ میں دنیاوی ساز و سامان اور مال و دولت کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اور نہ وہ کوئی چیز کل کے لئے جمع کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اللہ نے رزق کا ذمہ لے لیا ہے۔ چنانچہ وہ حصولِ رزق کے لئے کبھی سلاطین کے دروازوں پر نہیں جاتے تھے۔ رزق خود ان کے پاس آ جاتا تھا۔

جب نواب امیر خاں والئ ریاست ٹونک حضرت شیخ غلام علی نقشبندی دہلوی خلیفہ حضرت میرزا مظہر جانجاناںؒ (المتوفی ۱۲۴۰ھ) کی خدمت میں چار گانوں کی معافی کا فرمان بھیجا تو انہوں نے اس کی پشت پر یہ شعر لکھ کر نواب کو بھیج دیا۔

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

لیکن اس شانِ استغنا کے باوجود کہ انہوں نے ساری عمر کسی دولتمند سے سوال نہیں کیا۔ ان کی خانقاہ کا خرچ ہزار روپے سے کم نہ تھا۔

---

[1] اسی مضمون کو رحیم (عبدالرحیم خانخاں) نے یوں ادا کیا ہے :-

جا کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی
بال نہ بیکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے

یعنی جسے خدا زندہ رکھنا چاہے اسے ساری دنیا کے لوگ مل کر بھی قتل نہیں کر سکتے۔

اس کے مقابلہ میں ارباب ہوس کا حال یہ ہے کہ ساری عمر دنیا کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں مگر ہاتھ نہیں آتی۔

چوتھی خصوصیت: ع۔ معنی جبریل و قرآن است او الخ

اس مصرع میں "او" کا مرجع ذاتِ اقدس ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) لیکن ربطِ کلام کی خاطر لفظ نبی استعمال کروں گا۔ کہتے ہیں کہ نبی جبریل اور قرآن کا معنی اور مفہوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کا وجود ہستی باری تعالیٰ اور ہستی ملائکہ پر حجت اور دلیل ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا اور فرشتے دونوں غیر مشہود ہیں۔ اور میں قبل ازیں اس بات کو ثابت کر چکا ہوں کہ مجرد عقل نہ خدا کا اثبات کر سکتی ہے نہ فرشتوں کا۔ اس کی رسائی صرف محسوسات تک ہے۔ اور خدا محسوسات سے وراء الورا ہے۔ اس لئے عقل اس باب میں قطعی طور پر عاجز ہے۔ لیکن نبی خدا سے علم پا کر اسی کی ہستی کا اعلان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے بذریعہ (وحی) جبریل مجھے اپنی ہستی سے مطلع کیا ہے۔ اس طرح نبی کے وجود سے خدا اور ملائکہ دونوں کی ہستی ثابت ہو جاتی ہے۔ علامہ مرحوم نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا کہ اگر آنحضرت صلعم نہ فرماتے کہ خدا موجود ہے

تو میں خدا کی ہستی پر محض اپنی عقل کی مدد سے ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ چونکہ آپ کی بدولت مجھے خدا پر یقین حاصل ہوا۔ اس لئے آپ خدا سے بھی بڑھ کر مجھے محبوب ہیں۔ چنانچہ رموز میں کہتے ہیں:۔

معنی حسن ختم کنی تحقیق اگر | بنگری با دیدۂ صدیق رضؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ | از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

اب رہا نبی کا معنی قرآن ہونا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے اقوال اور اعمال سے قرآن کا مفہوم انسانوں کو سمجھایا۔ آپ کا وجود قرآن کی زندہ تفسیر ہے۔ مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ نماز پڑھنے کا طریقہ آپ نے ہمیں بتایا۔ اسی طرح شریعت کے تمام احکام پر آپ نے

عمل کر کے دکھایا۔ لہٰذا آپؐ کی زندگی قرآن کی تشریح ہے۔ اگر سنت نبوی کو دین سے خارج کر دیا جائے تو قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور چونکہ سنت نبوی احادیث میں محفوظ ہے اس لئے حدیث بلاشبہ دینی معاملات میں اسی طرح حجت ہے جس طرح قرآن۔ بالفاظِ دیگر قرآن دین کے لئے بمنزلہ متن ہے اور حدیث اس کی شرح ہے۔ اس لئے حدیث کا انکار درپردہ قرآن کا انکار ہے۔

میں نے اس نکتہ کی صراحت اس لئے کی ہے کہ اس زمانہ میں بعض مسلمان یہ کہتے ہیں کہ حدیث دین میں حجتؔ نہیں ہے۔ قرآن ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اس شرح میں فتنۂ انکار حدیث کی مکمل تردید تو ممکن نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کو اس فتنۂ عظیمہ سے بچانے کے لئے چند آیات ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے کلام پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتا ہے۔

وَ اَنزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۝ (۱۶-۴۴)

اور ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ کھول کر بیان کر دینگے لوگوں کے لئے معنی اور مفہوم اس کا جو کچھ نازل کیا گیا ہے انکی ہدایت کے لئے۔۔ یعنی قرآن کے مطالب اور معانی لوگوں کو شرح اور بسط کے ساتھ سمجھا دیجئے۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی یا نہیں؟

اگر نہیں کی تو آپ کی رسالت ساقط ہوتی ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ آپ نے ضرور تعمیل کی۔

اگر تعمیل کی تو آپ کی وہ تفسیر اور تشریح کہاں ہے؟ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ آپ کی تفسیر ہی کا دوسرا نام حدیث نبوی ہے۔ لِتُبَيِّنَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ قرآن کے بعض احکام مجمل ہیں ورنہ بیان (تشریح) کی کیا ضرورت تھی مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زکوٰۃ دو۔ مگر زکوٰۃ کی تفصیل قرآن میں بیان نہیں کی گئی آپ نے بتایا کہ کس چیز پر کتنی زکوٰۃ واجب ہے۔ لہٰذا حدیث حجت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ منکرین حدیث خود اپنے فعل سے اپنے قول کی کہ قرآن محتاج بیان نہیں ہے تکذیب کرتے ہیں۔ یہ حضرات بڑے اہتمام کے ساتھ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں اور اسے شائع کرنے کی زحمت بھی مول لیتے ہیں۔ جب قرآن اپنا تفسیر خود کرتا ہے تو یہ لوگ کیوں کرتے ہیں۔؟ تیسری بات یہ ہے کہ میں آجتک یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ان لوگوں کو تو قرآن کی تفسیر کا حق حاصل ہے مگر جس مبارک ہستی پر قرآن نازل ہوا اسے تفسیر کا حق حاصل نہ تھا

چوتھی بات :۔ ان لوگوں کے طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ رسول اعوذ باللہ محض ایک پیغام رساں تھا۔ اس نے پیغام پہنچا دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ اس کا مطلب تم خود سمجھو۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کا انکار کرنے کے بعد منکر حدیث کا کوئی روحانی رابطہ آپ سے قائم نہیں ہو سکتا۔

فافہم وتدبر ) اس شعر کا دوسرا مصرع بہت غور طلب ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ نبی کہ معنی جبریل و قرآن ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ فطرت اللہ کا نگہبان بھی ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ فطرت اللہ قرآن حکیم کی اصطلاح ہے۔ اور اس آیت سے ماخوذ ہے :۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ( ۳۰ - ۴۰

پس راست کر اپنے مونہہ کو عبادت ( اطاعت ) کے لئے یکسو اور ایک رُخ ہو کر ( یعنی ) پیروی کر خدا کے دین ( اللہ کی فطرت ) کی ( اور یہ خدا کا دین کیا ہے؟ وہی تو ہے ) جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ یعنی ان کی تخلیق ہی اس نہج پر کی ہے کہ وہ بلا تکلف دین خدا کی پیروی کر سکیں۔ اس دینِ خدا میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اور یہی ہے دین درست اور صحیح۔

فی الجملہ فطرت اللہ سے مراد ہے دین اللہ۔ اور اسی سے سرشت انسانی ہی مراد ہے۔ جیسا کہ خلق اللہ سے واضح ہو رہا ہے مطلب یہ ہے کہ

دین اللہ یعنی اسلام عین سرشت (فطرت) انسانی ہے۔ اور اس معنی کی تائید و تصدیق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَتِ فَاَبَوَاهُ يُنَصِّرَانِهِ اَوْ يُهَوِّدَانِهِ اَوْ يُمَجِّسَانِهِ۔

یعنی ہر بچہ اپنی فطرت سلیمہ یعنی دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے (اللہ نے انسان کی سرشت ایسی بنائی ہے کہ خود بخود دین اسلام کی طرف مائل ہوتا ہے۔ مگر اس کے والدین اسے نصرانی یا یہودی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

قرآن اور حدیث کے مطالعہ اور اس کی تعلیمات میں تدبّر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ حکم دیا کہ "اقم وجہك للدین" یعنی دین اسلام (دینِ فطرت) کی پیروی پر کمر بستہ ہو جاؤ تو یہ حکم خارج سے اس پر مسلط نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے صرف اس کی سرشت کے تقاضے کی تکمیل کی طرف متوجہ کیا ہے۔ بالفاظ دگر، اقامت وجہ برائے دین کسی بیرونی طاقت کا خارجی دباؤ یا غلبہ نہیں ہے۔ بلکہ دین اسلام کی پیروی خود سرشتِ انسانی کا اقتضا ذات ہے۔ جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

جب ایک شخص دین اسلام کی پیروی کرتا ہے تو وہ اپنی سرشت (تخلیق) کے باطنی تقاضوں کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ دیگر ہیچ اس فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اور یہی فطرت "دینِ قیّم" ہے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ فطرت اللہ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے خود اس کا جواب دے دیا ہے۔ کہ تمہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے اندر غور کر کے دیکھ لو شریعت خارج سے تم پر مسلط نہیں ہوئی ہے ہم نے تمہیں دینِ فطرت ہی پر پیدا کیا ہے۔ تمہاری سرشت اور دین دونوں عین یکدگر ہیں۔[1]

---

[1] اقبال نے اس شعر میں اسی صداقت کو بیان کیا ہے :-

شمع بر خیزد ز ماعماق حیات ۔۔۔ روشن از نورش ظلام کائنات

نوٹ :- خدا کی ہستی اس کی وحدانیت اور اس کی صفات اور آخرت کے متعلق قرآن کا اسلوب بیان وہ نہیں ہے جو منطقی مقدمات اور فلسفیانہ استدلال کا ہوتا ہے بلکہ وہ نہایت دلنشیں انداز میں انسان کی فطرت اور اس کے وجدانی ذوق کو مخاطب کرتا ہے۔ اور اس کے قلبی احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک خالق اور پروردگار ہستی (خدا) کا اعتقاد تمہارے ضمیر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے تم اگر اپنے دل کی آواز سن سکو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ خدا کی ہستی کا اعتراف کر رہی ہے۔
اکبر الہ آبادی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے :-

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں، تیری پہچان یہی ہے

باز آمدم برسر مطلب، اقبال کہتے ہیں کہ

ع فطرت اللہ را نگہبان است او

یعنی نبی (حضور انور بدرجہ اولیٰ اور اتم مراد ہیں) دین اسلام کا (اور دین اسلام عین فطرت انسانی ہے) نگہبان ہوتا ہے۔ وہ یہ نگہبانی کس طرح کرتا ہے؟ دین اسلام کے تابناک چہرے پر غلط عقائد کی جو بھی قدر گرد و غبار مرور ایام سے جم جاتی ہے۔ وہ اس کو دور کر کے فطرت اللہ (دین اللہ) کو حقیقی اور اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بالفاظ واضح تر خدا کا دین انسانوں کی جردی کی بنا پر مسخ ہو چکا تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ قرآن اسے از سر نو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور چونکہ یہ کتاب زندہ قیامت تک فطرت اللہ کی نگہبانی کرتی رہے گی۔ اس لئے آپ بجا طور پر نگہبان فطرت اللہ ہیں۔

پانچویں خصوصیت :- ع حکمتش برتر زعقل ذوفنوں۔
نبی کی حکمت عقل سے برتر ہوتی ہے۔ یعنی نبی ان حقائق کی تعلیم دیتا ہے

جو بذریعۂ عقل معلوم نہیں ہو سکتے۔ مثلاً خدا، ملائکہ، آخرت، حشر و نشر وغیرہ حکمتِ نبوی "برتر" اس لئے ہوتی ہے کہ وہ وحی سے ماخوذ ہوتی ہے۔ اور وحی، عقل سے برتر ہوتی ہے بلکہ؎

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

کہاں عقلِ انسانی جو ہر وقت غلطی کرتی رہتی ہے۔ اور کہاں وحی یزدانی جس میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔

دوسرا مصرع آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم کی بدولت دنیا میں ایک قوم پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جو لوگ اس کے دین میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ منکروں کے مقابلہ میں ایک مستقل جماعت (امت) بناتے ہیں بالفاظِ دیگر، یعنی قومیت کی بنیاد، وطن، زبان، نسل رنگ یا جغرافیائی حدود پر رکھنے کے بجائے دین (عقیدہ توحید) پر رکھتا ہے اس لئے جو لوگ اس کی تعلیم قبول کرتے ہیں وہ خود بخود ایک مستقل قوم (امت) بن جاتے ہیں۔

چھٹی خصوصیت:- نبی حکمراں تو ہوتا ہے۔ مگر وہ عام مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ نظامِ ملوکیت قائم نہیں کرتا جو اسے تخت و تاج کی ضرورت لاحق ہو۔ وہ تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کو نافذ کرتا ہے اور خدا کی نظر میں سب انسان یکساں ہیں اس لئے نبی یا اس کا جانشین نہ تخت پر بیٹھ سکتا ہے نہ تاج سر پر رکھ سکتا ہے۔

ساتویں خصوصیت:- ہمہ از نگاہش فرودیں خیزد ز دے الخ

فرودیں کنایہ ہے موسمِ بہار سے اور دے کنایہ ہے موسمِ خزاں سے۔ بہار کنایہ ہے عروج اور خوش نصیبی سے خزاں کنایہ ہے تباہی اور زوال سے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں غیر معمولی تاثیر پائی جاتی ہے۔ وہ ایک مایوس اور ناکام انسان کو ایک نگاہ میں پُر امید اور کامران بنا سکتا ہے۔

یعنی انسانوں کی زندگی میں انقلابِ عظیم برپا کر سکتا ہے۔

مثلاً" ابن خطاب رضؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے حضرت ارقم رضؓ کے دروازہ پر دستک دی تھی چونکہ شمشیر بکف تھے اس لئے صحابہؓ کو تشویش لاحق ہوئی۔ مگر سید الشہدا حضرت حمزہ رضؓ نے فرمایا دروازہ کھول دو۔ اگر وہ کسی فاسد ارادے سے آیا ہے تو انشاء اللہ اُسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔"

جب حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور ان کی طرف دیکھا۔ یوں سمجھو کہ ایک نگاہ ڈالی۔ جس نے عمرؓ کی کایا ہی پلٹ دی۔ اور فرمایا۔ عمر! کیوں آئے ہو؟ عمرؓ کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی اور ہمہ تن اطاعت و انقیاد بن کر کہنے لگے۔

"آپ پر ایمان لانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

اگر یہ "فیضانِ نظر" نہ تھا۔ تو پھر فرائڈ اور ایڈلر کے متبعین اس محیر العقول حادثہ (PHENOMENON) کی کیا نفسیاتی توجیہ پیش کریں گے؟ وہ تو قتل کی نیت سے آئے تھے تو حلقہ بگوش کیسے ہو گئے؟

نوٹ :- نبی تو خیر بہت بڑی چیز ہے مورد انعام و اکرام وحی و الہام معصوم عن الخطاء منبع صدق و صفا! نبی کے ادنیٰ غلاموں کی نگاہ میں بھی (نبی کی توجہ کی بدولت) یہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ

از نگاہش فرودیں خیز و زدے
دُرد ہر خم تلخ تر گردد زمے

اب دوسرے مصرع کا مطلب لکھتا ہوں:

دُرد بمعنی تلچھٹ، کنایہ ہے بیکار بے قیمت اشیاء یا افراد سے تلخ تر بمعنی زیادہ قیمتی (تلخی ہی شراب کی خوبی ہے۔ اسی پر اس کی قدر و قیمت موقوف ہے۔ جتنی تلخ ہو گی اتنی ہی نشہ آور ہو گی۔)

مطلب یہ ہے کہ اس کی نگاہ کی تاثیر سے ناکارہ اور بے قیمت افراد (کفارِ عرب) نہایت مفید اور کار آمد بلکہ قیمتی افراد بن جاتے ہیں (صحابہ کرامؓ)

ساتویں خصوصیت :۔ ع درسِ لا خوفٌ علیہم می دہد۔ الخ

نبی اپنی جماعت کے افراد کو غیر اللہ کے خوف سے آزاد کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا پہلا سبق یہ ہوتا ہے کہ زندگی اور موت نفع اور نقصان عزت اور ذلت یُسر اور عُسر فراخی اور تنگی۔ تونگری اور افلاس۔ رزق کی فراوانی یا کمی اعطائے اولادِ ذکور یا اناث، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا کسی انسان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کسی انسان میں کسی انسان کو نہ نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان پہنچانے کی۔

جب انسان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی میں کوئی قدرت[1] نہیں ہے۔ تو وہ سب سے منہ موڑ کر اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے مقامِ ولایت کہتے ہیں اور اولیاء کی شان بروئے قرآن یہ ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۱۰-۶۲)

آگاہ ہو جاؤ کہ بلاشبہ جو لوگ مرتبہ ولایت پر فائز ہو جاتے ہیں ان کی زندگی خوف اور حزن دونوں آفتوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ دنیا اور عقبیٰ دونوں میں ان دونوں مصیبتوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

غور سے دیکھو تو ہر انسان (باستثنائے اولیاء اللہ) از بدوِ شعور تا دمِ وفات انہی دو آفتوں میں گرفتار رہتا ہے۔ اور انہی کی وجہ سے اس کی زندگی

---

[1] اکبر الہ آبادی نے کیا خوب لکھا ہے ؎

دل میں تو ضعفِ عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

تلخ ہو جاتی ہے۔ زندگی کی ساری تلخی عبارت ہے۔ انہی دو بلاؤں سے۔ اگر یہ دو آفتیں نہ ہوتیں تو کسی انسان کو جنت کی آرزو نہ ہوتی، یہی دنیا جنت بن جاتی۔ آخر جنت میں وہ کیا شئی ہے جو دنیا میں نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اطمینان قلب (شانتی) اور مسرت نہیں ہے۔ بالفاظِ دگر دنیا اور جنت میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ جنت میں نہ کسی کو خوف ہوگا۔ نہ حزن ہوگا۔ چنانچہ جو لوگ زمرۂ اولیا میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے لئے یہی "دکھ بھری دنیا[1] جنت بن جاتی ہے۔

سب سے پہلے خوف اور حزن کے اسباب بیان کرتا ہوں پھر ان کے ازالہ کی صورت بیان کروں گا۔

(ا) ہر انسان (بادشاہ و ولی) صاحب اقتدار افراد کو مالک نفع و ضرر سمجھتا ہے۔ اس لئے ان سے ڈرتا ہے مبادا وہ کسی وجہ سے ناراض ہو جائیں تو مجھے نقصان (ضرر) پہونچا دیں گے۔ ضرر کی مختلف صورتیں ہیں:-

۱۔ مجھے قتل کرا دینگے۔

۲۔ جیلخانہ بھجوا دیں گے۔

۳۔ مالی نقصان پہونچا دیں گے۔

۴۔ ذلیل و رسوا کر دیں گے۔

۵۔ ملازمت سے محروم کر دینگے۔ وقس علیٰ ھٰذا

اس کے علاوہ ہر انسان بہت سے توہمات (Imaginary Fears) میں گرفتار رہتا ہے۔ یعنی وہ ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں:-

۱۔ میری محبوبہ مجھ سے خفا نہ ہو جائے۔

---

[1] اس تعلیم کا موازنہ بدھ دھرم سے کرو۔ جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے۔ سروھم دُکھم۔ یعنی یہ کائنات دکھ سے عبارت ہے۔

۲۔ میری دولت ضائع نہ ہوجائے۔
۳۔ میری کھیتی نہ اُجڑ جائے یا زمین دریا برد نہ ہوجائے۔
۴۔ میں نے جو روئی چار روپے من خریدی ہے کہیں اس کا بھاؤ نہ گر جائے۔
وقس علیٰ ھذا

خوف کی تیسری قسم یہ ہے کہ ہر انسان (باستثنائے ولی) ہر روز گناہوں کا ارتکاب (خدا کی نافرمانی) کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ہر وقت یہ خوف اس کے تحت الشعور میں کار فرما رہتا ہے

۱۔ میں نے جو رشوت لی ہے کہیں اس کا علم میرے افسروں کو نہ ہوجائے۔
۲۔ میں نے حکومت کو فریب دیکر جو "پرمٹ" حاصل کیا ہے اس کا راز فاش نہ ہوجائے۔ [1]
۳۔ میں نے ناجائز طریقے سے جو دولت جمع کی ہے کہیں اس کا علم حکومت کو نہ ہوجائے
۴۔ میرے غبن، میری خیانت، میرے فریب، میری عیاری کا بھانڈا نہ پھوٹ

---

[1] خدا نے ہر شخص کو ضمیر کی نعمت سے نوازا ہے تاکہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکے کہ میں نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا جب ہم کسی بُرے (evil) کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ باطنی قوت ہمیں متنبہ کر دیتی ہے کہ یہ کام اچھا نہیں ہے۔ اور جب ہم اس بُرے کام کے مرتکب ہوجاتے ہیں تو ہمارا دل چپکے سے ہم سے کہتا ہے کہ یہ کام اچھا نہیں کیا۔
کانٹ اس اخلاقی حاسہ یا قانون کو خدا کی ہستی پر موثر ترین دلیل قرار دیتا ہے۔
"THE STARRY HEAVENS ABOVE ME AND THE MORAL LAW WITHIN ME".
یعنی خارج میں نظام کائنات اور باطن میں اخلاقی قانون (ضمیر کی آواز) خدا کی ہستی پر دو سب سے بڑے گواہ ہیں۔ ۱۲

جائے۔ وقس علیٰ ھٰذا!

خلاصہ کلام اینکہ جس شخص کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے استوار نہیں ہوتا وہ ہر وقت کسی نہ کسی کے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ گویا زبانِ حال سے کہتا رہتا ہے ؎

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

(ب) ہر انسان (باستثنا دلی) جس طرح آئندہ حوادث، مصائب اور آفات سے خوفزدہ رہتا ہے۔ اسی طرح زمانۂ ماضی میں جو غلطیاں، حماقتیں اور نادانیاں اس سے سرزد ہو چکی ہیں اور جن کے نتائج اس کے حق میں بہت مضرت رساں نکلے ہیں۔ ان پر کفِ افسوس ملتا رہتا ہے۔ پچھتاتا رہتا ہے۔ رنجیدہ اور ملول رہتا ہے ان کیفیات کو قرآن نے حزن سے تعبیر کیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ ہر دنیا دار (جو حق کی مشیت پر ایمان نہیں رکھتا اور اسے مدبر و منظم کائنات یقین نہیں کرتا۔ خوف اور حزن ان دو بلاؤں میں گرفتار رہتا ہے جس کی وجہ سے اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ لیکن نبی ان دونوں باتوں کا ازالہ کر دیتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ

(۱) مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ (۵۷-۲۰)

اے لوگو! نہیں پہونچتی کوئی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ لکھی ہے ایک کتاب میں (یعنی مقدر ہو چکی ہے علمِ الٰہی میں) قبل ازیں کہ ہم پیدا (ظاہر) کریں اس کو۔ بلاشبہ یہ بات اللہ پر آسان ہے تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے فوت ہو جائے۔ اور نہ اتراؤ اس پر جو وہ تمہیں عطا کرے۔

یہ آیت نصِ صریح قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہے اس بات پر

کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ خالق کائنات کی مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ انصرام و انتظام کائنات صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے کسی مخلوق کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ تمام واقعات و حوادث قبل ظہورِ علم ازلی میں مقدر ہو چکے ہیں۔ اللہ تو فرماتا ہے کہ جس طرح ہم نے یہ کائنات اپنی مرضی سے پیدا کی ہے۔ اسی طرح ہم اپنی مرضی کے مطابق اسے چلا رہے ہیں۔ چونکہ ہم علیم بھی ہیں اور قدیر بھی۔ اس لئے پہلے سے جانتے ہیں۔ پھر (اس علم کے مطابق ہی) پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقدیری امور ہمارے لئے بالکل آسان ہیں۔ لہٰذا تمہارے اطمینان کے لئے ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ چونکہ سب کچھ ہماری مشیت کے مطابق ہو رہا ہے اس لئے۔

(ا) جو مصیبت تم پر نازل ہو مثلاً جوان بیٹا مر جائے یا جو نقصان تمہیں پہونچے۔ مثلاً گودام میں آگ لگ جائے اس پر رنج مت کرو۔

(ب) جو راحت تمہیں نصیب ہو مثلاً تم ایک مفلوک الحال سپاہی کے گھر پیدا ہوئے مگر جوان ہو کر احمد شاہ ابدالی بن جاؤ تم اس عروج کو اپنی کوشش یا دانائی کا نتیجہ قرار دے کر فخر مت کرو۔ ہم نے تمہیں اپنی مشیت کے مطابق ادنیٰ سے اعلیٰ بنا دیا۔

(۲) قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۵ (۹-۵۱)

اے رسول! آپ ان منافقوں سے کہہ دیجئے (کہ تم جو ہماری مصیبت پر زبانِ طعن دراز کرتے ہو کہ اگر ہم تمہارے کہنے پر چلتے تو مصائب سے محفوظ رہتے۔ یہ تمہاری حمایت پر دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ہرگز نہیں

---

[۱] اکبر الہ آبادی نے اسی مضمون کو یوں پورا ادا کیا ہے۔

مفت کیوں اپنی جان کھوتا ہے
جو خدا چاہتا ہے ہوتا ہے

پہنچیگی کوئی مصیبت مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے پہلے ہی سے مقدر کر دی ہے۔ وہی ہمارا آقا اور مالک ہے۔ اور (ہم) ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل (بھروسہ) رکھنا چاہیئے۔

۲۔ قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیہم القتل الیٰ مضاجعہم

اے رسول! آپ ان منافقوں سے جو اپنی طاقت کی وجہ سے آپ پر اعتراض کر رہے ہیں کہ اگر آپ مدینہ ہی میں رہ کر جنگ کرتے تو جو مسلمان دامن کوہِ احد میں شہید ہوئے وہ شہید نہ ہوتے) کہہ دیجئے کہ اگر تم جان بچانے کے لئے اپنے گھروں کے اندر بھی چھپ کر بیٹھ جاتے تو بھی جن لوگوں کے لئے قتل ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ وہ گھروں سے اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل کھڑے ہوتے (۳۔ ۱۵۴)۔

(۴) وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتٰباً مؤجلاً (۳۔ ۱۴۵)

اور نہیں مر سکتا کوئی شخص مگر اللہ کے حکم سے اپنے وقت مقرر پر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی موت کا وقت معین کر دیا ہے۔ اور اس میں نہ تاخیر ہو سکتی ہے نہ تقدیم۔

(۵) اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر ط (۱۳۔ ۲۶)

اللہ ہی روزی فراخ کرتا ہے جس کی چاہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کی چاہے۔ مطلب یہ ہے کہ کشادگی اور تنگی مقدر ہو چکی ہے۔

(۶) تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر ط (۳۔ ۲۶)

اے خدا! تو جسے چاہے اسے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے اسے ذلت دیتا ہے۔ ہر قسم کا خیر تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہے۔

(۷) یخلق ما یشاء ط یھب لمن یشاء اناثاً و یھب لمن یشاء الذکور ۵

اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے۔ (۴۲۔ ۴۹)

اس قسم کی آیتیں تو بہت سی ہیں مگر ایضاح مقصد کے لئے یہی کافی ہیں۔ اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ

(ا) موت اور زندگی اللہ کے اختیار میں ہے وقت سے پہلے نہ کوئی شخص مر سکتا ہے اور نہ کوئی شخص کسی کو مار سکتا ہے۔[1]

(ب) نزولِ مصائب اس کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص دوسرے کو اپنی مرضی سے نہ مبتلائے مصائب کر سکتا ہے نہ راحت پہنچا سکتا ہے۔

(ج) رزق میں کمی یا بیشی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ کوئی شخص دوسرے کی روزی نہ چھین سکتا ہے نہ اس میں زیادتی یا کمی کر سکتا ہے۔

(د) عزت اور ذلت اس کے اختیار میں ہے۔

(ہ) اولاد عطا کرنا اس کے اختیار میں ہے۔

(و) نفع اور ضرر اس کے اختیار میں ہے۔

(ز) صحت اور مرض اس کے اختیار میں ہے۔

جب یہ تمام حقائق اللہ کے کلام سے ثابت ہیں تو جو شخص اس پر ایمان رکھتا ہے وہ نہ دوسروں سے ڈرے گا نہ کسی نقصان پر رنجیدہ ہوگا۔ جو شخص دوسروں سے ڈرتا ہے وہ دراصل ان کو مالک، مختار اور فاعل حقیقی سمجھتا ہے۔ حالانکہ بقول غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ لا فاعل فی الحقیقۃ الا اللہ یعنی درحقیقت اللہ کے سوا کوئی فاعل نہیں ہے۔ اگر،

---

[1] یہی صداقت تو حضرت عالمگیر کے سامنے تھی جو انہوں نے دوران محاصرۂ قندہار میں عین تیروں کی بارش میں نہایت اطمینان کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی تھی۔ دشمن نے انہیں تاک تاک کر اپنے تیروں کا نشانہ بنانا چاہا مگر انہیں مطلق گزند نہ پہنچا ان کے لئے تو پچاس سال تک حکمرانی مقدر تھی لہٰذا نہ وہ مر سکتے تھے اور نہ کوئی انہیں مار سکتا تھا۔ ۱۲ منہ دیکھو فتوح الغیب مقالہ سوم ۱۲۔

فعل کی قوت عطا نہ کرے تو کسی سے کوئی فعل سرزد ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے۔

مَا شَاۤءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ۵ (۱۸-۴۰)

جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ جب تک اللہ کسی کو قوت عطا نہ کرے کسی میں کوئی قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایک شخص حضرت شیخ شیوخِ عالم بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی کہ میرے لئے بادشاہ کو سفارشی خط لکھ دیجئے۔ حضرت نے حسبِ ذیل خط لکھ کر اس کو دیا۔

"اے بادشاہ! میں نے اس شخص کی حاجت سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کی بعد ازیں تجھ سے بیان کرتا ہوں۔ اگر تو اس کی حاجت پوری کر دیگا تو در اصل معطی اللہ (عطا کرنے والا یعنی حاجت روا) ہے۔ تو مشکور ہو گا۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو در اصل مانع اللہ (روکنے والا) ہے۔ اور اس صورت میں تو معذور ہو گا۔ والسلام"

اس خط کے مضمون سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت کی نگاہ میں جب تک اللہ نہ چاہے کوئی انسان نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔

اس آیت کا مضمون دنیاوی زندگی کے علاوہ اخروی زندگی پر بھی حاوی ہے۔ یعنی مومنوں کو قیامت کے دن نہ خوف ہو گا نہ حزن۔ چونکہ دنیاوی زندگی میں انہوں نے احکامِ الٰہی کی تکمیل کی۔ اور اسی کی مشیت پر راضی رہے۔ اس لئے قیامت میں اللہ ان سے راضی ہو جائیگا۔ جیسا کہ خود قرآن فرماتا ہے:-

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ (۹۸-۸)

قیامت کے دن اللہ ان سے راضی ہو گا۔ اور وہ اللہ سے راضی ہونگے۔

یہ صورتِ حال اس شخص کے لئے ہے جو دنیاوی زندگی میں اپنے رب کی نافرمانی سے ڈرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ جس بندے سے اللہ راضی ہوگیا اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

آٹھویں خصوصیت:۔ ع عزم و تسلیم و رضا آموزدش

اس سے پہلے اقبال نے یہ لکھا ہے :۔

ع مومن از عزم و توکل قاہر است

عزم کی وضاحت اس مصرع کی شرح میں ہو چکی ہے تسلیم و رضا کی وضاحت آئندہ فصل کے اس شعر کی شرح میں کی جائیگی :۔

مصطفےٰ داد از رضائے او خبر

یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ تسلیم و رضا در اصل توکل کا نتیجہ ہے۔ توکل کا مفہوم یہ ہے کہ مومن اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عزم کی قوت عطا کی ہے اور عمل کا اختیار دیا ہے۔ اس لئے میرا یہ فرض ہے کہ جہاد کا عزم کروں۔ (جہاد عمل کی اعلیٰ صورت کا نام ہے) اور اس محدود اختیار کی بنا پر اپنے عزم کو عملی جامہ پہناؤں۔ عمل تو میرے اختیار میں ہے مگر کامیابی حاصل کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے اس لئے یہ بات میں اللہ کے فضل و کرم پر چھوڑتا ہوں۔ اس کی مرضی ہوگی تو کامیابی حاصل ہو جائیگی۔

اگر میں کامیاب ہوگیا تو یہ اس کا فضل ہے۔ اگر نہ ہوا تو راضی بہ رضا ہوں۔ خدا نے مجھے جہاد کا حکم دیا ہے یعنی عمل کا مکلّف ٹھہرایا ہے۔ لہٰذا میرا کام جہاد کرنا ہے۔ و نتیجہ (کامیابی یا ناکامی) اس کے اختیار میں ہے۔ قیامت کے دن مجھ سے یہ سوال تو ضرور ہوگا کہ جہاد کیوں نہیں کیا جبکہ ہم نے تجھے جہاد کی قوت عطا کی تھی لیکن یہ سوال نہیں ہوگا کہ کامیابی کیوں نہیں حاصل کی۔

الغرض مومن عزم کے بعد خدا پر توکل کر کے سرگرم جہاد ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ بس یہی شیوہ تسلیم و رضا ہے یعنی وہ

ہر حال میں راضی رہتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو بھی شکر بجا لاتا ہے اور اگر شہید ہو گیا۔ تو بوقتِ شہادت زبانِ حال سے یہ کہتا ہے :-

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

سلطان ٹیپو شہید کی زندگی شیوۂ تسلیم و رضا کی ایک روشن مثال ہے اس نے اسلام کی سربلندی کے لئے حتی المقدور کوشش کی۔ اللہ نے جس قدر اختیار اسے دیا تھا۔ اس میں یہ کام لے کر اس نے دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کیا لیکن مشیتِ ایزدی یہی تھی کہ وہ شہید ہو جائے۔ اسی لئے اس نے اللہ کی مشیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور شہادت کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ اس کا بھروسہ مادی اسباب پر نہیں تھا بلکہ خدا پر تھا۔ اسی کو توکل کہتے ہیں اور توکل سے مومن میں شانِ تسلیم۔ رضا پیدا ہو جاتی ہے۔

نویں خصوصیت :- ؏ من نمی دانم چہ افسوں می کند۔

مطلب یہ ہے کہ نبی اپنی روحانی طاقت کی بنا پر ان لوگوں کے اندر جو اس کی صحبت اختیار کرتے ہیں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیتا ہے۔ بلکہ انہیں نئی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ اس کی صحبت میں وہ تاثیر ہوتی ہے کہ نا کارہ (خزف) افراد مفید خلائق (دُر) بن جاتے ہیں۔ اور اس کی تعلیم نادانوں (تہی) کو دانا (پُر) بنا دیتی ہے۔

دسویں خصوصیت :- بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز

نبی اپنی روحانی طاقت کی بدولت اپنی جماعت کے افراد میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شمشیر بکف ہو کر تمام معبودانِ باطلہ کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔

مثال درکار ہو تو صحابہ کی زندگیوں کا مطالعہ کافی ہو گا۔ اسلام لانے سے پہلے وہ "خزف" اور "تہی" تھے۔ لیکن فیضِ صحبت سے ان کے اندر ایسا

انقلاب پیدا ہو گیا۔ انھوں نے ساری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

## مردِ حق یعنی مسلمان سے خطاب

اب اقبال مردِ حق سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔
(۱) اے مردِ حق! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت اختیار کر کے یعنی آپ کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تجھ میں یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ تو سبحان ربی الاعلیٰ کہہ کر اس دیرِ کہن کے افسوں کو باطل کر دے۔
افسون دیر کہن سے مراد ہے۔ دنیا اور اس کی لذات اور دلچسپیاں جب ایک شخص دنیا کو مقصود بنا لیتا ہے تو قرآنی زاویۂ نگاہ سے وہ دنیا اس کی معبود بن جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کی تعلیم یہ ہے۔ کہ
(الف) ہر محبوب انسان کا مقصود ہو جاتا ہے۔
(ب) اور ہر مقصود اس کا معبود بن جاتا ہے۔
محبوب سے مراد ہے مطاع یعنی معبود وہ ہے جس کی اطاعت کی جائے اور جس کو راضی کرنے اور راضی رکھنے کی کوشش کی جائے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں امتحان کی غرض سے بھیجا ہے۔ امتحان کی صورت یہ ہے کہ اس نے انسان کے دل میں عورت اور دولت کی محبت رکھ دی ہے اور اس کے بعد یہ حکم دیا ہے کہ میری محبت کو ان کی محبت پر غالب اور فائق رکھو۔ یعنی جب ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا موقع آئے تو عورت اور دولت دونوں کو میری محبت پر قربان کر دو۔ جسے شریعت کہتے ہیں۔ در اصل اس امتحان کا نصاب (COURSE) ہے۔ جب ایک شخص اسے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیتا ہے تو یہ طریقت ہے۔
جب وہ امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ معرفت ہے۔ جب اسے کامیابی کا ثمرہ حاصل ہوتا ہے تو یہ حقیقت ہے۔

اب میں آیاتِ قرآنی سے اپنے دعویٰ کو مبرہن کرتا ہوں۔
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ٥

آراستہ کی گئی ہے انسانوں کے لئے محبت آرزوہائے نفس کی (اب نفسانی خواہشات کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ مثلاً عورتیں[۱] بیٹے[۲] سونے چاندی کے خزانے[۳] جمع کردہ شدہ نشان زدہ (قیمتی) گھوڑے[۴] اور چارپائے[۵] اور کھیتی یہ ہے (کل) متاع دنیاوی زندگی کا۔ اس کے مقابلہ میں بہترین ٹھکانہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ (۳-۴)

مذکورہ بالا آیت کے ساتھ اس آیت کو بھی مدِّنظر رکھو
وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ
ایمانداروں کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں اشد ہوتے ہیں۔ یعنی انہیں دنیاوی اشیاء (عورت، دولت اور زمین) کے مقابلہ میں اللہ کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے۔

اب پہلی آیت سے حسبِ ذیل حقائق واضح ہو سکتے ہیں۔
(۱) انسان کے دل میں عورت اور دولت کی محبت فطری ہے۔ اس کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ خدا نے اس کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ زن، زر اور زمین سے محبت کرتا ہے۔
(۲) دنیا انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے قرآن نے چھ چیزیں بیان کی ہیں۔ میں نے ان کو تین چیزوں میں محدود کر دیا ہے۔
اللہ کے پاس اس دنیا سے بہتر ٹھکانہ ہے۔
مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے کہ :-

(ا) ہم نے خود دنیا کی محبت تیرے دل میں پیدا کی ہے۔
(ب) لیکن اب ہم تیرا امتحان لیتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ آرزوہائے نفس (شہوات) پر ہماری آرزو (محبت) کو غالب اور فائق رکھ۔ یعنی ہماری محبت کے مقابلہ میں زن، زر اور زمین تینوں کو قربان کر دے۔
اگر تو ایسا کرلیگا تو ہم تجھے متاعِ دنیوی سے بہتر نعماء عطا کریںگے۔
یعنی ہماری خاطر سے دنیا کی زندگی میں اپنی خواہشاتِ نفسانی کو ہمارے احکام (شریعت) پر قربان کر دو۔ جو ہم کہیں وہ کرو۔ (جو نفس کہے وہ مت کرو) اس کا ثمرہ یہ ملے گا کہ جنت (آخروی زندگی) میں جو تم چاہو گے وہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔
وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝
اے مسلمانو! یقین رکھو کہ جنت میں (جو حسن المآب ہے) تمہیں ہر وہ شی بآسانی ملے گی جس کی تم آرزو کروگے (یعنی ہر خواہشِ نفسی پوری ہوگی) اور جو چیز تم طلب کروگے وہ فوراً تمہیں آملے گی۔
نوٹ:- یہی وجہ ہے کہ ہمارے خواجگانِ جنت نے نفسِ امارہ کی مخالفت کو شعارِ زندگی بنا لیا تھا۔ کیونکہ تصوف (طریقت) نام ہی ہے شریعت پر عمل کرنے کا۔
ملا کنز اور ہدایہ کا درس دیتا ہے۔
عاشق اس درس کے اقتضاء پر عمل کرتا ہے۔
بس یہی فرق ہے رازی اور رومی میں اول الذکر اسلام کی خوبیوں پر لیکچر دیتا ہے آخر الذکر اس لیکچر پر عمل کرتا ہے۔
اب مردِ خدا کا فرضِ منصبی واضح ہوگیا۔ یعنی اسے لازم ہے کہ اس دیرِ کہن کے افسوں کو باطل کر دے۔ اگر وہ ایسا کر دے گا تو امتحان میں کامیاب ہو جائیگا۔ یعنی اپنا مقصدِ حیات حاصل کر لے گا۔

ابطال کا طریقہ کیا ہے؟ سُبحَانَ ربّیَ الاعلٰی کے اقتضا پر عمل کرنا۔ جب ہر درحق سر بسجود ہوتا ہے تو یہ کہتا ہے:-

سُبحَانَ ربّیَ الاَعلٰی

پاک ہے میرا رب ان تمام عیوب اور نقائص سے جو خاصہ امکان ہیں۔ یا جن کا تصوّر ہو سکتا ہے اور وہ کامل اور مجموعہ کمالات ہی نہیں ہے بلکہ اعلٰی یعنی تمام موجودات سے بلند و بالا (معزز اور محترم) ہے۔

اس جملہ میں دو لفظ قابل غور ہیں۔

سُبحَان اور اَعلٰی

(۱) حق تعالیٰ سبحان ہے۔ یعنی مخلوقات میں جس قدر عیوب اور نقائص پائے جاتے ہیں ان سب سے پاک (منزہ) ہے بالفاظ دگر وہ کامل ہے بلکہ منبع ہر کمال و مصدر ہر جمال ہے۔

(۲) وہ اعلٰی ہے وہ تمام مخلوقات سے اونچا اور بلند ہے یعنی اس عالم امکان (کائنات) میں نہ کوئی مد مقابل ہے نہ ہمسر۔ وہ ہر بلند سے بلند تر ہے۔ ہر قوی سے قوی تر ہے۔ ہر حسین سے حسین تر ہے۔ ہر قاہر سے قاہر تر ہے۔ اب چونکہ وہ سبحان بھی ہے اور اعلٰی بھی۔ اس لئے عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ زن زر اور زمین کے مقابلہ میں اسی کو اپنا محبوب و مطلوب و مقصود بنایا جائے۔ جب یہ عقیدہ دل میں جاگزیں ہو جائے تو دنیا کی محبّت خود بخود دل سے نکل جائیگی۔

---

لہ میں نے بلا مقصد اس جگہ منطق کی اصطلاح لکھدی اس لئے اس کی تشریح ضروری ہے، واضح ہو کہ امکان وجوب کی ضد ہے حق تعالیٰ واجب الوجود ہے اور یہ کائنات ممکن الوجود ہے۔ ہر ممکن مخلوق میں عیوب اور نقائص پائے جاتے ہیں اسی لئے کہتے ہیں کہ

بے عیب ذات تو صرف خدا کی ہے

ممکن میں سب سے بڑا عیب اور نقص تو یہ ہے کہ وہ اپنے وجود میں واجب کا محتاج ہوتا ہے۔

اس لئے اقبال نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اے مردِ حق سبحان ربی الاعلیٰ کی مدد سے اس دنیا کی محبت اپنے دل سے نکال دے۔

(۲) فقر خواہی از تہی دستی منال۔

پہلے شعر سے ربط یہ ہے کہ
ابطالِ فسونِ دہرِ کہن، مردِ حق کا مقصدِ حیات ہے۔
اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرے۔
اس کے بغیر دنیا کی محبت دل سے نہیں نکل سکتی۔
چونکہ ابطالِ فسوں کے لئے فقر شرطِ اولیں ہے اس لئے بطورِ دفعِ دخلِ مقدر اقبال ہم سے یہ کہتے ہیں کہ حصولِ مقصد کے لئے تمہیں سلکِ فقر پر گامزن ہونا پڑے گا۔ اور اس سلک میں "تہی دستی" سے دوچار ہونا یقینی ہے۔ اس لئے میں تمہیں پہلے ہی سے متنبہ کرتا ہوں کہ اگر خدا کی محبت میں فاقوں کی نوبت آجائے

---

۱؎ عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فاقہ میں مبتلا کیا اور آپ کی سنت کا اتباع تمام اولیا نے بھی کیا۔
جب آپ خندق کھود رہے تھے تو آپ کے شکمِ اقدس واطہر پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھئے۔
خود بھی فاقہ سے ہیں اور صحابہ بھی اسی حال میں ہیں مگر جب کدال کی ضرب سے پتھر سے چنگاری نکلتی تھی تو آپ اپنے عاشقوں سے فرماتے ہیں۔
واللہ میں نے دیکھا کہ کسریٰ کے خزانے اونٹوں پر لدے ہوئے اسی مدینہ کی طرف چلے آرہے ہیں جس کے گرد تم خندق کھود رہے ہو۔
آپ چاہتے تو سارا کوہِ احد بحکمِ خدا سونے کا ہو جاتا۔ مگر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کاشانۂ نبوت میں مہینوں چولہا نہیں سلگتا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

تو آزردہ مت ہونا کہ

ع عافیت در حال دے در جاہ و مال

عافیت حال میں ہے نہ کہ جاہ و مال میں۔ اس مصرع میں عافیت اور حال دو لفظ غور طلب ہیں۔

عافیت ایک کثیر المعانی لفظ ہے اس میں جسمانی اخلاقی تمدنی معاشی اور روحانی تمام خوبیاں پوشیدہ ہیں اسلئے ہر شخص طالبِ عافیت ہوتا ہے اس لفظ کے معانی ہیں صحتِ کاملہ، سلامتی، حفظ و امان، سود و بہبود فوز و فلاح کامیابی اور فارغ البالی۔

حال تصوف کی اصطلاح ہے۔ جب کوئی شخص اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو اسے صاحبِ حال کہتے ہیں۔ مزید وضاحت یہ ہے:۔ زید زبان سے کہتا ہے کہ لا اِلٰہ الا اللہ لیکن عمل اس کا یہ ہے کہ دولتمندوں اور حکمرانوں کے دروازوں پر جبہ سائی کرتا ہے۔ ان کو داتا اور مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتا ہے۔ تو وہ محض صاحبِ قال ہے۔ لیکن بکر توحید کے اقتضا پر عمل کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور کسی کو مالک نفع و ضرر نہیں سمجھتا۔ تو اس کا عقیدہ اس کا حال بن گیا۔ یعنی وہ صاحبِ حال ہے۔

فی الجملہ حال سے مراد ہے استقامت علی التوحید۔ یعنی توحید کے اقتضاء پر اس طرح عمل کرنا کہ پوری زندگی اس عقیدہ کی مظہر بن جائے۔

لا الٰہ گوی، بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں

(جاوید نامہ)

مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ اطمینان قلب حال (توحید کے اقتضا پر عمل کرنے) سے نصیب ہو سکتا ہے نہ کہ دولت سے۔ یا یوں سمجھو کہ کامیابی کا

ذریعہ حال ہے۔ نہ کہ دولت۔

نوٹ :- ہر شخص کا تجربہ ہے کہ دولت سے عافیت کے بجائے پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ مگر انسان چونکہ پیدائشی طور پر حریص واقع ہوا ہے اس لئے اس کی طرف دوڑتا ہے۔ اگلے شعر میں اسی شعر کی مزید وضاحت کی ہے کہتے ہیں کہ عافیت تو صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد (ثمرات حال) سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ زر و سیم و قماش سرخ و زرد (جاہ و مال) سے۔

واضح ہو کہ

(ا) توحید کے اقتضاء پر عمل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعا سے شدید قسم کی محبت پیدا نہ ہو جائے۔

(ب) اور جب ایک مسلمان عاشق بن جاتا ہے تو اس میں عشق کی بدولت یہ صفاتِ خمسہ پیدا ہو جاتی ہیں یعنی عم صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد

(ج) اور ان صفاتِ عالیہ کی بدولت سالک کو عافیت کی دولت یا نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔

(د) اور عافیت، جیسا کہ میں نے ابتداء میں لکھا ہے، وہ حالت ہے جو ہر ذی روح کا مطلوب مقصود اور محبوب ہے۔ دنیا میں ہر شخص عافیت کا طالب ہے۔ اسی کا جویا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حصول کا صحیح طریقہ (راستہ) اختیار کرتے ہیں۔

(۳) بگذر از کاؤس و کے الخ

یعنی بادشاہوں، حکمرانوں، اور اربابِ اقتدار سے قطع تعلق کر کے اپنی خودی کی تربیت میں مشغول ہو جاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پھر یہ بادشاہ جن کے سلام کے لئے تم جاتے ہو، خود تمہارے سلام کے لئے حاضر ہوں گے۔ افسوس ہے کہ تم نے اپنے منصب اور مقام رفیع کو فراموش کر دیا۔ اگر کسی (دوسروں) کے سامنے ہاتھ پھیلانا چھوڑ دو، تم تو شاہین زادہ ہو اس لئے

اپنا رزق خود اپنی قوتِ بازو سے حاصل کرو۔

نوٹ ا۔ بزرگان دین کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ عصر ان کی قدمبوسی کے متمنی رہتے تھے۔ مثلاً

(ا) التمش (متوفی ۱۲۳۶ء) حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ادنی کفش برداروں میں تھا۔ (تفصیل کے لئے دیکھو بزم صوفیہ اور تاریخ مشائخ چشت۔

(ب) بلبن نے اپنی بیٹی حضرت بابا فرید الدین گنج شکر اجودھنی کے حبالہ عقد میں دے دی تھی۔

(ج) سلطان علاؤ الدین خلجی ساری عمر سلطان المشائخ محبوب الہٰی دہلویؒ کی قدمبوسی کا متمنی رہا۔ مگر حضرت نے اسے شرف باریابی عطا نہیں فرمایا۔

(د) سلطان احمد شاہ بہمنی حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ کی حاشیہ برداری پر فخر کرتا تھا۔

(ہ) سلطان محمود بیگڑہ (والی گجرات متوفی ۱۵۱۱ء) حضرت شاہ عالمؒ کی خاکِ پا کو طوطیائے چشم بنایا کرتا تھا۔

(و) حضرت میاں میر لاہوری (المتوفی ۱۰۴۵ء) نے اپنے مرید خاص ملا شاہ کی سفارش پر شاہجہاں کو حاضر خدمت ہونے کی اجازت دی تھی۔

(ز) حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی (جنہوں نے دوبارہ دکن میں چشتیہ سلسلہ کو فروغ دیا) خلیفہ اعظم شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ (المتوفی ۱۱۴۲ء) اصرار پیہم کے باوجود بھی السنفہ عالمگیر اورنگ زیب جیسے بامشرع مسلمان سے ملنے نہیں گئے چنانچہ جب مرشد کو معلوم ہوا تو انہوں نے تحسین و آفرین کے بعد یہ فقرہ بھی لکھا کہ ہمارے اکابر چشت کبھی کسی بادشاہ سے ملنے نہیں گئے۔

اسی لئے اقبال نے ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ کاسہ اور کے سرِ سلاطین

سے بے نیاز ہو جاؤ۔

(۴) دیگر ایں نہ آسمان تعمیر کن الخ

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالے کے سوا کسی کی اطاعت مت کرو۔

برمرادِ خود جہاں تعمیر کردن، کنایہ ہے آزاد زندگی بسر کرنے سے یعنی وہ زندگی جس میں انسان اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکے۔

اس کے بعد اقبال ہمیں "برمرادِ خود جہاں تعمیر کردن" کا طریقہ بتاتے ہیں۔ اور اس فصل کا یہی حصہ بہت غور طلب ہے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

بلاشبہ یہ شعر اس مثنوی کے اہم اشعار میں سے ہے۔ اسکی تشریح ذیل میں ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔

فنا تصوف کی اصطلاح ہے اس سے مراد ہے سالک کی اپنی خواہشات نفسانی کو احکامِ شریعت کے تابع کر دینا۔ یعنی نفسِ امارہ کے، بجائے اللہ اور اس کے رسول کے حکموں پر عمل کرنا۔

رضائے حق قرآن اور ارشاداتِ رسول میں مندرج ہے اور انہی دو چیزوں کے مجموعہ کا معروف نام شریعت ہے۔ اور تصوف اسی شریعت (رضائے حق) پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے۔

جب بندہ اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے یعنی احکامِ شریعت پر خلوص کے ساتھ عمل کرتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ بندہ قضائے حق بن جاتا ہے۔ یعنی اس کی مرضی اللہ کی مرضی ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دگر جو وہ چاہتا ہے اسی کے مطابق ظہور میں آجاتا ہے۔

قضاء شریعت کی اصطلاح ہے اس کے معنی ہیں۔ اللہ کا فیصلہ۔

؏ بندۂ مومن قضائے حق شود

یعنی پھر اللہ کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو بندۂ مومن چاہتا ہے۔ اور جب سالک کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو

چار سوئے با فضائے نیلگوں
از ضمیرِ پاک او آید بروں

یعنی وہ نئی دنیا پیدا کر دیتا ہے با الفاظِ دگر، بر مرادِ خود جہاں تعمیر می کند

خواجگانِ چشت کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے اس شعر کی صداقت بآسانی واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً

جب رائے پتھورا نے سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ اجمیر خالی کر دو، ورنہ تمہارا انجام اچھا نہ ہوگا۔ تو حضرت نے حاضرینِ مجلس سے فرمایا، "مارا رائے پتھورا را زندہ گرفتار کردہ حوالہ سلطان شہاب الدین غوری کردیم۔"

یہ الفاظ (جن میں ایک عظیم الشان پیشگوئی مضمر تھی) اُس شخص کی زبان سے نکلتے ہیں۔

(۱) جو آنا ساگر کے کنارے ایک شکستہ بوریئے پر بیٹھا تھا۔
(۲) جس کے پاس نہ دولت تھی نہ فوج نہ کسی قسم کی مادّی طاقت
(۳) جو ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی بلکہ دشمنِ جان وایمان قوم میں رہتا تھا۔
(۴) جس کا بظاہر کوئی ہمدرد نہ تھا نہ مددگار نہ رفیق نہ غمگسار۔

لیکن ع گفتہ او گفتہ اللہ بود

جو وہ کہتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ یعنی

قبل ازیں کہ رائے پتھورا اس درویش گلیم پوش کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرے۔ خود اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

نوٹ :- چونکہ مستشرقین لفظ فنا کے اصطلاحی مفہوم سے آگاہ نہ تھے اس لئے انہوں نے اس لفظ کا وہ مفہوم مراد لے لیا جس کی تعلیم بودھ دھرم نے دی ہے اور بلا تامل یہ رائے ظاہر کردی کہ تصوف اسلام بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا دے ان جاہل مستشرقین کی تقلید میں بعض مسلمانوں نے بھی یہ کہنا شروع کردیا کہ اسلامی تصوف بھی غیر اسلامی عقائد سے متاثر ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اسلامی تصوف میں فنا سے مراد فنائے ذات نہیں ہے۔ بلکہ اپنی خواہشات کو شریعت کے تابع کردینا۔ ۱۲

اس کے بعد اقبال پھر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

ع در رضائے حق فنا شو چوں سلف

یعنی جس طرح تیرے اسلاف (بزرگانِ دین مثلاً خواجگانِ چشت) نے اتباعِ رسول کی بدولت اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا (گوہر خود را از صدف بروں آوردند) اسی طرح تو بھی فنا فی الرسول ہو کر یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباعِ کاملہ کی بدولت اس مقام کو حاصل کر۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ

ع چشم خود روشن کن از نورِ سرشت

یعنی اپنی فطرتِ سلیمہ کا مطالعہ کر تجھے معلوم ہو جائیگا کہ حق تعا نے تیرے اندر کائنات کو مسخر کرنے اور عبدیتِ کاملہ کے مرتبہ پر پہنچنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔

اس کے بعد حسب ذیل حقائق بیان کئے ہیں۔

(۱) ع تا نگیری از جلالِ حق نصیب الخ

واضح ہو کہ حق تعا کی شئون متکثرہ میں جلال اور جمال یہ دو شانیں بہت نمایاں ہیں بلکہ تمام شئون کی اصل ہیں۔

چونکہ بندۂ مومن مظہر ذات و صفات ہے اس لئے ان دونوں شانوں کا اس میں پایا جانا ازبس ضروری ہے۔ اور اقبال نے اس شعر میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ بندۂ مومن کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شانِ جلال پیدا کرے۔ کیونکہ شانِ جمال کا حصول اس پر موقوف ہے اور جب تک یہ دونوں شانیں جلوہ گر نہ ہوں مومن صحیح معنی میں مظہر حق نہیں بن سکتا۔

شانِ جلال کو شانِ جمال پر اس لئے تقدم حاصل ہے کہ لا الٰہ الا اللہ میں لَا پہلے ہے اِلَّا بعد میں ہے۔ اور اہلِ علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ لَا سے جلال اور اِلَّا سے جمال پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی وضاحت آئندہ فصل میں کی جائیگی اس لئے یہاں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۲) شعر ابتدائے عشق و مستی قاہری است الخ

اقبال نے اس شعر میں پہلے شعر کی وضاحت کی ہے یعنی عشق و مستی (سلوک) کی ابتدا قاہری (جلال) سے ہوتی ہے اور انتہا دلبری (جمال) پر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سالک کے اندر پہلے شانِ جلال کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے بعد شانِ جمال ظاہر ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ لَا اِلٰہ اِلا اللہ کا منطقی نتیجہ یہی ہے۔ چنانچہ جب سالک لا الٰہ کہتا ہے تو وہ ساری کائنات کی نفی کر دیتا ہے۔ یعنی وہ غیر اللہ کا ابطال کر دیتا ہے یہی شانِ جلال ہے۔ کہ اس کی نگاہ میں کسی شی کی ہستی ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر وہ الا اللہ کہتا ہے یعنی وہ ذاتِ حق کا اثبات کرتا ہے یہی شانِ جمال ہے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے سہارے سے یعنی اس کی بدولت موجود ہے (بذاتِ خود معدوم ہے)

جب ان دونوں شانوں کی جلوہ گری سرکارِ دو عالم اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں دیکھئے۔ آپ نے پہلے کفر کو مٹایا اور دینِ حق کو قائم کیا اس کے بعد آپ کا وجود اہلِ عالم کے حق میں رحمت بن گیا۔ یعنی پہلے آپ نے

مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد اہلِ مکہ کو لا تثریب علیکم الیوم کا مژدہ سنایا۔

دراصل دنیا میں سرکارِ دو عالم صلعم شانِ جلال اور شانِ جمال کا مظہرِ اتم ہیں۔ آپ کی اتباعِ کاملہ سے بندۂ مومن میں بھی یہ دونوں شانیں جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ جب بندۂ مومن کفر کا مقابلہ کرتا ہے تو گویا شانِ جلال کا مظاہرہ کرتا ہے اور جب اللہ کے بندوں پر مہربانی کرتا ہے تو شانِ جمال کا اظہار کرتا ہے۔ اور مومن کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ وہ

(۱) اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرے۔ باطل کو مٹائے (یہ شانِ جلال ہے)

(۲) اللہ کے بندوں پر مہربانی کرے انہیں راحت پہونچائے (یہ شانِ جمال ہے)

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

---

(۲) مردِ مومن از کمالاتِ وجود
او وجود و غیر او ہر شی نمود

اس اہم شعر میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اس کائنات میں صرف مردِ مومن پر ظلی اعتبار سے وجود کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کائنات میں جو کچھ ہے (حیوانات، نباتات اور جمادات) اس کی حقیقت "نمود" سے زیادہ نہیں ہے۔

(۱) اس شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ مردِ مومن چونکہ وجود کے کمالات سے بہرہ وافر حاصل کر لیتا ہے۔ بالفاظِ دگر، کمالاتِ وجود اس کی ذات میں پورے طور سے منعکس (جلوہ گر) ہو جاتے ہیں اس لئے ظلی اعتبار سے اسے موجود کہہ سکتے ہیں یعنی مجازی رنگ میں وجود کا اطلاق اس پر

بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض "نمود" ہے۔ جبکی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے۔

(۲) اسی شعر میں مردِ مومن کمالاتِ وجود، وجود اور نمود غور طلب ہیں۔

میری رائے میں یہ شعر اس مثنوی کے چند مشکل ترین اشعار میں سے ہے۔ اگر اس کی پوری وضاحت کی جائے تو یقیناً ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔

(ا) مردِ مومن سے اقبال کی مراد وہ شخص ہے جس نے فنا فی الرسول ہو کر حق تعالیٰ کی تمام صفات یعنی وجود کے تمام کمالات ظلی طور پر اپنے اندر پیدا کر لئے ہوں۔

(ب) کمالاتِ وجود، فلسفہ، تصوّف میں (اور اقبال اسی فلسفہ کے متبع اور مبلّغ ہیں) وجود باعتبارِ ذاتِ خویش تمام کمالات کا منبع اور مصدر ہے۔ مومن وجودِ مطلق کے کمالات کا ظہور ہے۔ اس لئے وہ بھی وجود ہے اور اس میں وجود مطلق کے علاوہ اس کے کمالات کا ظل بھی پایا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ کمالات وجود کی بدولت مومن میں بھی "وجود" کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال کے شعر میں اجمال ہے اس کی نثر یوں ہوگی۔

ہرگاہ مردِ مومن از کمالات وجود، بہرہ دانی حاصل می کند۔ بدیں وجہ او ہم، وجود می گردد۔ یعنی اطلاقِ وجود بر و روا باشد۔ اگرچہ ایں اطلاق در مرتبہ اظلالی می باشد غیر او ہر شی (جملہ کائنات) محض نمود است۔

یعنی چونکہ مردِ مومن وجودِ مطلق کے کمالاتِ لامتناہی سے بہرہ وافی حاصل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وجود مطلق کا ظہور اتم بن جاتا ہے۔ اس لئے اس پر بھی ظلّی طور سے وجود کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ساری

کائنات محض نمود ہے۔
(۱) مومن ، وجود کا ظہور (عکس) ہے اس لئے وجود ہے۔
(۲) کائنات ، وجود کی فعالیت کا اثر ہے، اس لئے نمود ہے۔
(ج) وجود :- اقبال نے اس لفظ کو اپنی تصانیف میں بکثرت اور مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ صرف مثنوی "پس چہ باید کرد" سے چند مثالیں لکھتا ہوں۔

(۱) مصرعہ — از تو ایں سوز و سرور اندر وجود — ص ۹
یہاں وجود سے کائناتِ محسوسہ مراد ہے۔

(۲) مصرعہ — تا بروں آئی ز گردابِ وجود — ص ۲۰
یہاں وجود سے کائنات مادی مراد ہے

(۳) مصرعہ — از وجودِ خود نگردد باخبر — ص ۱۶
یہاں وجود سے ذات یا شخصیت مراد ہے

(۴) مصرعہ — فکر ما جویائے اسرارِ وجود — ص ۶۰
یہاں وجود سے وجودِ مطلق (ذاتِ حق) مراد ہے۔

(۵) مصرعہ — مردِ مومن از کمالاتِ وجود
یہاں بھی وجود سے ذاتِ حق مراد ہے۔

واضح ہو کہ جب لفظ وجود کو فلسفہ کی اصطلاح قرار دیا جائے تو اس سے کائنات مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ موجودات و کائنات کی اصل یا ان کا منشا مراد ہوتا ہے اور دنیا میں فلسفہ خالص (ما بعد الطبیعات) کے جس قدر مدارسِ فکر آج تک مدون ہوئے ہیں سب کا نقطہ آغاز یہی مسئلہ وجود ہے۔ یعنی وہ شے کیا ہے جس سے موجودات سرزد ہوئے ہیں؟ بالفاظِ دگر اس کائنات کی اصل کیا ہے؟

فلسفہ کا جو شعبہ اس مسئلہ سے بحث کرتا ہے اسے اصطلاح میں ONTLOGY

یعنی علم الوجود کہتے ہیں۔ ہندی اور یونانی مدارس فلسفہ سے قطع نظر کر کے صرف مسلمانوں میں اس مسئلہ پر کئی مدارس فکر پیدا ہو گئے۔ مثلاً پیروان ارسطو (مشائیں) پیروانِ افلاطون (اشراقیوں) معتزلہ، متکلمین کا اشاعرہ اور صوفیہ ان تمام گروہوں نے اپنے اپنے نظریات مرتب کئے ہیں۔ جن کی تفصیل اس شرح کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس لئے چند ضروری اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) جمہور متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ وجود تمام موجودات کے لئے وصف ہے۔ یعنی زائد بر ذات ہے۔ نہ عین ماہیت ہے نہ جزو ماہیت ہے۔ بالفاظ دگر متکلمین وجود کو غیر ذات شی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً زید کی ذات اور ہے وجود اور ہے۔ ذات اصل ہے وجود اس کی ذات کو عارض ہو گیا ہے۔

(۲) مشائین اور معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ وجود بعض موجودات کے لئے وصف ہے اور بعض موجودات کے لئے عین ہے۔

(۳) صوفیہ، اشراقیہ اور اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ وجود بعض موجودات کے لئے عین ذات ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس عینیت کی تعبیر اور تشریح میں ان تینوں گروہوں میں عظیم الشان اختلاف پایا جاتا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ میں ناظرین کی آگاہی کے لئے صوفیہ کی تعبیر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں:-

ان حضرات کے نزدیک وجود نہ کلی طبعی ہے نہ معانی متعددہ ہے بلکہ معنی واحد، جزی حقیقی منحصر در فرد واحد ہے۔ اور واجب ہے اور تمام ممکنات اسی وجود واحد (حق تعالیٰ) کے اظلال و آثار ہیں۔ اقبال نے

مصرع
مرد مومن از کمالات وجود

میں لفظ وجود کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس معنی کی تشریح

عارف جامی کے الفاظ میں یہ ہے :-

لفظ وجود را گاہ بمعنی تحقیق و حصول کہ معانی مصدریہ و مفہومات اعتباریہ اند، اطلاق می کنند وبداں اعتبار در برابر وے امرے نیست در خارج ، بلکہ ماہیات را عارض می شود در تعقل چنانچہ حکما و متکلمین تحقیق آں کردہ اند و گاہ لفظ وجود می گویند و حقیقتے می خواہند کہ ہستی وے بذات خود است و ہستی باقی موجودات بوے ، و فی الحقیقۃ غیر از وے موجودے نیست در خارج و باقی موجودات عارض وے اند و قائم بوے و اطلاق ایں اسم بر حضرت حق سبحانہٗ بمعنی ثانی است نہ بمعنی اول۔ (لائحہ چہاردہم)۔

مطلب اس عبارت کا یہ ہے۔ کہ

معنی اوّل :- وجود کا ایک مفہوم تو مصدری ہے جس کا ترجمہ بودن ہستی یا ہونے سے کیا جاتا ہے) یہ مصدری مفہوم تمام مفاہیم مصدریہ کی طرح ایک اعتباری مفہوم ہے جو خارج میں منشا کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس ذہنی تصور کے اعتبار سے اشیا کو عارض ہو جاتا ہے۔ حکما اور متکلمین نے وجود کو اسی مفہوم مصدری کے پیشِ نظر اعتباری قرار دیا ہے۔

معنی ثانی :- لفظ وجود کا دوسرا مفہوم وہ حقیقت حقہ اور اصلیہ ہے جو بذاتِ خود موجود ہے یعنی اس کی ہستی بذاتہٖ خود ہے کسی کی محتاج نہیں ہے۔ اور باقی تمام موجودات کی ہستی اس کی بدولت ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے علاوہ اور کوئی شئی خارج میں (کائنات میں) موجود نہیں ہے۔ تمام موجودات اسے عارض ہیں۔ اس اسم کا اطلاق حق تعالیٰ پر معنی ثانی میں ہے نہ کہ معنی اول (مفہوم مصدری) میں۔

---

؎ لیکن بمکاشفات ارباب شہود
اشیا ہمہ عارض اند و معروض وجود
(جامی)

خلاصہ کلام اینکہ وجود جزی حقیقی ہے اور فرد واحد میں منحصر ہے جسے اللہ کہتے ہیں جو بذاتِ خود موجود ہے۔ یعنی واجب الوجود ہے اور باقی تمام ممکنات اسی ذاتِ واجب (حق) کی وجہ سے اور اسی سے انتساب کی بدولت موجود ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ کا وجود حقیقی اور اصلی ہے۔ باقی تمام ممکنات کا وجود ظلی اور اختیاری ہے۔

(د) نمود:۔ یہ لفظ بھی فلسفہ تصوف کی اصطلاح ہے۔ اقبال نے یہاں اسے وجود کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اس سے مراد ہے وہ شئی جس کا وجود حقیقی اور اصلی نہ ہو بلکہ وہمی ہو۔ یعنی دیکھو تو نظر آسکے مگر غور کرو تو اس کی کوئی حقیقت نہ ہو جیسے آئینہ میں کسی کا عکس کہ دیکھو تو ہے غور کرو تو کچھ بھی نہیں۔

صورت وہمی بہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ بر طاق عدم داریم ما

(بیدل)

اب شعر کا مطلب کہتا ہوں۔ اقبال کہتے ہیں کہ مردِ مومن چونکہ وجود مطلق کا مظہرِ اتم ہے۔ وجود مطلق (ذات حق) کے سارے کمالات اسکی ذات میں منعکس ہیں۔ اس لئے وہ بھی ظلی طور پر موجود ہے۔ وجود کا اطلاق مجازی رنگ میں اس پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے سوا کائنات میں جو کچھ ہے نمود کے مرتبہ سے آگے نہیں ہے۔ یعنی کائنات کا وجود حسی اور وہمی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اقبال نے اسی مضمون کو بالِ جبریل میں یوں ادا کیا ہے:۔

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی

یعنی کائنات کی حقیقت نمود سیمیائی سے زیادہ نہیں ہے نمودِ

سیمیائی کی مثال وہ حلقہ یا دائرہ آتشیں ہے جو نقطۂ آتشیں کو نہایت تیزی کے ساتھ گردش دینے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ درحقیقت موجود نہیں ہے۔ محض گردش کی بدولت نظر آتا ہے یعنی اس کا وجود محض وہمی ہے۔

علامہ محمود شبستری نے اسی صداقت کو یوں بیان کیا ہے:-

ہمہ از وہم تست ایں صورت غیر
کہ نقطہ دائرہ است از سرعت سیر

اب رہی یہ بات کہ مرد مومن یعنی انسان وجود مطلق کا مظہر اتم کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خود مشیت ایزدی نے (جس میں بحث نہیں ہو سکتی) آدم کو اس منصب و مقامِ رفیع کے لئے منتخب فرمایا کما قال اللہ تعالیٰ:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲-۳۰)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانیوالا ہوں۔

اگر آدم خلیفۃ اللہ ہے تو لازمی ہے کہ اس میں اس ذات کے تمام کمالات ظلی طور پر موجود ہوں جس کی نیابت وہ اس کائنات میں کریگا۔ مثلاً علم، قدرت، ارادہ سمع، بصر اور کلام۔ اور سب جانتے ہیں کہ انسان کے علاوہ اور کسی حیوان میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی نے اسی مضمون کو اپنی شہرہ آفاق تصنیف نصوص الحکم کی پہلی نص کی ابتدا میں یوں بیان کیا ہے:-

لما شاء الحق سبحانہ من حیث اسمآئہ الحسنیٰ التی لا یبلغھا الاحصاء ان یریٰ اعیانھا ان شئت قلت ان یریٰ عینہ فی کون جامع یحصر الامر لکونہ متصفا بالوجود ویظھر بہ سرّہ الیہ فان رؤیۃ الشی نفسہ فی نفسہ نبفسہ ما ھی مثل رؤیتہ نفسہ فی امر آخر یکون لہ کالمرآۃ فاقتضی الامر جلاء مرآۃ العالم

فکان آدم عین جلاءِ تلك المرءاة وروح تلك الصورة۔

ترجمہ :- جب چاہا حق سبحانہ نے باعتبار اپنے اسمائے حسنیٰ کے جن کا شمار نہیں ہو سکتا یہ کہ دیکھے ان اسماء کے حقائق کو (اے خوانندہ کتاب) اگر تو چاہے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے، کہ دیکھے خود اپنی حقیقت کو (یعنی اپنے وجود کو) ایک کون جامع یعنی ایسے وجود میں جو جامع کمالات ہو اور محیط ہو وہ وجود تمام امور اسمائی کو بہ سبب متصف ہونے اس کون جامع کے ساتھ وجود کے۔ اور یہ کہ ظاہر ہو اس کی بدولت اس (حق تعم) کا بھید (اس کی حقیقت) اس پر (اب شیخ خود اس نکتہ بلیغ کی وضاحت کرتے ہیں۔ کیونکہ دیکھنا ایک شخص کا اپنی ذات کو اپنی ذات میں اپنی ذات سے انہیں مثل دیکھنے اپنی ذات کو کسی دوسری شی میں مثلاً آئینہ میں۔ اس لئے ظاہر ہوتی ہے اس طرح جلوہ گری ذات اس کے سامنے پس تقاضا کیا شانِ الٰہی نے کہ آئینۂ عالم کو جلا (صیقل) دی جائے پس آدم وہ آئینہ جلاء ہے اسی آئینہ کی اور روح ہے اس صورت (کائنات) کی۔ الخ

اگر میں اس عبارت کی تشریح کروں تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو جائیگی اس لئے چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(ا) یہ عبارت پیرایہ آغاز ہے فصِ اول کا جس کا عنوان ہے

فصّ الٰهيّةٍ فی کلمةٍ آدميّةٍ۔

(ب) اس فص میں انہوں نے اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے۔

خلافت آدم (انسانی) مظہر الوهيّة ہے۔

(ج) حق کا معروف نام اللہ ہے۔ اور الوہیت کی خصوصیت اولین علم و اقتدار ہے بلکہ قوتِ تسخیر ارض وسما (کائنات) ہے۔ اس لئے جسے صفت الوہیت کا مظہر قرار دیا جائے اس میں بھی تسخیر کائنات کی صفت ہمعنی لازمی ہے۔

(د) حق نے اپنے آپ کو دیکھنا چاہا۔
(ہ) ایک کون جامع میں یعنی ایسے وجود میں جو جامع کمالات ایزدی ہو۔
(و) حق تعالیٰ تو عین وجود ہیں اور وہ کون جامع متصف با لوجود ہے۔ یعنی چونکہ اس میں وجودِ باری منعکس ہو رہا ہے (وہ مظہرِ ذات ہے) اس لئے اس میں بھی شانِ وجود پیدا ہو گئی ہے۔
(ز) تاکہ خدا کی حقیقت اس کون جامع میں منعکس ہو کر خود خدا کے سامنے ظاہر ہو جائے (شیخ نے اسے یوں لکھا ہے۔ کہ سرّ حق، حق کے سامنے ظاہر ہو جائے۔
(ح) چونکہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر حق تع اپنے آپ کو آئینہ میں کیوں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے شیخ اکبر نے اس کا یہ جواب دیا کہ اپنا حسن و جمال بلا واسطہ دیکھنے میں اور ایسے جلوہ پذیر محل میں دیکھنے میں جو جلوہ گر کے سامنے اسی کے جلوے کو پیش کرے، بڑا فرق ہے۔
(ط) خلاصہ کلام اینکہ جب حق تع نے اپنے آپ کو ایک کون جامع میں دیکھنا چاہا۔ تو اس نے فیصلہ کیا کہ آئینہ کائنات کو جلا دی جائے پس آدم جلائے آئینہ کائنات اور روح صور کائنات ہے۔ جلا کے بعد یہ کائنات آئینہ بن گئی جس میں وہ اپنا جلوہ دیکھ رہے ہیں۔

پوچھتے ہو کہ سرِّ وحدت کیا
ماسوا کی بھلا حقیقت کیسا

باز آمدم بر سرِ مطلب :-
حق تعالےٰ عین وجود ہے۔
چونکہ آدم میں وجود کے تمام کمالات منعکس ہیں۔

اس لئے آدم متصف بالوجود ہے۔

باقی تمام اشیائے کائنات میں چونکہ کمالاتِ وجود منعکس نہیں ہوتے۔ اس لئے ان کی حیثیت نمود سے زیادہ نہیں ہے۔

اب پڑھو اقبال کے اس شعر کو۔

مردِ مومن از کمالاتِ وجود

او وجود و غیر او ہر شی نمود

آخری شعر، گر بگیرد سوز و تاب از لا الٰہ الخ

اس سے پہلے شعر میں اقبال نے یہ بات واضح کی ہے کہ مومن "وجود" ہے۔ یعنی موجود ہے اور ماسوی "نمود" ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے انسان نے غلط بینی کی وجہ سے کائنات کو اپنا مقصود بنالیا ہے۔ اس لئے اس کے سامنے سربسجود ہو گیا ہے۔ اگر وہ مومن (موحد) بن جائے۔ اگر وہ لا الٰہ سے سوز و تاب حاصل کرلے۔ اگر وہ اس حقیقت کا ادراک کرلے (یہ مقام ذکر مراقبہ اور مجاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے کہ کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر وہ غیر اللہ کی نفی کردے (لا الٰہ کا یہی مفہوم ہے) تو اس کائنات پر حکمراں ہو جائیگا۔ یہ مہر و ماہ اس کے تابع فرمان ہو جائیں گے۔

مرضی او مرضی حق می شود

ماہ از انگشتِ او شق می شود

نوٹ :- اقبال نے جو کچھ لکھا ہے وہ پاکانِ امت مثلاً جامی، عراقی، رومی، اور شیخ اکبر سے سنکر (ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد) لکھا ہے۔ اس لئے بالکل صحیح لکھا ہے۔ مگر یہ مقام صحبت مرشد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ جن بزرگوں نے زمان و مکان پر حکومت کی ہے ان سبھوں نے صحبتِ مرشد سے اکتساب فیض کیا ہے۔ ۱۲

---

# فصل پنجم

## حکمتِ فرعونی

حکمتِ اربابِ دیں کردم عیاں ‏ ‏ حکمتِ اربابِ کیں را ہم بداں

حکمتِ اربابِ کیں مکر است و فن ‏ ‏ مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن!

حکمتے از بندِ دیں آزادۂ ‏ ‏ از مقامِ شوق دور افتادۂ

مکتب از تدبیرِ او گیرد نظام ‏ ‏ تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام

شیخِ ملّت با حدیثِ دلنشیں ‏ ‏ بر مُرادِ او کند تجدیدِ دیں

از دمِ او وحدتِ قومے دو نیم ‏ ‏ کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر ‏ ‏ کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر

می شود در علم و فن صاحب نظر ‏ ‏ از وجودِ خود نہ گردد باخبر!

نقشِ حق را از نگینِ خود سترُد ‏ ‏ در ضمیرش آرزو بازاد و مُرد

بے نصیب آمد ز اولادِ غیور ‏ ‏ جاں بہ تن چو مردۂ در خاکِ گور

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن | نوجوانان چوں زناں مشغول تن
درد دل شاں آرزو ہابے ثبات | مُردہ زایند از بطونِ[1] امہات[2]
دخترانِ او بزلفِ خود اسیر | ابروانِ مثلِ دو تیغ آختہ
ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر | سینۂ ماہی بموج اندر نگر
ملتے خاکسترِ او بے شرر | صبحِ او از شامِ او تاریک تر
ہر زماں اندر تلاشِ سازو برگ | کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ
منعمانِ او بخیل و عیش دوست | غافل از مغز اند و اندر بندِ پوست
قوتِ فرماں روا معبودِ او | در زیانِ دین و ایماں سودِ او
از حدِ امروزِ خود بیروں نجست | روزگارش نقشِ یک فردا نبست
از نیاگاں دفترے اندر بغل | الاماں از گفتہ ہائے بے عمل!
دینِ او عہد وفا بستن بغیر | یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

آہ قومے دل ز حق پرداختہ
مُرد و مرگِ خویش را نشناختہ

---

[1] جمع بطن۔ پیٹ۔ [2] جمع اُم۔ مادر۔

# تعارف

جس طرح کلیم انبیاء کے نمائندے ہیں اسی طرح فرعون ان سلاطین کا نمائندہ ہے۔ جو اللہ کے بندوں کو اپنی غلامی پر مجبور کرتے ہیں۔ لہٰذا حکمتِ فرعونی سے مراد ہے مفاسدِ ملوکیت۔ بالفاظِ دگر ملوکیت انبیاء کی تعلیمات کی ضد ہے اور اس کا مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں ملوکیت کی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو اس کے مفاسد سے آگاہ کیا ہے۔ نبیؑ انسان کو اللہ کا بندہ بناتا ہے۔ بادشاہ، انسان کو اپنا بندہ بناتا ہے۔ چونکہ ملوک اشتمادراس کے رسولوں کے دشمن ہوتے ہیں اس لئے اقبال نے انہیں اربابِ کیں سے تعبیر کیا ہے۔

یہ فصل چونکہ مقابلتاً آسان ہے اس لئے پوری فصل کا مطلب مجموعی طور پر لکھوں گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے گذشتہ فصل میں انبیاء کی تعلیمات واضح کردی ہیں۔ اس فصل میں بادشاہوں کی حکمتِ عملی (طریقِ کار) یا پالیسی بیان کرتا ہوں:۔

(۱) سلاطین کی پالیسی سراسر مکر و فریب پر مبنی ہوتی ہے اور مکر و فن کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ ایسا نظامِ زندگی مدوّن کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ افرادِ قوم مادّیات میں مشغول ہو کر روحانیت (عشقِ الٰہی) سے بیگانہ ہو جائیں۔ اس لئے وہ ان کی جسمانی آسائش اور ذاتی فوائد کا انتظام تو کر دیتے ہیں۔ مگر کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس سے ان کے اندر تقوٰی اور روحانیت پیدا ہو سکے۔

(۲) ان کی پالیسی (حکمتِ عملی) دین (اسلام) کی قیود سے آزاد ہوتی ہے

یعنی وہ لادینی نظام کو فروغ دیتے ہیں۔ اس نظامِ زندگی میں "مقامِ شوق" یعنی خدا تک پہنچنے کی گنجائش مطلق نہیں ہوتی۔ مثلاً :-

(ا) وہ کلچر کو فروغ دینے کے پردے میں رقص و سرود اور اختلاط مرد و زن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لیکن قرآن و حدیث کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔

(ب) ان اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں جن کا مقصد افراد میں بیحیائی اور فحاشی کا میلان پیدا کرنا ہو۔ تاکہ کوئی شخص ان کی بدکاریوں پر معترض نہ ہو سکے۔

(ج) گھڑ دوڑ (ریس) کے پردے میں قمار بازی کو فروغ دیتے ہیں۔

(د) ہوٹلوں کے مالکوں کو شراب فروخت کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور تاجروں کو بہترین قسم کی شرابیں منگوانے کا پرمٹ عطا کرتے ہیں۔

(ہ) عریاں لٹریچر اور عریاں فلمیں امپورٹ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

(و) کتابوں کو سامانِ تعیش میں اور سامان تعیش کو ضروریاتِ زندگی میں شمار کرتے ہیں۔

(ز) وہ نمود و نمائش پر لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں۔ مگر اسلام کی تبلیغ کے لئے بجٹ میں کوئی رقم مخصوص نہیں کرتے۔

(ح) فلم اسٹاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مگر دین کے خادموں کو کسی قسم کی سہولت بہم نہیں پہنچاتے بلکہ انہیں ملّا کہہ کر مطعون کرتے ہیں۔

(س) وہ افراد کی تعلیم کے لئے کالج اور اسکول (مکتب) قائم کرتے ہیں مگر نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم ایسا مرتب کرتے ہیں جس کی بدولت غلام اپنے آقا کے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ یعنی خوئے غلامی میں پختہ تر ہو سکے۔ اور ایسے اساتذہ کا انتخاب کرتے ہیں جو انہیں کامیابی کے ساتھ

غلامی کا درس دے سکیں۔[1]

(۴) اربابِ کیں ایسے شیوخِ ملت (دنیوی پیشواؤں) کو مناصب عالیہ کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ لہٰذا جو اللہ اور اس کے رسول سے قطع نظر کر کے ان کی مراد کے مطابق دین کی تجدید کر سکیں۔ یعنی دینِ اسلام کو ان کے خیالات کے سانچہ میں ڈال سکیں اور جو علمائے حق ان سے اختلافِ رائے کرتے ہیں ان کو ختم کر دیتے ہیں۔

(۵) ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم میں اتحاد اور وحدت پیدا نہ ہو بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ وحدتِ قومی کو فنا کرنا ہی ان کا مقصدِ حیات ہوتا ہے۔

اربابِ کیں (سلاطین) کی حکمتِ عملی واضح کرنے کے بعد آئندہ اشعار میں اقبال اس قوم کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہیں جو بادشاہوں کی غلامی میں گرفتار ہو کر اپنی تخریب اور غیر کی تعمیر پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس قوم کی حالت یہ ہوتی ہے کہ :-

(۱) می شود در علم و فن صاحب نظر
از وجودِ خود نگردد باخبر

یعنی اس قوم کے افراد مختلف علوم و فنون میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً :-

(ا) یورپ کی درس گاہوں سے ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں۔
(ب) آسمان کے ستاروں کے حالات بیان کر سکتے ہیں۔
(ج) فنونِ لطیفہ پر لیکچر دے سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] اکبر الہ آبادی نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے ؎
یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

لیکن اپنی شخصیت اور اس کی صلاحیتوں سے بیگانہ رہتے ہیں۔ یعنی اپنی "خودی" کی تربیت نہیں کر سکتے۔

(۲) نقشِ حق یعنی اللہ کی محبت کو اپنے دل سے مٹا دیتے ہیں اگر ان کے دلوں میں ترقی کی آرزو پیدا ہوتی ہے تو بہت جلد فنا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کی تکمیل کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے۔[۱]

(۳) اس قوم کے افراد "اولادِ غیور" سے محروم رہتے ہیں۔ یعنی اس قوم کے نوجوانوں میں دینی غیرت کا مادہ نہیں ہوتا۔ اور اس بے غیرتی کی بنا پر ان کی روح قبر کے مُردے کی طرح بے حس ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس بے غیرتی اور بے حسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے افراد

(ا) اپنے بھائیوں کی جاسوسی کا مقدس فرض انجام دیتے ہیں۔

(ب) اپنی گولیوں سے اپنے بھائیوں کا سینہ چھلنی کر دیتے ہیں۔

(ج) عہدوں اور جاگیروں کے لئے اپنا دین و ایمان فروخت کر دیتے ہیں۔

(۴) اس قوم کے پیرانِ کہن بڑے بوڑھے حیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور نوجوان عورتوں کی طرح آرائشِ جسمانی میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کی تمام تر توجہ لباس اور غذا، کلب اور ہوٹل پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنے کی کوئی آرزو ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ اور ہو بھی کیسے؟ یہ آرزو تو غیور اور زندہ قوم کے افراد میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس قوم کے افراد تو ماں کے پیٹ ہی سے مُردہ پیدا ہوتے ہیں۔

(۵) اب رہیں اس قوم کی لڑکیاں، تو ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہی زلفوں میں اسیر ہوتی ہیں! شوخ چشم۔ بے باک، بے حیا، خود نما اور دوسرے دل

---

[۱] آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کبھی
ہو اگر پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
(ارمغانِ حجاز)

کا عیب نکلنے والی رات دن آرائشِ جسمانی میں مصروف، ہر وقت بناؤ سنگھار سے کام۔ دیدے کا پانی ڈھلا ہوا (دل باختہ) نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ ہر لحظہ" میک اپ" سے کام۔ بھنویں جیسے کھنچی ہوئی تلوار، تبرّج (جسم کی نمائش) کی دلدادہ! "ساعدِ سیمیں" اغیار کی نگاہوں کے لئے سامانِ عیش! ملبوس اس قدر مہین (باریک) کہ تمام جسم اس سے اس طرح نمایاں جس طرح پانی میں مچھلی۔

ع سینہ ماہی بموج اندر نگر

یعنی جس طرح مچھلی کا جسم پانی میں نظر آتا ہے اس طرح ان کا جسم لباس میں نظر آسکتا ہے۔

فرزندان و دخترانِ ملت کی زندگی کا نقشہ کھینچنے کے بعد اقبال غلام قوم کی مجموعی حالت پر تبصرہ کرتے ہیں :-

جو قوم کشتۂ تدبیرِ غیر ہوتی ہے۔ یعنی ملوکیت کا شکار ہو جاتی ہے اس کا جسم (خاکستر) زندگی (شرر) سے محروم ہو جاتی ہے۔ یعنی غلامی روحانی موت ہے۔ اور ملوکیت کا مقصد ہی انسانوں کو روحانی اعتبار سے ختم کر دینا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی بقا اسی پر موقوف ہے۔

ملوکیت کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلام قوم کے افراد ہر وقت تلاشِ برگ و ساز میں مصروف و منہمک رہتے ہیں[۱]۔ بلکہ

---

[۱] ان اشعار کی وضاحت چنداں ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ جو کچھ اقبال نے ان اشعار میں لکھا ہے۔ وہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے۔ کیونکہ ہم ابھی تک غلامی کی منحوس زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بقول داغ :-

خیر نواب کی مناتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

بلکہ پوری زندگی فکرِ معاش اور ترسِ مرگ بن جاتی ہے۔ یہ بدقسمت لوگ ہر وقت روزی کی فکر میں سرگرداں اور موت سے خائف رہتے ہیں۔

اب رہے اس قوم کے دولتمند افراد تو ان کی حالت یہ ہے کہ:

(ا) وہ بخیل اور زر پرست ہو جاتے ہیں۔ قومی کاموں کے لئے اپنی دولت مطلق صرف نہیں کرتے۔ ہاں عیش و عشرت اور حکومت کو راضی کرنے کے لئے اسی دولت کو پانی کی طرح بہاتے رہتے ہیں۔

(ب) زندگی کے حقائق (مغز) سے بیگانہ رہتے ہیں۔ صرف مادی آسائش (پوست) پر قانع ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اسی کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔

(ج) خدا کے بجائے اربابِ اقتدار (قوتِ فرمانروا) کی اطاعت (عبادت) کرتے ہیں۔ ان کا معبود، اللہ نہیں بلکہ حکمراں طبقہ ہوتا ہے اور اسی ملوکیت پرستی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ دین اور ایمان فروشی کو اپنے حق میں مفید سمجھتے ہیں۔

(د) مستقبل سے بے نیاز بلکہ بے گانہ ہو کر صرف عارضی منفعت کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ آئندہ کی فکر تو زندہ قوم کیا کرتی ہے۔

(ہ) یہ لوگ اپنے بزرگوں کی تصانیف کا مطالعہ تو کرتے ہیں مگر ان کے ارشادات پر اصلاً عمل نہیں کرتے۔

(و) غلام قوم کا دین صرف یہ ہے کہ وہ اغیار سے عہدِ وفا استوار کرتی ہے اور خشتِ حرم سے دیر و کلیسا کی تعمیر کرتی ہے یعنی قرآن و حدیث سے کافروں کی اطاعت کا جواز ثابت کرتی رہتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے مسلمانوں کو مدِنظر رکھ کر یہ تمام اشعار لکھے ہیں اسی لئے انہوں نے "خشتِ حرم" کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان غیر مسلموں کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے وجود سے کفر کو تقویت پہونچاتے ہیں اور حق بات یہ ہے کہ اسکے

علاوہ وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے۔

بقول اکبر الہ آبادی اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے ؎

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی

انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

اگر ناظرین مسلمان ملکوں کے حالِ زار کا مطالعہ کریں تو اقبال کے اشعار کی صداقت خود ان پر واضح ہو جائے گی۔ چونکہ آپ بیتی محتاجِ شرح نہیں ہوتی اس لئے میں نے ان اشعار کی تشریح سے اجتناب کیا ہے۔

آخری شعر گویا مسلمانانِ عالم کی زندگی کا مرقع ہے یا یوں سمجھئے کہ اقبال نے ان کی روحانی اور اخلاقی موت پر مرثیہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ افسوس ہے اس قوم پر جو مسلمان ہونے کی مدعی ہو مگر اس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبّت سے بالکل خالی ہو۔ وہ دراصل مر چکی ہے، مگر جہالت کی وجہ سے اس تلخ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔ اس لئے اپنے آپکو زندہ سمجھ رہی ہے۔

---

# فصل ششم

## لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

نکتہ می گویم از مردانِ حال — اُمّتاں را لَا جلال اِلّا جمال

لَا و اِلّا احتسابِ کائنات — لَا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نوں — حرکت از لَا زاید از اِلّا سکوں

تا نہ رمزِ لَا اِلٰہ آید بدست — بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لَاست — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

ملتے کز سوزِ او یک دم تپید — از گلِ خود خویش را باز آفرید

پیشِ غیر اللہ لَا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات

از جنونش ہر گریباں چاک نیست — در خورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد — می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ — تخمِ لَا در مشتِ خاکِ او بریز

ہر کہ را ایں سوز باشد در جگر | ہولش از ہولِ قیامت بیشتر
لا مقامِ ضربہائے پے بہ پے | ایں غو رعد است نے آوازِ نے

ضربِ او ہر بود را سازِ نبود
تا بروں آئی ز گردابِ وجود

با تو می گویم ز ایامِ عرب | تا بدانی پختہ و خامِ عرب
ریزہ ریزہ از ضربِ او لات و منات | در جہاں آزاد از بندِ جہات
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او | قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او
گاہ دشت از برق و بارانش بدرد | گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد
عالمے در آتشِ او مثلِ خس | ایں ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس
اندریں دیرِ کہن پیہم تپید | تا جہانے تازہ آمد پدید
بانگِ حق از صبح خیزیہائے اوست | ہر چہ ہست از تخم ریزیہائے اوست
اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند | از کنارِ جوئے او آوردہ اند

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست

ہمچناں بینی کہ در دورِ فرنگ | بندگی با خواجگی آمد بجنگ

---

ے بجلی کی کڑک

روس را قلب و جگر گردیده خون — از ضمیرش حرفِ لا آمد برون

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

کرده ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں، لا کلیسا، لا اِلٰہ

فکرِ او در تند بادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تند باد آرد بروں

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا و اِلّا سازو برگِ اُمّتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ اُمّتاں

در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے اِلّا دلیل[1]

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن

ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو — از جلالِ لا اِلٰہ آگاہ شو

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

---

[1] راہ نما۔

# تمہید

اس فصل میں تین بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے لا الٰہ الا اللہ کے معانی کثیرہ اور مفاہیم متعددہ میں سے صرف ایک معنی اور ایک مفہوم کو واضح کیا ہے کہ جب تک لا الٰہ کا حقیقی مفہوم قلب و دماغ میں جاگزیں نہ ہو انسان غیر اللہ کی غلامی سے نہیں نکل سکتا۔

تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ نتوان شکست

دوسرے بند میں ایامِ عرب سے لا الٰہ کی تاثیر کی مثالیں بیان کی ہیں۔ مثلاً جب عربوں کے دل و دماغ میں لا الٰہ کا حقیقی معنی راسخ ہوگیا تو سہ

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او

تیسرے بند میں روس کی تاریخ سے لا الٰہ کی تاثیر واضح کی ہے اور اسی ضمن میں یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ وہ وقت بھی آنے والا ہے جب روسی قوم لا الٰہ کے بعد الا اللہ کا اعتراف کرے گی۔ کیونکہ

درمقام لا نیاساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

پہلا بند :- پہلا شعر : کہتے ہیں کہ مردانِ حال سے کسب فیض کرنے کے بعد یہ نکتہ بیان کرتا ہوں کہ قوموں کی زندگی میں لا الٰہ سے شانِ جلال اور الا اللہ سے شانِ جمال پیدا ہوتی ہے۔

شعر کا مطلب لکھنے سے پہلے اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ اقبال نے یہ نکتہ منطقیوں، فلسفیوں اور سائنسدانوں سے حاصل نہیں کیا ہے۔ (یہ حضرات اس کوچہ سے نابلد ہیں) بلکہ مردانِ حال یعنی صوفیائے کرام کی تصانیف سے اخذ کیا ہے۔ (انہوں نے اپنے بعض واردات مکاشفات اور تجربات کو عوام کی آگاہی کے لئے قلمبند کر دیا ہے)

مردانِ حال سے مراد ہیں وہ مبارک افراد جنہوں نے توحید کو اپنی عقل اور جذباتی زندگی میں ایک زندہ اور فعّال عنصر بنا لیا ہے۔ یعنی ان کے افکار اقوال اور اعمال توحید کے مفہوم سے مطابقت کلی رکھتے ہیں۔ یعنی ان حضرات کے لئے عقیدۂ توحید قال کی منزل سے گزر کر "حال" بن گیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نے یہ نکتہ ارسطو، ابن سینا، ابن رشد، امام رازی یا صدر الدین شیرازی سے نہیں سیکھا۔ بلکہ شیخ اکبر، حضرت مجدد الف ثانی رح اور حضرت مجدّد دہلوی کے ارشادات سے اخذ کیا ہے کہ

عہ امتاں را لا جلال، الا جمال

یعنی جب کوئی قوم لا الٰہ کے اقتضا پر عمل کرتی ہے تو اس میں شانِ جلالی (قہاری، جباری، سطوت، شوکت، طاقت، غلبہ، اقتدار اور حکومت) پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ قوم الا اللہ کے مفہوم کو دلنشیں کر لیتی ہے تو شانِ جمال (رافت، شفقت، رحمت، جود و کرم فضل و عطا) کی مظہر بن جاتی ہے۔

(۱) شان یا صفتِ جلال کا تقاضہ یہ ہے کہ مقابل کو نیست یا فنا کر دیا جائے۔ چونکہ لا الٰہ کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی ہستی یا شئی الٰہ نہیں ہے یعنی یہ کلمہ ہستی غیر یا غیر اللہ کی نفی کر رہا ہے۔ اس لئے منطقی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ لا الٰہ میں شانِ جلال پائی جاتی ہے۔ لہٰذا جو شخص یا قوم اس کے اقتضا پر عمل کریگی اس کے اندر لازمی

طور سے شانِ جلال (قہاری) سطوت حکمرانی پیدا ہو جائیگی۔

لا کا مطلب ہے کوئی موجود نہیں ہے۔ یعنی قائل نے سب کی نفی کردی۔ چونکہ جلال سبھی نفی کر دیتا ہے اس لئے لا : جلال۔

(۲) شانِ جمال کا تقاضا یہ ہے کہ مقابل کو باقی رکھا جائے بلکہ اسے شعور اور ادراک بھی عطا کیا جائے۔ تاکہ وہ جمال کا مشاہدہ کر سکے اس لئے اِلاَّ : جمال۔

بطرزِ دیگر :- جلال اپنے مقابل یا غیر کو برداشت نہیں کر سکتا اس کی ذات کا تقاضہ یہی ہے کہ ماسویٰ کی ہستی فنا ہو جائے۔ کوئی موجود نہ رہے اس لئے جلال اپنے غیر کو فنا کر دیتا یعنی جلال : لا

جمال اپنی نمود چاہتا ہے اس لئے برعکس جلال اپنے غیر کو قائم رکھتا ہے یعنی جمال = اِلاَّ۔

واضح ہو کہ جلال کا تقاضہ ہے فنائے ماسویٰ

اور جمال کا تقاضہ ہے بقائے ماسویٰ

اور حق تو یہ ہے یہ دونوں شانیں ہر لحظہ کارفرما ہیں۔

(بفحوائے آیۂ مبارکہ کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِی شَانٍ)

اس لئے کائنات ہر لحظہ فنا ہوتی رہتی ہے اور معاً ہر لحظہ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ فلسفۂ تصوف میں اس حقیقت کو "تجدد امثال" کہتے ہیں۔

یعنی مثلاً زید بتقاضائے شان جلال فنا ہو گیا۔ اور بتقاضائے شانِ جمال اس کی مثل پھر پیدا ہو گئی بالفاظِ دگر ہر آن (جس کا تصور عقلاً محال ہے) زید فنا ہو جاتا ہے اور اسی آن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تجدد مثل زید اس سرعت سے ہوتا ہے کہ زید کی شخصیت میں بظاہر کوئی خلل واقع نہیں ہو بلکہ اسکی ذات یا شخصیت ایک امر ممتد اور مستمر محسوس ہوتی ہے۔ جیسے چراغ کی لو یا

شعلہ جوالہ یا آبِ رواں پر غور کرنا مفید ہوگا۔ گردش کی سرعت سے نقطۂ آتشیں دائرہ محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح تجدد امثال کی سرعت سے عالم ایک امر ممتد محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر آن فنا ہوتا ہے اور ہر آن اس کا مثل ظہور میں آجاتا ہے۔ کیونکہ شانِ جلال عالم کو پوشیدہ کرتی ہے اور شانِ جمال معاً اسے ظاہر کر دیتی ہے۔

اب اس شعر کو امتوں کی زندگی پر منطبق کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگر کوئی قوم لا الٰہ کے مفہوم کو شعار زندگی بنالے یا اس کے اقتضا پر عامل ہو جائے تو اس کے اندر بھی شانِ جلال پیدا ہو جائے گی۔ اس کی وجہ شروع میں بیان کر چکا ہوں کہ لا الٰہ شانِ جلال کا مظہر ہے۔

اقبال نے اس مصرعہ میں لا کو لا الٰہ کا نمائندہ قرار دیا ہے اور لا الٰہ سے اس جگہ یہ مراد لی ہے کہ اس کائنات میں کوئی ہستی مجھ پر حکمراں نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہو نہیں سکتی۔ یعنی کسی ہستی میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ مجھ پر حکمراں ہو سکے۔

مثلاً اگر پاکستان کے باشندوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو جائے کہ دنیا کی کسی قوم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ہم پر مسلط ہو جائے ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی انسان یا قوم یا حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے (لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم یہی ہے)۔ تو امریکہ اور روس اس کے آستانے پر جبہہ سا نظر آئیں گے۔

جب کوئی قوم لا الٰہ کا مفہوم سمجھ کر اس کے اقتضا پر عمل کرتی ہے تو اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ اور اس کی بدولت اس کے اندر بے پناہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ الا اللہ کہتی ہے۔ یعنی خدائی قانون کے سامنے سر تسلیم خم

کرتی ہے تو اس کا وجود دنیا کے حق میں رحمت بن جاتا ہے۔ قوت کا دوسرا نام جلال اور تقویٰ کا دوسرا نام جمال ہے اور جس قوم میں یہ دونوں شانیں جمع ہوتی ہیں۔ تو وہ قوم اس دنیا کی محتسب بن جاتی ہے۔ یعنی دیگر اقوام کو قوانینِ ایزدی کی پابندی کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اور یہ کائنات اس کی مطیع ہو جاتی ہے۔

پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمان محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں اس کے اقتضا پر عمل نہیں کرتے اس لئے دوسروں کے دست نگر ہیں۔ جس طرح زبان سے لفظِ آب کہنے سے پیاس نہیں بجھ سکتی اسی طرح زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتے رہنے سے شانِ جلال اور شانِ جمال پیدا نہیں ہو سکتی اسی لئے اقبال نے جاوید نامہ میں ہمیں متنبہ کیا ہے

لا الٰہ گوی، بگو از روئے جاں
تا از اندام تو آید بوئے جاں
این دو حرف لا الٰہ گفتار نیست
لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست

لا الٰہ کے مفہوم پر عامل ہونے سے انسان صاحب شمشیر ہو جاتا ہے۔ اور الا اللہ کے مفہوم پر عمل کرنے سے اس میں درویشی پیدا ہو جاتی ہے۔

خسروی شمشیر و درویشی نگہ
ہر دو گوہر از محیطِ لا الٰہ

**دوسرا شعر:-** اس شعر کا مطلب اوپر بیان ہو چکا ہے احتساب کائنات کنایہ ہے۔ غلبہ و اقتدار سے کیونکہ جب تک کسی قوم میں یہ صفت موجود نہ ہو وہ احتساب نہیں کر سکتی فتح باب

کائنات کنایہ ہے دشواریوں اور مشکلاتِ زندگی پر غالب آنے سے۔ یعنی جو قوم لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم پر عمل کرتی ہے۔ وہ دنیا میں سب اقوام پر غالب آجاتی ہے اور تمام دشواریوں کو اپنے راستے سے ہٹا سکتی ہے بلکہ تسخیرِ کائنات کا دروازہ اس کے لئے کھل جاتا ہے۔

تیسرا شعر:- لا الٰہ الا اللہ یہ اس دنیا کی جو کلمہ کُن سے پیدا ہوئی ہے، تقدیر ہیں۔ لا سے حرکت پیدا ہوتی ہے الّا سے سکون پیدا ہوتا ہے۔

(۱) لا اور الّا اس دنیا کی تقدیر ہے۔ یعنی حق نے فیصلہ کر دیا کہ اس دنیا پر صحیح معنی میں حکومت کرنے کا حق (ایسی حکومت جو اہلِ دنیا کے لئے رحمت ہو) صرف اسی قوم کو حاصل ہو سکتا ہے جو لا الٰہ اور الا اللہ دونوں کے اقتضاء پر عمل کرے۔

(۲) لا الٰہ کا لازمی نتیجہ ستیز و پیکار ہے۔ اور اس کے لئے حرکت لازمی ہے۔ جب کوئی قوم لا الٰہ کہتی ہے یعنی اس کے مفہوم پر عمل کرتی ہے تو لامحالہ دشمنوں سے برسرِ جنگ ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ الا اللہ کہتی ہے تو اللہ کے قانون کو نافذ کرتی ہے اور قوانین شریعت کے نفاذ کا لازمی نتیجہ امن وامان یعنی سکون ہے۔

صحابۂ کرام نے پہلے لا الٰہ کا نعرہ بلند کیا۔ اس کا نتیجہ جہاد فی سبیل اللہ (جنگِ بدر و دیگر غزوات) کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بعد ازاں الا اللہ کہا۔ یعنی خدا کا قانون نافذ کیا تو ہر طرف امن قائم ہو گیا گویا حرکت سے جہاد اور سکون سے اطمینانِ قلب مراد ہے۔ جب کوئی قوم لا الٰہ کے بعد الا اللہ بھی کہتی ہے۔ تو اس قوم کو بھی اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے

چوتھا شعر:- تا ز رمزِ لا الٰہ آید بدست الخ

جب تک کوئی فرد یا قوم لا الٰہ الا اللہ کے حقیقی مفہوم سے آگاہ نہ ہو اس وقت تک وہ غیر اللہ (انسانوں) کی غلامی سے نہیں نکل سکتے۔

اب سوال یہ ہے کہ رمز لا الٰہ کا مطلب کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کا درحقیقت مفہوم یہ ہے کہ

لا موجود الا اللہ

یعنی اللہ کے سوا کائنات میں کوئی شی حقیقی معنیٰ میں موجود ہی نہیں ہے۔ کلمہ طیبہ میں یہی حقیقت کبریٰ مخفی ہے اسی کو اقبال نے رمز سے تعبیر کیا ہے اور یہ وہ حقیقتِ کبریٰ اور صداقتِ عظمیٰ ہے جس کو تسلیم کئے بغیر مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

اس کلمہ میں دو لفظ غور طلب ہیں (۱) الٰہ اور (۲) اللہ

ترجمہ اس کا یہ ہے اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی میں الوہیت کی صفت نہیں ہے۔ یعنی ساری کائنات میں صرف ایک ہی ہستی الٰہ ہے اور اس کا نام اللہ ہے۔

واضح ہو کہ جس ہستی کو حکما اپنی اصطلاح میں واجب لذاتہ یا واجب الوجود کہتے ہیں قرآنِ حکیم اس کو اپنی اصطلاح میں الٰہ سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا نام اللہ رکھتا ہے۔

(ا) الٰہ وہ ہے جو واجب لذاتہ یا ذات الوجود ہو۔

(ب) اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

(ج) یعنی اللہ کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں ہے۔

(د) واجب اسے کہتے ہیں جو از خود موجود ہو جس کی ذات کا یہ تقاضہ ہو کہ وہ لازمی طور سے موجود ہو۔ جس کے لئے وجود ضروری ہو جس کا نہ ہونا محال عقلی ہو۔ جس کا وجود خانہ زاد ہو، مستعار نہ ہو جسے کسی دوسرے نے وجود عطا نہ کیا ہو۔ بلکہ وہ خود بخود موجود ہو۔

چونکہ اس کا وجود ذاتی ہے اس لئے اس وجود کے کمالات بھی ذاتی ہوں گے۔ کیونکہ اگر اس کے کمالات کسی دوسرے کے عطا کردہ ہیں تو وہ مستکمل بالغیر ہو جائے گا۔ اور استکمال بالغیر مستلزم احتیاج اور احتیاج منافی وجوب ہے اس لئے وہ واجب نہ رہے گا۔

لہٰذا اگر وہ واجب لذاتہ ہے تو تمام کمالات بھی اس کے لئے ثابت ہوں گے۔ بالفاظِ دگر وہ واجب الوجود غنی ہوگا یعنی اسے کسی اعتبار اور کسی جہت سے کسی دوسرے کی احتیاج نہیں ہوگی۔

وجوب وجود کی بنا پر واجب الوجود میں حسبِ ذیل صفات کا پایا جانا لازمی اور یقینی اور لابدی ہے۔

(ا) واجب الوجود کی ذات میں وحدت لازمی ہے۔ کیونکہ اگر اس کی ذات میں کسی قسم کی ترکیب پائی جائے تو ذات حادث ہو جائیگی۔

(ب) بالفاظِ دگر واجب الوجود میں ذات، حقیقت، وجود، تعین تشخص اور وجوب سب ایک دوسرے کا عین ہوں گے ان میں کوئی مغائرت نہیں ہوگی۔ کیونکہ مغائرت سے ترکیب لازم آتی ہے۔ اور ترکیب مستلزم حدوث ہے۔

(ج) واجب الوجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا یعنی تعدد وجبا محال ہے۔ کیونکہ اگر دو ہستیوں کو واجب تسلیم کیا جائے۔ تو ان دونوں میں وجوب تو مابہ الاشتراک ہوگا۔ اور وجوب کے علاوہ ہر ایک میں کوئی ایسی شی بھی ہوگی جس کی بنا پر ان میں امتیاز ہو سکتا ہے۔ اس کو مابہ الامتیاز کہتے ہیں۔ لہٰذا دونوں واجب مرکب ہو گئے۔ اور ہر مرکب حادث ہوتا ہے۔

(د) واجب الوجود ہر جہت سے واجب ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی صفات اور اپنے کمالات میں کسی غیر کا محتاج نہیں ہوتا۔ واجب الوجود کی ذات

اپنی تمام صفات کمالیہ کے لئے خود ہی کافی ہوتی ہے۔

(۵) واجب الوجود قادر مطلق، خیر مطلق، عالم الغیب والشہادۃ اعلیٰ کُلِّ شیءٍ شہید، ہمہ جا حاضر وناظر فعال لما یرید، صاحب اختیار صاحب ارادہ، صاحب جود وکرم، خالق، صانع، مبدع، رب، رحمٰن و رحیم، رازق، مالک اور حاکم ہوتا ہے۔

دلیل اس پر یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی صفت اس میں نہ ہو تو وہ ناقص اور محدود ہو جائیگا اور نقص وتحدید مستلزم احتیاج ہے اور احتیاج منافی وجوب ہے۔ جو ہستی کسی دوسرے کی محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتی۔ اب ناظرین قرآنِ حکیم کا مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ جس قدر صفات اور جس جس قسم کی صفات حکماء نے واجب الوجود سے منسوب کی ہیں وہی صفات قرآن نے الٰہ سے منسوب کی ہیں۔

اگر اس کی تفصیل درج کروں تو یہ شرح علم العقائد کی کتاب بن جائے گی۔ اس لئے صرف چند آیات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ! اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ۔

اے لوگو! تم سب (ہر امر میں مثلاً وجود حیات، قوت، حرکت وغیرہ) اللہ کے محتاج ہو (اور تمہارے مقابلے میں اللہ کی شان یہ ہے کہ) اور اللہ تو وہ غنی (بے نیاز) اور خوبیوں والا (صاحب کمالات) ہے۔ (۳۵ - ۱۵)

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوئیں:-

(ا) اللہ تعالیٰ غنی اور حمید ہے۔ یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں واجب الوجود ہے۔ اور اس کی ذات مسجع جمیع کمالات وحسنات ہے۔

(ب) ماسوی اللہ (کائنات) ہر امر میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے یعنی

فلسفہ کی اصطلاح میں ممکن الوجود ہے اور مستجمع جمیع عیوب و نقائص ہے۔

(۲) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۵ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ۵ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۵ (۲ - ۲۵۵)

اللہ کی شان یہ ہے کہ اس کے علاوہ ساری کائنات میں کوئی ہستی اِلٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے (الوہیت کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہیں۔

(ا) وہ خود بھی زندہ ہے اور ساری کائنات کو بھی قائم رکھنے والا ہے۔

(ب) یہ کائنات اسی کی بدولت موجود ہے اگر وہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

(ج) نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند، یعنی وہ تمام مادی اور جسمانی نقائص اور عیوب اور کمزوریوں سے پاک ہے۔

(د) ساری کائنات اسی کی خادم مطیع اور فرمانبردار ہے، وہ مالک ہے۔ حاکم ہے۔ بادشاہ ہے بلکہ مالک الملک لاشریک لہ ہے۔

(۳) قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۳-۱۶)

آپ انسانوں کو آگاہ کر دیجئے کہ اللہ ہی ہر شی کا خالق ہے اور وہ واحد ہے۔ اور ساری کائنات اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

(۴) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۵ (۲۲ - ۶۲)

یہ اس لئے کہ بلاشبہ صرف اللہ ہی الحق ہے۔ اور بلاشبہ ہر وہ شی جس کو وہ لوگ اللہ کے سوا الٰہ سمجھ کر یا قرار دیکر پکارتے ہیں باطل ہے۔ اور بلاشبہ صرف اللہ ہی صاحب علو اور صاحب کبریا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ

(۱) کائنات میں صرف اللہ تو ہی الحق ہے۔ یعنی صرف وہی واجب الوجود ہے۔ وہی ہے جس کی ہستی از خود ہے۔ اسی کی ذات ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ صرف وہی قائم بالذات ہے۔ الحق سے مراد ہے وہ

ذات یا وہ ہستی جو کبھی مٹ نہ سکے جو ازلی و ابدی ہو، جو از خود موجود ہو یعنی واجب الوجود ہو جس کا ہونا ضروری ہو جس کا نہ ہونا محال ہو جو درحقیقت موجود ہو۔ جو اپنے وجود اور ہستی میں کسی کی محتاج نہ ہو جسے ثبات اور دوام حاصل ہو۔ غور کیجئے :۔

(۱) اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

(۲) اللہ کے سوا کوئی الحق نہیں ہے۔

اس لئے ثابت ہوا کہ اللہ کے سوا ہر شی باطل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لبید کے اس قول سے بڑھ کر سچی بات کسی عرب کی زبان سے نہیں نکلی۔

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہ بَاطِلٌ
وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ

آگاہ ہو جاؤ اللہ کے سوا ہر شی باطل ہے اور ہر نعمت ایک نہ ایک دن یقیناً زائل ہو جائیگی

اسی لئے قرآنِ حکیم نے اس آیت میں دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ

(ب) ہر وہ شی جسے وہ لوگ اللہ کے علاوہ اِلٰہ سمجھ کر پکارتے ہیں باطل ہے۔ اور چونکہ انسانوں نے اپنی جہالت کی بنا پر کائنات کی ہر شی کو اِلٰہ سمجھ کر پکارا ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ کائنات کی ہر شی بذاتہ باطل ہے۔

بالفاظِ دیگر : صرف اللہ الحق ہے۔ باقی یہ ساری کائنات باطل ہے۔ چونکہ باطل ضد ہے حق کی اس لئے باطل کے معنی ہوتے وہ شی جو مٹ جانے والی ہو۔ جس کی حقیقت وجود نہ ہو بلکہ عدم ہو، جو بذاتِ خود قائم نہ ہو، جو بذاتِ خود موجود نہ ہو جسے ثبات و دوام نہ ہو۔

باطل کا مفہوم خود قرآن نے واضح کر دیا ہے۔

إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷-۸)

بلاشبہ باطل نابود ہو جانے والا ہے۔ یعنی اس کی ذات کا اقتضا یہ ہے کہ وہ مٹ جائے۔

فی الجملہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ حق ہے اور ماسوی اللہ (کائنات) باطل ہے۔ اسی کو فلسفہ کی اصطلاح میں یوں کہیں گے کہ اللہ واجب الوجود ہے۔ اور ماسوی اللہ (کائنات) ممکن الوجود اور جس طرح باطل حق کی ضد ہے۔ اسی طرح ممکن، حق کی ضد ہے۔

(۵) لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۵(۲۱-۲۲)

اگر ہوتے ان (آسمان و زمین) میں چند اور بھی اِلٰہ (اللہ کے سوا) تو یقیناً وہ دونوں تباہ ہو جاتے۔

قرآنِ حکیم نے تعدادِ الٰہ کا ابطال کرنے کے لئے فلسفیانہ اسلوب کے بجائے عام فہم اسلوب اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ فرمایا کہ اگر اللہ کے علاوہ بھی کوئی اور ہستی الٰہ ہوتی تو وہ اللہ کی مشیت قضاو قدر، مرضی اور فیصلہ کو ہرگز تسلیم نہ کرتی۔ بلکہ اپنی مرضی نافذ کرتی۔ مثلاً اللہ فیصلہ کرتا کہ زید کی وفات کے بعد حامد اس کا جانشین ہو۔ وہ دوسرا الٰہ کہتا کہ نہیں خالد جانشین ہوگا۔ وقس علیٰ ھذا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ زمین و آسمان دونوں تباہ ہو جاتے۔

اس سے ثابت ہوا کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی الٰہ یعنی واجب الوجود نہیں ہے۔

---

ؔ اسی لئے اقبال نے کائنات کو باطل قرار دیا ہے۔

برسرِ ایں باطلِ حق پیرہن
تیغِ لا موجود اِلّا ھو بزن

(رموزِ بیخودی)

دوسری بحث :-

میں نے بدلائل عقلیہ و نقلیہ یہ ثابت کر دیا کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی الٰہ یعنی واجب الوجود نہیں ہے۔

میں نے الٰہ کا معنی واجب الوجود اس لئے کیا ہے کہ قرآن حکیم نے الٰہ کی جو صفات بیان کی ہیں۔ وہی صفات حکماء نے واجب الوجود سے منسوب کی ہیں۔ یعنی جسے حکماء واجب کہتے ہیں۔ قرآن اسے الٰہ (الحق) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اور جس طرح تعدد وجبا محال ہے۔ اسی طرح تعدد الٰہ بھی محال ہے یعنی الٰہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

فی الجملہ جب صرف اللہ ہی الٰہ ہے۔ صرف اللہ ہی الحق ہے یعنی صرف اللہ ہی واجب الوجود یا واجب لذاتہ یا بذاتِ خود موجود ہے تو ماسوی اللہ (کائنات) یقینی طور پر غیر اللہ یا غیر الحق یا ممکن الوجود ہے۔

جسے فلسفہ میں ممکن الوجود کہتے ہیں۔ قرآن اسے مخلوق کہتا ہے اور کتاب اللہ نے مخلوق کی وہی تعریف کی ہے جو حکماء نے ممکن کی بیان کی ہے۔ اس موضوع پر آیات تو بہت سی ہیں۔ بنظرِ اختصار صرف ایک آیت درج کرتا ہوں۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝

بیشک آیا ہے اوپر آدمی کے ایک وقت زمانہ میں سے جبکہ نہ تھا وہ کچھ چیز جس کا ذکر ہوتا۔ یعنی ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب انسان معدوم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا۔ تو موجود ہو گیا۔ یعنی اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے۔ بلکہ مستعار ہے۔ فلسفہ میں اس شخص یا شئی کو جو بذاتِ خود معدوم ہو مگر کسی (واجب الوجود) کے موجود کرنے سے موجود ہو جائے

ممکن کہتے ہیں۔ اس آیت میں انسان ساری کائنات کا نمائندہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب یہ کائنات معدوم تھی۔

خلاصہ کلام اینکہ

اللہ واجب الوجود ہے۔ یعنی اس کی ذات کا تقاضا وجود ہے۔

ماسوی اللہ ممکن الوجود ہے یعنی اس کی ذات کا تقاضا عدم ہے۔

اسی لئے قرآن نے اللہ کو حق اور ماسوی اللہ کو باطل قرار دیا ہے۔

ممکن الوجود (مخلوق) وہ ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے معدوم ہو مگر کسی کے موجود کرنے سے موجود ہو جائے۔ قرآنِ حکیم کی رو سے ماسوی اللہ مخلوق (معدوم) ہے۔ کائنات میں جس قدر اشیاء ہیں سب مخلوق ہیں یعنی ہر شی ممکن الوجود ہے۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (۳۵-۳)

کیا کوئی اور ہستی بھی خالق ہے اللہ کے سوا جو تم کو آسمانوں اور زمین میں سے رزق دیتا ہے۔ (آگاہ ہو جاؤ کہ) اس کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی اللہ نہیں ہے۔

---

لہ یہاں یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ قرآن نے تخلیق کو بالحق قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۴۵-۲۲)

بیشک تخلیق بالحق ہے مگر مخلوق باطل ہے۔ اللہ کا فعل تخلیق بالحق ہے یعنی اس میں ایک خاص مصلحت ہے یا مقصد ہے بالفاظِ دگر فعل تخلیق عبث یا بیکار نہیں ہے۔ مگر جو چیز (کائنات) پیدا کی ہے وہ باطل یعنی مٹ جانے والی ہے اس کو ہمیشگی نہیں ہے۔ کما قال کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ۝

اس آیۂ مبارکہ سے تین باتیں ثابت ہوگئیں۔
(۱) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی خالق نہیں ہے۔
(۲) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی رازق نہیں ہے
اور اس کی وجہ یہ ہے کہ
(۳) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی الٰہ نہیں ہے۔

## تیسری بحث:-

اب ممکن الوجود کی حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہوتا ہے یعنی
واجب کی حقیقت وجود ہے۔ اور ممکن کی حقیقت عدم ہے۔
واضح ہو کہ جس کی حقیقت عدم ہوتی ہے جب واجب اسے موجود کرتا ہے تو اس کا وجود محض عارضی، ظلی مجازی یا اعتباری ہوتا ہے۔ درحقیقت وجود کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ممکن حقیقی معنیٰ میں موجود نہیں ہوتا حقیقی معنیٰ میں صرف اللہ ہی موجود ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقی معنی میں اللہ کے سوا کوئی شئی موجود نہیں ہے۔ اس نکتہ کو ارباب تصوف نے انداز بلیغ یوں بیان کیا ہے۔

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ

قرآنِ حکیم نے متعدد آیات سے اس حقیقت کو مبرہن فرمایا ہے مثلاً:-
(ا) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ٥ (۵۷ - ۳۰)
(ب) فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ٥ (۲ - ۱۵)
(ج) وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ٥ (۵۷ - ۴)
(د) وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥ (۲-۲۰)

(ہ) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲-۱ تا ۴)

(و) مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۝ (۷-۵۹)

(س) لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ الخ (۱ - ۸۷)

(ج) لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا الخ (۲۰-۱۴)

(ط) اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝ (۴۱-۵۴)

(ی) مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ الخ (۵۸-۷)

ذیل میں ان آیات کا با محاورہ ترجمہ کرتا ہوں۔

(ا) وہی اللہ ہر شی کا اول ہے اور وہی ہر شی کا آخر ہے یعنی وجود کے لحاظ سے اس کو ہر شی پر تقدم حاصل[1] ہے۔ اور تمام اشیاء کے فنا ہو جانے کے بعد ہی باقی رہ جائے گا۔ پھر فرمایا وہی ہر شے کا ظاہر ہے اور وہی ہر شی کا باطن ہے۔ یعنی ہر شی کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی مثلاً انسان کہ اس کا ظاہری پہلو جسم ہے اور باطنی پہلو روح ہے تو قرآن حکیم صاف لفظوں میں اعلان فرماتا ہے کہ ظاہر بھی وہی اور باطن بھی وہی ہے۔ یعنی وہی ہے غیر اللہ کا وجود ہی نہیں۔ آخر میں فرمایا کہ وہ ہر شی کا علم رکھتا ہے یعنی ہر شی کی ظاہری اور باطنی حالت سے آگاہ ہے کیونکہ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ ہر شی کا ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے۔

(ب) پس تم جدھر بھی اپنا رخ کرو گے اسی طرف اللہ کا منہ ہے

---

[1] بقول امام غزالی حق تعالیٰ اول ہے بایں معنی کہ وہ ہماری ہستی اور ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے ۱۲

یعنی جسے تم کائنات کہتے ہو یہ بذاتِ خود کچھ نہیں ہے۔ مگر اس کی جلوہ گاہ ہے۔ ؎

(ج) اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔

(د) بیشک اللہ تعالیٰ ہر شی پر قدرت رکھتا ہے۔

(ہ) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ احد ہے اللہ تعالیٰ صمد ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا۔ اور نہ کوئی ہستی اس کی ہمسر ہے۔

(و) اس کے علاوہ تمہارے لئے اور کوئی الٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے۔ یعنی اس کے سوا اور کوئی ہستی بذات خود موجود نہیں ہے۔

(ز) اے خدا تیرے سوا ساری کائنات میں اور کوئی الٰہ نہیں ہے۔

(ح) اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ سے فرمایا کہ میں اللہ ہوں اور میرے سوا اس کائنات میں اور کوئی الٰہ (بذاتِ خود وجود) نہیں ہے۔

(ط) آگاہ ہو جاؤ کہ وہ ہر شی کو محیط ہے یعنی وہ کائنات کی ہر شی کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی ہر شی سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔

(ی) جب تین آدمیوں میں صلاح مشورہ ہوتا ہے تو وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔ اور جب پانچ آدمیوں میں صلاح مشورہ ہوتا ہے تو ضرور ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے۔ اور اس سے کم ہوں یا زیادہ اور کہیں بھی ہوں وہ ضرور ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

نوٹ:۔ ان آیات کے ساتھ اس آیتِ مبارکہ کو بھی مدِ نظر رکھو۔

---

؎ نیاز بریلوی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

یعنی اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے الخ

یعنی ساری کائنات کچھ نہیں مگر اس کا جلوہ ذات ہے۔۱۲

اب پڑھیئے اس شعر کو

تا نہ رمز لا اِلٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی جب تک یہ حقیقت دل پر نقش نہ ہو جائے کہ

(ا) غیر اللہ (کائنات) کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(ب) یعنی یہ کائنات حقیقی معنی میں موجود ہی نہیں ہے اس لئے

(ج) یہاں کسی شی میں نہ کوئی قوت ہے نہ طاقت۔

(د) جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

نفع و ضرر عزت اور ذلت زندگی اور موت صحت اور مرض تونگری اور افلاس، روزی کی کشادگی یا تنگی، غرضکہ ہر بات اسی کے اختیار (قبضہ قدرت) میں ہے۔

اس لئے کسی انسان سے ڈرنے یا خوفزدہ ہونے یا کسی قسم کی توقع رکھنے یا کسی کی اطاعت کرنے کی مطلق حاجت نہیں ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ انسان غیر اللہ کی قید (غلامی) سے صرف اسی وقت رہائی پا سکتا ہے جب وہ یہ یقین پیدا کر لے کہ

لا موجود الا اللہ

اور یہی رمز لا الٰہ اِلَّا اللہ ہے

جب ایک انسان لا الٰہ اِلَّا اللہ کے رمز (حقیقی مفہوم) سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جب یہ عقیدہ اس کے دل و دماغ میں راسخ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے تو وہ دنیا میں

عوام تو درکنار، بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ صداقت اس پر واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بادشاہ دراصل میری طرح ہی عاجز درماندہ، بیکس اور محتاج (فقیر الی اللہ) ہے۔ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ اس میں کوئی طاقت ہی نہیں ہے۔ جب تک خدا بھی نہ چاہے اس کا چاہا ہو ہی نہیں سکتا۔[۱]

میں بھی ممکن، یہ بادشاہ بھی ممکن، میں بھی مخلوق یہ بادشاہ بھی مخلوق، میں بھی عاجز اور محتاج (فقیر الی اللہ) یہ بادشاہ بھی عاجز اور محتاج زندگی اور موت میرے اختیار میں نہیں ہیں تو اس بادشاہ کے اختیار میں بھی تو نہیں ہیں۔ میں اگر خالی ہاتھ آیا تھا۔ اور خالی ہاتھ دنیا سے جاؤں گا تو یہ بادشاہ بھی خالی ہاتھ ہی جائیگا۔

الغرض جب یہ بادشاہ بھی میری طرح عاجز اور محتاج ہے تو پھر میں اس کے آگے ہاتھ کیوں پھیلاؤں؟ اس سے توقعات کیوں وابستہ کروں؟ اس سے خوف کیوں کروں؟ اس کی اطاعت کیوں کروں؟

جب یہ حقیقت دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے تو پھر انسان کی نگاہ میں بادشاہ کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ انہیں یہ

---

[۱] قرآنِ حکیم میں اس مضمون کی بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں۔ اس جگہ صرف ایک آیت درج کرتا ہوں۔

مَا شَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ (۱۸-۳۹)

جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے (اور کسی میں کوئی قوت نہیں جبتک اللہ کی توفیق شاملِ حال نہ ہو۔ اس مضمون کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

لکھ کر بھیج دیتا ہے۔

باز گیر ایں عامل بدگوہرے
ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے[1]

اب میں اس بند کے بقیہ اشعار کا مطلب مجموعی طور پر سپرد قلم کرتا ہوں۔ کیونکہ ان سب میں مذکورہ بالا بنیادی تصور یعنی رمز لا الٰہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ موحد (مرد خدا) کی پہلی منزل لا اِلٰہ ہے۔ یعنی پہلے وہ غیر اللہ کی نفی کرتا ہے نفی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی ہستی مجھ سے بڑی یا مجھ پر حکمراں نہیں ہے۔ کیونکہ سب میری ہی طرح عاجز اور محتاج اور مخلوق ہیں۔

جب یہ عقیدہ کسی ملت (قوم) کے افراد میں ایک زندہ حقیقت بن جاتا ہے۔ تو وہ قوم نئی زندگی حاصل کر لیتی ہے۔ یعنی انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جاتی ہے۔

---

[1] اس شعر میں اقبال نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملک نائب گورنر (صوبہ دار) پانی پت نے حضرت بوعلی شاہ قلندر کے ایک مرید کو ایذا پہنچائی تھی اس پر حضرت قلندر نے اس کے آقا سلطان علاؤ الدین خلجی کو حسب ذیل عتاب نامہ تحریر فرمایا تھا۔

"علاؤ الدین شحنہ دہلی را غلام آنکہ خواجہ سرائے۔ یکے از درویشاں را رنجانید عرش الرحمٰن را لرزہ آورد۔ اگر اورا بسزا رسانیدی بہتر ورنہ بجائے شحنہ، دیگر بدہلی نشانیدہ خواہد شد۔"

شانِ قلندری ملاحظہ کے لائق ہے کہ سلطان علاؤ الدین خلجی جیسے مطلق العنان اور خود مختار اور باجبروت حکمراں کو جس کی سلطنت از اٹک تا گنگ وسیع تھی محض شحنہ دہلی کہہ کر خطاب کیا ہے۔ ۱۲۰

غیر اللہ کے سامنے لا اِلا کہنا یعنی غیر اللہ سے یہ کہنا کہ تیری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کہنے والے کو زندگی (حرّیت) عطا کر دیتا ہے۔ مگر ہر شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا صرف وہی شخص اس پر قادر ہو سکتا ہے جو حقیقی معنی میں موحّد بن جائے۔

اگر کسی شخص میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی مجھ پر حکمراں نہیں ہو سکتی تو وہ شخص ہزاروں انسانوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ بے عمل (رہ نشین) انسانوں کو با عمل (رہ نورد) بنا سکتا ہے۔

بزرگانِ دین کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے اس شعر کی صداقت واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً خواجگانِ چشت نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اگر تم کسی غلام (بندہ) کو اس کے آقا (خواجہ) کے خلاف صف آرا کرنا چاہتے ہو تو اسے اس حقیقت سے آگاہ کر دو کہ لا الٰہ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی ہستی اس لائق نہیں ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے

جس شخص کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہو جائے کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی مجھ پر غالب (حکمراں) نہیں ہے۔ سلاطین اس سے اس طرح لرزہ براندام ہو جائیں گے جس طرح قیامت کے تصوّر سے انسانوں کے حواس گم ہو جاتے ہیں۔

لا الٰہ کی ضرب، آواز نہیں ہے بلکہ بجلی کا کڑکا ہے۔ اس کی ضرب میں یہ طاقت ہے کہ ہر ہستی (بود) نیستی (نبود) ہو جاتی ہے۔ یعنی لا الٰہ کی بدولت اس کائنات کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لا الٰہ کہنے والا "گردابِ وجود" یعنی کائنات کے طلسم سے آزاد ہو جاتا ہے۔

ع تا بروں آمی ز گردابِ وجود

اس مصرع میں اقبال نے "وجود" کو کائنات کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ گرداب کہتے ہیں بھنور کو جس میں پھنس کر انسان غرق ہو جاتا ہے چونکہ کائنات کی دلچسپیوں میں منہمک ہو کر انسان حقیقت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کائنات کو گرداب سے تشبیہ دی ہے۔

اقبال کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات درحقیقت ایک طلسم یا فریب نظر ہے۔ دنیا کی زندگی درحقیقت دھوکہ کی پونجی ہے[۱]۔ مگر انسان اپنی جہالت کی وجہ سے اسی دنیا کو موجود سمجھتا ہے اس لئے اس کے حصول میں منہمک ہو کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ بلکہ اسی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتا ہے۔ اس طلسم سے نکلنے کی صورت یہ ہے کہ انسان اس طلسم کو لا الٰہ کی ضرب پیہم سے پاش پاش کر دے۔

قرآن حکیم نے دنیا کی زندگی کو "دھوکہ کی پونجی" قرار دیا ہے انسان اپنی جہالت کی بنا پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ دنیا اور اس کی نعما پائندار ہیں اس لئے انہیں حاصل کرنا چاہیئے۔ اور ان کے حصول میں وہ ایسا منہمک ہوتا ہے کہ خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اسے مذموم قرار دیا ہے۔

اسلام کی رو سے تمام دنیاوی نعمتوں سے تمتع تو جائز ہے۔ مگر حصولِ دنیا میں ایسا انہماک کہ انسان خدا سے غافل ہو جائے ممنوع ہے۔ دنیا مذموم نہیں ہے۔ دنیا میں منہمک ہو جانا مذموم ہے۔

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

---

[۱] وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (۵۷-۲۰)
اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکہ کی پونجی۔

اس دھوکہ (گرداب وجود) سے جو چیز انسان کو نجات دے سکتی ہے وہ لا الٰہ الا اللہ ہے۔ یعنی اللہ کے سوا حقیقی معنیٰ میں کوئی ہستی ہی موجود نہیں ہے لہٰذا یہ کائنات اس لائق ہی نہیں کہ اسے مقصودِ حیات بنایا جائے یا اس سے دل لگایا جائے۔

جب تک ایک انسان لا الٰہ اِلَّا اللہ کے حقیقی مفہوم یعنی لاموجود الا اللہ کو ذہن نشین نہ کرے اس وقت تک وہ گرداب وجود (کائنات) کے طلسم سے رہائی نہیں پا سکتا۔ اور جب تک وہ اس طلسم سے آزاد نہ ہو خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لئے عرفا نے یہ کہا ہے کہ جب تک ایک مسلمان وحدۃ الوجود کا قائل نہ ہو اس وقت تک اس کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا وحدۃ الوجود کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا حقیقی معنیٰ میں کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے۔ جب یہ حقیقت موحّد کے دل میں جانشین ہو جاتی ہے تو وہ لامحالہ دنیا سے قطع نظر کر کے صرف اللہ کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے اور سب سے بے تعلق ہو کر اسی کا ہو رہتا ہے اور اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہی چاہتا ہے کہ ہم اسی کے ہو رہیں۔ چنانچہ سرکار دوعالم صلعم سے خطاب ہوتا ہے

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (س۔ ۸)

اور اپنے رب کے نام کو یاد کرتے رہیئے اور سب دنیاوی دلچسپیوں سے قطع نظر کر کے یعنی سب سے مونہہ موڑ کر اسی کے ہو رہیئے۔

اب میں ناظرین سے یہ کہہ کر اس بحث کو ختم کر دیتا ہوں کہ جب تک ایک شخص کے دل میں یہ صداقت جاگزیں نہ ہو جائے کہ

لا موجود الا اللہ

جب تک کائنات کی ہر شی کی نفی نہ ہو جائے، جب تک یہ یقین حاصل نہ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی حقیقی معنیٰ میں موجود ہی نہیں ہے

اس وقت تک کوئی شخص خواہ وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے ماسوی اللہ سے قطع نظر کرکے اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔

اسی لئے صوفیائے کرام نے اور ان کی تقلید میں اقبال نے ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ پہلے ہر موجود کی نفی کرو تاکہ ہر موجود سے قطع تعلق عقلاً اور عملاً ممکن ہو سکے اور جب یہ کائنات نگاہوں میں ہیچ ہو جائیگی تو قدرتی طور پر انسان کی توجہ موجود حقیقی (اللہ) کی طرف مبذول ہو جائیگی۔

لا الہ الا اللہ کے پہلے جزو یعنی لا الہ کے مراقبہ سے انسان میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ماسوی اللہ کی نفی کر دیتا ہے اور نفی کے بعد صرف اللہ جو موجودِ حقیقی ہے باقی رہ جاتا ہے۔

مرشد رومی نے ان اشعار میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے۔

تیغ لا در قتلِ غیرِ حق بر اند
در نگر زاں پس کہ بعد از لا چہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت
شاد باش اے عشقِ شرکت سوز رفت

مطلب ان اشعار کا یہ ہے کہ جب عشق حقیقی یعنی لا الہ کی تلوار غیر حق (ماسوی اللہ) کو فنا کرنے کے لئے بلند کی تو اے مخاطب! اس پر غور کر کہ لا الہ کے بعد باقی کیا رہا؟ اس کے بعد خود جواب دیتے ہیں کہ صرف اللہ باقی رہ گیا۔ ماسوی اللہ یکسر فنا ہو گیا۔

اسی مضمون کو عارف جامی نے یوں ادا کیا ہے۔

لا نہنگے ست کائنات آشام
عرش تا فرش درکشید بکام

ہر کجا کردہ ایں نہنگ آہنگ
از من وما نہ بوئے ماندہ نہ رنگ

انہی بزرگ کی تقلید میں اقبال نے ہمیں یہ تاکید کی ہے

بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ھو بزن

مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات درحقیقت باطل ہے یعنی معدوم ہے۔ مگر التباس بالحق کی وجہ سے موجود نظر آتی ہے اس لئے اے مخاطب تو لا موجود الا ھو کی تلوار سے اسے فنا کر دے۔

خلاصہ کلام اینکہ جب تک ایک مسلمان وحدۃ الوجود پر ایمان نہ لائے اس وقت تک وہ ماسویٰ اللہ کی غلامی سے نجات نہیں پا سکتا یعنی گرداب وجود سے باہر نہیں نکل سکتا۔

دوسرا بند:۔

اس بند میں اقبال نے عربوں کی تاریخ سے لا الٰہ کی تاثیر کو واضح کیا ہے کہتے ہیں کہ جب تک انہوں نے لا الٰہ کو مدارِ زندگی نہیں بنایا وہ بدترین قسم کی غلامی میں گرفتار رہے۔ لیکن جب انہوں نے اس کلمہ کے اقتضاء پر عمل کیا تو لات و منات یعنی تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اور اگرچہ وہ دنیا میں رہے مگر علائق دنیوی سے آزاد ہو گئے

مصرعہ در جہات، آزاد از بند جہات

بہت بلیغ مصرع ہے۔ صنعتِ تضاد کی وجہ سے اس میں بڑی دلکشی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے دنیا فتح کر لی مگر اس کو مقصودِ حیات نہیں بنایا۔ جہات کنایہ ہے دنیا سے بند جہات کنایہ ہے علائق دنیوی یا محبت مال و زر سے۔ یعنی دنیا میں رہے مگر اس سے تعلق خاطر پیدا نہیں کیا۔

انہوں نے اسی کلمہ کی بدولت قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیئے صحراؤں اور سمندروں میں اپنی یلغاروں سے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور یہ ہنگامہ صرف لا الٰہ کی بدولت برپا ہوا۔ اسی کی بدولت انہوں نے نئی دنیا پیدا کر دی آج دنیا میں علوم و فنون کی جس قدر گرم بازاری ہے ان سب کی بنیاد انہوں ہی نے ڈالی۔

اینکہ شمع لالہ روشن کردہ اند
از کنار جوئے او آوردہ اند

اس شعر میں اقبال نے عربوں کی ان خدماتِ جلیلہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو انہوں نے تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے سلسلے میں انجام دیں آج دنیا میں جس قدر سائنٹفک ترقی نظر آرہی ہے۔ اس کی داغ بیل عربوں ہی نے ڈالی تھی۔ انہوں ہی نے یورپ کو جملہ علوم و فنون سے روشناس کیا۔

آخری شعر میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جب عربوں نے غیر اللہ کا تصوّر اپنے دل سے نکال دیا یعنی جب یہ عقیدہ ان کے دل میں راسخ ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی یا قوم ہم پر حکمراں نہیں ہو سکتی تو

ع از کف نماکش دو صد ہنگامہ رُست

لہٰذا اگر موجودہ زمانہ کے مسلمان دنیا میں از سر نو ہنگامہ برپا کرنا چاہتے ہیں یعنی اگر وہ دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کے آرزومند ہیں تو انہیں لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم پر عمل کرنا چاہیئے۔ یعنی یہ عقیدہ اپنے دل میں راسخ کر لینا چاہیئے کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی ہم پر حکمراں نہیں ہو سکتی اور وجہ اس کی محض یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی شی درحقیقت موجود ہی نہیں ہے اور جب موجود ہی نہیں تو حکمراں کیسے ہو سکتی ہے؟ خلاصہ کلام اینکہ جب تک ماسویٰ اللہ کی نفی نہ کر دی جائے۔ اس کے طلسم سے

رہائی نصیب نہیں ہو سکتی۔

**تیسرا بند:۔**

اس بند میں انھوں نے انقلابِ روس سے استشہاد کیا ہے. جو ۱۹۱۷ء میں واقع ہوا ناظرین کی آگاہی کے لئے ذیل میں اس انقلابِ عظیم کی مختصر تاریخ درج کرتا ہوں۔

انقلابِ روس کا بانی لینن ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا ۱۸۸۷ء میں قازان یونیورسٹی میں قانون پڑھنے گیا مگر باغیانہ خیالات کا اظہار کرنیکے جرم میں اس کو درس گاہ سے خارج کر دیا گیا۔ اخراج کے بعد اس نے کارل مارکس کے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ مزدوروں اور کاشتکاروں کی بہبود کے لئے اشتراکی نظام کا قیام ضروری ہے۔ چنانچہ اُس نے اس مقصد کے حصول کے لئے ایک یونین بنائی اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اشتراکی عقائد و افکار کی اشاعت شروع کی۔ اس جرم کی پاداش میں اسے جلاوطن کر دیا گیا ۱۹۰۰ء میں اس نے جرمنی میں پناہ لی. اور ۱۹۰۵ء میں روس واپس آیا۔ اور ٹراٹسکی کی معیت میں مزدوروں کی تنظیم شروع کی کچھ عرصہ کے بعد اسے میکسم گورکی کی رفاقت حاصل ہو گئی ۱۹۱۳ء میں اس نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے ایک اخبار (PERVADA) جاری کیا اور چند سال کے عرصہ میں عوام الناس کا لیڈر بن گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انقلاب برپا ہو گیا۔ نکولس ثانی (زارِ روس) اور اس کے خاندان کے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس انقلاب میں ٹراٹسکی نے لینن سے بڑھ کر شاندار کارنامے انجام دیئے۔ قوم نے لینن کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کیا۔ اور وہ ۱۹۱۷ء سے لیکر تا دمِ وفات (۱۹۲۴ء) زارِ روس سے بھی بڑھ کر مطلق العنانی (آمریت) کے ساتھ حکمراں رہا۔ اس نے چھ سال کے اندر روس

میں اشتراکی نظام بہت استوار بنیادوں پر قائم کر دیا۔ اور آج امریکہ کے بعد یہ ملک دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ اب ہم اس بند کی شرح لکھتے ہیں۔

کہتے ہیں ہمارے زمانہ میں روس میں عوام (بندگی) اور ملوکیت (خواجگی) کے درمیان جنگ واقع ہوئی۔ جب روسی عوام ملوکیت کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئے۔ (قلب و جگر خون گردید) تو انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ہم پر کوئی حکمراں نہیں ہے (از ضمیرش لا الٰہ بروں آمد) چنانچہ انہوں نے زار روس کا خاتمہ کر دیا (نظام کہنہ را برہم زد)

کہتے ہیں کہ میں نے روسیوں کے نظام نو (اشتراکیت) کا مطالعہ کیا ہے اس نظام کی بنیادی تعلیمات حسب ذیل ہیں:

عہ لا سلاطین الا کلیسا، لا الٰہ

یعنی اشتراکیت، ملوکیت، کلیسا اور خدا تینوں کی منکر ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس بند میں اشتراکیت کے معاشی نظام پر تنقید نہیں کی ہے۔ صرف یہ دکھایا ہے کہ اشتراکیت نے ملوکیت، کلیسا اور خدا کا انکار کیا ہے چونکہ اقبال بھی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت (کلیسا) کے خلاف ہیں اس لئے انہوں نے آئندہ اشعار میں اشتراکیت کی اس غلطی کو واضح کیا ہے کہ انسان کو محض لا الٰہ کہنے سے اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد الا اللہ کہنا بھی ضروری ہے۔

در مقام لا نیاساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات

یعنی انسان کی فطرت اور اس کی عقل دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ لا الٰہ کے بعد الا اللہ پر بھی ایمان لایا جائے۔ کیونکہ جب تک خدا یعنی خالقِ کائنات کو تسلیم نہ کیا جائے کائنات کی گتھی نہیں سلجھ سکتی۔

ع۔ نفی بے اثبات مرگبِ امتاں

مارکس کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ اس کائنات کی حقیقت ہے اور انسان سالمات مادی کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ مفروضہ تجربہ اور عقل دونوں کے خلاف ہے آج تک کوئی مادہ پرست یہ ثابت نہیں کر سکا کہ

(ا) نفس مدرک، مادہ کی پیداوار ہے یا
(ب) مادہ ترقی کر کے باشعور ہستی (انسان) بن گیا یا
(ج) مادہ اس کائنات کا خالق اور صانع ہے۔

ناظرین کی آگاہی کے لئے ذیل میں مسلکِ مادیت پر مختصر تنقید سپردِ قلم کی جاتی ہے۔

مادہ پرستوں کا دعویٰ یہ ہے کہ کائنات میں مادہ کے علاوہ اور کسی شی مثلاً خدا یا روح کا وجود نہیں ہے۔ نیز مادہ ازلی، ابدی، ناقابلِ فنا اور متحرک بالذات ہے۔ شعور ادراک اور تفکر یہ سب دماغی حالات اور کیفیات، سالمات مادی کی حرکت کا نتیجہ ہیں۔

فی الجملہ مادیات کی بنیاد اسی قسم کے دعاوی پر ہے جن کا کوئی ثبوت مادہ پرستوں کے پاس نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ یہ لوگ آج تک مادہ کی کوئی جامع اور مانع تعریف بھی پیش نہیں کر سکے۔ لینن نے اس کمزوری کو محسوس کر کے مادہ کی تین تعریفیں کی ہیں مگر وہ بھی تسلی بخش نہیں ہیں۔ مثلاً تیسری تعریف یہ ہے۔

مادہ وہ ہے جو ہمارے حواس پر عمل کر کے احساسات پیدا کرتا ہے۔ یہ تعریف منطقی اعتبار سے ناقص بھی ہے اور مبہم بھی ہے۔

ناقص اس لئے ہے کہ یہ تعریف، تعریف نہیں ہے بلکہ ایک دعویٰ ہے بلا دلیل۔ اور مبہم اس لئے ہے کہ اس سے مادہ کی ماہیت کا کوئی علم

حاصل نہیں ہوتا۔

چونکہ مادہ پرست یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور، سالمات مادی کے امتزاج باہمی کی بدولت رونما ہوتا ہے اس لئے ہم ذیل میں ارباب سائنس کی تحقیقات کا خلاصہ درج کرتے ہیں جس سے مادہ پرستوں کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ بلکہ مسلک مادیت کی بیخکنی ہو جاتی ہے۔

(۱) جب سائنس والوں نے مادہ کی ماہیت معلوم کرنے کی غرض سے سالمات مادی (ATOMS) کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان سے خاص قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں جنکو ریڈیم اور یورے نیم کہتے ہیں۔ ان کا اصطلاحی نام الیکٹرون یا برق پارے ہے۔

لیکن یہ برق پارے مادی نہیں ہیں بالفاظ دیگر ان پر مادی شی (SUBSTANCE) کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ الیکٹران در اصل بجلی کا چارج ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مادہ کی حقیقت مادی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک قسم کا نظام توانائی (ENERGY SYSTEM) ہے۔

گویا جدید تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ سالمہ (ATOM) جسے انیسویں صدی میں ناقابل تقسیم اور ناقابل فنا سمجھا جاتا تھا۔ اب ایک مخلوق شی ثابت ہو چکا ہے۔ کیونکہ وہ توانائیوں کا مرکب ہے۔ اور یہ بات منطقی طور پر مسلّم ہے کہ ہر مرکب حادث (مخلوق) ہوتا ہے۔

(۲) مادہ کی ماہیت معلوم کرنے (حقیقت کی تلاش) کے سلسلہ میں ہم برق تک پہونچے اب ہم پھر عالم طبیعات سے دریافت کرتے ہیں کہ برق کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میں نہیں جانتا۔ مگر میرا قیاس یہ ہے کہ برقی ذرات ایتھر (ETHER) میں دباؤ (STRAIN) سے عبارت ہیں۔ بالفاظ دیگر برقی ذرات کی ماہیت، توانائی (ENERGY) ہے۔

(۳) اب ہم پھر سوال کرتے ہیں کہ توانائی کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا جواب

بھی سائنسداں یہی دیتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم۔ مجبوراً ہم فلسفی سے پوچھتے ہیں کہ مادّہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیئے ہم نے اس کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مالی کیولیس (MOLECULES) سے مرکب ہے۔ اور وہ سالمات (ATOMS) سے مرکب ہیں۔ اور وہ الیکٹرانس (برق پاروں) سے مرکب ہیں۔ اور الیکٹران ایک قسم کی توانائی ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ توانائی کی ماہیت کیا ہے؟ فلسفی اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ توانائی کی ماہیت، ارادہ (WILL) ہے جسے آپ روحانی توانائی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ارادہ کوئی مادّی یا ٹھوس شی نہیں ہے۔ چنانچہ پروفیسر گلینزل میں کہتا ہے کہ اب ہمیں مادہ کے بجائے توانائی کو تسلیم کر کے اپنے فلسفہ توانائی (DYNAMISM) کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہیئے اور اربابِ علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ فلسفہ روحانیت کی ایک خاص شکل ہے۔

(۴) برٹرینڈ رسل کا قیاس یہ ہے کہ کائنات کی اصل تین چیزیں ہیں۔ (۱) برق پارے (۲) ہائیڈروجن کے مراکز (سالمات فعلیہ) اور اگر ہم (۱) اور (۲) کو ایتھر میں دباؤ کی کیفیت قرار دے دیں جیسا کہ قرینِ عقل ہے تو ایتھر کو کائنات کی اصل قرار دے سکتے ہیں۔

لیکن ہم پھر وہی سوال کرتے ہیں کہ ایتھر کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا جواب بھی حسبِ معمول نفی میں ہے یعنی من نمی دانم۔

ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بڑا ہی عالم تھا

(۵) ہم مادّہ کی ماہیت معلوم کرنے چلے تھے تو ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس کی ماہیت توانائی ہے اور توانائی کی ماہیت روح سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے یعنی نکلے تھے مادّہ کی تلاش میں دوچار ہو گئے رُوح سے بالفاظِ دگر کائنات کی اصلی بنیاد یا حقیقت مادّہ نہیں بلکہ روح ہے۔

جو صداقت سائنسدانوں پر بیسویں صدی عیسوی میں منکشف ہوئی قرآنِ حکیم نے اسے ساتویں صدی میں بایں الفاظ بیان کر دیا تھا:

اللّٰہُ نورُ السّمٰواتِ وَ الارضِ۔

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین (کائنات) کا نور ہے۔

بقول شیخ اکبرؒ جسے ہم کائنات کہتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے مگر جلوۂ ذات ہے۔ یعنی جلوۂ ذات کا دوسرا نام کائنات ہے۔

اسی صداقت کو مرشدِ رومی نے یوں بیان کیا ہے:۔

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ
زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

ناظرین کی آگاہی کے لئے اس شعر کا مطلب ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

جملہ معنی ہمہ، معشوق بمعنی او یعنی مرشد رومی نے ہمہ اوست کی تعلیم دی ہے عاشق سے مراد کل ممکنات ہے۔ پردہ سے موجود ظاہری مراد ہے۔ جو حجاب ہے موجود حقیقی کا۔ مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ نظر آتا ہے سب اسی معشوقِ حقیقی کا جلوۂ ذات ہے۔ یعنی ممکنات بظاہر موجود نظر آتے ہیں۔ مگر در حقیقت معدوم ہیں۔ ان تمام ممکنات میں سے کوئی ممکن (شئی) بذاتِ خود حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ صرف ایک ذاتِ حق حقیقی معنی میں یعنی بذات خود موجود ہے اور یہ تمام ممکنات اسی ذاتِ حق کے اسماء صفات کے عکوس و آثار ہیں۔

اسی مضمون کو شاہ نیاز احمد صاحب چشتی بریلوی نے یوں بیان کیا ہے ؎

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

اور خواجہ میر دردؔ نے اسی نکتہ کو یوں ادا کیا ہے:۔

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیاں ہیں سب مظاہر ظاہر ظہور تیرا

پاکانِ امت[1] کے پیرو صادق اقبال مرحوم نے بھی اپنی تمام تصانیف نظم و نثر میں اسی حقیقت کو مختلف الفاظ میں واضح کیا ہے۔ ان کی رائے میں مادہ اور روح میں بلحاظ اصل کوئی فرق نہیں ہے۔ جسے ہم مادہ کہتے ہیں وہ درحقیقت روح کی ایک کثیف شکل ہے۔ ضربِ کلیم میں اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:-

عقل ہے مدت سے اس پیچاک میں الجھی ہوئی
روح کس جوہر سے؟ خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے
میری مشکل: مستی و سوز و سرور و درد و داغ
تیری مشکل: مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے

مشکل کا بیان کرنے کے بعد خود اسے یوں حل کرتے ہیں:-

ارتباطِ حرف و معنی؟ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قباپوش اپنی پیراہن سے ہے

---

[1] اقبال کے نادان دوست خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں، تصوف اور وحدت الوجود کا کتنا ہی استخفاف کیوں نہ کریں مگر اقبال تو ساری عمر وحدۃ الوجود ہی کا نغمہ جانفزا سناتے رہے اور اربابِ تصوف کی تقلید اور اتباع پر فخر کرتے رہے۔ اس جگہ صرف ایک رباعی لکھتا ہوں:-

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکانِ امت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

یعنی روح اور مادّہ میں اصلیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے. جو فرق نظر آتا ہے یہ محض کیفیت کے اعتبار سے ہے۔
خطبۂ الہ آباد میں لکھتے ہیں :-

"MATTER IS ALSO SPRIT REALISING ITSELF IN SPACE AND TIME

یعنی مادّہ بھی روح ہی ہے جو بقیدِ زمان و مکان اپنی تحقیق کر رہا ہے۔
خلاصہ کلام اینکہ، مادہ پرستوں کا دعویٰ یہ تھا کہ مادّہ ہی اس کائنات کی حقیقت یا اصل ہے. لیکن پھر عصرِ حاضر کے سائنسدانوں نے اپنی تحقیقات سے ثابت کر دیا ہے کہ مادّہ توانائی میں تبدیل ہو سکتا ہے. اور توانائی کوئی مادّی چیز نہیں ہے. بالفاظِ دیگر مادّہ اور توانائی ایک ہی شی کے دو نام ہیں. یعنی مسلکِ مادّیت کا خاتمہ ہو گیا۔

باز آمدم بر سرِ مطلب :- اقبال کہتے ہیں کہ :-

آید‌ش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

یعنی وہ دن دور نہیں ہے جب روسی قوم انکارِ خدا کی منزل سے نکل کر اقرارِ خدا کی منزل تک پہنچ جائے گی. کیونکہ

در مقامِ لا نیا ساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

یعنی انکارِ خدا (مسلکِ مادّیت) سے انسان کو آسودگی (تسکین) حاصل نہیں ہو سکتی. کائنات کا نظام اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس کا خالق مادّہ نہیں ہے بلکہ خدا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا بحث میں واضح ہو چکا ہے۔
اس کے بعد اقبال اپنے مقصود کی طرف رجوع کرتے کہتے ہیں کہ قوموں کی زندگی لا اور اِلّا دونوں کے امتزاج پر موقوف ہے یعنی لا اِلٰہ کے بعد اِلّا اللہ

بھی کہنا چاہیئے جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی مجھ پر حکمراں نہیں ہے۔ جو قوم لا الہ کے بعد الا اللہ نہیں کہتی وہ روحانیت اور اخلاق کے اعتبار سے مردہ ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت کو انہوں نے حضرت ابراہیم کی زندگی سے واضح کیا ہے۔ کہ پہلے انہوں نے تمام معبودانِ باطلہ کی نفی کی۔ اس کے بعد معبودِ برحق کا اثبات کیا جس کی وضاحت یہ ہے کہ کائنات میں جس قدر چیزیں ہیں وہ سب فانی اور متغیّر اور محتاج ہیں۔ اس لئے ایک ایسی ہستی کا پایا جانا عقلاً ضروری ہے جو باقی ہو اور بذاتِ خود موجود ہو۔ ایسی ہستی صرف اللہ ہے جو واجب الوجود ہے۔

آخر میں اقبال مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

ع نعرہ لا پیشِ نمرودے بزن

یعنی ملوکیت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے بالفاظ دگر بادشاہوں سے کہہ دے کہ خدا کے سوا مجھ پر اور اس کائنات پر کوئی ہستی حکمراں نہیں ہو سکتی۔

یاد رکھ! جس شخص کے ہاتھ میں لا الہ کی تلوار آ جاتی ہے وہ ساری کائنات پر حکمراں ہو جاتا ہے یعنی کلمۂ توحید میں یہ طاقت ہے کہ اگر کوئی قوم اس کے اقتضا پر عمل کرے تو غیر اللہ کی غلامی سے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔

---

# فصل ہفتم

## فقر

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل ❊ یک نگاہِ راہ بیں، یک زندہ دل

فقر کارِ خویش را سنجیدن است ❊ بر دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن است

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر ❊ بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست ❊ ما امینیم این متاعِ مصطفیٰ است

فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند ❊ بر نوامیس[۱] جہاں شبخوں زند

بر مقامِ دیگر اندازد ترا ❊ از زجاج الماس می سازد ترا

برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم ❊ مردِ درویشے نگنجد در گلیم

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن ❊ یک دمِ او گرمیِ صد انجمن

بے پراں را ذوقِ پروازے دہد ❊ پشہ را تمکینِ شہبازے دہد

---

۱۔ جمع ناموس، مراد قدرت کی پوشیدہ قوتیں۔

با سلاطیں درفتد مردِ فقیر     از شکوہِ بوریا لرزد سریر

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر     وارہاند خلق را از جبر و قہر

می نگیرد جز بہ آں صحرا مقام     کاندرو شاہیں گریزد از حمام

قلبِ او را قوت از جذب و سلوک     پیشِ سلطاں نعرۂ او لا ملوک

آتشِ ما سوزناک از خاکِ او     شعلہ ترسد از خس و خاشاکِ او

بر نیفتد ملتے اندر نبرد     تا درو باقیست یک درویش مرد

آبروئے ما ز استغنائے اوست     سوزِ ما از شوقِ بے پروائے اوست

خویشتن را اندریں آئینہ بیں     تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر

قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں[1]     مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں

الاماں از گردشِ نہ آسماں     مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش     تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو     ترکِ ایں دیرِ کہن تسخیرِ او

---

۱۔ تلمیح ہے حضرت رسالت مآبؐ کی ایک مشہور حدیث کی طرف جس میں ارشاد ہے کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔

راکبش بودن از و دارستن است | از مقامِ آب و گل بر جستن است
صیدِ مومن ایں جہانِ آب و گل | باز را گوئی کہ صیدِ خود بہل؟
حل نہ شد ایں معنیٔ مشکل مرا | شاہیں از افلاک بگریزد چرا
وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد | مرغکے از چنگ او نامد بدرد
درکنامے ماند زار و سرنگوں
پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں
فقرِ قرآں احتساب ہست و بود | نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات | بندہ از تاثیرِ او مولا صفات
فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است | فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است!
زندگی آں را سکونِ غار و کوہ | زندگی ایں را ز مرگِ با شکوہ!
آں خدا را جستن از ترکِ بدن | ایں خودی را بر فسانِ حق زدن
آں خودی را کشتن و وا سوختن | ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر | از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین | فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین رضؓ

---

ؔلہ باز کے رہنے کی جگہ۔

فقر را تا ذوقِ عریانی نماند
آں جلال اندر مسلمانی نماند

وائے ما اے وائے ایں دیرِ کہن | تیغِ لا در کف نہ تو داری نہ من
دل ز غیر اللہ بپرداز اے جواں | ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں
تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن | اے مسلماں مُردن است ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را | جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

بر عیارِ مصطفیٰ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

آہ زاں قومے کہ از پا بر فتاد | میر و سلطاں زاد و درویشے نزاد
داستانِ او مپرس از من کہ من | چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ | ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ
مسلم ایں کشور از خود ناامید | عمر باشد باخدا مردے ندید
لاجرم از قوّتِ دیں بدظن است | کاروانِ خویش را خود رہزن است
از سہ قرنؔ ایں اُمّتِ خوار و زبوں | زندہ بے سوز و سرورِ اندروں

---

سہ صدی ۔

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق ‌ ‌ ‌ ‌ مکتب و مُلّائے او محروم شوق

ز شتنی اندیشہ او را خوار کرد ‌ ‌ ‌ ‌ افتراقِ[1] او را ز خود بیزار کرد

تا نداند از مقام و منزلش ‌ ‌ ‌ ‌ مُرد ذوقِ انقلاب اندر دلش

طبعِ او بے صحبتِ مردِ خبیر ‌ ‌ ‌ ‌ خستہ و افسردہ و حق ناپذیر

بندۂ رد کردۂ مولاست او ‌ ‌ ‌ ‌ مفلس و قلّاش و بے پرواست او

نے بکف مالے کہ سلطانے برد ‌ ‌ ‌ ‌ نے بدل نورے کہ شیطانے برد

شیخِ او لُردِ[2] فرنگی را مرید ‌ ‌ ‌ ‌ گرچہ گوید از مقامِ بایزید

گفت دیں را رونق از محکومی است ‌ ‌ ‌ ‌ زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را رحمت شمُرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد ‌ ‌ ‌ ‌ می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد ؟

عصرِ ما ما را ز ما بیگانہ کرد ‌ ‌ ‌ ‌ از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ کرد

سوزِ او تا از میانِ سینہ رفت ‌ ‌ ‌ ‌ جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

باطنِ ایں عصر را نشناختی ‌ ‌ ‌ ‌ داوِ[3] اوّل خویش را در باختی

تا دماغِ تو بہ پیچاکش فتاد ‌ ‌ ‌ ‌ آرزوئے زندہ در دل نزاد

---

[1] پراگندگی۔ [2] انگریزی لفظ لارڈ کا مفرس [3] داو اوّل الخ۔ یعنی تو نے اپنے آپ کو پہلے ہی داؤ میں ہار دیا۔

احتساب بخویش کن از خود مرد | یک دو دم از غیرِ خود بیگانہ شو
تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس | اندریں کشور مقامِ خود شناس
ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند | بر نگوں شاخ آشیانِ خود مبند
نغمہ داری در گلو اے بے خبر | جنس خود بشناس و باز اغاں مپر
خویشتن را تیزیٔ شمشیر دہ | بازِ خود را در کفِ تقدیر دہ
اندرونِ تست سیلِ بے پناہ | پیشِ او کوہِ گراں مانندِ کاہ
سیل را تمکین[1] ز نا آسودن است | یک نفس آسودنش نابودن است
من نہ ملّا، نے فقیہِ نکتہ در | نے مرا از فقر و درویشی خبر
در رہِ دیں تیز بیں و سست گام | پختہ من خام و کارم ناتمام
تا دلِ پُر اضطرابم دادہ اند | یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں نایدچو من مردِ فقیر

---

---

[1] تمکین: وقار، شان و شوکت

# تمہید

اس مثنوی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبال نے اپنے نظریہ فقر پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔ محض اس لئے کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں فقر کی قدر و منزلت اہمیت اور عظمت جاگزیں ہو جائے۔ ذیل میں اس نظریہ کی وضاحت ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

نظریۂ فقر کا ارتقاء:۔

اقبال نے اپنے ابتدائی کلام میں اس لفظ کو لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً بانگِ درا میں لکھتے ہیں:۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

اس شعر میں انہوں نے فقر کو غنا کے مقابلہ میں یعنی مفلسی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

اسرارِ خودی، رموزِ خودی، پیامِ مشرق اور زبورِ عجم میں انہوں نے اس
(۱۹۱۵ء) (۱۹۱۸ء) (۱۹۲۳ء) (۱۹۲۶ء) لفظ کو جہاں تک مجھے علم ہے۔ کہیں استعمال نہیں کیا۔

جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) میں انہوں نے پہلی مرتبہ اس لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کیا۔ ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء
۱۹۳۸ء اور اس کے بعد مسافر، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، مثنوی پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز ان تمام کتابوں میں انہوں نے اس اصطلاح کی وضاحت کی۔

ان کتابوں میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقر کو خودی کی پختگی، تربیت اور تکمیل کا ثمرہ سمجھتے ہیں یعنی جب خودی اتباعِ رسول کی بدولت پختہ ہو کر مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر فقر کمالاتِ انسانی کا دوسرا نام ہے اور اسی لئے انہوں نے اس اصطلاح کو اسلام کا مرادف قرار دیا ہے:-

لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

میرا قیاس یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء تک فقر کا تصور ان کے ذہن میں تشکیل پذیر رہا۔ ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ میں انہوں نے اس کو ایک نظریہ کے طور پر پیش کیا۔ اور ضرب کلیم میں یہ نظریہ ان کے لئے ایک عقیدہ بن گیا۔ کیونکہ ۱۹۳۲ء سے تادمِ وفات انہوں نے اس اصطلاح کی تبلیغ اسی جوش و خروش اور یقینِ محکم کے ساتھ کی جس طرح کوئی شخص اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرتا ہے۔ کون شخص ہے جو حسب ذیل اشعار کو پڑھ کر اس نتیجہ پر نہیں پہنچے گا کہ شانِ فقر سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی کمال متصور نہیں ہو سکتا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

(بالِ جبریل)

فقر کا لغوی معنیٰ :-

امام راغب اصفہانی نے مفرادات میں لفظ فقر کے حسبِ ذیل معانی لکھے ہیں :-

(ا) وجود الحاجتہ الضروریہ۔ یعنی ان حاجات کا پایا جانا جن سے کسی انسان کو کسی وقت مفر نہیں ہے۔ مثلاً ہوا، پانی، آگ، روشنی اور غذا یعنی فقر کے اصلی اور لغوی معنی احتیاج کے ہیں۔

(ب) عدم المقتنیات۔ یعنی سامانِ معیشت کا نہ ہونا یعنی فقیر وہ ہے جس کے پاس زندگی بسر کرنے کا سامان نہ ہو۔

(ج) فقر النفس۔ یعنی طبیعت میں حرص و طمع کا نہ ہونا جس کی وجہ سے انسان ہر وقت مختلف اشیاء کا حاجتمند، خواہشمند، طلبگار یا محتاج رہتا ہے۔ چنانچہ کاد الفقر ان یکون کفراً میں اسی افتقاد نفس کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فقر و مفلسی، حاجتمندی احتیاج (ضرورت) وہ بری بلا ہے کہ کبھی کبھی انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔

(د) الفقر الی اللہ یعنی نفس کی وہ حالت جب انسان ہر وقت اپنے آپ کو خدا کا محتاج یقین کرے۔ یعنی یہ ایمان و ایقان اسی کے لیے بمنزلہ حال بن جائے کہ

(ا) میں اپنی ہستی اپنی ذات اور اپنے وجود سب کے لیے اللہ کا محتاج ہوں۔ اگر وہ مجھے موجود نہ کرتا تو میں از خود ہرگز موجود نہیں ہو سکتا

تھا کیونکہ مجھ میں اس کی قدرت ہی نہیں ہے۔

(ب) میں اپنے وجود کو از خود ہرگز برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے میں اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اس کی صفت قیومیت کا محتاج ہوں۔ یعنی اسی کی بدولت زندہ ہوں۔

(ج) اگر اس کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو تو میں کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھ میں تو بذات خود کوئی قوت یا خوبی ہے ہی نہیں [۱]

(د) خلاصہ کلام اینکہ میں اپنی زندگی اور اس کے تسلسل کے لئے بھی اللہ کا محتاج ہوں اور زندگی کے ہر شعبہ میں بھی ہر وقت اسکا دست نگر ہوں [۲]

چنانچہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں فقر کو اسی احتیاج کے معنی میں استعمال فرمایا ہے:۔

اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْکَ

اے اللہ مجھے اپنا محتاج بنا کر (ساری دنیا سے) غنی کر دے اور اپنی ذات سے مستغنی کر کے (ساری دنیا کا) محتاج مت بنا یو۔

---

[۱] اسی مضمون کو ایک ہندی شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

سائیں اکھیاں پھیریاں تو بھیری ملک جہان
ٹک اکھیاں مہر کی تو لاکھوں کریں سلام

(۲) اسی مضمون کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے

بے تو از خواب عدم چشم کشودن نتواں
بے تو بودن نتواں، با تو نبودن نتواں

(پیام مشرق)

## قرآنی مفہوم :-

قرآن حکیم میں "فقر" احتیاج اور مفلسی کے معنوں میں آیا ہے۔

(ا) یَا اَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ ج واللّٰه غنی الْحَمِیْدُ ہ

اے لوگو! تم سب (اپنی ہستی کے لئے) اللہ کی طرف محتاج ہو (اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ) تو غنی (بے نیاز بے پروا) اور لائق حمد و ثنا ہے (۳۵ - ۱۵)

(ب) اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاکِیْنَ الخ (۹-۶۰)

بلاشبہ صدقات تو مفلسوں اور محتاجوں کے لئے ہیں۔

(ج) الشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ الخ (۲ - ۲۶۸)

شیطان تم کو مفلسی سے ڈراتا ہے۔

## قرآنی مفہوم کی وضاحت :-

اگرچہ قرآنِ حکیم نے فقر کو احتیاج اور مفلسی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ مگر اس معنی میں اقبال کا اصطلاحی مفہوم بھی پوشیدہ ہے جس کی تشریح انہوں نے جاوید نامہ سے لیکر ارمغانِ حجاز تک ہر تصنیف میں کی ہے۔ ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(ا) قرآنِ حکیم انسانوں کو فقراء (محتاج) حاجتمند اور اللہ تم کو غنی (بے نیاز حاجات سے بالاتر) قرار دیتا ہے۔

(ب) فقر اور غنا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جس طرح نیازمندی اور بے نیازی۔

(ج) اللہ کی ذات میں غنا بے نیازی ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ اپنے وجود کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا وجود خانہ زاد ہے۔ یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں وہ واجب الوجود ہے۔

(د) انسان کی ذات میں فقر (نیازمندی، احتیاج اور بیچارگی) ہے کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ اپنے وجود کے لئے اللہ کا محتاج ہے۔ اس کا وجود مستعار ہے اللہ کا عطا کردہ ہے۔ یعنی فلسفہ کی اصطلاح میں وہ ممکن الوجود ہے [1]

(لا) چونکہ انسان بروئے قرآن اپنے وجود کے لئے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ اس لئے عقلی طور پر ہر بات میں ہر معاملہ میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر پہلو اور ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنی ذات کے لئے حق تعالیٰ کا محتاج ہے تو اپنی صفات (علم، قدرت، ارادہ، حرکت فعل سمع، بصر، کلام، حکومت اقتدار، غرضیکہ جملہ صفات وجودیہ ایجابیہ) میں بدرجۂ اولیٰ حق تعالیٰ کا محتاج ہوگا۔ چنانچہ قرآن حکیم اس پر شاہد ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ ہی بذاتِ خود موجود ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

---

[1] یہیں سے شیخ اکبر نے یہ عقیدہ مستنبط کیا ہے کہ صفت افتقار و احتیاج ممکن (انسان) کی ذات میں داخل ہے جو کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتی چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

الْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی۔ وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ۔

عبد (انسان) ہمیشہ عبد ہی رہیگا۔ خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے۔ اور (رب) اللہ ہمیشہ رب ہی رہیگا خواہ کتنا ہی تنزل کیوں نہ فرمائے۔ اس قرآنی تعلیم کو کہ انسان کا وجود حق تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ وہ اپنی اصطلاح میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ حقائق ممکنات حق کے اسماء صفات کی تجلیات ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی اسی صداقت کو اپنی وضع کردہ اصطلاح میں یوں پیش کرتے ہیں۔

حقائق ممکنات حق کے اسماء و صفات کے عکوس و اظلال ہیں۔

یعنی دونوں بزرگ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ فرق صرف تعبیر کا ہے۔

نظامی گنجوی نے اسی صداقت کو یوں نظم کیا ہے۔

مرا اہدا رسد کبر با وضی کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی مستقل بالذات اور ازخود موجود (واجب الوجود) نہیں ہے۔

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِيْرُ ۝ (۳۱ - ۳۰)

یہ جملہ شواہد مذکورہ بالا اس صداقت پر دلیل ہیں کہ صرف اللہ ہی الحق (واجب الوجود) اور قائم بالذات ہے اور بلاشبہ اس کے سوا جس کسی کو بھی وہ لوگ پکارتے ہیں اور باطل (فانی اور مٹ جانے والا) ہے۔ اور بلاشبہ صرف اللہ ہی علیٰ (بلند مرتبہ اور بالاترین) اور کبیر (عظمت اور بزرگی والا) ہے۔

(۲) حیات اسی کے لئے ہے کما قال ھو الحیّ القیّوم

اللہ کے سوا کوئی الٰہ (واجب الوجود) نہیں ہے اور وہی درحقیقت زندہ ہے اور وہی سب مخلوقات کو زندہ رکھنے والا ہے۔

اسی سے ثابت ہوا کہ کسی مخلوق میں صفت حیات ذاتی نہیں ہے۔ کوئی مخلوق ازخود زندہ نہیں ہے۔ خلاصہ کلام اینکہ ہم موجود ہوئے تو اس کے موجود کرنے سے۔ اور زندہ ہیں تو اس کے زندہ رکھنے سے۔ ہماری حیات اور اس کا تسلسل یہ دونوں باتیں اسی کی نگاہ جود و کرم کا صدقہ ہیں۔

(۳) علم و قدرت بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہے۔

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝ (۳۰ - ۵۴)

وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہ بہت علم اور بہت قدرت والا ہے۔

(۴) ارادہ (مشیت) بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہے۔

وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط (۷۶ - ۳۰)

ورتم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ

یعنی بے مشیت الہٰی کوئی شخص کوئی بات چاہ نہیں سکتا۔ کسی بات کا ارادہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ بندے کی مشیت اللہ کی مشیت کی تابع ہے۔

(۵) سماعت و بصارت بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۷-۱)

تحقیق اللہ ہی سب کچھ سننے (اور) دیکھنے والا ہے۔

(۶) حکومت بھی درحقیقت اسی کے لئے ثابت ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۴-۲)

اسی کے قبضہ اور تصرف میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (۲۵-۲)

اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے اور اس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔ (جو اس کی بادشاہت میں شریک ہو سکے) اور حقیقت حال یہ ہے کہ یہ بات ممکن ہی نہیں کہ کوئی ہستی بادشاہت اور حکومت میں اس کی شریک ہو سکے۔ کیونکہ ساری کائنات تو اس کی محتاج ہے۔ اور یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ ممکن (محتاج) کبھی بھی۔ واجب (غنی) کا مدِ مقابل یا ہمسر یا شریکِ کار ہو سکے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶-۵۷)

نہیں ہے حکم کسی (انسان) کا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔

(۷) انتہائے عاجزی و درماندگی و بیچارگی و افتقار و احتیاج و بے مائیگی یہ ہے کہ ہم اپنے افعال کے بھی خالق نہیں ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ٥ (۳۷-۹۶)

اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔

قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ہ (۱۳-۱۶)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے اور وہ واحد (اور) زبردست ہے۔

نوٹ :- اگر اللہ ہر شی کا خالق ہے تو چونکہ ہر انسان کا ہر فعل بھی ایک شی ہے۔ اس لئے ہر فعلِ انسانی کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان میں ذاتی طور پر نہ زندگی ہے نہ قدرت نہ طاقت ہے نہ قوت۔

اور اس پر یہ آیت شاہد ہے۔

مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ہ (۱۸-۳۹)

(خدا پرست نے اس متکبر انسان سے کہا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ بات کیوں نہ کہی کہ جو اللہ چاہے (وہی ہوتا ہے) کسی انسان میں قوت نہیں ہے جب تک اللہ اسے قوت عطا نہ کرے۔

---

باز آمدم بر سرِ مطلب :- جب یہ صداقت انسان پر منکشف ہو جاتی ہے کہ میں بذاتِ خویش کچھ نہیں ہوں۔ میری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میں اگر موجود ہوں تو محض اس لئے کہ اس نے مجھے وجود عطا کیا ہے۔ اگر زندہ ہوں تو محض اس لئے کہ اس نے مجھے زندگی عطا کی ہے۔ بالفاظِ دیگر اسی کے وجود سے موجود ہوں۔ اسی کی حیات سے زندہ ہوں۔ اسی کے علم سے جانتا ہوں۔ اسی کی قدرت اور ارادہ سے مجھ میں قدرت اور ارادہ ہے۔ تو وہ شخص کائنات کی تمام ہستیوں سے منہ موڑ کر اور سب مخلوقات سے رشتہ توڑ کر اپنا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ سے جوڑ لیتا ہے۔ اور اس کے دل میں یہ یقین جاگزیں ہو جاتا ہے کہ نہ کوئی شخص مجھے

نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، نہ کوئی شخص میری دستگیری کر سکتا ہے نہ کارسازی کر سکتا ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ سب میری طرح عاجز، مسکین اور محتاج ہیں۔ بالفاظِ دگر اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ میں محتاج یعنی فقیر ہوں۔ اور ہر شخص میری ہی طرح فقیر ہے اس یقین کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ شخص حقیقی معنی میں موحد یا مومن یا قلندر بن جاتا ہے۔ یعنی اس میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ صداقت اس پر واضح ہو جاتی ہے کہ مجھ میں جس قدر صفات ہیں سب خدا کی عطا کردہ ہیں اور میں کچھ نہیں ہوں مگر مظہر ذاتِ حق ہوں۔ میری زندگی اور میرے افعال سے اسی وجود حقیقی کی قوتوں کا ظہور ہو رہا ہے۔ یہ یقین اس کی روح میں اسقدر بلندی پیدا کر دیتا ہے کہ اس کا سر کسی ہستی کے سامنے نہیں جھک سکتا کیوں؟ اس لئے کہ اسے یہ یقین حاصل ہو چکا ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا حقیقی معنی میں کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عاشقاں جز خدا ہیچ نیست

(سعدیؔ)

---

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ
زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

## فقر کا اصطلاحی مفہوم:-

فقر کا اصطلاحی مفہوم اقبال نے سب سے پہلے جاوید نامہ کے ان اشعار میں پیش کیا۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است — فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں، اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدیم جز بہ ذکر

انہوں نے فقر کا یہ مفہوم (کہ وہ اختلاط ذکر و فکر کا دوسرا نام ہے) قرآنِ حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:-

وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۝ (۱۸۹-۱۹۰)

اور (آگاہ ہو جاؤ کہ) آسمانوں اور زمین کی بادشاہت صرف اللہ ہی کیلئے ہے۔ (اس کے علاوہ نہ کوئی مالک ہے نہ حاکم۔ اور اللہ ہی ہر شی پر قدرت رکھتا ہے۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لئے بہت سی نشانیاں (خدا کی ہستی پر بہت سی دلیلیں) ہیں (یہ عقلمند کون ہیں؟) وہ جو ذکر کرتے رہتے ہیں اللہ کا کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (یعنی ہر حالت میں) اور غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں (اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو بلیاختہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو عبث یا بیکار نہیں پیدا کیا۔

اس آیت میں دو لفظ آئے ہیں ذکر (یذکرون) اسی سے مشتق ہے، اور فکر (یتفکرون) اسی سے بنا ہے۔ اقبال نے انہی دو لفظوں سے فقر کا اصطلاحی مفہوم پیدا کیا ہے۔ مگر ان دو لفظوں کا مفہوم واضح کرنے سے پہلے ان کی لغوی تحقیق ضروری ہے۔

ذکر کی تعریف:-

ماہرینِ فن نے ذکر کی تعریف یوں کی ہے۔

استحضار اللہ فی القلب واستغراق الجوارح فی اداءِ النوافل علی الدوام بغایۃ تخصیصہٖ وحبّہٖ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے قلب میں حاضر کرنا (مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر حال میں اور ہر جگہ حاضر و ناظر، علیٰ کلّ شیٍٔ شہید یقین کرنا) اور اس کی بیحد تعظیم اور اس سے بے انداز محبت کی بنا پر نہایت پابندی کے ساتھ اس کے عاید کردہ فرائض ادا کرنے کے لئے اپنے تمام اعضائے جسمانی کو وقف کار کر دینا (یعنی ہر وقت اس کے احکام کی بجا آوری میں مشغول رہنا کامل توجہ کے ساتھ۔)

واضح ہو کہ ذکر کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً

(۱) ذکر لسانی یعنی زبان سے اپنے محبوب کا ذکر کرنا۔ اس کا نام لینا۔ اس کے نام کا ورد کرنا۔ اس کی صفات یا خوبیوں کا زبان سے اظہار کرنا۔ اس کے نام کی مالا جپنا چنانچہ تسبیح و تحمید و تمجید و تحلیل و تکبیر وغیرہ یہ سب ذکر لسانی کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زبان سے ذکر کرنا (مالا پھیرنا یا تسبیح گھمانا) ذکر کی ابتدائی شکل یا پہلی منزل ہے۔ جو شخص غلطی سے اسی منزل کو انتہائی منزل سمجھ لے وہ ساری عمر ابتدائی منزل میں ہی رہیگا۔[1] جس طرح وہ شخص جو آمد نامہ یا خالق باری کو فارسی ادبیات

---

[1] ایشور بھگت کبیر مہاراج نے ایسے ہی لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے یہ دوہا کہا تھا۔

مالا پھیرت جگ بھیو، پایو نہ من کا پھیر
کر کا منکا چھانڈ دے من کا منکا پھیر

اے مورکھ! تجھے مالا پھیرتے جگ بیت گئے مگر تو اپنے نفسِ امارہ (من) کی عیاریوں سے واقف نہ ہو سکا۔ اس لئے تو ہاتھ کی کے دانوں (تسبیح) کو پھینک دے اور اس کے بجائے نفسِ امارہ کو مغلوب کر کیونکہ جب تک من (نفسِ امارہ)

کی آخری کتاب سمجھ لے وہ کبھی ہرگز دیوانِ بیدل اور کلیاتِ جامی سے مستفید نہیں ہو سکتا۔

(ب) ذکر قلبی! یعنی اپنے محبوب کو دل میں یوں یاد کرنا اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اُسی کا تصور کرنا (اسی کا دھیان کرنا) اسکی یاد سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا۔ یہ منزل ذکر لسانی سے اونچی ہے۔ کیونکہ دھیان سے گیان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور گیان (معرفت) کی بدولت عاشق میں معشوق کی صفات کا عکس جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔

(ج) ذکر بالجوارح۔ یہ ذکر کی آخری اور اعلیٰ صورت ہے۔ جب محبوب کی محبت دل میں گھر کر لیتی ہے اور ریشہ ریشہ میں سما جاتی ہے تو

---

بقیہ حاشیہ صہ ۳۶۱ :۔ شانت (مطمئن) نہ ہو جائے۔ محبوب کا دیدار نہیں ہو سکتا (جس طرح جب تک سطح آب ساکن نہ ہو جائے تمہیں اپنا عکس نظر نہیں آسکتا اور جسے دیدار نصیب نہ ہو اس کا جیون ہی اکارت گیا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں ؎

برمقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

ہم کبیر کے اس دعوے کو ذیل میں قرآن سے ثابت کرتے ہیں:۔

(ا) مقصودِ حیات، لقاء رب ہے (فمن کانَ یرجو لِقاءِ ربہٖ الخ

(ب) لقاء رب جیتے جی ہونا چاہیئے کیونکہ

من کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھُوَ فی آخرۃ اعمیٰ"

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا۔

(ج) مگر یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نفس امارہ مطمئن نہ ہو جائے۔

یا ایتھا النفسَ المطمئنۃ الرجعی الی ربکِ راضیۃً مرضیۃ

عاشق اپنے طرزِ عمل (افعال) سے اپنی محبت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ شریعت کی زبان میں اسے اتباعِ رسول کہتے ہیں اور اسی اتباع کی بدولت عاشق صادق مقامِ محبوبیت پر پہونچ جاتا ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۵ (۳-۳۱)

اے رسول! آپ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اس کا ثمرہ یہ ملے گا کہ اللہ تمہیں محبوب بنالے گا۔

صحابہ کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات عمل (جہاد) کو ذکر کی بہترین صورت یقین کرتے تھے۔

## ذکر کے معانی :-

قرآنِ حکیم نے ذکر کو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے جن سے مذکورہ بالا اقسام کا ثبوت بآسانی مل سکتا ہے۔

(۱) ذکر بمعنی قرآن مثلاً :-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۵

بلاشبہ ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے یقینی محافظ ہیں۔

(۲) ذکر بمعنی احضار الشئ فی الذھن یعنی کسی بات یا واقعہ کو ذہن میں حاضر کرنا یا کسی واقعہ کو یاد کرنا یا اس پر غور کرنا مثلاً

یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم الخ (۲-۴۰)

اے بنی اسرائیل یاد کرو ان احسانات کو جو میں نے تم پر کئے۔

(۳) ذکر بمعنی زبان سے اللہ کا نام لینا یعنی ذکر لسانی مثلاً

وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۵ (۸۷-۱۵)

اور ذکر کیا اپنے رب کے نام کا (رب کا نام لیا) اور اس کے بعد نماز پڑھی۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (۸-۲۰)
بیشک مومن تو وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جائے تو اس کی عظمت کے تصور سے ان کے دل کانپنے لگیں۔

(۴) ذکر بمعنی دل میں یاد کرنا۔ یعنی ذکرِ قلبی مثلاً
وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً الخ (۷-۲۰۵)
اور یاد کیجئے اپنے رب کو اپنے دل میں بہت گڑگڑا کر ڈر کر۔

(۵) ذکر بمعنی نصیحت یا وعظ یا پند مثلاً
لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ۔
بیشک ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے
فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرٰى ۔ (۸۷-۹)
پس آپ نصیحت کیجئے اگر (ان کو) نصیحت نفع ہے۔

(۶) ذکر بمعنی عبرت حاصل کرنا تھا۔ مثلاً:۔
أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ الخ
کیا انسان کبھی اس بات کو یاد نہیں کرتا (غور نہیں کرتا تاکہ عبرت حاصل کر سکے کہ ہم نے اس کو پیدا کیا اس سے پہلے اور وہ نہیں تھا کچھ بھی۔ (۱۹-۶۷)

(۷) ذکر بمعنی شدید قسم کی محبّت کرنا یعنی کسی کی یاد میں مستغرق رہنا۔ مثلاً:۔
قَالُوا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتّٰى تَكُونَ حَرَضًا الخ
انہوں نے کہا بخدا تم تو سدا یوسف ہی کی یاد میں مشغول رہو گے یہاں تک کہ جھر جھر کے از کار رفتہ ہو جاؤ گے (۱۲-۸۵)

(۸) ذکر بمعنی تذکرہ یعنی داستان بیان کرنا۔ مثلاً:۔
ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا (۱۹-۲)

یہ تذکرہ ہے تیرے رب کی رحمت کا اپنے بندے زکریا پر

(۹) ذکر بمعنی رابطہ قلبی یا تعلق خاطر مثلاً

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ الخ

ایسے لوگ کہ نہیں غافل کرتی ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے (۲۴-۳۷)

(۱۰) ذکر بمعنی نماز یا عبادت مثلاً

(ا) فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ (۶۲-۹)

تو دوڑو ذکر الٰہی (نماز) کی طرف اور چھوڑ دو خرید و فروخت۔

(ب) فَاذْكُرُوا اللهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ الخ (۲-۱۹۸)

تو یاد کرو اللہ کو مزدلفہ میں قیام کرکے۔

(۱۱) ذکر بمعنی اطاعت یا اتباع قانونِ ایزدی۔

(ا) وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا الخ

اور جو شخص میرے قوانین کی اطاعت سے روگردانی کریگا تو بلاشبہ اس کی زندگی تنگی اور پریشانی میں گزرے گی۔ (۲۰-۱۲۴)

(ب) فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ (۲-۱۵۲)

تم میرے احکام کی تعمیل کرو۔ میں اس کے صلہ میں تمہیں مغفرت اور ثواب عطا کروں گا۔

(۱۲) ذکر بمعنی معیتِ الٰہی کا احساس یعنی ہر وقت خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس کی حضوری میں زندگی بسر کرنا۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (۲۰-۴۲)

اے موسیٰ تم دونوں (تو اور تیرا بھائی) میری آیات لیکر مصر جاؤ اور دیکھو کسی وقت کسی حال میں میری یاد میں کوتاہی یا تقصیر نہ کرنا۔

اگر ناظرین ذکر کے ان تمام معانی پر غور کرینگے تو یقیناً بآسانی اس

نتیجہ پر پہونچ جائیں گے کہ قرآنِ حکیم کی رو سے "ذکر" انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ ذکر کے مفہوم میں ذکر، یاد، تلاوتِ قرآن نماز، عبادت، رابطہ قلبی، محبت اطاعت عملِ صالح (جہاد) اتباعِ شریعت، عبرت پذیری، محوبیت، استغراق، تذکیر، نصیحت، وعظ و پند اور معیتِ الٰہی کا احساس۔ یہ تمام تصورات داخل ہیں۔ بالفاظِ دگر انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ذکر کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

## فکر کی تعریف :-

فکر کی تعریف علما نے یوں کی ہے:۔

احضار المعرفتین او المعارف لاستفتاح معرفۃ اخری۔

یعنی ذہن انسانی جن دو یا زیادہ صداقتوں کی معرفت حاصل کرچکا ہے ان کو بدیں غرض پیشِ نظر رکھنا کہ ان کی بدولت تیسری چیز کی معرفت حاصل ہوسکے۔ مثلاً ہمیں یہ دو صداقتیں پہلے سے معلوم ہیں۔

(۱) الآخرۃ القبلی من الدنیا۔

یعنی آخرت دنیا کے مقابلہ میں زیادہ باقی رہنے والی ہے۔

(ب) الالقبلی اولیٰ بالانتخاب

یعنی جو شی سب سے زیادہ باقی رہنے والی ہے۔ وہی اس کی مستحق ہے کہ اس کا انتخاب کیا جائے۔

جب ہم نے ان صداقتوں (معرفتوں) کو اپنے ذہن میں حاضر کیا (اور ان پر تفکر کیا) تو ہم منطقی طور سے اس نتیجہ پہونچے کہ

فالآخرۃ اولیٰ بالانتخاب

یعنی اندریں صورت آخرت اس لائق ہے کہ دنیا کے مقابلہ میں اس کا انتخاب کیا جائے۔

اللہ کے کسی رسول نے ہم سے کہا کہ

الاخرۃ خیرلک من الاولیٰ۔

اگر ہم نے اس صداقت کو محض سن کر تسلیم کر لیا تو یہ تقلید ہے۔ لیکن اگر ہم نے خود اس مسئلہ پر غور و فکر کی اور اپنی قوت مفکرہ کی بدولت مسلمات کو اس طرح مرتب کیا کہ وہی نتیجہ برآمد ہو گیا۔ جو رسول تلقین کرتا تھا تو یہ فکر یا تفکر ہے۔

## ذکر اور فکر میں حدِ فاصل :-

یہ ایک طویل بحث ہے۔ ذیل میں چند اشارات درج کئے جاتے ہیں۔

(ا) ذکر میں معارف تو حاصل ہوتے ہیں۔ مگر استنتاج نہیں ہوتا۔ اور فکر کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ معارف سے نتیجہ نکالا جائے۔

(ب) فکر کا تعلق محض ذہن (Mind) یا قوتِ مدرکہ سے ہے۔ مگر ذکر کا تعلق ذہن اور جوارح (اعضائے جسمانی) دونوں سے ہے۔

(ج) ذکر میں فکر کی شان یا صفت بھی پائی جاتی ہے مگر فکر میں ذکر کی صفات نہیں پائی جاتیں۔

(د) دنیا میں ہر شخص ذکر (محبت، تذکرہ، یادگاری) اور محبت اکر سکتا ہے لیکن فکر کی استعداد یا صلاحیت ہر شخص میں نہیں پائی جاتی بالفاظِ دیگر، ذکر کی نعمت عام ہے۔ فکر کی دولت خاص ہے۔

(ہ) ذاکر مقلد ہوتا ہے۔ مگر مفکر محقق کا لقب پاتا ہے۔

(و) فکر ذکر کی خادم ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ فکر کے بغیر معرفت نہیں ہو سکتی اور معرفت کے بغیر محبت محال ہے۔

(ز) ذکر کرتے رہنے سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

فکر کرتے رہنے سے معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔

## ذکر اور فکر کی کار فرمائی:-

عاشق کی فکر یا اپنے محبوب کی ذات سے متعلق ہوگی یا اپنی ذات سے۔ جب وہ اپنی ذات میں غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ

(۱) محبوب کے مقابلہ میں میری کوئی ہستی نہیں ہے۔

(۲) مجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنا جو محبوب کی مرضی کے خلاف ہو۔

(۳) بالفاظِ دگر اپنی مرضی (خواہشِ نفس) کو محبوب کی مرضی میں فنا[1] کر دینا چاہیے۔ لیکن جو شخص حق تعم کو اپنا محبوب بناتا ہے وہ لا محالہ اس کی پیدا کردہ کائنات ہی میں غور و فکر کرے گا۔ کیونکہ حق تعم تو نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ بالفاظِ دگر، ذکر، محبت نے اسے فکر پر مائل کیا۔

اندریں حالات عاشق کی زندگی اسی نہج پر بسر ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اپنے محبوب کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔

(یَذْکُرُونَ اللّٰہَ قِیَاماً وَّ قُعُوداً الخ)

اور ہر وقت کائنات (مخلوقات) میں غور کرتا رہتا ہے)

(وَیَتَفَکَّرُونَ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ۔)

اور جب وہ بیک وقت ذکر اور فکر پر عامل ہوگا۔ تو لا محالہ پکار اٹھے گا۔ رَبَّنَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً۔

---

[1] "فنا" تصوف کی اصطلاح ہے اس سے فنا ذات مراد نہیں ہے بلکہ اتباع یا اطاعت مراد ہے۔ یعنی اپنی خواہشات کو محبوبِ حقیقی کی مرضی کے طابع کر دینا اور جب ایسا ہوتا ہے تو عاشق کے اندر صفاتِ رذیلہ زائل ہونے لگتی ہیں۔ اور اسی زوال کا اصطلاحی نام تزکیہ ہے۔ مرشدِ رومی فرماتے ہیں:

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
دے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ

جب وہ اپنی ذات میں غور و فکر کرتا ہے تو اس نتیجہ پہ پہنچتا ہے کہ میری تمام قوتیں اور میرے تمام جوارح، سب اطاعتِ محبوب کے لئے وقف ہو جائیں۔ کیونکہ اس سے بہتر ان کا کوئی اور مصرف نہیں ہو سکتا ہے

جب وہ کائنات میں غور کرتا ہے تو ہر ذرّہ میں اسے اپنے محبوب کا جمال نظر آتا ہے اور اس کی معرفت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جوں جوں معرفت بڑھتی ہے محبّت میں بھی شدت ہوتی جاتی ہے۔

چونکہ وہ ہر شی میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھتا ہے اس لئے وہ مومن اور کافر دونوں پر شفیق ہو جاتا ہے ؎

## ذکر کی وسعت :-

اگر غور سے دیکھو تو عقائد عبادات، اخلاق معاملات اور سلوک یعنی دین اسلام کے پانچوں پہلو ذکر کی آغوش میں آجاتے ہیں۔ (اگر شک ہو تو آیات مذکورہ بالا دوبارہ پڑھ لیا جائے۔ گویا دینِ اسلام ذکر کا دوسرا نام ہے)

ذکر الٰہی کسی انسان کو تعلیم و تعلم تجارت وصنعت و حرفت، کسب معیشت، نکاح، حیات اجتماعی۔ تدبیر منزل، جہاد، تالیف یا حکمرانی سے باز نہیں رکھتا کیونکہ یہ جملہ امور خود از قبیل ذکر الٰہی۔

---

؎ نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست
(نظامی)

؎ در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چراست
از یک چراغِ کعبہ و بتخانہ روشن است
(لا اعلم)

اب اس ذکر کے ساتھ فکر کو شامل کر دو اور پھر غور کرو کہ اب انسان کی زندگی کا کون سا شعبہ ان دونوں کی گرفت سے باہر رہ گیا؟ اسی لئے اقبال نے فقر کو دینِ اسلام کا دوسرا نام قرار دیا ہے۔

آج ہماری خانقاہوں اور مسجدوں میں جو ذکر ہو رہا ہے وہ ذکر کی محض ابتدائی صورت ہے۔ یعنی ذکر لسانی یا ذکر قلبی۔ بیشک یہ بھی لازمی ہے۔ مگر مسلمان وہ ہے جو شریعت حقہ کے تمام احکام کی تعمیل کرے۔ یعنی ذکر لسانی کے بعد ذکر الجوارح (جہاد) بھی کرے۔

جس طرح زبان کا ذکر یہ ہے کہ زبان سے اللہ اللہ کہا جائے اسی طرح دماغ کا ذکر یہ ہے کہ کائنات میں فکر کی جائے۔ اور اسی طرح ہاتھ کا ذکر یہ ہے کہ جہاد بالسیف کیا جائے۔ وقس علیٰ ھذا۔

## خلاصۂ داستان:-

ذکر کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ عاشق (ذاکر) کے تمام اعضائے جسمانی اپنے اپنے فرائض ادا کرنے میں مشغول رہیں۔ یعنی مختصر لفظوں میں ذکر، بجاآوری احکام الٰہی کا دوسرا نام ہے۔ اور فکر کا مفہوم (کما صرّح) یہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب کی معرفت حاصل کرے جس قدر علم میں اضافہ ہوگا۔ اسی قدر محبت میں شدت ہوگی [۱]

ان دونوں کے اختلاط سے شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور دنیا میں ذات رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) اس شانِ فقر کی سب سے بڑی مظہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ قیامت تک تمام عاشقوں (مسلمانوں) کے لئے کامل نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہیں۔

---

[۱] گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید
رَبِّ زِدْنِی از زبانِ او چکید (اقبال)

جب عاشق کائنات میں فکر کرتا ہے تو اسے معرفتِ الٰہی حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ بتدریج مگر یقینی طور سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ مظاہرِ کائنات کے پسِ پردہ ایک علیم و قدیر و حکیم ہستی کارفرما ہے۔ [۱]

اور جب وہ اپنے نفس میں فکر کرتا ہے تو اسے معرفت فرائض حاصل ہو جاتی ہے۔ اور ذکر انہی فرائض کی بجا آوری کا اصطلاحی نام ہے۔

اسی لئے اقبال نے لکھا ہے۔

ع فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

یعنی جب تک انسان اپنے نتائج افکار کے تقاضوں پر عمل نہ کرے (شریعتِ حقہ کا اتباع نہ کرے) اس وقت تک ان نتائج افکار سے اس کو کوئی فائدہ یا نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔

بالفاظِ دگر محض استنتاج کرتے رہنا انسان کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ غور و فکر کے بعد جو نتائج معلوم ہوں ان پر عمل کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ کیونکہ

---

[۱] چو شمع از پئے علم باید گداخت
که بے علم نتواں خدا را شناخت
(سعدی)

اسی مضمون کو اکبر الہ آبادی نے یوں ادا کیا ہے۔

نظامِ عالم بتا رہا ہے کہ ہے اک اسکا بنانیوالا
ظہورِ آدم دکھا رہا ہے کہ ہے کوئی دل میں آنیوالا

منشی تلوک چند محروم نے بھی اسی مضمون کو بڑے دلکش اور دلنشیں انداز میں باندھا ہے۔

معدوم اسے نہ جان جو ہے مستور
ظلمت کے مقابلہ میں موجود ہے نور
اے منکر ذاتِ حق ذرا آنکھیں کھول
فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرور

عمل (تعمیلِ احکام) ہی سے عاشق اپنے محبوب کی نظروں میں عزت حاصل کر سکتا ہے۔ جو عاشق اپنے فرائض کی بجا آوری سے غافل رہتا ہے وہ محبوب کی نظروں سے گر جاتا ہے [۱]

ان تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ جب تک ذکر شامل نہ ہو۔ فکر کامل نہیں ہو سکتی۔ اس نکتہ کو باندازِ دگر یوں سمجھو:۔

فکر دراصل ایمان صحیح کا اور ذکر، عمل صالح کا دوسرا نام ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہی ایمان انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے جس کے ساتھ عملِ صالح بھی ہو۔

**نکتہ :۔** انسانی شخصیت کے دو پہلو ہیں:۔

علمی یا شعوری پہلو۔ جذباتی پہلو اور ارادی یا عملی پہلو۔

فکر اس کے علمی پہلو کی تربیت کرتی ہے۔

شعور جذبات اور عمل کے مجموعہ کو انسان کہتے ہیں۔

فکر اور ذکر کے مجموعہ کو فقر کہتے ہیں۔

گویا فقر، انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں کی آبیاری کرتا ہے۔

اور چونکہ اسلام ایمان اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔

اس لئے فقر اسلام ہی کا دوسرا نام ہے۔

**حرفِ آخر :۔**

فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض کا علم حاصل ہو جاتا ہے اور ذکر فرائض کی بجا آوری کا نام ہے۔ اس لئے جب عاشق اپنے فرائضِ منصبی کو بقدر طاقت خویش بجا لاتا ہے تو اسے

---

[۱] رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اطمینان حاصل ہوجاتا ہے کہ میں نے اپنے محبوب (حق تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کردی۔ یقیناً وہ مجھ سے راضی ہوجائیگا۔

اسی صداقت کو قرآنِ حکیم نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

اِلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۵ (۱۳-۲۸)

آگاہ ہوجاؤ کہ صرف اللہ کے احکام کی تعمیل ہی سے انسانوں کے قلوب کو حقیقی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔

اور یہ بات کون نہیں جانتا کہ حق تعالیٰ کے دیدار اور اس سے ملاقات کی نعمتِ کبریٰ اور دولتِ عظمیٰ (جو دراصل مقصدِ حیات ہے) اسی شخص کو حاصل ہوسکتی ہے جس کا نفس مطمئن ہوچکا ہو۔

یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً

اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی طرف واپس آجا اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے۔ اور وہ تجھ سے راضی ہے۔

نوٹ:۔ مرشدِ رومی نے بھی دفترِ ششم میں یہی تعلیم دی ہے کہ ذکر، فکر سے افضل ہے۔ اور اس کے بغیر فکر کامل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

این قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر اگر جامد بود رو ذکر کن
ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشید این افسردہ ساز

یعنی نیستی کا مفہوم اسقدر تو میں نے سمجھا دیا۔ اب اس کی روشنی میں مزید غور و فکر تو خود کرلے۔ (عشقِ الٰہی اختیار کر) کیونکہ ذکر میں یہ خاصیت ہے کہ وہ فکر کو متحرک (زندہ) کردیتا ہے۔ اور اس کی بدولت قلب پر انکشافِ حقائق ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا تو ذکر کو فکر کے حق میں بمنزلہ خورشید

بنا لے۔ خورشید میں دو وصف ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اشیا کو منور کر دیتا ہے دوسرا یہ کہ جاندار اشیاء کو متحرک (زندہ) کر دیتا ہے۔ اسی طرح تیرا ذکر تیری فکر کو بھی منوّر کر دیگا اور متحرک بھی۔ ۱۲

ذکر کی افضلیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ فکر کی بدولت معارف تو حاصل ہو سکتے ہیں مگر محبوب کے دل میں عاشق سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا اس کے مقابلہ میں ذکر سے معارف بھی حاصل ہوتے ہیں اور محبوب بھی محب کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یعنی ذکر میں کشش کی قوت بھی ہے جو فکر میں مطلق نہیں پائی جاتی۔ قرآنِ کریم کی یہ آیت میرے دعویٰ پر شاہد ہے:۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (۲-۱۵۲)

لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ لیکن مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرو (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) میں تم سے محبت کروں گا۔

## تشریح فقر از کلام اقبالؒ:۔

اقبال نے بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں جو اشعار فقر کی تشریح کے سلسلہ میں لکھے ہیں۔ وہ سب تو اس جگہ نقل نہیں کر سکتا۔ لیکن چند اشعار بغرضِ ایضاحِ مقصد اس جگہ درج کئے دیتا ہوں:۔

(۱) فقر، افلاس، بیکسی، عاجزی، یا بیچارگی کا نام نہیں ہے۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے فقیر وہ ہے جس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر اللہ کے لئے سب کچھ ترک کر دیتا ہے۔ وہ اس لئے زمین پر نہیں سوتا کہ اس کے پاس سامانِ راحت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس لئے کہ سامانِ راحت کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اس لئے اگرچہ صورۃً فقر اور رہبانیت یکساں ہیں۔ مگر معناً دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی ۔۔۔ تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

(۲) صاحبِ فقر، راہب کی طرح سکون پرست نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ جدوجہد (جہاد) میں مصروف رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کی تمام مخفی طاقتوں کو آشکار (عریاں) کردے مسلمانوں کے زوال کا اصلی باعث ہی یہ ہے کہ وہ فقر کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہوگئے۔

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

(۳) نقر، انسان کے اندر بے پناہ قوت اور شجاعت پیدا کردیتا ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت مردِ مومن پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ

لا موجود الا اللہ

یعنی حقیقی معنی میں (دراصل) اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ یہ عالم تو وہم و طلسم و مجاز ہے[1]۔ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ فی الجملہ جب کوئی بذاتِ خود موجود ہی نہیں تو پھر کسی ہستی سے خوف کیسا؟

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلبِ سلیم

قبضہ میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن[2]
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرِ کرارؓ

---

[1] نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز (اقبالؔ)

[2] اشارہ بجانبِ تیغِ فقر۔ ۱۲

(۴) فقر، انسان کو دونوں جہان سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ کیونکہ فقر کی بدولت اس کا مقصود صرف اللہ ہو جاتا ہے۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

(۵) جس شخص میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مظہر صفاتِ ایزدی بن جاتا ہے۔ مثلاً اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔

ہاتھ۔ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

(۶) اسلامی فقر، انسان کو غیر معمولی عظمتوں کا مالک بنا دیتا ہے:۔

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی

(۷) فقر کی بدولت مردِ مومن زمانہ پر حکمراں ہو جاتا ہے:۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

(۸) جس قوم میں شانِ فقر پیدا ہو جائے وہ کائنات میں کسی کی محکوم نہیں ہو سکتی۔

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

(۹) فقر سے انسان میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں:۔

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سبحانی

(۱۰) فقر کی بدولت انسان اللہ کی ہستی پر برہان بن جاتا ہے اور اس میں جلال و جمال کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ان تصریحات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال کا تصورِ فقر دراصل ان تمام کمالاتِ عقلی و اخلاقی و روحانی کا جامع ہے جو اتباعِ شریعت سے ایک انسان کے اندر پیدا ہو سکتے ہیں۔ قرآن حکیم کی رو سے مقصدِ حیات یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا کرلے۔ اور یہ رنگ فقر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ جو فکر اور ذکر کے امتزاج کا دوسرا نام ہے فکر سے محبوبِ حقیقی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اور ذکر انسان کو اس محبوبِ حقیقی کی بارگاہ تک پہنچا دیتا ہے۔ اور عشق میں یہ طاقت ہے کہ محبوب کو محب سے ملا دیتا ہے۔ بقول اقبال :-

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

## خلاصہ مطالب :-

اس فصل میں چھ بند ہیں :-

پہلے بند میں اولاً فقر کی ماہیت بیان کی ہے۔ اور اس کے عناصرِ ترکیبی

کی تشریح کی ہے۔ بعد ازاں فقر کی خصوصیات واضح کی ہیں۔

دوسرے بند میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ فقر ترک دنیا کا نام نہیں ہے بلکہ ؎

ترک ایں دیر کہن تسخیر او

تیسرے بند میں فقرِ کافر اور فقرِ مومن میں جو فرق ہے اسے واضح کیا ہے۔

چوتھے بند میں مسلمانوں کو اپنے اندر غیرتِ دین پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔

پانچویں بند میں مسلمانانِ عالم کے زوال پر مرثیہ خوانی کی ہے۔

چھٹے بند میں عصر حاضرہ کی مادہ پرستی اور اس کے ملحدانہ رجحانات کو ظاہر کیا ہے۔ اور مسلمانوں کو احتسابِ خویش کی دعوت دی ہے۔

# پہلا بند

## تمہید:۔

ہم قبل ازیں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ قرآنِ حکیم نے بندوں کو "فقیر" قرار دیا ہے۔ یعنی ہم سب اپنے وجود اور اس کے توابعات (حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام وغیرہ) کے لئے حق تعٰ کے محتاج ہیں۔ ہمارا وجود خانہ زاد نہیں ہے۔ بلکہ حق تعٰ کا عطا کردہ یعنی مستعار ہے۔ وجود اور تمام صفاتِ وجودیہ اصالتاً اور حقیقتاً صرف حق تعٰ ہی کے لئے ثابت ہیں۔ یعنی اسی کا وجود ذاتی اور حقیقی ہے۔ برعکس ایں ہمارا وجود ظلّی اور مجازی ہے۔ [1]

---

[1] اسی صداقت کو سب سے پہلے شیخ اکبر نے واضح کیا ہے۔ اور ان کے بعد حضرت (باقی ص ۳۷۹ پر)

جب یہ صداقت ایک مسلمان کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ کے سوا حقیقی معنیٰ میں کوئی وجود نہیں ہے (لاموجود الا اللہ) تو وہ قدرتی طور پر ماسویٰ اللہ سے قطع نظر کر کے صرف اللہ تعالیٰ کو اپنی محبت کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اور یہی عقیدہ فقر کا سنگِ بنیاد ہے۔ یعنی جب یہ عقیدہ دل میں راسخ ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا حقیقی معنیٰ میں کوئی موجود نہیں ہے تو مسلمان حقیقی معنیٰ میں موحد بن جاتا ہے[1] اقبال نے ذیل کے اشعار میں اسی صداقت کو واضح کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| آں مسلمانے کہ بیند خویش را | از جہانے برگزیند خویش را |
| از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست | تیغ لاموجود الا اللہ اوست |

(مسافر)

---

(بقیہ حاشیہ صہ ۳۷۸) مجدد الف ثانی نے اس کو مبرہن کیا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

(الف) وجود مبداء ہر خیر و کمال است و عدم منشاء ہر نقص و شر۔ پس وجود مرا واجب را ثابت باشد و عدم نصیب ممکن بود۔

(ب) ممکن را وجود ثابت کردن فی الحقیقت شریک کردن است اورا در ملک و ملک حق تعالیٰ۔

(ج) اگر علماء ظواہر ازیں دقیقہ آگاہ می گشتند ہرگز ممکن را وجود ثابت نمی کردند

(ماخوذ از مکتوب ۱ جلد دوم صہ ۳ نولکشور)

ان تصریحات کا مطلب یہ ہے کہ ممکنات کا وجود اصلی اور حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی اور مجازی ہے یعنی ممکنات اپنے وجود اور توابعاتِ وجود کے لئے حق تعالیٰ کے محتاج ہیں۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللہِ۔ (۳۵-۱۵)

اے لوگو تم سب اپنے وجود کے لئے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو۔ ۱۲

[1] یہی وجہ ہے کہ تمام عرفاء نے اسی بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ وحدت الوجود تسلیم کئے بغیر کسی مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ ۱۲

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب
بجود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش
زلاموجود الا اللہ دریاب (ارمغان)

اب ہم اس بند کا مطلب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

پہلا اور دوسرا شعر :-

اقبال دنیاداروں سے سوال کرتے ہیں کہ جانتے ہو فقر کی ماہیت کیا ہے ؟ پھر خود جواب دیتے ہیں کہ فقر حسبِ ذیل خصوصیات کا نام ہے۔

(۱) نگاہِ راہ بیں

(۲) دلِ زندہ

(۳) کارِ خویش را سنجیدن

(۴) بر لا الٰہ پیچیدن

نگاہ راہ بیں کا مطلب یہ ہے کہ فقیر کو وہ بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جس کی بدولت وہ حق تعؔ تک پہونچ سکتا ہے۔ بصیرت سے مراد ہے صحیح علم یعنی صاحبِ فقر (مردِ مومن) کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کائنات میں حق تعؔ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ اس لئے اسے چھوڑ کر غیر کی طرف متوجہ ہونا سراسر نادانانی ہے۔

(۲) دلِ زندہ سے یہ مراد ہے کہ جب مومن صاحبِ فقر حق تعؔ کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو عشقِ الٰہی کی بدولت اس کا دل محیطِ انوار بن جاتا ہے۔ بالفاظِ دگر اس کا دل غیر اللہ کی محبت سے یکسر خالی ہو جاتا ہے اور جب مسلمان کے دل میں اللہ جلوہ گر ہو جاتا ہے تو اس کی تجلیات کی بدولت اس کا دل زندہ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے دل کے منور ہو جانے کو زندہ ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔

صوفیائے کرام کی تعلیم یہ ہے کہ
غیر اللہ کی محبت دل کو مردہ کر دیتی ہے۔
اللہ کی محبت اس کو زندہ کر دیتی ہے۔
اقبال چونکہ صحیح اسلامی تصوف کے مبلغ اور علمبردار ہیں۔ اس لئے انہوں نے وہی لکھا ہے جو ان سے پہلے تمام پاکانِ امت نے اپنے مخصوص انداز میں سپردِ قلم فرمایا تھا۔

(۳) کار خویش را سنجیدن سے مراد ہے اپنے اعمال (حرکت) سکون قول فعل، اور خیال کو شریعت (رضا الہٰی) کی ترازو میں تولنا یعنی اپنی پوری زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنا۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ فقیر (مومن) کی زندگی از سرتاپا شریعت کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔[۱]

(۴) بر لا الٰہ پیچیدن :- یعنی توحید کے ساتھ مطابقتِ کلی پیدا کرنا یا توحید کے اقتضا پر عمل کرنا حقیقی معنی میں موحد بن جانا بایں طور کے اپنے خیال قول اور فعل (پوری زندگی) سے عقیدہ توحید کا اظہار اور اثبات کرنا۔ اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں

واضح ہو کہ اقبال نے یہاں لا الٰہ گفتن نہیں کہا۔ بلکہ بر حرف لا الٰہ پیچیدن کہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔
لا الٰہ گفتن سے مراد ہے محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہنا جس طرح آج ساری دنیا کے مسلمان کہہ رہے ہیں۔

---

[۱] خلافِ پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید (سعدی)

برلا الٰہ یحیدن سے مراد ہے لا الٰہ الا اللّٰہ کے مفہوم پر عمل کرنا۔ اور اسلام دراصل توحید کے اقرار کے بعد اس کے مفہوم یا اقتضا پر عمل کرنے کا نام ہے۔ جب تک ایک مسلمان توحید کے اقتضا پر عمل نہ کرے وہ حقیقی معنی میں موحد نہیں ہو سکتا۔

توحیدِ الٰہی کا اقتضا (مفہوم) کیا ہے یہ کہ موحد حق کے سوائے کسی انسان کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے نہ کسی انسان کے نافذ کردہ قانون کی اطاعت نہ کرے۔ کسی کو آقا مالک صاحبِ اقتدار یا نفع و نقصان کا مالک نہ سمجھے۔ کسی کو مشکل کشا، دستگیر، کارساز یا حاجت روا نہ جانے۔ کسی سے کوئی توقع یا امید نہ رکھے۔

کیوں؟ اس لئے کہ ہر شخص (بادشاہ ہو یا نواب) اپنی حقیقت یا ذات کے اعتبار سے فقیر الی اللّٰہ (اللہ کا محتاج) ہے۔ تو ایک مسلمان یہ سوچتا ہے کہ میں اس شخص کے آگے کیوں ہاتھ پھیلاؤں جو میری ہی طرح محتاج ہے۔ اس لئے میں کسی شخص کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کروں گا۔ کسی کو حاجت روا تسلیم نہیں کروں گا۔ کسی کو اپنا آقا نہیں بناؤں گا۔ کسی کی اطاعت نہیں کروں گا۔

اس کے بعد تشکر کی اعلیٰ منزل آتی ہے۔ وہ یہ کہ صاحب فقر اس نکتہ پر غور کرتا ہے کہ

(ا) ہر شخص اپنے وجود کے لئے حق کا محتاج ہے۔

(ب) یعنی ہر شخص اپنی حقیقت یا ذات کے اعتبار سے معدوم ہے۔ لیکن چونکہ اسے حق تعالیٰ نے موجود کر دیا۔ اس لئے وہ موجود ہو گیا[1]

---

[1] ممکن یا محتاج کہتے ہی اس کو ہیں جو بذاتِ خود معدوم ہو۔ واجب یا غنی کے موجود کر دینے سے موجود ہو جائے۔

(ج) لہٰذا اس کا وجود ذاتی یا اصلی نہیں ہے بلکہ مستعار یا ظلّی ہے۔
(د) اس لئے اگرچہ اسے بھی موجود کہہ سکتے ہیں مگر اس کا وجود حق تعالیٰ کے وجود کی طرح یا اس کے مثل نہیں ہے۔ دونوں کے وجود میں فرق ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ بذاتِ خود موجود ہے (واجب الوجود ہے) اور انسان حق تعالیٰ کے موجود کرنے سے موجود ہوا ہے۔ (ممکن الوجود ہے)
(ہ) یعنی انسان کا وجود، حقیقی معنی میں وجود نہیں ہے بلکہ محض مجازی معنی میں وجود کہلاتا ہے۔
لہٰذا انسان حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے محض مجازی معنی میں موجود ہے۔
بالفاظِ دگر ہم اسے معدوم تو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ نظر آتا ہے۔ اور موجود اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ بذاتِ خود موجود نہیں ہے۔
(۱) اس لئے اس کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی یا وہمی ہے [1]

---

[1] امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی بھی یہی فرماتے ہیں:۔
نزد فقیر عالم عبارت از عدمات است کہ اسماء و صفات واجب جل سلطانہا در خانہ علم در انجا منعکس گشتہ و در خارج آں عدمات بایجاد حق سبحانہٗ بآں نکوس بوجود ظلی موجود شدہ۔ (مکتوب اول جلد دوم ص)
" انچہ مکشوف فقیر است آنست کہ ایں عرصہ، عرصہ وہم است و ایں صور و اشکال کہ دراں عرصہ است صور و اشکال ممکنات است کہ صنع خداوندی در مرتبہ حس و وہم ثبوتے پیدا کردہ است۔ (مکتوب ۶۷ جلد سوم ص۱۱)
عالم را موہوم می گویم نہ بآں معنی کہ عالم منحوت و مجعول وہم است، بلکہ بایں معنی کہ حضرت حق سبحانہٗ عالم را در مرتبہ وہم خلق کردہ است و مرتبہ وہم عبارت از نمود بے بود است کہ در رنگ دائرہ کہ از نقطہ جوالہ در وہم ناشی گشتہ است کہ نمودے دارد بے بود (مکتوب ص۱ جلد سوم ص۱۱۱)

(ت) لہٰذا جب انسان در اصل موجود ہی نہیں ہے محض نمود بے بود کا مصداق ہے۔ یعنی نظر تو آتا ہے۔ مگر در اصل موجود نہیں ہے۔ جس طرح حلقۂ آتشیں جو گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ محسوس و مشہود تو ہوتا ہے۔ مگر در حقیقت موجود نہیں ہے تو پھر اس سے رابطہ قائم کرنا۔ اسے اپنی تمناؤں کا مرکز بنانا۔ اسے حاکم حکمراں مالک، بادشاہ، آقا معطی، رافع، نافع یا صاحب اقتدار سمجھنا سراسر حماقت ہے اور یکسر جہالت ہے۔

جب یہ حقیقت دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ تو مردِ مومن ماسوی اللہ سے بکلی قطع تعلق کر لیتا ہے۔ اور صرف اللہ کو اپنا الٰہ یعنی معبود مطلوب، مقصود، محبوب اور مرکزِ توجہ بنا لیتا ہے۔ ساری کائنات اس کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتی ہے۔ وہ جب منظر جس حیوان یا جس انسان کو دیکھتا ہے تو فوراً دل میں کہتا ہے کہ یہ محض نمود بے بود ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نظر اس لئے آ رہا ہے کہ اسے خدا نے موجود کر دیا ہے۔ ورنہ بذاتِ خود تو معدوم ہے[1]۔ ابھی حق تعالیٰ کی صفتِ حیات کی تجلی رک جائے ابھی یہ منظر فنا ہو جائے۔ یعنی ابھی اصل کی طرف لوٹ جائے۔ معدوم تھا، معدوم ہو جائے۔

جب مومن اس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ تو حقیقت کائنات اس پر عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور وہ خود بخود پکار اٹھتا ہے لاموجود الا اللہ۔

واضح ہو کہ جب تک لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی معنی اور مفہوم

---

[1] طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
(ضربِ کلیم)

جو لا موجود الا اللہ ہے۔ مسلمانوں کے دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہو جائے وہ حقیقی معنی میں موحد نہیں بن سکتا۔ جب ایک مسلمان اس مقام کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے۔

فقر کیا چیز ہے؟ فقر اس عقیدہ کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کائنات میں کوئی ہستی بذاتِ خود یعنی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے کوئی ہستی اس لائق نہیں کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ یا اس سے کوئی توقع کی جائے۔ یا کسی قسم کی قدرت یا قوت منسوب کی جائے یا کسی درجہ میں بھی اسے مؤثر سمجھا جائے۔

واضح ہو کہ جب تک انسان ماسوی اللہ کو کسی اعتبار سے بھی اللہ کا شریک سمجھتا رہے گا۔ وہ شرک کی خباثت اور نجاست سے پاک نہیں ہو سکتا اور جب تک ایک شخص شرک سے بہمہ وجوہ پاک نہیں ہوگا۔ وہ موحد نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے صوفیائے کرام نے یہ تعلیم دی ہے کہ جس طرح کوئی شخص صفات، یا ذات کے اعتبار سے خدا کا شریک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص وجود کے اعتبار سے بھی خدا کا شریک نہیں ہو سکتا۔

اگر شرک فی الصفات اور شرک فی الذات محال ہے تو شرک فی الوجود بدرجۂ اولیٰ محال ہے۔ اگر کوئی شخص صفات یا ذات میں خدا کا شریک نہیں ہو سکتا تو وجود جیسی بنیادی شی میں اس کا شریک کیسے ہو سکتا ہے [1]

ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ جب تک لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ لا موجود الا اللہ۔ اس وقت تک شرک کی کامل نفی نہیں ہو سکتی یعنی مسلمان حقیقی معنی میں موحد نہیں ہو سکتا۔

---

[1] تو بھی موجود اور حق بھی موجود
ظالم! یہ شرک و بت پرستی کب تک

(امجد حیدرآبادی)

جب ایک مسلمان حقیقی معنی میں موحد بن جاتا ہے۔ یعنی اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ لا موجود الا اللہ، تو

(۱) وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ بالفاظِ دگر اپنی زندگی کو قرآن کی ترازو میں تول کر بسر کرتا ہے۔

(۲) اس کا دل محبتِ الٰہی سے معمور ہو جاتا ہے۔ یعنی زندہ ہو جاتا ہے

(۳) اسے خدا تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی نگاہ "راہ بیں" ہو جاتی ہے۔

یہی فقر کی حقیقت ہے۔ اور اقبال نے اپنی مختلف تصانیف میں اسی حقیقت کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔

تیسرا شعر:-

اگر کسی شخص میں شانِ فقر پیدا ہو جائے تو وہ جو کی روٹی کھانے کے باوجود خیبر کا قلعہ فتح کر سکتا ہے۔ دراصل اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؓ میں یہ طاقت فقر کی بدولت ہی پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے جو شخص غیر معمولی روحانی کمالات حاصل کرنے کا آرزومند ہو اسے اپنے اندر یہی شانِ فقر پیدا کر لینی چاہیئے۔

چوتھا شعر:-

کہتے ہیں کہ فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ صفتِ فقر دراصل متاعِ مصطفےٰ ہے۔ ہم اس کے امین ہیں۔

اس شعر میں اقبال نے تین باتیں بیان کی ہیں۔

(۱) فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا ہے

(۲) یہ صفت دراصل متاعِ مصطفےٰ ہے۔

(۳) ہم (مسلمان) صرف اس کے امین ہیں۔

ذیل میں ان تینوں باتوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(۱) ذوق و شوق کنایہ ہے عشق سے اور تسلیم و رضا سے مراد ہے عاشق صادق کا اپنی مرضی اور اپنی خواہش کا معشوق کی مرضی کے تابع کر دینا[1]۔ اور یہ منطقی نتیجہ ہے عشق ہے۔ یعنی عشق اور شیوۂ تسلیم و رضا لازم و ملزوم ہیں۔ جب تک ایک عاشق اپنی مرضی معشوق کی مرضی کے تابع نہ کر دے وہ عاشق نہیں کہلا سکتا۔ اور اگر ایک شخص اپنی مرضی کسی کی مرضی کے تابع کر دے تو سمجھ لو کہ وہ اس پر عاشق ہے۔ بات یہ ہے کہ عشق کی دنیا میں دوئی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جب تک دل میں دوئی کا تصوّر باقی ہے۔ عشق میں خامی ہے عشق کی انتہا یہ ہے کہ عاشق خود معشوق بن جائے یا باصطلاحِ قرآنی اس میں معشوق کا رنگ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اقبالؒ[2] نے آئندہ شعر میں خود اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

---

[1] اسی کو تصوف کی اصطلاح میں مقامِ فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

(اقبال)

[2] قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ج وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ہ

قبول کیا ہم نے اللہ کا رنگ اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے۔ اور ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ (۲ ـ ۱۳۸)

اللہ کے رنگ سے دینِ اسلام مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کی اتباعِ کاملہ سے انسان میں صفاتِ ایزدی کا عکس پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی اتباعِ کاملہ کو اقبالؒ نے فقر سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۲

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیر او مولیٰ صفات

پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ فقر در اصل عشقِ الٰہی کا نام ہے اور عشق کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عاشق میں شیوۂ تسلیم و رضا پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ در اصل فقر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متاعِ حیات ہے۔ یعنی حقیقی معنیٰ میں صرف آپ ہی صاحبِ فقر ہیں۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ عشق کے لئے معشوق کی معرفت ضروری ہے بے دیکھے کوئی کسی پر عاشق نہیں ہو سکتا۔ چونکہ آپ نے بواسطہ جبریل حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلی۔ اس لئے عاشق کا لقب در اصل آپ ہی کو سزاوار ہے۔

آپ سے بڑھ کر کسی انسان کو اس حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا کہ انسان فقیر ہے۔ یعنی اپنے وجود کے لئے خدا کا محتاج ہے۔

جس طرح وجود در اصل اللہ تعالیٰ کی صفت[1] ہے اور صرف اسی کے لئے

---

[1] چونکہ حق تعالیٰ کی جمیع صفات عین ذات ہیں۔ اس لئے میں نے وجود کے لئے صفت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی ذات عین وجود ہے اور وجود عین ذات ہے۔ دونوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ لیکن انسان کی ذات اور اس کے وجود میں فرق ہے وہ یہ کہ ذات عارض ہے وجود معروض ہے۔ صوفیائے کرام کا مسلک یہی ہے چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں:-

ہستی بقیاس و عقلِ اصحاب نبود
جز عارض اعیان و حقائق نہ نمود
لیکن مکاشفات اربابِ شہود
اشیا ہمہ عارض اند و معروض وجود

(لائحہ چہاردہم)

اصالتاً ثابت ہے۔ ہمارا وجود اس کا عطا کردہ ہے۔ یعنی وجود ہمارے لئے صرف امانتاً ثابت ہے۔ اسی طرح فقر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اصالتاً ثابت ہے۔ ہمارے لئے صرف امانتاً ثابت ہے یہ مطلب ہے اس مصرع کا۔

ع ما امینیم ایں متاعِ مصطفٰے است

یعنی جس طرح ہمارا وجود ہمارا نہیں ہے۔ ہم اس کے مالک نہیں ہیں۔ بلکہ حق تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ یعنی ہم اس کے امین ہیں۔ اسی طرح ہمارے اندر جو شانِ فقر پائی جاتی ہے۔ یہ ہماری ملک (حاصل کردہ) نہیں ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ ہے۔ یعنی ہم اس کے امین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نعمت ہم کو صرف اتباعِ رسول سے حاصل ہو سکتی ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ :۔

(ا) وجود وہ نعمت ہے جو ہمیں حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔

(ب) فقر وہ دولت ہے جو ہمیں حضور نے ارزانی فرمائی ہے۔

بالفاظِ دگر :۔ اگر خدا نہ ہوتا تو ہم وجود سے سرفراز نہ ہوتے۔ اور اگر آپ نہ ہوتے تو ہم کمالاتِ وجود سے بہرہ ور نہ ہوتے۔

چونکہ کمال زندگی کا حصول عشقِ رسول پر موقوف ہے اس لئے اقبال نے عشقِ رسول کو بجا طور پر شرطِ ایمان قرار دیا ہے۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم از عاشق نباشد کافر است

پانچواں شعر :۔

فقر کی بدولت انسان پاکیزگی اور روحانیت کے اعتبار سے فرشتوں پر تفوق حاصل کر سکتا ہے۔ اور کائنات کی مخفی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ ان دونوں باتوں کی وضاحت یہ ہے کہ

(۱) فرشتوں میں انکار یا نافرمانی کا مادہ موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں تو اس میں ان کا کوئی کمال نہیں ہے لیکن انسان میں نافرمانی کا مادہ موجود ہے۔ اس لئے اگر وہ ہمت اور اختیار سے کام لیکر اپنی نفسانی خواہشات کو تابع (احکامِ الٰہی) کر دے تو بلاشبہ مستحق تحسین و آفرین ہے۔ لہٰذا فرشتوں پر اس کی افضلیت از روئے عقل ثابت ہو گئی۔

(۲) فقر کی بدولت انسان زمان و مکان پر غالب آسکتا ہے۔ اور جس شخص کو زمان و مکان پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ساری کائنات اس کی تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ فقر کی بدولت انسان زمان و مکان پر کس طرح غالب آجاتا ہے قال سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس لئے لفظوں کے ذریعہ سے نہ کوئی سمجھا سکتا ہے۔ نہ کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس کا تعلق حال سے ہے۔ یعنی اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر لو۔ پھر تمہیں خود معلوم ہو جائیگا کہ زمان و مکان پر کیسے قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔

پہلی مثال:۔

ایک سائنسداں (ماہر فن طبیعات) آپ سے کہتا ہے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن بہ تناسبِ خاص ملایا جائے تو پانی بن جاتا ہے۔ اب اگر آپ اس سے دریافت کریں کہ کیسے بن جاتا ہے۔ تو وہ اس کا جواب یہی دیگا کہ ماہر فن سے ان کے ملانے کا طریقہ سیکھو۔ پھر خود ملا کر دیکھ لو۔ تمہیں خود معلوم ہو جائیگا کہ کیسے بن جاتا ہے۔

دوسری مثال:۔

آپ سرکس میں ایک عورت کو تار پر رقص کرتے دیکھتے ہیں اور حیران ہو کر اس سے دریافت کرتے ہیں کہ تو باریک تار پر کس طرح کھڑی ہو جاتی ہے

تو وہ اس کا جواب یہی دیگی کہ تم خود نار پر ناچنے کی مشق کر لو۔ تمہیں خود معلوم ہو جائیگا۔ کہ میں کس طرح کھڑی ہو سکتی ہوں۔

اسی طرح اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ انسان زمان و مکان کو کس طرح مسخر کر سکتا ہے تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ کسی ماہر فن (عاشقِ رسول) سے اس کا طریقہ سیکھ لو۔ اس کے بعد اس کی مشق کرو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ کہ انسان زمان و مکان پر کیسے غالب آجاتا ہے۔

جسے عرفِ عام میں تصوف کہتے ہیں وہ در اصل تسخیر زمان و مکان کا عملی طریقہ ہے۔ اور جو شخص اس کا طریقہ بتاتا ہے اسے شیخ طریقت کہتے ہیں۔ مولینا نظام الدین بدایونی اسی طریقہ کو سیکھنے کے لئے حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور جب انہوں نے شیخ کی صحبت میں رہ کر زمان و مکان کو مسخر کر لیا تو ملا نظام الدین کے بجائے محبوبِ الٰہی سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے لقب سے چار دانگِ عالم میں مشہور ہو گئے۔ اور قیامت تک ان کی شہرت اسی طرح قائم رہیگی انشاء اللہ۔

چونکہ تسخیرِ زمان و مکان کا طریقہ کتابوں (قیل و قال) کے بجائے صرف مردِ کامل کی صحبت اختیار کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مرشدِ رومیؒ نے طالبِ حق کو یہ وصیت فرمائی ہے۔

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

خود اقبالؔ نے بھی اپنے روحانی مرشد کی تقلید میں اپنی قوم کو یہی مشورہ دیا ہے۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر

(حاشیہ صفحہ ۳۹۲ پر)

چھٹا شعر:۔

بر مقامِ دیگر انداز و ترا الخ مقامِ دیگر سے عالمِ ملکوت یا عالمِ روحانیت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فقر کی بدولت انسان مادی قیود سے آزاد ہو کر عالمِ ملکوت کی سیر کر سکتا ہے۔ یہ وہ عالم ہے جو زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ اسی مضمون کو انہوں نے یوں ادا کیا ہے ؎

ہستی او بے جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات

دوسرے مصرع میں زجاج کنایہ ہے ضعف و عاجزی سے۔ اور الماس کنایہ ہے قوت اور سطوت سے۔ مطلب یہ ہے کہ فقر کی بدولت انسان میں غیر معمولی طاقت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیری کی زندگی اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آخر وہ کونسی قوت تھی جس کے پیشِ نظر انہوں نے اس شہر کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ جہاں نہ کوئی ان کا دوست تھا نہ مددگار، نہ کوئی آشنا تھا نہ غمگسار؟ بلکہ یہ وہ شہر تھا جہاں کا حکمراں ان کا مخالف تھا۔ لیکن انہوں نے دشمنوں کی چھاتی پر بیٹھ کر مونگ دلنے شروع کر دیئے۔ یعنی اس ناساز گار ماحول میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ اجمیر کے تنکدے میں بیٹھ کر انہوں نے اسلام کی وہ شمع روشن کی جس نے سارے ہندوستان کو منور کر دیا۔

---

(حاشیہ صفحہ ۳۹۱) لہ اکبر الہ آبادی نے بھی یہی بات کہی ہے:۔ ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
(اکبر)

آئندہ دس اشعار میں اقبال نے صاحب فقر کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان اشعار کا مطلب مجموعی طور پر لکھتا ہوں:-

(۱) کہتے ہیں کہ مردِ درویش (صاحبِ فقر) کی طاقت کا سرچشمہ صرف قرآنِ عظیم ہوتا ہے۔ یعنی اسی کتاب پر عمل کرنے سے اس میں یہ غیر معمولی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ گلیم کنایہ ہے کائنات سے۔ یعنی مرد درویش زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہوتا ہے۔

(۲) وہ اگرچہ بہت کم گفتگو کرتا ہے (کم گوید یعنی کمی گوید) لیکن اس کا وجود سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ (دم سے سانس بھی مراد ہو سکتی ہے اور صحبت اور ہستی بھی)

(۳) وہ ضعیف اور پست ہمت لوگوں میں ہمت اور حوصلہ پیدا کر دیتا ہے۔

(۴) وہ سلاطینِ وقت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے بوریئے کی ہیبت اور سطوت سے تختِ شاہی کانپنے لگتا ہے یعنی شاہانِ وقت اس کے سامنے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلوی کی زندگی اس شعر کی صداقت پر شاہد ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی، سلطان علاؤ الدین خلجی اور سلطان قطب الدین مبارک خلجی تینوں بادشاہوں نے حضرت موصوف کو اپنے دربار میں سلام کے لئے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ مگر انہوں نے کسی بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔

(۱) جلال الدین خلجی نے پیغام بھیجا کہ اگر میری واپسی پر آپ میرے سلام کو نہ آئے تو میں آپ کو زبردستی طلب کروں گا۔ آپ خاموش ہو گئے۔ جب وہ واپس آیا تو دہلی سے کچھ فاصلہ پر خیمہ زن ہوا۔ خدام نے عرض کیا کہ شاید کل آپ کو دربار میں جانا پڑے گا۔ آپ نے فرمایا ہنوز دلی دور است[۱]۔

---

[۱] یہ فقرہ اسی زمانہ سے ضرب المثل ہو گیا ہے۔ غیر ممکن الوقوع بات کیلئے بولا جاتا ہے۔

چنانچہ رات کے وقت یہ بادشاہ لکڑی کے محل کے نیچے دب کر مر گیا۔

(ب) علاؤالدین خلجی نے چند مرتبہ درخواست کی کہ دربار میں تشریف لائیے۔ لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ مجبوراً اس نے کہلا بھیجا کہ کسی دن میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ بادشاہ سے کہہ دینا کہ فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ جب تم ایک دروازے سے داخل ہو گے تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔

(ج) مبارک خلجی نے بھی کئی مرتبہ آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ اور جب آپ نے پیہم انکار فرمایا تو اس بدبخت نے کہلا بھیجا کہ اگلے چاند کی پہلی تاریخ کو اگر حاضر نہ ہوئے تو میرے سپاہی آپ کو کشاں کشاں حاضرِ دربار کریں گے۔ آپ خاموش ہو گئے۔ چند روز بعد چاند رات آئی۔ آپ کے خادمِ خاص خواجہ اقبال کا بیان ہے کہ اسی رات کو نصف شب کے قریب ایک خاص حالت میں آپ چھت پر ٹہل رہے تھے اور یہ شعر وردِ زبان تھا۔

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

صبح کو خبر آئی کہ گذشتہ شب سلطان محبوب غلام خسرو خاں (ہندو بچہ) نے اپنے آقا کو قتل کر دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

(۵) وہ اپنے جذبۂ باطن (جنون) کی بدولت انسانوں کے دلوں میں جوش و خروش کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اور انہیں سلاطین کے جبر و قہر سے آزادی عطا کر دیتا ہے۔

(۶) وہ ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں زبردست (شاہین) زیردست (حمام) سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی دولتمند یا صاحبِ ثروت آدمی میں کمزور کو ستانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

فاروقِ اعظم کی زندگی اس شعر کی بہترین تفسیر ہے۔ آپ کے عہد

خلافت میں بلامبالغہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ بخوفِ طوالت شواہد درج کرنے سے اجتناب کرتا ہوں۔ ناظرین الفاروق کا مطالعہ کریں۔

(۷) اس کا دل عشق الٰہی (جذب وسلوک) کی بدولت قوی ہو جاتا ہے اور اسی لئے وہ سلاطین کے سامنے بلاخوف و خطر یہ کلمۂ حق کہہ دیتا ہے کہ اسلام ملوکیت کا دشمن ہے۔ اس لئے میں تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کرتا۔

اسلام ملوکیت کا مخالف اسی لئے ہے کہ ملوکیت اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ

ملوکیت، انسانوں سے یہ کہتی ہے کہ ملوک کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔

اسلام انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔

چونکہ انسان ایک وقت میں ایک ہی آقا یا حاکم کی اطاعت کر سکتا ہے۔ اسی لئے اسلام بجا طور پر یہ تعلیم دیتا ہے کہ

لا ملوکیت فی الاسلام

یعنی اسلام میں ملوکیت کی گنجائش قطعاً نہیں ہے۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے سب لوگ عالم ہوں یا عامی اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ کہ اسلام نے ملوکیت کو حرام قرار دیا ہے۔ مگر سلاطینِ زمانہ

---

[۱] حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ ملوکیت کے نشہ میں سرشار ہو کر اپنی اصلیت کو فراموش کر دیتا ہے۔ اور اپنے طرزِ عمل سے خدا کا مدعی بن جاتا ہے۔ یعنی جس طرح فرعون نے زبان سے کہا تھا کہ میں خدا ہوں۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے لوگوں پر یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ میں تمہارا خدا ہوں۔ دنیا کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کہ بادشاہ اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ سمجھتا ہے ذیل میں صرف ایک مثال درج کر رہا ہوں۔ باقی حاشیہ ص ۳۹۶) پر

کے منہ پر اس حقیقت کے اظہار کی جرأت صرف صاحبِ فقر میں پیدا ہوسکتی ہے۔

(۸) اس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ میں دینی حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اس کی ہیبت سے بڑے بڑے فرعونوں کے پتّے پانی ہوجاتے ہیں۔

(۹) اور جب تک کسی قوم میں ایک صاحبِ فقر بھی موجود رہتا ہے تو وہ قوم دنیا میں ذلیل وخوار یا مفتوح اور محکوم نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو اس آئینہ میں اپنی حالت دیکھ! مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ اپنے اندر یہی شانِ فقر پیدا کر ع

تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

یعنی اے مسلمان اگر تو اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرلے تو کارکنانِ قضا و قدر تجھے غلبہ و اقتدار (سلطانِ مبین) عطا کردیں گے۔

آخری شعر میں فقر کی ایک جامع اور مانع تعریف پیش کی ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۵) جب ہمایوں نے چانپانیر (گجرات) کے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس کی فوج میں بہت سے ہاتھی سجے تھے۔ قلعہ فتح کرنے کے بعد اس نے مغرب کی نماز قلعہ کی مسجد میں ادا کی۔ شامت کے مارے امام نے پہلی رکعت میں سورۃ الفیل پڑھی۔ چونکہ ہمایوں ہاتھی لیکر آیا تھا۔ اس لئے اس نے یہ سمجھا کہ امام نے مجھ پر طنز و تشنیع کی ہے۔ نتیجہ اس غلط فہمی کا یہ نکلا کہ جب امام نے سلام پھیرا تو شاہِ دین پناہ نے حکم دیا کہ اس گستاخ ملازم کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈالدیا جائے تاکہ دوسروں کے لئے سامانِ عبرت مہیا ہوسکے۔ ۱۲

کہتے ہیں۔

(۱) حکمت یعنی پاکیزہ ترین اخلاقی نصب العین

(۲) قوت یعنی بہترین سیاسی نظام

حکمت کیا ہے؟ یہ فقر کی شانِ دلنوازی کا دوسرا نام ہے۔ یا یوں سمجھو کہ فقر سے انسان میں پاکیزہ ترین اخلاقی اور روحانی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کی بدولت انسان اپنا نصب العین حاصل کر سکتا ہے۔ اور وہ نصب العین جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں یہ ہے کہ انسان میں خدائی صفات کا عکس پیدا ہو جائے۔

قوت کیا ہے؟ یہ اسی فقر کی شانِ بے نیازی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی فقر کی بدولت انسان میں شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ (بے نیازی کیا ہے؟ انسان کا بندوں سے بے نیاز ہو جانا۔) اور جب وہ بندوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

بالفاظِ دیگر فقر کی بے نیازی سے دین میں قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس قوت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان کسی بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ اس شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

(۱) فقر ہی سے مسلمان میں شانِ دل نوازی پیدا ہوتی ہے[1]۔ اور اس شانِ دلنوازی کی بدولت اس کا وجود بنی آدم کے حق میں باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ اور یہی حکمتِ دین ہے کہ دوسروں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرو۔

---

[1] اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے :۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا ٭ مروت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

(ب) فقر ہی سے مسلمان میں شان بے نیازی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی شانِ بے نیازی کی بدولت وہ ایسا نظامِ حکومت قائم کرتا ہے جو بنی آدم کے حق میں موجبِ برکت ہو جاتا ہے۔ یعنی اس حکومت میں کوئی شخص کسی پر ظلم نہیں کرسکتا۔ اور دین میں جس قدر قوت پیدا ہوتی ہے وہ اسی شانِ بے نیازی کی بدولت پیدا ہوتی ہے کیونکہ جب مسلمان خدا کے علاوہ کسی انسان کے سامنے سر نہیں جھکاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کو قوت اور سربلندی نصیب ہو جاتی ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ دین اسلام کی تمام باطنی اور ظاہری خوبیاں فقر ہی کے اندر پوشیدہ ہیں۔

دوسرا بند :-

اس بند کا بنیادی تصوّر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملّت اسلامیہ کی غرض و غایت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ دنیا میں اسلام کو غالب کرنے کے لئے اپنی تمام قوتوں کو وقف کردے۔ تاکہ اس دنیا میں خدا کا بول بالا ہو سکے۔ (اسلامی حکومت قائم ہو سکے) جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرسکے گا۔ قرآنِ کریم کی یہ آیت اس دعویٰ (تصور) کی صداقت پر شاہد ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹-۲۴)

یقیناً اللہ وہی ہے جنے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دیکر دنیا میں بھیجا۔ تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے اگرچہ مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں (یعنی مشرک ضرور مخالفت کرینگے)

کہتے ہیں کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لئے مسجد بنادیا ہے۔ لیکن

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج مسلمانوں کی یہ مسجد دوسروں کے قبضہ میں ہے لہٰذا مسلمانوں کو انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے آقا و مولیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مسجد پر دوبارہ قابض ہو سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے۔ اس ارشادِ بلیغ کے دو مطلب ہیں۔

پہلا اور ظاہری مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے یا سجدہ کرنے کے لئے مسجد کی احتیاج نہیں[1] ہے۔ وہ بھی اللہ کے (بندے) ہیں۔ اور یہ زمین بھی اللہ کی ملکیت ہے۔ اس لئے وہ جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ان کی عبادت کسی عمارت کے وجود پر موقوف نہیں ہے۔

اگر مندر نہ ہو تو کوئی ہندو "دیوی" کے درشن نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر گرجا نہ ہو تو کوئی عیسائی اپنی مقدس رسوم مذہبی ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک مسلمان ہر جگہ (جب وقت نماز آجائے) ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو سکتا ہے۔

دوسرا اور باطنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ ساری دنیا کو (تمام روئے زمین کو) مسجد بنا دو۔ یعنی ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کر دو۔ تاکہ ہر جگہ اللہ ہی کا قانون نافذ ہو سکے۔ اور ہر شخص آزادی کے ساتھ اللہ کے سامنے سر جھکا سکے۔ کوئی انسان کسی کو اللہ کی عبادت سے باز نہ رکھ سکے۔ یا اس کی اذان

---

[1] مذاہب عالم قبل اسلام میں معبد کی قید موجود تھی۔ مثلاً کوئی ہندو مندر (بتخانہ) کی چار دیواری سے باہر اپنی پوجا پاٹ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح نصاریٰ کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے مراسم مذہبی گرجے کی مقدس عمارت کے اندر بیٹھ کر ادا کریں۔ حضور نے یہ کہہ کر کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے مسلمانوں کو اس پابندی سے آزاد کر دیا ہے۔

یا نماز پر کوئی پابندی عائد نہ کر سکے [1]

ابتدائً دوسرا مفہوم (جو حقیقی مفہوم ہے) مسلمانوں کے پیشِ نظر رہا چنانچہ انہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت محض اسلئے الٹ دیئے کہ اللہ کے بندے ان خداؤں کی غلامی سے آزاد ہو سکیں۔ لیکن جب مسلمان خود ملوکیت کے غلام ہو گئے تو صرف پہلا مفہوم دماغوں میں باقی رہ گیا۔

اقبال کا ملتِ اسلامیہ پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس کے افراد کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ کہ اے مسلمانو! آج تمہارے آقا و مولیٰ کی مسجد کافروں کے قبضہ میں ہے۔ اٹھو اور اُسے ان کے قبضے سے نکالو۔ یعنی تمام روئے زمین کو اپنے تصرف میں لے آؤ۔ تاکہ قرآنِ حکیم کی وہ پیشگوئی پوری ہو سکے جو لیظہرہٗ میں پوشیدہ ہے۔

چونکہ ایک عرصہ سے مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ سرد ہو چکا ہے اور ان کی ذہنیت ترکِ جہاں کی طرف مائل ہو چکی ہے۔ اس لئے اقبال نے بجا طور پر ہمیں متنبہ کیا ہے کہ

اے کہ از ترک جہاں گوئی، مگو
ترک ایں دیر کہن تسخیر او

---

[1] چونکہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اللہ کی حکومت کے بجائے اپنی حکومت قائم کر کے لال کنور کو ملکہ ہندوستان بنا دیا۔ اس لئے غیرتِ الٰہی نے سکھوں کو غافل مسلمانوں کی تعذیب پر مامور کر دیا۔ اور سارے پنجاب میں بانگِ اذان پر پابندی لگا دی۔ بلکہ اٹھارہویں صدی کے آخر اور رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں سکھوں نے پنجاب کی اکثر مسجدوں کو دمِ خنزیر سے آلودہ کیا اور نسخہ ہائے قرآن کو لاہور کے گردواروں کی سیڑھیاں بنایا۔

(دیکھو سفر نامہ مسٹر بیل (BELL) مطبوعہ لندن ۱۸۱۶ء)

یعنی اے مسلمان! تو ترکِ دنیا کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔
کیوں؟ اس لئے کہ تو اسلام کا پیرو ہے۔ وہ ترکِ جہاں کی بجائے تسخیرِ جہاں کا حکم دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسلام کی رُو سے ترکِ جہاں کا مفہوم ہی تسخیرِ جہاں ہے۔ ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت کی جاتی ہے:۔
واضح ہو کہ دنیا کے اکثر مشہور مذاہب مثلاً جین دھرم، بودھ دھرم ہندو دھرم اور مسیحیت کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ
(ا) مادہ ناپاک ہے۔ کیونکہ بدی اس کی ذات میں داخل ہے۔
(ب) اس لئے دنیا بھی (جو سراسر مادی ہے) ناپاک ہے۔
(ج) اس لئے ترکِ دنیا لازمی ہے۔ اس کے بغیر انسان روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔
اس مفروضہ کی رو سے ترکِ دنیا کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا اور علائقِ دنیوی سے بکسر قطع تعلق کر لینا چاہیئے۔ یعنی ترکِ دنیا کے معنی ہیں واقعی ترکِ دنیا لفظاً و معناً۔
لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ یا دنیا ناپاک نہیں ہے چنانچہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۶-۷۳)
اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو مصلحتِ خاص پیدا کیا۔
چونکہ قرآنِ حکیم کی رو سے تخلیقِ کائنات بالحق ہے۔ اس لئے یہ دنیا منبعِ شر یا ناپاک نہیں ہو سکتی۔
قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق میں مصلحتِ الٰہی یہ ہے کہ انسان جو خلیفۃ اللہ ہے۔ اسے مسخر کرے تاکہ اس میں حکومت

الٰہیہ قائم کر کے خود اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کر سکے۔

اس لئے قرآنِ حکیم انسان کو حکم دیتا ہے کہ پہلے اس دُنیا کو مُسخّر کرو پھر اس میں خدا کا قانون نافذ کرو۔

جس وقت انسان دنیا میں خدا کا قانون نافذ کریگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اس کی تمام لذتوں کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ترک کر دے گا۔ مثلاً اس کے قبضہ میں کروڑوں روپے ہوں گے۔ مگر وہ بیت المال میں سے صرف اتنی رقم لیگا جو اس کی جائز ضرورتوں کے لئے کافی ہو سکے۔ بالفاظِ دگر وہ دنیا کا مالک ہوتے ہوئے اللہ کے لئے دنیا کو ترک کر دیگا۔ یعنی ترکِ دنیا اسلام میں بھی ہے۔ مگر اس کا مفہوم ہے تسخیرِ دنیا۔ اب پڑھو یہ مصرع:۔

ترک ایں دیرِ کہن، تسخیرِ او

اگلے شعر میں اقبال نے خود اس شعر کی وضاحت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ اسلام کی رو سے دنیا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ اسے اپنے قبضہ میں لے آؤ۔ پھر اسے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ترک کر دو۔

غیر مذاہب تمہیں ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہیں مگر تمہیں اس کی دلفریبی سے نجات نہیں دے سکتے۔ کیونکہ انسان کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب تک وہ کسی شے کو حاصل نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کی آرزو اس کے دل سے نہیں نکل سکتی۔ یعنی بظاہر ترکِ دنیا کے باوجود وہ مادیات میں گرفتار رہتا ہے۔

لیکن اسلام چونکہ عین فطرت ہے۔ اس لئے وہ تمہیں یہ حکم دیتا

ہے کہ اسے مسخر کرو۔ اور جب وہ تمہارے قبضہ میں آجائے تو اسے اللہ کی خوشنودی کے لئے ترک کردو۔ اس طرح تم دنیا میں رہتے ہوئے مادیات سے بالاتر ہو جاؤ گے۔

ترکِ دنیا کا اسلامی مفہوم ذہن نشین کرنے کے بعد اقبال پھر مسلمان سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اے مسلمان یہ جہانِ آب وگل، یہ مادی دنیا تو "صیدِ مومن" ہے۔ یعنی اللہ نے یہ دنیا پیدا اسی لئے کی ہے کہ تو اسے مسخر کرے۔ لہٰذا تیرا یہ کہنا کہ "دنیا ترک کردو" ایسا ہی خلافِ عقل ہے جیسا کسی باز سے یہ کہنا کہ اپنے صید کو ترک کردو۔

کہتے ہیں کہ میں آج تک نہ سمجھ سکا کہ مسلمان ان تمام حقائق سے آگاہ ہونے کے باوجود ترکِ دنیا کی طرف کیسے مائل ہو گیا۔

کیا اس شاہین کی زندگی قابلِ افسوس نہیں ہے۔ جو شاہین ہو کر شکار سے مجتنب ہو جائے؟ اور فضائے نیلگوں میں پرواز کے بجائے اپنے آشیانے میں سرنگوں بیٹھا رہے۔

---

## تیسرا بند:-

یہ بند بہت غور طلب ہے۔ کیونکہ اس میں اقبال نے فقرِ مومن اور فقرِ کافر میں جو فرق ہے اسے نہایت دلنشیں انداز میں واضح کیا ہے۔

(۲) اسلامی فقر یا فقرِ مومن کیا ہے؟ خود جواب دیتے ہیں کہ فقرِ مومن تو تسخیرِ کائنات کا دوسرا نام ہے۔ یعنی اسلامی فقر مسلمانوں کو تسخیرِ کائنات پر آمادہ کرتا ہے۔ مومن اس کائنات کو کیسے مسخر کر سکتا ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ اسلامی فقر سے مسلمان کے اندر صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا

ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

فقرِ کافر (غیر اسلامی فقر) کیا ہے؟ جنگل میں جا کر خلوت نشین ہو جانا۔ یعنی کافر بظاہر تارک الدنیا ہوتا ہے۔ مگر در اصل متروک والدنیا ہوتا ہے۔ وہ خود دنیا کو ترک نہیں کرتا۔ درحقیقت دُنیا اسے ترک کر دیتی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے قبضۂ قدرت اور حیطۂ اقتدار میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس کے مقابلہ میں مومن حقیقی معنی میں ترکِ دنیا کرتا ہے۔ یعنی دنیا اس کے تصرف میں ہوتی ہے۔ مگر وہ اسے ذاتی فوائد کے لئے استعمال نہیں کرتا۔ وہ اگر چاہے تو سونے کے برتنوں میں کھانا کھا سکتا ہے۔ مگر وہ چونکہ مادیات کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس لئے نانِ جویں پر قناعت کرتا ہے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے اس کے قدموں میں ہوتے ہیں۔ مگر وہ قوم کی اجازت کے بغیر اپنے استعمال کے لئے بیت المال سے دو تولے شہد بھی نہیں لیتا۔ اس کے قبضہ میں دیبا و حریر کے ملبوسات ہوتے ہیں۔ مگر وہ ایسی قمیض پہنتا ہے۔ جس پر بارہ پیوند لگے ہوتے ہیں۔

اور اس ترکِ دُنیا کے باوجود شاہانِ عالم اس کے نام سے لرزہ بر اندام ہو جاتے ہیں۔ اور خالدِ جانباز جیسا نامور سپہ سالار اس کے حکم سے سرِ مُو انحراف نہیں کر سکتا۔ وہ لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتا ہے۔ مگر غلّہ کی بوری اپنے کاندھے پر اٹھا کر ایک غریب بدّو کے خیمہ پر پہنچاتا ہے[1]۔ (رضی اللہ عنہ)

---

[1] غالباً یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ میرا اشارہ جناب فاروقِ اعظم کی طرف ہے۔ ۱۲ ص

چونکہ کافر کا فقر اسے دُنیا سے فرار کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی لئے وہ کسی غار میں جاکر خلوت نشین ہو جاتا ہے اور اپنی تمام زندگی سجالیت سکون بسر کر دیتا ہے۔ لیکن مردِ مومن چونکہ احتسابِ کائنات کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اسے یقینی طور پر باطل سے برسرِ جنگ ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کی زندگی سکون کے بجائے مسلسل جدوجہد ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ اکثر حالات میں میدانِ جنگ میں شہادت ہی ہوتا ہے۔[۱]

کافر اور مومن دونوں طالبِ خدا ہوتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ کافر ترکِ دنیا کے ذریعے سے اُسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مومن اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی خودی کو سچائی کی فسان (سان) پر تیز کرتا ہے۔ یعنی مومن، قرآن (حق) کی تعلیمات پر عمل کر کے اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اور جب خودی پختہ ہو جاتی ہے تو وہ باطل کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتا ہے۔

بالفاظِ دگر کافر، خدا کو سکونِ غار میں تلاش کرتا ہے۔ لیکن مومن اس کو جنگ میں ڈھونڈتا ہے۔

فقرِ کافر یعنی غیر اسلامی فقر کی تعلیم یہ ہے کہ خودی، باطل یا فریب یا مایا ہے اس لئے اسے فنا کر دو۔ لیکن اسلامی فقر اس کے برعکس یہ تلقین کرتا ہے کہ خودی حق ہے اس لئے اس کی تربیت کر کے مرتبۂ کمال تک پہنچا دو۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے ؎

---

[۱] یہی وجہ ہے کہ جین دھرم. بدھ دھرم اور ہندو دھرم میں شہید کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ یہ مذاہب راہِ خدا میں جان دینے کے تصوّر ہی سے ناآشنا ہیں۔

آں خودی را کشتن و وا سوختن
ایں خودی راچوں چراغ افروختن

یعنی فقر کافرانہ (غیر اسلامی فقر) خودی کو فنا کر دینے یا نیست و نابود کر دینے کا نام ہے۔ مگر فقرِ مومنانہ (اسلامی فقر) اسے مرتبہ کمال تک پہنچا دینے کی تلقین کرتا ہے جہاں پہنچکر وہ مثل چراغ منّور ہوجاتی ہے۔

واضح ہو کہ ہندوستان کے تمام مذاہب اور مدارسِ فکر کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ زندگی سراپا دُکھ، مصیبت، رنج و غم ہے۔ اس لئے یہ دنیا اپنی ذات کے اعتبار سے شر (EVILS) ہے۔

(۱) ہندو دھرم، بودھ دھرم اور جین دھرم تینوں مذہبوں کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ دنیا بدی کا گھر ہے۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ ہم اس قید میں کیوں کر داخل ہو گئے۔ لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس سے رہائی کیونکر حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲) ان تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم کا نقطہ آغاز "خدا" نہیں ہے۔ بلکہ ذاتی تجربہ یا مشاہدہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(ا) انسانی زندگی دکھ سے معمور ہے۔ کلیش سے بھرپور ہے۔

(ب) دنیا باعتبار ذات سراپا شر اور بدی اور برائی ہے۔

(ج) اس کی بنیاد خواہشِ زیست پر ہے۔

(د) اس لئے انسان کے دُکھ کا بنیادی سبب "خواہش" ہے۔

(ہ) لہٰذا خواہش، آرزو، تمنّا یا ارادے کو فنا کردو۔

(۳) ہندوستان کے تمام مدارسِ فکر کی بنیاد دُکھ کے احساس

پر ہے۔ چنانچہ سانکھ کریک مصنف لکھتا ہے۔

"دکھ بزے ابھی گھاتت جگرسی تد دے گھاتک ھیتو"
یعنی فلسفیانہ غور و فکر کا آغاز دکھ کی تین قسموں کے احساس سے ہوتا ہے۔

ہندو فلسفہ میں دکھ کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) ادھیاتمک یعنی ذہنی یا روحانی دُکھ۔

(۲) اَدھی بھوتک یعنی جسمانی دُکھ۔

(۳) اَدھی دیوک یعنی حادثاتی یا اتفاقی یا عارضی دُکھ۔

(۴) اس قنوطیت (PESSIMISM) کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تیاگ کو بہترین طرز حیات یقین کیا جائے۔ واضح ہو کہ تیاگ کو عرفِ عام میں ترکِ دنیا یا رہبانیت کہتے ہیں۔

(۵) رہبانیت کے مشہور علمبردار سوامی ووِیکانند کا مشہور قول ہے کہ میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ دنیا کیسے موجود ہو گئی؟ کوئی فلسفہ اس گتھی کو نہیں سلجھا سکتا۔ لیکن میں اس جیل خانے سے رہائی پانے کا طریقہ ضرور جانتا ہوں۔ اور رہائی پانا ہمارے لئے[2] اشد ضروری ہے

---

[1] شوپن ھاور (جرمنی فلسفی) کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ دنیا سراسر شر ہے۔ اور خواہشِ زیست (WILL TO LIVE)

[2]:۔ واضح ہو کہ سوامی جی نے جو کچھ کہا ہے یہی ویدانت فلسفہ کی الف با تے ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف (فلسفہ وحدۃ الوجود) کی تعلیم یہ ہے کہ

(۱) یہ دنیا حق کے اسماء صفات کی تجلیات پیہم کا دوسرا نام ہے۔ بقول شیخ اکبر

(باقی صفحہ ۴۰۸ پر)

(۶) مکمل طور پر ترکِ دنیا ہی زندگی کا بلند ترین آدرش (نصب العین) ہے اس کو اصطلاح میں سنیاس کہتے ہیں۔

(۷) اسی لئے ان تمام مذاہب نے تجرّد (عورت سے بیگانگی) کو تاہل گرہستی یا نکاحی زندگی سے افضل قرار دیا ہے۔

(۸) اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر تجرد اور ترکِ دنیا کو دستورِ حیات بنا لیا جائے تو پھر فوج، حکومت، سلطنت، تجارت، صنعت و حرفت اسکول، کالج، فیکٹریاں، کارخانے، دفاتر، سینما، اوپیرا تھیٹر، رقص و سرود، ہاکی، کرکٹ، فٹ بال۔ غرضکہ زندگی کی ساری گہما گہمی اور رونق ہی ختم ہو جائیگی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر برہمچریہ (تجرد) کی بدولت دنیا میں توالد و تناسل کا سلسلہ بند ہو جائے تو اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

اگر اس طرح سارے انسانوں کو مکتی حاصل ہو جائے تو پھر اور باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔ جس کی آرزو کی جائے۔ ہم اگر دنیا ختم ہو جائے

---

صـ۴۰۷ کا بقیہ حاشیہ:- او وجود مطلق بتقاضائے صفت جود خویش، بصورت اعیان ثابتہ جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔

(ب) یہ دنیا جیل خانہ نہیں ہے بلکہ حق کی صفت جود و کرم کا ظہور ہے۔

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا ہو بندگان جودے کنم

اس لئے وحدۃ الوجود کے اسلامی عقیدے کو ویدانت فلسفہ سے ماخوذ سمجھنا دونوں سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ ۱۲

تو دوسرے لفظوں میں مقصد زندگی حاصل ہو جاتے ہیں۔[1]

نوٹ :۔ متی کی انجیل ۱۹ - ۱۰ تا ۱۲ میں مخنثوں کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) جو ماں کے پیٹ سے نامرد پیدا ہوتے ہیں (۲) جن کو دوسرے لوگ مخنث (ہیجڑا) بنا دیتے ہیں۔ (۳) جو آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے خود اپنے آپ کو (مخنث) نامرد بنا لیتے ہیں۔ نیز اگر نتھیوں ۷ - ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ پولس نے بھی تجرد کو تاہل پر ترجیح دی ہے چنانچہ ۷ - ۷ میں وہ کہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ میری ہی طرح زندگی بسر کریں۔ پھر ۷ - ۸ میں کہتا ہے کہ میں غیر شادی شدہ افراد اور رانڈ عورتوں سے یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ میری طرح رہیں تو بہتر ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ مسیحیت نے بھی ہندو دھرم کی طرح رہبانیت ترکِ دنیا اور تجرد کو گرہستی زندگی سے بہتر قرار دیا ہے۔

۹ - ہندوستان کے تمام مذاہب نے باستثنائے چارواک مت، قنوطیت اور رہبانیت کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ مسٹر ابن متر اپنے مقالہ قنوطیت اور زندگی کا نصب العین میں لکھتے ہیں کہ ہمارے (ہندی) مذاہب اور مدارسِ فکر میں تصور خدا قدر مشترک نہیں ہے۔ بلکہ قنوطیت اور رہبانیت قدر مشترک ہے۔ اور یہی ہمارے کلچر کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہی ہماری تہذیب کی روح ہے۔

ویدانت جس میں وحدت الوجود کی تعلیم دی گئی ہے۔ سانکھیہ درشن جس میں خدا کا انکار کیا گیا ہے۔ نیائے اور ویشیشک جس میں خدا محض

---

[1] دیکھو مسٹر کے۔ این متر اکا مضمون شائع شدہ در ویدانت کیسری ۱۹۲۵ء

نمت کارن (علتِ فاعلی) ہے۔ عنایانِ بودھ دھرم جس میں خدا کے علاوہ روح (نفس ناطقہ) کا بھی انکار کیا ہے۔ اور جین دھرم جو صاف لفظوں میں خالق و صانع کائنات کا منکر ہے۔ یہ تمام مذاہب تین بنیادی اصول پر متفق اور متحد ہیں۔

اصل اوّل :- زندگی سراپا دکھ اور عذاب ہے۔

اصل دوم :- ہمارے دکھ کا کارن (سبب) آرزو ہے جسے ترشن کہتے ہیں۔

اصل سوم :- مقصدِ حیات، اس دکھ کا ناش کرنا۔

خلاصہ کلام اینکہ۔ مقصدِ حیات میں کامیابی صرف تیاگ (رہبانیت) سے ہوسکتی ہے۔ اور تیاگ رہبانیت کا مطلب ہے خواہش کو فنا کردینا۔ یعنی اپنے آپ کو فنا کردینا۔

ع این خودی را کشتن و واسوختن

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم ہندوستان کے مختلف مذاہب کی راہبانہ تعلیم کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

**ھندو دھرم**:- ہندو دھرم میں جس قدر فلسفیانہ مدارسِ فکر قائم ہوئے سب نے زندگی کو ایک قسم کی قید قرار دیا ہے۔ یعنی روحِ انسانی سابقہ گناہوں کی وجہ سے جسم کی قید میں آکر سزا بھگت رہی ہے۔ شریر (جسم) آتما (روح) کے لئے بمنزلۂ قید خانہ ہے۔ اس لئے جب تک روح اس قید خانہ سے ہمیشہ کے لئے رہائی حاصل نہ کرلے۔ ہمارے دکھ کا خاتمہ ہی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ترکِ دنیا (رہبانیت) کے ذریعہ سے روح اور جسم کے اس تعلق کو ختم کردینا چاہیئے۔ یعنی۔

## ۶۔ آں خودی را کشتن و واسوختن

(ا) دکھ کا سبب بندھن (ربط جسم و روح) ہے۔

(ب) اور یہ بندھن ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب تک کرم (عمل) کا سلسلہ جاری ہے۔

(ج)، اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا جب تک آرزو (ترشن) باقی ہے۔

(د) اس لئے آرزو کو ختم کر دو۔ زندگی خود بخود ختم ہو جائیگی۔ کیونکہ جب آتما اس جسم کی قید سے آزاد ہو جائیگی تو مکت ہو جائیگی اور مکتی یافتہ روح دوبارہ جسم کی قید میں ہرگز نہیں آئے گی۔ یعنی پھر اس پر دنیاوی زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکے گا۔ بالفاظِ دگر دنیاوی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہو جائیگا۔

یا یوں کہیئے کہ ہندو دھرم کی رو سے زندگی بہت بڑی لعنت ہے اس لئے ہر عقلمند آدمی کا فرضِ منصبی (اخلاقی آدرش یا نصب العین) یہ ہے کہ وہ اس لعنت سے نجات حاصل کرے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد صرف نفی حیات ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زندہ رہتے ہوئے کوئی شخص بھی زندگی کے لوازم (دکھ درد رنج و غم، تلخی، پریشانی، مصیبت، کلیش) سے نجات نہیں پا سکتا۔ زندگی نام ہی ہے دکھ کے غیر مختتم سلسلہ کا۔ حیات نام ہی ہے غم و اندوہ کی مسلسل داستان کا۔ لہٰذا جس طرح ممکن ہو اس زندگی کا خاتمہ کر دینا چاہیئے [1]

---

[1] واضح ہو کہ یہ تعلیم سراسر غیر اسلامی ہے اسی لئے اقبال نے اپنی ساری عمر اس کے خلاف جہاد میں بسر کر دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقبال جس تصوف کے خلاف ہیں وہ اسلامی نہیں بلکہ غیر اسلامی ہے جو ترکِ دنیا (رہبانیت) خلوت گزینی

باقی صفحہ ۴۱۲ پر

چنانچہ پوروکانسا درشن کی تعلیم یہ ہے کہ موکش (نجات) نام ہے دھرم اور ادھرم (حرکت اور سکون) کے خاتمہ کی بدولت جسم کے پورے طور سے فنا ہو جانا۔ جو شخص موکش کا طالب ہے وہ سب سے پہلے کرم (اعمال) کا خاتمہ کرتا ہے۔ بعد ازاں کامل ریاضت اور صحیح علم کی بدولت جسمانی زندگی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔[1]

**جین دھرم:-** جین دھرم کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی اور شخصیت دونوں کی نفی کر دی جائے۔ کیونکہ یہ زندگی دکھ اور مصیبت ہے۔ اور دکھ سے نجات پانا ہی مقصدِ حیات ہے۔ اور چونکہ دنیا سے علاقہ یا سمبندھ رنج و غم کا سبب ہے اس لئے ترکِ دنیا بہترین طرزِ زندگی ہے۔

جین دھرم نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے جذبات پر قابو حاصل نہ کر سکے۔ اور ریاضت (ترکِ لذّات) پر بھی قادر نہ ہو سکے تو اسے خودکشی کر لینی چاہیئے۔

---

بقیہ حاشیہ ص۴۱۱: سکون، مفلسی اور مایوسی، مسکینی اور محرومی کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ وہ خود طنزیہ انداز میں کہتے ہیں۔ اے مردِ خدا تجھکو وہ قوت نہیں حاصل

جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

مسکینی، محکومی، محرومی، جابرحیں کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کو ایجاد۔ یعنی اسلام اس تصوف کا حامی نہیں ہے جو انسان کو بے عمل اور خلوت نشین اور تارک الدنیا بنا دے اس کے برعکس اسلامی تصوف انسان کو سلطان الہند خواجہ معین الدین اجمیری۔ اور سلطان المشائخ سلطان نظام الدین اولیاء دہلوی بنا دیتا ہے۔

[1] تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ فلسفہ ہند جلد دوم ص۲۱۳ مولفہ ڈاکٹر رادھاکرشنن مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۰ء

ع آں خودی راکشتن و واسوختن

ذیل میں ایک جینی راہب کی زندگی کا پروگرام درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جین دھرم میں زندگی اور شخصیت کو فنا کر دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ بلکہ یہی مقصدِ حیات ہے۔

ڈگمبر جینی راہب کے لئے ضروری ہے کہ برہنہ رہے۔ لوٹے مور چھل اور کتابوں کے علاوہ کوئی سامان اپنے پاس نہ رکھے۔ زمین پر سوئے۔ دن رات میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھائے۔ وہ بھی کھڑے ہو کر جسم کے بال اپنے ہاتھ سے اکھیڑ دے۔ کسی جاندار کو ایذا نہ پہنچائے۔ کبھی شادی نہ کرے، روپے پیسے کو ہاتھ نہ لگائے۔ بلا ضرورت گفتگو نہ کرے۔ اپنے دل کو نفرت اور محبت کے جذبات سے خالی کر دے۔

**بودھ دھرم:۔** بودھ دھرم دراصل راہبانہ نظام ہے۔ اور دنیا میں رہبانیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ زندگی سراسر دکھ ہے۔ نہ خدا ہے نہ روح۔ جسے عرفِ عام میں روح کہتے ہیں وہ دراصل گیان دھارا (شعور کا تسلسل) ہے۔

ہماری ہستی کا سبب خواہشِ ذلیت ہے۔ لہٰذا نجات (مکتی) اسی کی نفی کا نام ہے۔ پیدا ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا نروان (نیستی) سب سے بڑا نصب العین ہے۔ خواہشات کو فنا کر دو تاکہ پیدائش کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ نروان کا مطلب ہے بجھ جانا یا ٹھنڈا ہو جانا۔[1] نجات کے لئے تجرّد (عورت سے دور رہنا) شرط ہے۔ کیونکہ عائلی زندگی

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھو تاریخِ فلسفہ ہند جلد اول صفحہ ۳۶۲ تا ۴۷۴ مؤلفہ ڈاکٹر رادھا کرشنن مطبوعہ لندن ۱۹۴۰ء

سے خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ اور خواہش سے انسان بار بار پیدا ہوتا ہے۔ خواہش کو فنا کردو تاکہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ یعنی

ع آں خودی را کشتن و واسوختن

اسلامی اور غیر اسلامی فقر میں امتیاز کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ جب صاحب فقر (مومن) خودی کی مخفی طاقتوں کا مظاہرہ کرتا ہے تو زمین و آسمان میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔ آئندہ شعر میں "فقر عریاں" کی مثال دی ہے کہ جنگِ بدر اور جنگِ حنین میں مسلمانوں کو جو کامیابی ہوئی وہ اسی لئے کہ انہوں نے خودی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر، کافر کا فقر اسے غار کی طرف لیجاتا ہے جہاں وہ خلوت میں بیٹھ کر اپنی شخصیت کو فنا کر دیتا ہے۔ لیکن مومن کا فقر اسے میدانِ جنگ میں لے جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی شخصیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ زندہ رہا تو غازی اور مارا گیا تو شہید یعنی دونوں صورتوں میں اس کی جیت ہوتی ہے۔

آخری شعر میں اس تلخ حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جب سے مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شانِ فقر کا مظاہرہ کرنا ترک کر دیا تو ان کی زندگی میں شانِ جلال بھی باقی نہ رہی۔

## چوتھا بند:-

عصرِ حاضر کے مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی پر ماتم کرتے ہیں۔ کہ افسوس! آج فقر (لا اللہ) کی تلوار کسی مسلمان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ مسلمان غیر اللہ کی محبت اپنے دل سے نکال دیں۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ اے مسلمان تو کب تک یہ بے غیرتی کی زندگی

بسر کرتا رہے گا ؟ یہ زندگی تو دراصل موت ہے ۔

اللہ کا بندہ وہ ہے جو اپنے آپ کو دوبارہ پیدا کرے ۔ یعنی اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرے ۔ جب مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا کریگا تو گویا دوبارہ پیدا ہو جائے گا ۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نورِ حق کی روشنی میں دیکھے ۔ نورِ حق کی روشنی میں دیکھنے کا مطلب ہے اپنے اندر ایمانِ کامل پیدا کرنا ۔

بالفاظِ دگر وہ اپنے آپ کو اس معیار پر جانچے جو آنحضرت صلعم نے اس کے لئے مقرر فرمایا ہے ۔ اور وہ معیار عشقِ رسول ہے ۔ یعنی مسلمان حقیقی معنی میں مومن اس وقت ہوتا ہے جب حضور کی محبت تمام محبتوں پر غالب آجائے ۔ جب مومن میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے ۔ یعنی وہ دنیا جس میں انسانوں کے قانون کے بجائے اللہ کا قانون نافذ ہوتا ہے ۔

**پانچواں بند** :- افسوس مسلمان قوم پر کہ دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہی ہے ۔ ایک عرصہ سے اس میں میر و سلطان تو پیدا ہو رہے ہیں ۔ مگر کوئی درویش (صاحبِ فقر) پیدا نہیں ہوتا ۔ مسلمانانِ عالم کی موجودہ حالت ناگفتہ بہ ہے ۔

مصرع — ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ

اب رہے ہندوستان کے مسلمان[1] تو ان کی حالت یہ ہے کہ (۱) وہ اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس ہو چکے ہیں ۔ اور اس کی خاص

---

[1] اقبال نے یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی جب پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا ۔ لہٰذا اس وانید کو پڑھتے وقت اسی زمانہ کو مدِنظر رکھیے ۔ ۱۲

وجہ یہ ہے کہ مدتوں سے ان میں کوئی مردِ باخدا پیدا نہیں ہوا ہے۔
جو ان کے اندر ذوقِ یقین اور جذبۂ جہاد پیدا کر سکتا ہو۔

(۲) فقدانِ یقین کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوتِ دین سے بدظن ہو گئے۔ یعنی اب ان کے دلوں سے یہ حقیقت محو ہو چکی ہے کہ اگر ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں تو دوبارہ کفار پر غالب آسکتے ہیں۔
واضح ہو کہ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے
کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مومنین ط (۳ — ۱۳۹)
اگر تم اپنے اندر سچا ایمان پیدا کر لو تو بلاشبہ تم ہی غالب رہو گے۔
چونکہ وہ ایمان سے محروم ہیں۔ اس لئے خود ہی اپنے رہزن بن گئے ہیں۔ یعنی ان کی ذلت اور محکومی کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ذوقِ یقین سے بیگانہ ہیں۔

تین صدیوں سے یہ ذلیل و خوار قوم عشقِ رسول (سوزِ اندروں) کے بغیر زندگی بسر کر رہی ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں مسلمانوں کی ذلت اور محکومی کا یہی ایک سبب بیان کیا ہے کہ ان کے قلوب عشقِ رسول سے خالی ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں لکھتے ہیں ؎

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

چونکہ ان کے قلوب محبتِ رسول سے خالی ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کی حالت یہ ہے کہ

ع پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق

یعنی ان کا حوصلہ پست ہو چکا ہے۔ طبیعت ادنیٰ چیزوں کی طرف مائل ہے اور مذاق بگڑ گیا ہے۔ یعنی نیکی اور بدی میں امتیاز نہیں کر سکتے۔

چونکہ ان کے مذہبی پیشوا خود عشقِ رسول کی نعمت سے محروم ہیں اسلئے ان کے حلقہ ہائے درس و تدریس میں سب کچھ ہے مگر عشقِ رسول کی تلقین نہیں ہے۔

عقائد کی خرابی (درشتی اندیشہ) نے انہیں زندگی کے ہر شعبہ میں ذلیل و رسوا کر رکھا ہے۔ اور اسی لئے وہ فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہیں۔

چونکہ وہ اپنے مقام سے بیگانہ ہیں۔ یعنی چونکہ وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ اللہ نے انہیں ساری قوموں کا سردار بنایا ہے۔ اس لئے ان میں انقلاب برپا کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

واضح ہو کہ اسلام دراصل ایک انقلاب آفریں نظامِ حیات کا نام ہے۔ یعنی اسلام اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیتا ہے کہ دنیا کو ملوکیت کی لعنت سے آزاد کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان شمشیر بکف ہو کر ملوکیت کو دنیا سے مٹا دیں۔ بالفاظِ دیگر دنیا میں انقلاب برپا کر دیں لیکن یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان اپنے منصب اور مقام سے آگاہ ہوں۔ اور آگاہی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اس آیت کے مفہوم پر غور کریں۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۵ (۳ - ۱۱۰)

اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو پیدا کی گئی ہے بنی آدم کے فائدے کے لئے۔ (تمہارا فرض منصبی یہ ہے کہ تم لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔ اور تمہارے اندر یہ طاقت اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

گویا اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی لئے پیدا کیا تھا کہ ہم انسانوں کو نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خود دوسروں کے غلام ہیں یا محکوم ہیں بلکہ قوتِ لایموت کے لئے کافروں کے ممنونِ احسان ہیں۔

ہم دوسروں کو تو بدی سے کیا روک سکتے ہیں۔ خود ہر قسم کی بدی کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اس معاملہ میں دنیا کی کوئی قوم ہماری برابری نہیں کر سکتی۔[1] اخلاقی پستی کے اعتبار سے ہم شتّیٰ أُمّتہ کے مصداق ہیں۔

چونکہ مسلمان مردِ خبیر (اللہ کا دوست) کی صحبت اختیار نہیں کرتے اسی لئے مایوس، شکستہ دل اور صداقت سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس زمانہ کے مسلمان "ردکردۂ مولا" یعنی مردودِ بارگاہِ ایزدی ہیں، نیز مفلس اور اپنے فرائض سے غافل ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ نہ ان کے پاس دولت ہے جو کوئی بادشاہ

---

[1] تفصیل کا تو موقع نہیں ہے۔ صرف اسی بات سے ہماری اخلاقی پستی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہمارے علاوہ دنیا کی کوئی قوم اپنی عبادت گاہوں سے جوتیاں نہیں چراتی۔ اور نہ کسی قوم کے مرد عورتوں کی سی وضع قطع اختیار کرتے ہیں۔

اسس کے حصول کی غرض سے ان کی طرف متوجہ ہو۔ اور نہ ان کے قلوب میں ایمان کا نور ہے جس سے محروم کرنے کے لئے شیطان ان کی جانب مائل ہو۔

ان کی دینی اور روحانی پستی کا یہ عالم ہے کہ جو شخص ان کی اصلاح کا مدعی ہے جو یہ کہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ روحانیت کے اعتبار سے میں کسی ولی (مثلاً بایزید بسطامی) سے کم نہیں ہوں جو یہ کہتا ہے کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے وغیرہ ذالک... اس کا حال یہ ہے کہ وہ حکومتِ برطانیہ کو رحمتِ ایزدی قرار دیتا ہے... وہ فرنگی (انگریز) کا مرید ہے... انگریزی حکومت کی بقا کے لئے دست بدعا ہے... انگریزوں کو اولی الامر منکم کا مصداق سمجھتا ہے... اور اپنی جماعت کو برطانیہ کا "خود کاشتہ" پودا قرار دیتا ہے۔

اس شخص نے مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ اگر تم انگریزوں کی غلامی پر قانع رہو گے تو دین اسلام کو بہت رونق حاصل ہو جائیگی اور زندگی کے طالب ہو تو خودی سے بیگانگی اختیار کر لو۔ یہ ہے اسی تعلیم کا خلاصہ!

اس نے حکومت اغیار کو رحمت قرار دیا اور انگریز حکومت (کلیسا) کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے کرتے مر گیا۔ یہ ہے اس کی اصلاح کا مرقع۔

چھٹا بند :-

اے مسلمان! اے وہ مسلمان جو ذوق و شوق یعنی عشقِ رسول سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ عصر حاضر نے تیرے اور

تیری قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

عصرِ ما، مارا زما، بیگانہ کرد

یعنی اس دورِ مادیت نے (جو ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بدولت مستحکم ہوا) ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اور جب ہم اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے قلوب جمالِ مصطفےٰ یعنی سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھی خالی ہو گئے۔ یعنی مادیت نے ہمیں اس قدر اندھا کر دیا کہ اب ہمیں سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اگر حضور ہماری نگاہوں میں محبوب ہوتے تو ہم حضور کے دشمنوں سے سوالات نہ کرتے۔ ان کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرتے ان کا لباس۔ ان کی وضع قطع اور ان کی زبان اختیار نہ کرتے۔ مختصر یہ کہ ان کی غلامی پر رضامند نہ ہوتے۔

---

لہ آج سے سو سال پہلے تک ہمارے اسلاف اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ

عہ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مگر خدا بھلا کرے غفران مآب آنریبل سر سید احمد خاں بہادر ستارۂ ہند، کا اور خان بہادر مولوی بشیر الدین کا جنہوں نے علی گڑھ اور اٹاوے میں انگریزی درسگاہ قائم کر کے مسلمانوں کو ترقی کی چاٹ لگا دی۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی نے ان بزرگوں کی خدمت میں یوں خراجِ تحسین ادا کیا ہے ؎

یہ کیوں کہتے ہو اسے بھائی نہ ملجا ہے نہ ماوا ہے
خدا کے فضل سے اب تو علی گڑھ ہے اٹاوا ہے
اکبر

لیکن جب ہمارے سینے عشقِ رسول کے سوز سے محروم ہو گئے تو آئینہ سے جوہرِ آئینہ بھی رخصت ہو گیا۔

اس مصرع میں آئینہ کنایہ ہے مسلمان سے اور جوہرِ آئینہ کنایہ ہے عشقِ رسول سے

افسوس تو نے اس عصرِ مادیت کی روح کو نہ پہچانا تو نے یہ نہ سمجھا کہ انگریزی حکومت تجھے تہذیب و تعلیم کے پردے میں دین سے بیگانہ بنا رہی ہے۔ اس لئے تو کالج میں داخل ہوتے ہی اپنی ہستی سے بیگانہ ہو گیا۔ یعنی تہذیبِ مغرب کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔

چونکہ اس مادی تہذیب کے طلسم (پیچاک) میں گرفتار ہو کر دینِ اسلام سے بیگانہ ہو گیا۔ اس لئے اس دین کی سربلندی کے لئے جدو جہد کی کوئی آرزو تیرے دل میں پیدا نہ ہو سکی۔

اے مسلمان! دینِ اسلام سے بیگانگی کا یہ شیوہ ترک کر دے تو کیوں از خود رفتہ ہو گیا ہے؟ ذرا اپنی حالت کا جائزہ تو لے! ذرا ایک گھڑی کے لئے اپنے غیر سے (انگریزی تہذیب سے) قطع تعلق تو کیا تو کب تک خوف و ہراس میں زندگی بسر کریگا... اپنا مقام پہچان اور عزت کی زندگی بسر کرنے کا سامان کر...

جب سربلندی کی صورت (شاخ بلند) موجود ہے تو ذلت کی زندگی (شاخِ نگوں) پر کیوں قناعت کر رہا ہے۔

اے مسلمان! تو شاہین ہے اس لئے زاغ و زغن کے ساتھ اپنی زندگی والبستہ مت کر بلکہ

خویشتن را تیزی شمشیر دہ     باخود یا در کفِ تقدیر دہ

یعنی پہلے اپنی خودی کو پختہ (اور خودی کی پختگی عشقِ رسول پر موقوف ہے) اس کے بعد سرگرمِ عمل ہوجا۔ یعنی باطل کا مقابلہ کر اور نتیجہ خدا (تقدیر) پر چھوڑ دے۔

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے صحیح اسلامی زندگی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوتا تو وہی ہے جو خدا چاہتا ہے (اسی کا نام تقدیر ہے) مگر اسلام نے ہمیں یہ تعلیم بھی تو دی ہے کہ مسلمان کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی سی تدبیر ضرور کرے اور حتی المقدور جد و جہد کے بعد نتیجہ یا فیصلہ یا انجام خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ انسان مشیّتِ ایزدی (تقدیر) کو تو بدل نہیں سکتا۔ مگر اپنی سی جد و جہد تو بہر حال و بہر صورت کر سکتا ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ اقبال نے اس شعر میں تدبیرِ انسانی اور تقدیرِ ایزدی دونوں کو بڑی خوبی کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اسلام نہ تو انسان کو مجبورِ محض قرار دیتا ہے اور نہ قادرِ مطلق۔ پہلی صورت میں شریعت باطل ہوجاتی ہے۔ اور دوسری صورت میں خدا بیکار ہوجاتا ہے۔ اس لئے قرآن نے تدبیر اور تقدیر میں ایک خوشگوار امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ جس کی بدولت خدا کی خدائی بھی برقرار رہتی ہے۔ اور انسان کی آزادی بھی برقرار رہتی ہے۔ اور بات بھی یہی ہے کہ ایمان جبر اور اختیار کے درمیان ہے۔

چنیں فرمودہ سلطانِ بدر است
کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است

اے مسلمان! میری بات پر یقین کر کہ تیرے اندر ایک سیلِ بے پناہ

پوشیدہ ہے۔ بہ سبیل کنایہ ہے عشقِ رسول سے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تو عاشقِ رسول یعنی سچے معنی میں مسلمان بن جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی حکومت تیرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اس نکتہ کو بھی یاد رکھو کہ سیلاب کا وقار اس کی ناآسودگی یعنی مسلسل حرکت (سیلان) پر موقوف ہے۔ جو سیلاب کسی جگہ یا کسی وقت رک جائے وہ اپنی ہستی اسی وقت اور اسی جگہ کھو دیتا ہے۔ پھر اس پر سیلاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یعنی وہ سیلاب ہی نہیں رہتا۔ بلکہ تالاب (ساکن پانی) بن جاتا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ سیلاب اور تالاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

اسی طرح مسلمان نام ہے مردِ مجاہد کا جو ہر وقت اور ہر جگہ جد و جہد میں مصروف رہتا ہے۔ اگر وہ جہاد ترک کر دے تو پھر اس پر مسلمان یا مومن مجاہد کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یعنی وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔ کافر بن جاتا ہے[1]۔ اسی نکتہ کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

ع یک نفس آسودنش نابودن است

---

[1] یہی وجہ ہے کہ فتح علی خاں (سلطان ٹیپو شہید) تا دمِ آخر جہاد کرتا رہا اور اس مردِ مومن نے نظام علی خاں (نظام حیدر آباد) کی نصیحت قبول کرنے کے بجائے سپاہی کی موت قبول کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخر الذکر ۱۸۰۲ء میں ہمیشہ کے لئے مر گیا۔ اور سلطان کے نام کی نوبت ابھی تک دکن میں بج رہی ہے۔ اور ہمیشہ بجتی رہے گی۔ ۱۲

یعنی جس طرح سیلاب ساکن ہو جائے تو نابود ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر مسلمان ساکن (جہاد) سے غافل ہو جائے تو مسلمان کی حیثیت سے اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ پاکستانی یا ایرانی یا مصری یا ترکی کی حیثیت سے زندہ رہے اور امریکن امداد کے سہارے زندگی کے دن پورے کرتا رہے۔

آخر میں یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! شاید میرے بعد صدیوں تک "چو من مرد فقیر" پیدا نہ ہو جو تمہیں اس دلنشین انداز میں تمہارے دین کے حقائق و معارف سے آگاہ کر سکے۔

یہ سچ ہے کہ نہ میں ملّا ہوں نہ فقیہہ اور نہ میں نے سلوک طے کیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں عالم بے عمل (تیز بین و سست گام) ہوں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ میرے سینے میں ایسا دل ہے جو ہر وقت قوم کے غم میں مضطرب رہتا ہے۔ یعنی میں ہر وقت اپنی قوم کے غم میں گھلتا رہتا ہوں۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

اس لئے عشقِ رسول کی آگ سے جو میرے سینہ میں بھڑک رہی ہے اپنا حصّہ لے لو۔

؎ بعد ازیں نابد چو من مرد فقیر

# فصل ہشتم

## مردِ حُر

مردِ حُر محکم ز وردِ لا تخف[1] | ما بہ میداں سر بجیب، او سر بکف
مردِ حُر از لا الٰہ روشن ضمیر | می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
مردِ حُر چوں اشتراں بارے برد | مردِ حُر بارے بَرد خارے خورد
پائے خود را آنچناں محکم نہد | نبض را از سوزِ او برمی جہد
جانِ او پائندہ تر گردد ز موت | بانگِ تکبیرش برون از حرف و صوت
ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج | گیرد آں درویش از سلطاں خراج
گرمیٔ طبعِ تو از صہبائے اوست | جوئے تو پروردۂ دریائے اوست

---

[1] لا تخف: تلمیح آیہ قرآنی کی طرف یعنی خوف نہ کر۔

پادشاہاں در قباہائے حریر
زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

سِرّ دیں ما را خبر او را نظر
او درونِ خانہ ما بیرونِ در

ما کلیسا دوست ! ما مسجد فروش !
او ز دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش

نے مغاں را بندۂ نے ساغر بدست
ما تہی پیمانہ او مستِ الست

چہرۂ گُل از خمِ او احمر است
ز آتشِ ما دودِ او روشن تر است

دارد اندر سینہ تکبیرِ اُمم
در جبینِ اوست تقدیرِ اُمم

قبلۂ ما گہ کلیسا گاہ دیر
او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہٗ
او نہ گنجد در جہانِ رنگ و بو

صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ
آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ!

در جہانِ بے ثبات او را ثبات
مرگ او را از مقاماتِ حیات!

اہلِ دل از صحبتِ ما مُضمحل
گُل ز فیضِ صحبتش دارائے دل

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن
او ہمہ کردار و کم گوید سخن

ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست
فقرِ او از لا اِلٰہ تیغے بدست

ما پرِ کاہے اسیرِ گرد باد
ضربتش از کوہِ گراں جوئے کشاد

محرمِ او شو ز ما بیگانہ شو / خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

شکوہ کم کن از سپہر گرد گرد / زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است / صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

مردِ حُر دریائے ژرف[۱] و بیکراں / آب گیر از بحر و نے از ناوداں[۲]

سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ / پیشِ او کوہِ گراں یک تودہ ریگ

روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن / ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن

روزِ کیں آں محرمِ تقدیرِ خویش / گورِ خود می کند از شمشیرِ خویش!

اے سرت گردم گریز از ما چو تیر / دامنِ او گیر و بے تابانہ گیر

می نہ روید تخمِ دل از آب و گِل / بے نگاہے از خداوندانِ دل

اندریں عالم نیرزی با خسے
تا نیاویزی بدامانِ کسے!

---

۱ عمیق۔ گہرا۔
۲ پرنالہ

# مردِ حُر

## تمہید

اگرچہ اقبال نے گذشتہ فصل میں زیرِ عنوان فقر، صاحبِ فقر کی صفات بھی واضح کردی ہیں۔ مگر اس مقام کی اہمیت اس امر کی متقاضی ہوئی کہ وہ اس کے لئے بھی ایک مستقل باب باندھیں۔ چنانچہ اس فصل میں انھوں نے بعنوان مردِ حُر، اس کے مقام کی مزید توضیح کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مضامین کی تکرار ہوگئی ہے۔ مثلاً گذشتہ فصل میں انہوں نے یہ لکھا ہے۔

با سلاطیں درفتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

اس فصل میں انہوں نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

بادشاہاں در قبا ہائے حریر
زرد رُو از سہمِ آں عریاں فقیر

واضح ہو کہ اقبال کی رائے میں اسلامی تعلیمات کی غایت یہ ہے کہ انسان میں شانِ فقر پیدا ہو جائے یہ مقام خودی کی معراج ہے یعنی اس مقام پر پہونچ کر انسان میں صفاتِ ایزدی منعکس ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں مسلمانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو اور چونکہ اسلامی تصوف نام ہے

اس پروگرام کا جب ہر گامزن ہو کر انسان میں یہ شان بالفعل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل اقبال نہ شاعر ہیں نہ فلسفی نہ متکلم بلکہ تصوف کے علمبردار ہیں۔ چونکہ ذیل کی رباعی میں انہوں نے اپنی اس بنیادی حیثیت کو خود واضح کر دیا ہے۔

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکانِ امت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

مطلب ان کا یہ ہے کہ میں نے اپنی تصانیف میں شاعری نہیں کی ہے بلکہ مسلمانوں کو عشقِ رسول کا پیغام دیا ہے۔ اور یہ حدیثِ عشق میری فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ جو کچھ میں نے بزرگانِ دین (پاکانِ امت) سے سنا ہے اسی کو شعر کے دلکش لباس میں (با شوخیٔ رندانہ) ان کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

بالفاظِ دگر جو کچھ انہوں نے کشف المحجوب، عوارف المعارف، فتوح الغیب، مرصاد العباد، قوت القلوب، لطائف اشرفی، لوائح جامی، کشکول فوائد الفواد اور سب سے بڑھ کر مثنوی میں پڑھا اسی کو اپنے الفاظ میں نظم کر دیا ہے۔

اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ ایسا کرنے سے یہ شرح اپنی حدود سے متجاوز ہو جائیگی تو میں اقبال کی ہر تعلیم کا ماخذ اور منبع مذکورہ بالا کتابوں سے نکال کر دکھا دیتا۔ اسی لئے میں صرف ایک مثال دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اقبال نے جاوید نامہ میں لکھا ہے :۔

کم خورد کم خواب وکم گفتا رباش
گرد خود گردندہ چوں پرکار باش

یہ شعر سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے۔

سخن در تزکیۂ افتاد، بر لفظ مبارک راند کہ کمال (تزکیہ) از چہار چیز پیدا می شود اعنی قِلّۃ الکلام و قلّۃ الصحبۃ مع الانام و قلۃ المنام۔

واضح ہو کہ اقبال نے صاحب فقر کو مختلف خطابات سے یاد کیا ہے۔ مثلاً مرد حق، مرد مومن، قلندر، فقیر، درویش خدا مست صاحب دل، اور مرد حر۔ اس فصل میں انہوں نے مرد حر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور مردِ حُر سے ان کی مراد وہ شخص ہے جس نے غیر اللہ کے طلسم سے آزادی حاصل کرلی ہو۔ اور میں بیان کر چکا ہوں کہ غیر اللہ کی غلامی سے وہی شخص رہائی حاصل کر سکتا ہے جو کلمہ طیبہ

لا الٰہ الا اللہ

کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو گیا ہو۔ اس کا حقیقی مفہوم یہ ہے۔

(۱) اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی الٰہ نہیں ہے

(۲) الٰہ کہتے ہیں اسے جو واجب الوجود ہو یعنی از خود موجود ہو۔

(۳) یعنی اللہ کے سوا ساری کائنات میں کوئی ہستی از خود موجود نہیں ہے۔

(۴) یعنی کسی کا وجود ذاتی، اصلی اور حقیقی نہیں ہے۔

(۵) یعنی اللہ کے سوا سب کا وجود مستعار، ظلی اور مجازی ہے۔

(۶) یعنی جس طرح کوئی شخص ذات و صفات میں اللہ کا شریک نہیں ہے اسی طرح کوئی شخص وجود میں بھی اس کا شریک نہیں ہے۔

(۷) یعنی لا الہ الا اللہ کے مفہوم کی رو سے جس طرح شریک فی الذات محال ہے اسی طرح شریک فی الوجود بھی محال ہے۔

(۸) یعنی اگر کسی کو شریک فی الوجود سمجھا جائے تو وہ اللہ یا وہ خدا واجب الوجود یعنی از خود موجود ثابت ہو جائیں گے۔

(۹) اور لا الہ الا اللہ کا مفہوم صاف لفظوں میں دوسری کسی ہستی کو واجب الوجود یعنی از خود موجود تسلیم کرنے سے مانع ہے۔

(۱۰) اس لئے کوئی ہستی ذات کے علاوہ وجود میں بھی اللہ کی شریک نہیں ہو سکتی یہی لا الہ الا اللہ کا حقیقی مفہوم ہے جسے شیخ ابرار مجدد الف ثانی نے لا موجود الا اللہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اب پڑھو اقبال کے اس شعر کو

تا نہ رمز لا الہ آید بدست
بندہ غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی جب تک انسان لا الہ الا اللہ کے رمز (حقیقی مفہوم) سے آگاہ نہ ہو اس وقت تک وہ غیر اللہ کی قید سے نہیں نکل سکتا بالفاظِ دگر جب تک ایک شخص پر یہ حقیقت منکشف نہ ہو کہ اللہ کے سوا اس ساری کائنات میں کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ اس وقت تک وہ غیر اللہ کے طلسم سے رہائی نہیں پا سکتا۔

واضح ہو کہ جس بات کو میں نے کلمہ طیبہ سے ثابت کیا ہے۔ موجودہ سائنس سے بھی اسی بات کا ثبوت مل رہا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ مادہ کیا ہے۔؟

اس کے جواب میں سائنسدانوں نے مادہ کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ مادہ مرکب ہے ذرّات (MOLECULES) سے اور یہ مرکب ہیں ATOMS یعنی سالمات سے۔

جب سالمہ کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان سے شعاعیں نکلتی ہیں جن کو برق پارے ELECTRONS کہتے ہیں۔ یہ برق پارے مادی نہیں ہیں۔

ان پر از روئے ماہیت مادہ یا جسم SUBSTANCE کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ برق پارہ دراصل بجلی کا چارج ہے اس سے ثابت ہوا کہ مادہ دراصل کوئی مادی شی نہیں ہے۔

لیکن ہمارا سوال بدستور قائم ہے۔ یعنی یہ کہ برق پارہ یا برق کیا ہے ؟ سائنسداں اس کے جواب میں کہتا ہے کہ من نمی دانم۔ یعنی برق کی ماہیت سے آگاہ نہیں ہوں[1]

ہم اس سے کہتے ہیں کہ کچھ تو بتاؤ۔ تو وہ کہتا ہے کہ میرا قیاس یہ ہے کہ برق کی اصل توانائی ENERGY ہے۔

یعنی جسے ہم مادہ کہتے ہیں وہ دراصل توانائی ہے جو ایک غیر مادّی شی ہے۔ یعنی سائنس نے مادہ کے مستقل وجود کو باطل کر دیا۔

برٹرینڈ رسل (عصر حاضر کے مشہور فلسفی اور سائنسداں) کا قیاس

---

[1] ہر ایک بات پہ کہنا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بڑا ہی عالم تھا

یہ ہے کہ کائنات کی حقیقت یا تو برق پارے ہیں یا سالمات فعل یا ایتھر۔ اور یہ تینوں غیر مادی اشیاء ہیں۔

کوانٹم نظریہ کی رو سے مادہ اور توانائی ایک ہی شی کے دو مختلف نام ہیں۔

فی الجملہ مادہ تو باطل ہو گیا۔ اس کی جگہ توانائی، اصل کائنات قرار پائی۔ اب سوال یہ ہے کہ توانائی کیا ہے؟ اور ہم اس لفظ سے کیا سمجھتے ہیں۔؟

ہر عقلمند آدمی اس سوال کا یہی جواب دیگا کہ توانائی کسی توانا ہستی کی صفت ہے۔ یعنی کوئی توانا (قادر مطلق) ہستی اپنی توانائی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ کائنات اس توانا ہستی کی توانائی کی مظہر یا جلوہ گاہ ہے۔ توانائی کو عرف عام میں صفت کہتے ہیں یعنی اس کائنات کی حقیقت اس ہستی کی صفات کی تجلیات ہیں اور جو لوگ آشنائے راز ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ تجلیات پیہم رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اور اسی رونمائی کا دوسرا نام یہ کائنات ہے۔

جو بات سائنسدانوں پر آج بیسویں صدی میں منکشف ہوئی ہے شیخ اکبر نے اسی حقیقت کو ساتویں صدی ہجری میں واضح کر دیا تھا کہ حقائق ممکنات در اصل اسماء و صفات کی تجلیات ہیں۔

شیخ اکبر کی تقلید میں اقبال نے بھی اسی صداقت کا اعلان کیا ہے۔ اندازِ بیان مختلف ہے۔ مگر مفہوم ایک ہی ہے۔

اقبال کا مسلک یہ ہے کہ مادہ اور روح میں اصلیت کے اعتبار

سے کوئی فرق نہیں ہے جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ صرف کیفیت کا ہے یہ کائنات سالمات مادی کی غیر شعوری حرکت سے لیکر فکر انسانی کی با شعور حرکت تک کچھ نہیں ہے۔ مگر انا ئے کبیر (حق تعالیٰ) کا جلوۂ ذات ہے اور اسی صداقت کو صوفیائے کرام

لا موجود الا اللہ

سے تعبیر کرتے ہیں۔

باز آمدم بر سرِ مطلب :۔

جب مسلمان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات میں کوئی ہستی از خود موجود نہیں ہے۔ تمام انسان اپنے وجود، اپنی ہستی اپنی ذات اپنی صفات اور اپنی زندگی کے تسلسل کے لئے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو وہ سب انسانوں سے قطع نظر کر لیتا ہے۔

بقول اقبال جب وہ ضمیرِ کائنات (کائنات کی حقیقت) سے آگاہ ہو جاتا ہے تو خود اسی کے ضمیر کی گہرائیوں سے یہ صدا بلند ہوتی ہے [۱]

لا موجود الا اللہ

اس مقام پر پہنچ کر یہ صداقت اسی کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے کہ جب ہر شخص اپنے وجود اپنی ذات اور اپنی صفات (مثلاً قدرت، علم، ارادہ) کے لئے محتاج ہے تو پھر کسی میں کیا طاقت ہے کہ مجھے کچھ دے سکے یا کسی قسم کا نفع نقصان پہونچا سکے۔ [۲]

---

[۱] از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست
تیغ لا موجود الا اللہ اوست

[۲] ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ ۵ (۸ — ۴۰)
جو اللہ چاہتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک اللہ

جہاں یہ حقیقت مومن پر منکشف ہوئی اسی وقت وہ غیر اللہ کے طلسم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یعنی مردِ حُر بن جاتا ہے۔

ایک ضروری بات کی وضاحت اور کردوں تو اس تمہید کو ختم کر دوں وہ یہ ہے کہ اقبال نے مردِ حُر کی جس قدر صفات بیان کی ہیں وہ دنیائے اسلام میں نہ تو کسی منطقی میں پائی جاتی ہیں نہ متکلم میں نہ فلسفی میں، نہ مورخ میں نہ ادیب میں نہ فقیہہ نکتہ دان میں نہ واعظِ رنگین بیان میں نہ خطیب میں نہ مدرس میں ــــ!

اگر پائی جاتی ہیں تو ان بزرگوں میں جن کے نام سے اس زمانے کے مدعیانِ اصلاح چیں بجبیں ہو جاتے ہیں جن کے تذکرے سے ان حضرات کا لٹریچر بالکل خالی ہے۔ یعنی خواجگانِ چشت یا خواجگانِ نقشبندیہ یا بزرگانِ سلسلہ قادریہ یا سہروردیہ مثلاً حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیریؒ یا قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ یا سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا یا شیخ الشیوخ عالم حضرت بابا فرید گنج شکر اجودھنیؒ یا شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (کثّر اللہ تعالیٰ امثالہم۔

اس بات سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اقبال نے ہمیں حکماء، فلاسفہ، متکلمین اور واعظین کی پیروی کے بجائے انہی بزرگوں (مردانِ حُر) کی اتباع کا مشورہ دیا ہے۔ چنانچہ اس فصل

---

بقیہ حاشیہ ص ۴۳۴ :۔ کسی کو قوت عطا کرے کسی کو قوت نصیب ہی نہیں ہو سکتی (کیونکہ کوئی شخص از خود تو موجود ہی نہیں ہے۔)

کی شرح میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو جائیگی۔ اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

پہلی صفت:-

مردِ حُر باطل کے مقابلہ میں محکم ہوتا ہے۔ یعنی اس کے پائے ثبات کو کسی حالت میں بھی لغزش نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کے پیشِ نظر رہتا ہے

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ٥ (۲۰-۶۷)

ہم نے موسیٰ سے کہا مت ڈر۔ بیشک تو ہی (ان باطل پرستوں پر) غالب آئیگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مردِ حُر میں انبیا کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم (جو نعمتِ فقر سے محروم ہیں) میدانِ جنگ میں مضطرب (سر بجیب) ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ ثابت قدم (سر بکف) رہتا ہے۔

دوسری صفت:-

مردِ حُر چونکہ کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللّٰہ کے مفہوم سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس لیئے وہ کسی بادشاہ کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ (یعنی اس میں شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے) بلکہ بادشاہ اپنی حاجتیں لیکر اس کے آستانے پر حاضر ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت میاں میر رح کبھی شاہجہاں کے دربار میں نہیں گئے۔ ہاں شاہجہاں ان کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔

تیسری صفت:- وہ باطل کے مقابلہ میں ایسی ثابت قدمی

دکھاتا ہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ ہوتے ہیں ان میں بھی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

چوتھی صفت:-

جب اسے راہِ خدا میں شہادت نصیب ہوتی ہے تو مرنے کے بعد اسے وہ زندگی حاصل ہو جاتی ہے جو دنیاوی زندگی سے پائندہ تر ہوتی ہے۔

یہ مضمون قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:-

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۵ (۲-۱۵۴)

اور جو لوگ راہِ خدا میں مارے جائیں ان کو مُردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ لیکن تم نہیں سمجھتے (کہ راہِ خدا میں شہید ہو کر انسان حقیقی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔)

مردِ حُر جب میدانِ جنگ میں اللہ اکبر کہتا ہے تو اس کا یہ نعرہ حرف وصوت سے بالاتر ہوتا ہے۔ یعنی وہ محض زبان سے یہ لفظ نہیں کہتا بلکہ دل سے کہتا ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ جو شخص (راہِ خدا میں مشکلات (سنگِ راہ) کو آسان (زجاج) سمجھتا ہے وہ درویش، بادشاہوں سے اپنی عظمت کا اعتراف کرا لیتا ہے۔

اے مخاطب! اسی کی تلقین (صہبا) کی بدولت تیرے دل میں ہمت (گرمی) پیدا ہو سکتی ہے۔ اور تیری زندگی (جوئے تو) اسی کی شخصیت (دریائے او) کی تاثیر سے پایۂ تکمیل کو پہونچ

سکتی ہے۔

پانچویں صفت :-

اگرچہ وہ بے سروسامان ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سلاطین عالم اس کی ہیبت سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک مثال درج کرتا ہوں :-

سلطان محمود بیگڑا والیٔ گجرات اس شان و شوکت کا بادشاہ تھا کہ پچپن ۵۵ سال تک حکومت کی۔ مگر کسی معرکہ میں شکست نہیں کھائی جوناگڑھ اور پاوا گڑھ کے ناقابلِ تسخیر قلعے فتح کیے۔ اس کی سلطنت مغربی ساحل سے لیکر وسطِ ہند تک اور اجمیر سے لیکر خاندیش تک وسیع تھی۔ سارے ہندوستان میں کوئی بادشاہ اس کا مدِ مقابل نہ تھا ـــ لیکن جب وہ حضرت شاہ عالمؒ (نبیرہ مخدوم) جہانیاں سید جلال الدین بخاری کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو ان کی ہیبت سے وہ لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

چھٹی صفت :-

ہم لوگ دین کے اسرار و رموز صرف کتابوں میں پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن وہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم صرف کتابوں میں پڑھ کر یا دوسروں سے سنکر یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ خدا ہے اور وہ اپنے بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مگر وہ دراصل خدا سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ چونکہ اسے خدا سے براہِ راست تعلق پیدا ہو جاتا ہے اس لئے۔ مجھ

او درونِ خانہ، ما بیرونِ در

ظاہر ہے کہ گھر کا حال اسی کو معلوم ہوتا ہے جو گھر کے اندر جاسکے جو شخص دروازے کے باہر بیٹھا ہو اسے اندر کا حال کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے خدا کی ہستی پر کامل یقین ہوتا ہے۔

اس کے بعد اقبال عام مسلمانوں کا اس کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں کہ ہم تو کافروں سے دوستی کرتے ہیں اور ان کو خوش کرنے کے لئے اپنا ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔ لیکن وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق ہوتا ہے۔ یعنی کفر اور کفار دونوں سے بیزار بلکہ برسرِ پیکار رہتا ہے۔

ہم بادشاہوں کی غلامی کرتے ہیں اور دولتِ ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ مگر وہ مستِ الست ہوتا ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں غرق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دھواں (جسم) ہماری آگ (روح) سے زیادہ منور اور روشن ہوتا ہے۔

ہم کبھی نصاریٰ سے طالبِ امداد ہوتے ہیں۔ اور کبھی بت پرستوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتا۔

مختصر یہ ہے کہ ہم سب انگریزوں کے غلام ہیں۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ اور چونکہ وہ حقیقی معنی میں مومن ہوتا ہے اس لئے۔

ع اونہ گنجد در جہانِ رنگ و بو

یعنی وہ دنیا میں کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ کسی انسان کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بالفاظِ دگر وہ ساری دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ہم جب تک زندہ رہتے ہیں روزی کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں اور اسی حالت میں ہزاروں حسرتیں دل میں لئے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی نظر میں موت زندگی کے خاتمہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مقامات حیات میں سے ایک مقام یا منزل ہے۔ چونکہ ہم دنیا کے بندے ہیں۔ اس لئے ہمارے حق میں موت انتہائی تلخ (ناگوار) ہوتی ہے۔ مگر وہ موت کو خود لبیک کہتا ہے اس کے لئے موت نہایت خوشگوار ہوتی ہے۔

اللہ کے بندے ہماری صحبت سے متنفر ہوتے ہیں بلکہ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا پرست (دگل) بھی حق پرست (صاحب) دل ہو جاتا ہے۔

ہماری زندگی محض قیاسات (ظن و تخمین) پر موقوف ہوتی ہے یعنی ہم صرف منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں۔ مگر وہ باتیں کرنے کے بجائے عمل کرتا ہے۔

ہماری زندگی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں بسر ہوتی ہے۔ مگر وہ اپنی زندگی باطل کا مقابلہ کرنے میں بسر کرتا ہے۔

ہم ضعیف (پرکاہ) اور ناتواں ہیں مگر وہ اپنی ضرب سے بڑے بڑے پہاڑوں سے پانی کی نہریں جاری کر دیتا ہے۔

اسی مصرع میں تلمیح ہے حضرت موسیٰ کی اس ضرب کی طرف جسکی بدولت پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تھے۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط (۲ – ۶)

(ہم نے موسےٰ سے کہا اپنا عصا پتھر پر مارو) پس پھوٹ پڑے اس سے بارہ چشمے ۱۲

موازنہ کے بعد اب اقبال ہم سے یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم دنیا میں سر بلند ہونا چاہتے ہو تو سگانِ دنیا کی صحبت ترک کر کے مردانِ حُر کی صحبت اختیار کرو۔

یہ نصیحت انہوں نے اس لئے کی ہے کہ انسان میں ایمان و یقین کا رنگ کتابوں، لیکچروں اور خطبوں سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ دنیائے اسلام میں جس قدر مردانِ حُر گزرے ہیں سب نے مردانِ حُر کی صحبت اٹھائی تھی۔ محض کتابوں سے کوئی شخص مردِ حُر نہیں بن سکتا۔

فی الجملہ اقبال مسلمان سے خطاب کرتے ہیں:۔

(۱) اے مسلمان! اگر تو دین اور دنیا میں سر بلندی اور عزت کا طالب ہے تو سگانِ دنیا کی صحبت سے دور بھاگ۔ جس طرح تیر کمان سے بھاگتا ہے۔ اور کسی مردِ حُر سے پیمانِ محبت استوار کرلے۔

ع خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

عجیب و غریب مصرع ہے کہتے ہیں کہ تو اس کی خاطر اپنا گھر ویران کر دے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تیرا گھر آباد ہو جائیگا۔ اس مصرع کی دلکشی اس کے اسلوب بیان میں مضمر ہے جسے عرف عام میں متناقضہ (PARADOX) کہتے ہیں۔ یعنی شاعر اپنی بات کو اس انداز سے کہتا ہے جو بظاہر مہمل یا خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے

مطلب اس مصرع بلیغ کا یہ ہے کہ اے مخاطب! تو اپنی زندگی کو

اسی کے قدموں پر نثار کردے۔ اپنی مرضی کو اسی کی مرضی کے تابع کردے۔ شاعرانہ انداز میں یوں سمجھ لو کہ اپنے آپ کو اسی کی محبت میں برباد کردے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تجھے ابدی نیند حاصل ہو جائیگی۔

اگر مثال درکار ہو تو صدیق اکبرؓ کا نمونہ تیرے لئے کافی ہے انہوں نے حضور کے ارشاد پر اپنا سارا اثاث البیت حضور کے قدموں پر نثار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا گھر ہمیشہ کے لئے آباد ہو گیا۔ آج ان کا گھر ہر مومن کے دل میں بنا ہوا ہے اور قیامت تک اسی طرح بنا رہے گا۔

(۲) اے مسلمان! تو شوخیِ تقدیر (جورِ فلک) کا شکوہ مت کر۔ کسی اللہ والے (زندہ مرد) کی صحبت اختیار کرلے۔ تاکہ تجھے بھی زندگی نصیب ہو جائے۔

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

(۳) مطلب یہ ہے کہ انسان خواہ ساری عمر کتابیں پڑھتا رہے مگر اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ انسان صرف مردانِ حُر کی صحبت میں بیٹھ کر انسان بنتا ہے۔ یعنی صرف اسی کی صحبت کی تاثیر سے اس پر اپنی حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں تو خدا کا نائب یا خلیفہ ہوں۔ مجھ میں اسی کی صفات کا عکس جلوہ گر ہے۔ میں تو اشرف المخلوقات ہوں۔[۱]

---

[۱]: جو لوگ بزرگانِ دین کی صحبت سے محروم رہے ہیں وہ ساری عمر اپنی حقیقت

(باقی صفحہ ۴۴۳ پر)

واضح ہو کہ اقبال نے یہ شعر مرشد رومیؒ اور دیگر بزرگانِ دین (پاکانِ امت) کی تعلیمات سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ تمام اولیائے امت نے صحبتِ مرشد کی ضرورت اور اہمیت واضح کی ہے۔ کیونکہ کتابوں سے دماغ تو منور ہو سکتا ہے مگر دل کا چراغ صرف اللہ والوں کی صحبت سے جل سکتا ہے۔

جلا دیتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اُن کی
الٰہی! کیا چھپا رہتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
(اقبالؔ)

ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کو اعلیٰ سے اعلیٰ ولی پر جو فضیلت حاصل ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ شرفِ صحبت ہی تو ہے۔ مہاجرین اور انصارؓ (صحابہؓ کرام) کے مجد و شرف کا باعث کیا ہے؟ محض یہ امر کہ انہوں نے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی تھی۔

یہ سچ ہے کہ فاروقِ اعظمؓ نے نہ مراقبے کئے نہ مجاہدے۔ نہ ہر روز قرآن ختم کیا نہ ہر رات ایک ہزار نوافل پڑھے۔ نہ ایک لاکھ

---

(بقیہ حاشیہ صہ۴۴) سے بیگانہ رہتے ہیں۔ وہ قرآن اور حدیث میں بے شک یہ پڑھتے ہیں کہ آدم خلیفۃ اللہ ہے۔ مگر اس کا مفہوم ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہوتی جس سے اہلِ دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ حضرت اللہ کے خلیفہ ہیں یا ان کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق ہے جس طرح ایک عامی دنیا طلبی میں گرفتار رہتا ہے اسی طرح یہ علماء بھی دنیا کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ ۱۲

مرتبہ ذکر خفی کیا اور نہ دو لاکھ بار درود پڑھا۔ وغیر ذالک۔ لیکن آنجناب کا مرتبہ اور مقام تمام اولیائے امت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے اس کی وجہ محض یہی تو ہے کہ آنجناب نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر سے فیض حاصل کیا تھا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی
(اقبالؔ)

ہم بخوفِ طوالت صرف مثنوی سے چند اشعار لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں :-

یک زمانے صحبتِ با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ صخرہ و مرمر بوی
چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی
(دفتر اول)

اے مخاطب! مردِ حُر معرفتِ الٰہی کا دریا ہے۔ پس اگر تو معرفت (پانی) کا طالب ہے۔ تو بڑنالہ (علمائے ظاہری) کے بجائے دریا (اولیاء) سے پانی (معرفت) حاصل کر۔

مردِ حُر کی صفت یہ ہے کہ بزم (روزِ صلح) میں وہ اپنی پاکیزہ اور معارف سے لبریز گفتگو کی بدولت تیرے دل کو اس قدر شگفتہ کر دے۔ جس طرح بادِ بہار چمن کو شگفتہ کر دیتی ہے۔

اور رزم (روزِ کین) میں وہ اپنی تلوار کی مدد سے اپنی شہادت

کا سامان مہیّا کرتا ہے۔ اور وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کہ وہ اپنی تقدیر سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مومن کی تقدیر ہی یہ ہے کہ وہ اپنی جان راہِ خدا میں قربان کر کے ابدی زندگی حاصل کرے۔

آخری تین اشعار میں اقبال نے مکرر صحبتِ مرشد اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ کہتے ہیں:-

اے مخاطب! میں تیرے قربان جاؤں (سرت می گردم) تو ہم طالبانِ دنیا سے اس طرح دور بھاگ جس طرح کڑی کمان سے تیر، اور اس (مردِ حر) کا دامن مضبوطی سے تھام لے بلکہ نہایت درجہ عقیدت کے ساتھ تھام! کیوں؟ اس لئے کہ:-

می نہ روید تخمِ دل از آب و گل

بے نگاہ از خداوندانِ دل

جب تک صاحبانِ دل کی نگاہ تجھ پر نہیں پڑے گی تیرا دل زندہ نہیں ہو سکتا۔ یہ شعر مثنوی کے ان اشعار سے ماخوذ ہے:-

آنکہ او ہر کور را روشن کند

آنکہ او ہر خار را گلشن کند

دامنِ او گیر زوتر بے گماں

تا رہی از فتنۂ آخر زماں

آخری شعر میں اقبال نے اس مبحث کی روح کھینچ کر رکھ دی ہے کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو نے کسی اللہ والے (مردِ حرؒ) کی صحبت نہ اُٹھائی اور یونہی پہلے کسی ہفتہ وار اخبار، بعد ازاں کسی ماہوار رسالہ کی ایڈیٹری کرتے کرتے کسی اسلامی جماعت کا امیر بن گیا۔ اور خود کسی

کے ہاتھ پر بیعت کئے بغیر دوسروں سے بیعت لینے لگا۔ تو یاد رکھ اس دنیا میں تیری قیمت اتنی بھی نہ ہوگی جتنی گھاس کے ایک تنکے کی ہوتی ہے۔

اقبال کا یہ شعر کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے دیکھ لیجئے۔

حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیریؒ۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر اجودھنی، حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی دہلوی، حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز والی گلبرگہ (دکن) حضرت مخدوم علی احمد صابر کلیریؒ اور حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی نے اپنے آپ کو کسی کے دامن سے وابستہ کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی ان بزرگوں کا نام کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں محبت اور عقیدت کے جذبات موجزن کر دیتا ہے۔ اور آج بھی ان کا آستانہ مرجعِ خلائق بنا ہوا ہے۔

اسی کے برعکس جن لوگوں نے اپنے آپ کو کسی کے دامن سے وابستہ نہیں کیا اور محض اپنی تحریر اور تقریر کے بل بوتے پر مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے تحریکیں جاری کیں اور پوسٹر شائع کئے ان میں سے کوئی بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

خلاصہ کلام اینکہ انسانوں کے قلوب میں عزت و احترام کے جذبات صرف انہی مقدس حضرات کے لئے موجزن ہوتے ہیں جنہوں نے کسی مردِ حر کی صحبت میں بیٹھ کر پہلے اپنی اصلاح اور اپنا تزکیۂ نفس کیا ہو۔ اس کے بعد مسلمانوں کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا ہو۔ یہ وہ کلیہ ہے جس پر تیرہ سو سال سے کوئی استثناء

ظہور پذیر نہیں ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ چراغ تو چراغ ہی سے جلتا ہے۔ اور شمع کسی شمع ہی سے روشن ہو سکتی ہے۔

فافہم وتدبر

---

# فصل نہم

## در اسرارِ شریعت

نکتہ ہا از پیرِ رومؔ آموختم　　خویش را در حرفِ او واسوختم

"مال راگر بہرِ دیں باشی حمول (رومی) نِعمَ مَالٌ صَالِحٌ گوید رسولؐ"[1]

گر نداری اندریں حکمت نظر　　تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر

از تہی دستاں کشادِ اُمّتاں　　از چنیں منعم فسادِ اُمّتاں

جدّت اندر چشمِ او خوار است و بس　　کہنگی را او خریدار است و بس

در نگاہش ناصواب آمد صواب　　ترسد از ہنگامہ ہائے انقلاب

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد　　آبروئے دخترِ مزدور برد

---

[1] نعم مال صالح، حدیث نبویؐ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مال دینی امور پر خرچ کرنے کے لئے جمع کیا جائے تو وہ مالِ صالح ہے۔

در حضورش بندہ می نالد چو نے　　بر لبِ او نالہ ہائے پے بہ پے
نے بجامش بادہ ونے در سبوست　　کاخ ہا تعمیر کرد و خود بگوست

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست
در چنیں عصرے خدا اندیش زیست

تا ندانی نکتۂ اکلِ حلال　　بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست　　چشمِ او ینظر بنور اللہ[۱] نیست
او نداند از حلال و از حرام　　حکمتش خام است و کارش ناتمام
اُمتے بر اُمتے دیگر چرد　　دانہ ایں می کارد و آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است　　از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است　　پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک[۲] ایں فکرِ چالاکِ یہود　　نورِ حق از سینۂ آدم ربود

---

[۱] ینظر بنور اللہ: تلمیح ہے حدیث نبوی کی طرف جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔
[۲] بنوک: بنک کی جمع، عربوں نے اس انگریزی لفظ کو جذب کر لیا ہے۔

تا نہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

آدمی اندر جہانِ خیر و شر | کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوبِ کار چیست | جادۂ ہموار و ناہموار چیست
شرع بر خیزد ز اعماقِ حیات[1] | روشن از نورش ظلامِ کائنات
گر جہاں داند حرامش را حرام | تا قیامت پختہ ماند ایں نظام
نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر | با نگاہے دیگرے او را نگر
حکمتش از عدل است و تسلیم و رضا ست | بیخِ او اندر ضمیرِ مصطفےٰ است
از فراق است آرزو ہا سینہ تاب | تو نمانی چوں شود او بے حجاب
از جدائی گرچہ جاں آید بلب | وصلِ او کم جو رضائے او طلب
مصطفےٰ داد از رضائے او خبر | نیست در احکامِ دیں چیزے دگر
تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریا ست | فقر و شاہی از مقاماتِ رضا ست
حکمِ سلطاں گیرد از حکمتش مثال | رزمِ میداں نیست رزمِ قیل و قال

---

[1] جمع عمیق، گہرائی۔

ناتوانی گردن از حکمش مپیچ　　تا نہ پیچد گردن از حکمِ تو ہیچ

از شریعت احسنُ التقویم شو[1]

وارثِ ایمانِ ابراھیم شو

پس طریقت چیست اے والا صفات　　شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں　　جز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں

گر نہ بینی دین تو مجبوری است　　ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار　　برنمی آید ز جبر و اختیار

تو یکے در فطرتِ خود غوطہ زن　　مردِ حق شو برظن و تخمیں متن

تا بہ بینی زشت و خوب کار چیست　　اندریں نُہ پردہ اسرار چیست

ہر کہ از سِرّ نبی گیرد نصیب　　ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم　　تا کجا در حجرہ می باشی مقیم

در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن　　نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

---

[1] تلمیح ہے آیہ قرآنی کی طرف، جس کا مطلب یہ ہے کہ وجود انسانی کی ساخت نہایت احسن طریق پر ہوئی ہے۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس　　نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

مکتب و مُلّا سخن با ساختند　　مومناں این نکتہ را نشناختند

زندہ قومے بود از تاویل مُرد　　آتشِ او در ضمیرِ او فسُرد

صوفیانِ باصفا را دیدہ ام　　شیخِ مکتب را نکو سنجیدہ ام

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید　　آنکہ در قرآں بغیر از خود ندید

ہر یکے دانائے قرآن و خبر　　در شریعت کم سواد و کم نظر

عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس　　منبرِ شاں منبرِ کاک[1] است و بس

زیں کلیماں نیست امیدِ کشود　　آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود؟

کارِ اقوام و ملل ناید درست

از عمل بتما کہ حق در دستِ تست

---

[1] منبرِ کاک : کاک ایک قسم کی چھوٹی روٹی ہوتی ہے۔ منبرِ کاک اس چوبی منبر کو کہتے ہیں جس پر نان بائی روٹی رکھ کر بیچتا ہے۔

# تمہید

یہ فصل اس کتاب کی جان ہے اس لئے بہت غور سے مطالعہ کے لائق ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شریعت (دین) طریقت (تصوف) اور حکمت (فلسفہ) تینوں کا امتزاج پایا جاتا ہے. اس فصل کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لئے ہر بند کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے.

پہلا بند:-

چونکہ معیشت کا بنیادی مسئلہ دولت کا حصول اور حصول کی غایت ہے. اس لئے سب سے پہلے اقبالؔ نے اسی نکتہ کو واضح کیا ہے کہ اسلام میں کسب دولت مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود بالعرض ہے۔

جو شخص اس نکتہ کو مدِّ نظر نہیں رکھتا یعنی جو شخص دولت کو مقصود بالذات سمجھتا ہے وہ دولت کا غلام یعنی سرمایہ دار ہے اور اس کا وجود قوم کے حق میں سراسر موجب فساد ہے۔

ان حقائق کی تصریح کے بعد اقبال نے سرمایہ دار کی مذموم ذہنیت واضح کی ہے۔ اور آخر میں بتایا ہے کہ وہی منعم لائقِ تحسین ہے جو درویش صفت ہو۔

## دوسرا بند :-

دوسرے بند میں انہوں نے اکلِ حلال کی قدر و قیمت واضح کی ہے اور ہمیں متنبہ کیا ہے کہ جو قوم ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرتی ہے اس کی زندگی اس کے حق میں وبالِ جان بن جاتی ہے۔ یعنی وہ اطمینانِ قلب سے محروم ہو جاتی ہے۔

اپنے دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے یورپین اقوام کی مثال دی ہے۔ اور بتایا ہے کہ چونکہ ان کا زاویۂ نگاہ ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ہے (تہذیبِ مغرب مادیت پر مبنی ہے) اس لئے ان کی تہذیب دراصل آدم دری ہے۔

آخر میں ہمیں تلقین کی ہے کہ اس ملحدانہ نظام کو تہ و بالا کر دیں کیونکہ جب تک ایسا نہ ہوگا۔ دنیا میں دانش و تہذیب و دین کا قیام ناممکن ہے۔

## تیسرا بند :-

یہ بند اس فصل کی جان ہے (جس طرح یہ فصل اس کتاب کی جان ہے) اس بند میں اقبال نے پہلے یہ بتایا ہے کہ شریعت (دین) ہی وہ شمع ہے۔ جس کی روشنی میں انسان خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے نفع اور نقصان سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ شریعت کا منبع کہاں ہے؟ یہ بحث حکمتِ قرآنی کے ایک غامض ترین پہلو پر مشتمل ہے۔ اور ہماری انتہائی توجہ کی مستحق ہے۔ چنانچہ میں اسے آئندہ اوراق میں وضاحت کے ساتھ لکھوں گا۔ تاکہ فکرِ اقبال کی عظمت ناظرین کے دلوں میں بخوبی

جاگزیں ہو سکے اور انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ میں کیوں اس کتاب کو اقبال کی تصانیف میں "دل" کا درجہ دیتا ہوں۔

### چوتھا بند :-

اس بند میں اقبال نے پہلے یہ بتایا ہے کہ طریقت کیا ہے اور شریعت سے اس کا رابطہ کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے فلسفۂ مذہب کے بعض حقائق واضح کئے ہیں۔ اور جبر و اختیار کی گتھی کو بڑی دلکشی کے ساتھ سلجھایا ہے۔ یہ بحث بھی بہت غور طلب ہے۔

اس کے بعد انہوں نے ہمیں تلقین کی ہے کہ ہم پوری قوت کے ساتھ دنیا میں شریعتِ اسلامیہ کی تبلیغ کریں۔ کیونکہ اسی شریعت کی بدولت دنیا میں وہ معاشی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اس وقت دنیا میں بہت سے معاشی نظام مروج ہیں۔ مگر ہر نظام میں انسان دوسروں کا محتاج ہے۔ یہ خصوصیت صرف اسلامی نظامِ معیشت ہی کو حاصل ہے کہ اس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس نظام کو دنیا میں قائم کریں۔ تاکہ ایک طرف دنیا میں امن و امان قائم ہو جائے۔ دوسری طرف اسلام کی فضیلت تمام ادیان پر واضح ہو جائے۔

آخر میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے۔ اور ہمیں یہ مشورہ دیا ہے کہ :-

ع ~ از عمل بنما کہ حق در دست تست

چونکہ اس فصل کا مرکزی تصور یہ ہے کہ اسلام معاشی نظام دنیا کے تمام معاشی نظاموں پر تفوق رکھتا ہے۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس فصل کی شرح سے پہلے اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات اور اس کی برتری کے پہلوؤں کو واضح کر دوں تاکہ ناظرین کی نگاہ میں اقبال کا دعویٰ ثابت ہو سکے۔

---

# اسلامی نظامِ معیشت

## تمہید

واضح ہو کہ دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے۔ جس نے عقائد اور عبادات کے علاوہ انسانوں کو ایک مکمل معاشی نظام بھی عطا کیا ہے۔ اور چونکہ اس معاشی نظام کو نافذ کرنے کے لئے قوت (سیاسی اقتدار) شرطِ اولین ہے۔ اس لئے اسلام اپنے پیروؤں کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ وہ دنیا میں اس معاشی نظام کو نافذ کر سکیں۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ

ع کس نباشد در جہاں محتاج کس

اسلام نے عقائد اور عبادات (مذہب) کے علاوہ انسانوں کو معاشی نظام کیوں عطا کیا؟ اس لئے کہ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ

۱:۔ انسان ماسویٰ اللہ (دوسرے انسانوں) کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔

۲:۔ لیکن اگر رزق (معیشت) کے سرچشمے انسانوں کے قبضہ میں ہوں تو انسان دوسروں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔

(ج) اس لئے اسلام نے حکم دیا کہ ان سرچشموں کو انسانوں کے قبضہ سے نکال کر ملّت (خلیفہ) کے قبضہ میں دے دیا جائے۔ یعنی اس طرح ملوکیت کا خاتمہ کر دیا۔

(د) مگر ان سرچشموں کو انسانوں کے قبضہ سے نکالنے کے لئے قوت (سیاسی اقتدار) شرطِ اولیں ہے۔ اس لئے اسلام نے مسلمانوں کو تمکّن فی الارض حاصل کرنے کا حکم دیا۔ کما قال اللہ:-

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ (۲۲-۴۱)

اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کی سچائی کی حمایت کریگا۔ ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں کہ وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے۔ (یہ مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا (تمکین فی الارض عطا کر دی) یعنی ان کا حکم چلنے لگا۔ تو نماز (کا نظم) قائم کریں گے زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دینگے لوگوں کو برائیوں سے روکیں گے۔

اس آیت نے واضح کر دیا کہ قرآن کے نزدیک مسلمانوں کے اقتدار و حکومت کا اصلی مقصد کیا تھا؟ فرمایا اگر ان مظلوم مسلمانوں کے قدم جم گئے تو کیا کریں گے؟ یعنی تمکّن فی الارض کو کن کن مقاصد کے لئے کام میں لائیں گے؟ فرمایا کہ یہ لوگ نماز کا نظام قائم کریں گے۔ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ لوگوں کو نیکی کا حکم دینگے۔ برائیوں (زنا، لواطت، شراب، قمار، غبن، خیانت، اکتناز، احتکار، رشوت، بلیک مارکیٹ اور

دغا فریب سے روکیں گے۔ یعنی مسلمانوں کے اقتدار (حکومت) کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ظلم اور بدعملی کی جگہ عدل اور راستی کی مملکت قائم ہو جائے۔

(ترجمہ و حواشی مندرجہ ترجمان القرآن از جناب مولانا ابوالکلام آزاد جلد دوم ص ۵۱۲)

چونکہ معاشی نظام کا قیام سیاسی اقتدار پر موقوف ہے اس لئے اسلام بیک وقت ایک اخلاقی نصب العین یا دین بھی ہے اور نظام الدولت یا سیاست بھی ہے۔ اور یہ دونوں شانیں (ASPECTS) اس طرح آپس میں مربوط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا[1]

اخلاقی نصب العین سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ خدائے واحد کی صفات کا رنگ اپنے اندر پیدا کرو

رنگ او برکن مثال او شوی
درجہاں نقشِ جمالِ او شوی

اور اربابِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ یہ نصب العین اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب دنیا میں ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں کوئی

---

[1] چونکہ اسلام دین اور سیاست کی ناقابلِ تقسیم وحدت کا نام ہے۔ اسی لئے مرشد رومیؒ نے اقبال کو یہ حکم دیا ہے۔

متنی دین و سیاست باز گوئے
اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوئے

دولت اور زمین پر مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہو سکتے ۔ وہ اپنی دولت اور زمین پر قابض و متصرف تو ہو سکتا ہے۔ مگر ان کا مالک نہیں ہو سکتا۔ زر اور زمین (بلکہ ساری کائنات) کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان یعنی مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس ملک کا امین ہے۔ اس لئے اس کا قبضہ اور تصرف دونوں شریعت کے حدود کے اندر رہ کر ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی مرضی کو دخل دیگا تو امانت میں خیانت کے جرم کا مرتکب ہوگا۔ اور خلافت اس سے باز پرس کریگی۔ چنانچہ اقبال صاف لفظوں میں کہتے ہیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین
اس سے بڑھ کر ہوگا کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

(ارمغانِ حجاز)

جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اس کی تائید میں اقبال کو پیش کرتا ہوں:۔

واضح ہو کہ اسلام میں وہ حقیقت ایک ہی ہے جسے ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ حقیقت مملکت (STATE) نظر آتی ہے ۔ یعنی مذہب اور سیاست ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ مذہب اور سیاست ایک ہی شی کے دو رُخ ہیں سچ تو یہ ہے کہ اسلام ایک واحد اور ناقابلِ تجزیہ حقیقت ہے جو تمہارے زاویہ نگاہ کے بدلنے سے کبھی مذہب نظر آتی ہے۔ کبھی مملکت۔ یہ نکتہ بہت دقیق اور دور رس ہے۔ اسلام کی رو سے مملکت انسانی تنظیم کے ذریعہ سے زندگی کے روحانی پہلو کے تحقیق کی کوشش کا دوسرا

شخص کسی دوسرے کا غلام نہ ہو۔ کیونکہ غلام کا کوئی اخلاقی نصب العین نہیں ہو سکتا۔

ع جب حبّ کا غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

سیاست سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام ایسا نظام حکومت قائم کرتا ہے۔ جس میں کوئی انسان دوسرے انسانوں پر حکومت نہیں کر سکتا۔ تمام انسان صرف اللہ تعالیٰ کے محکوم ہیں۔ اور خلیفہ یا امیر کا فرض یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کا قانون نافذ کرے۔ خود بھی اس کی اطاعت کرے اور قوم سے بھی اس کی اطاعت کروائے۔ تاکہ وہ اخلاقی نصب العین حاصل ہو سکے اور سب جانتے ہیں کہ نصب العین ہی مقصودِ حیات ہوا کرتا ہے بالفاظِ دگر انسان اپنے اندر خدائی صفات صرف اس وقت پیدا کر سکتا ہے جب دنیا میں ایسا سیاسی نظام قائم ہو۔ جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا مطیع نہ ہو۔ سب یکساں طور پر اللہ کے مطیع ہوں۔

جب یہ سیاسی نظام قائم ہو جائیگا۔ تو وہ معاشی نظام نافذ ہو سکے گا جس کی رو سے خلافت ہر شخص کی معاشی ضروریات کی ذمہ دار ہوگی۔ اور چونکہ رزق کے سرچشمے افراد کے بجائے خلافت کے قبضہ میں ہوں گے اس لئے کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے دوسرے کا محتاج نہ ہوگا۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

رزق کے سرچشمے یوں تو بہت سے ہیں۔ مگر وہ سب زر اور زمین کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ اسی لئے شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو

نام ہے۔

(تشکیل جدید مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۳۴ء ص ۱۴۶)

اقبال نے اس نکتہ دقیق کو صفحہ ۱۲۰ پر اس انداز سے بیان کیا ہے۔
ثقافتِ اسلامیہ نے اصولِ توحید کو وحدتِ عالم کے لئے سنگِ بنیاد قرار دیا۔ اور اسلام ایک نظام دولت یا نظام عمرانی (POLITY) کی حیثیت سے کچھ نہیں ہے۔ مگر اسی اصولِ توحید کو بنی آدم کی عقلی اور جذباتی زندگی میں ایک عنصر فعال بنا دینے کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے اسلام انسان کو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی وفاداری (اطاعت) کا مرکز اللہ کو بناؤ نہ کہ ملوکیت کو" یعنی بادشاہوں کے بجائے اللہ اور صرف اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔

اور چونکہ اللہ ہی زندگی کی آخری روحانی بنیاد ہے اس لئے اللہ سے وفاداری (اس کی اطاعت) در اصل انسان کی خود اپنی ہی مثالی فطرت سے وفاداری بن جاتی ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت عملی طور پر خود اپنی ہی فطرت کے تقاضوں کی تسکین کا دوسرا نام ہے۔

میں اس جگہ ان اقتباسات کی شرح تو سپردِ قلم نہیں کر سکتا لیکن اپنے موضوع کو واضح کرنے کے لئے حسبِ ذیل استنباط ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

---

لہ یہ دعویٰ قرآنِ کریم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:۔
وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (۵۳ ـ ۴۲)
اور تحقیق ہر شی کی انتہا (آخرکار) تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

اقبال کی رائے میں عقیدہ توحید الٰہی، وحدت عالم کے لئے
بمنزلہ سنگ بنیاد ہے۔ یعنی قرآن حکیم یہ اعلان فرماتا ہے کہ ساری
کائنات میں اللہ تبارک و تعالےٰ کے سوا اور کوئی ہستی اس لائق نہیں
ہے کہ اس کی اطاعت (عبادت) کی جائے یا اسے حاجت روا یا مشکل کشا
یا دستگیر یا کارساز یا معطی یا مانع یا حاکم یا قاہر یا فرماں روا تسلیم
کیا جائے۔ اس کے سوا کسی انسان میں یہ طاقت نہیں کہ کسی انسان
کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ یا کسی کو کچھ دے سکے یا کسی سے کچھ لے سکے۔

لیکن یہ سوال ہے کہ یہ عقیدہ انسانوں کی عقلی اور جذباتی زندگی
میں ایک زندہ حقیقت یا ایک فعال عنصر کیسے بنے؟ اقبال کہتے ہیں
اور بالکل صحیح کہتے ہیں۔ (اور اسی لئے میں ان کو عصر حاضر میں روح اسلام

---

ؔ اسی لئے صوفیائے کرام نے لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے۔

(ا) لا معبود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

(ب) لا مطلوب و لا مقصود الا اللہ اللہ کے سوا کوئی مطلوب اور مقصود نہیں ہے۔

(ج) لا فاعل فی الحقیقۃ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا درحقیقت کوئی فاعل نہیں ہے۔

(د) لا موثر فی الوجود الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی شخص اشیائے کائنات میں تاثیر پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

(ہ) لا موجود فی الحقیقۃ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا درحقیقت کوئی شی (انسان، حیوان، شجر حجر وغیرہ) از خود موجود نہیں ہے۔ ۱۲

کے سب سے بڑے رازدانوں ہیں۔ اور قرآنِ حکیم کے سب سے بڑے
مفسرین میں یقین کرتا ہوں) کہ جسے تم اسلام کا نظام الدولہ (ح۲۶ از ۱۸ ح)
کہتے ہو (نظام الدولہ سے اقبال کی مراد ہے اسلام کا سیاسی اور معاشی
نظام) وہ تمہارے اسی سوال کا تو لشافی جواب ہے۔ قرآن نے تمہیں
عقائد اور عبادات اور اخلاق کے علاوہ یہ سیاسی اور معاشی نظام
جو عطا کیا ہے اس کی غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تمہیں
اس طرح زندگی بسر کرنے کے مواقع بہم پہنچائے کہ تم کسی وقت
اور کسی صورت اور کسی حال میں بھی غیر اللہ کے محتاج یا دست نگر نہ
ہو سکو۔ اور ظاہر ہے کہ جب تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں غیر اللہ (بادشاہ
شہنشاہ، آمرِ مطلق، ڈکٹیٹر، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، نواب،
جاگیردار، زمیندار یا سرمایہ داروں کی غلامی سے آزاد ہو جاؤ گے تو خود
بخود حقیقی معنی میں موحد بن جاؤ گے۔ یعنی عقیدہ توحید تمہاری عملی
زندگی میں ایک حقیقتِ ثابتہ اور صداقت نیرہ بن جائے گا۔ یعنی تمہارے
قول اور فعل (عقیدہ اور عمل) میں مطابقتِ کُلّی پیدا ہو جائے گی۔
بالفاظِ دگر تم حقیقی معنی میں مسلمان بن جاؤ گے۔ اسی وقت تم محض
زبان سے لا الٰہ الا اللہ نہیں کہو گے بلکہ یہ صداقتِ عظمیٰ تمہارے
ہر عمل ہر فعل سے ظاہر ہو گی پھر تمہاری زندگی کے ہر شعبہ میں ہم آہنگی
پیدا ہو جائے گی۔ پھر تمہاری حالت یعنی تمہاری زندگی میں جو مضحکہ خیز
تضاد پایا جاتا ہے وہ بالکل مٹ جائیگا۔ پھر یہ نہ ہوگا کہ جب تم مسجد میں
جاؤ گے تو یہ اعلان کرو گے کہ اے اللہ ہم تیرے سوا کسی کی اطاعت
نہیں کرتے۔ اور جب مسجد کی چار دیواری سے باہر نکلو گے تو یہ اعلان

کرو گے کہ ہم حکومت کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔

فی الجملہ اسلامی نظام الدولہ (سیاسی اور معاشی نظام) کی غایت ہی یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام یا مطیع یا فرمانبردار یا دست نگر یا محتاج نہ ہو۔ اس نظام کو عرفِ عام میں شریعت کہتے ہیں۔ اور اقبال نے اس فصل میں اسی شریعت کے اسرار بیان کیے ہیں اور اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس

نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

مبادا کسی مسلمان کے دل میں یہ شبہ گزرے کہ اقبال نے اشتراکیت کے روزافزوں سیلاب کا سدِ باب کرنے کے لیے اسلام کی یہ نئی تعبیر پیش کر دی ہے۔ میں اس جگہ اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تعبیر اقبال کے دماغ کی اپج (اختراع) نہیں ہے۔ حضرت سعد ابنِ ابی وقاصؓ (سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب غلام اور صحابی) نے بھی اہلِ ایران کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہیں۔ یہی جواب دیا تھا:۔

ان اللہ ارسلنا لنخرج الناس من ظلمۃ الجہالۃ
وجور الملوک الی عدل الاسلام ونور الایمان الخ

اے باشندگانِ عراق، بے شک اللہ نے ہمیں تمہارے ملک میں بھیجا ہے، مگر اس لیے بھیجا ہے کہ ہم بنی آدم کو جہالت کی تاریکی اور بادشاہوں کے ظلم وستم (ملوکیت) کی لعنت سے نجات

دے کر اسلام کے عادلانہ (سیاسی اور معاشی) نظام۔ اور ایمان (توحید الٰہی) کی روشنی میں داخل کر دیا۔ الخ

(ا) اسلام ملوکیت کا دشمن ہے۔ کیوں؟

اس لئے کہ ملوکیت انسانوں کو انسانوں کا غلام بناتی ہے۔

(ب) اسلام کا مقصد کیا ہے؟

ایسا عادلانہ سیاسی اور معاشی نظام قائم کرنا جس کی بدولت انسان دوسرے انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرعِ مبیں ایں است و بس

---

# دوسری بحث

تمہید میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے عقائد اور عبادات کے علاوہ ایک عمل معاشی نظام بھی پیش کیا ہے۔ اب اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ دیگر مذاہب نے معاشی نظام کیوں پیش نہیں کیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جین دھرم، بودھ دھرم، ہندو دھرم اور مسیحیت دنیا کے ان چاروں بڑے مذاہب نے رہبانیت کی تعلیم دی ہے۔ یعنی نجات یا مکتی یا موکش کو ترکِ دنیا پر موقوف کیا ہے چونکہ رہبانیت اپنے بنیادی تصور کے اعتبار سے معیشت اور معاشرت

کی ضد ہے۔ اس لئے یہ مذاہب انسانوں کو کسی قسم کا معاشی نظام دے ہی نہیں سکتے تھے۔

دنیا میں بدھ دھرم رہبانیت (ترکِ دنیا) کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اور میری تحقیق کے مطابق جین دھرم، ہندو دھرم اور مسیحیت یہ تینوں مذاہب بدھ دھرم کی تعلیم رہبانیت سے متاثر ہوئے ہیں خصوصاً آخر الذکر مذہب کا راہبانہ نظام تو سراسر بودھ دھرم سے ماخوذ ہے۔ اور بدھ دھرم میں ایک بھکشو (راہب) کے لئے لازمی ہے کہ وہ ساری عمر تجرّد کی زندگی بسر کرے اور حسبِ ذیل اشیاء کے علاوہ کوئی چیز اپنے قبضہ میں نہ رکھے۔
خرقہ، درولیٹی، کمر بند، پیالہ، استرہ، سوئی تاگا اور چھلنی

جین دھرم بھی ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے جس کی طرف قبل ازیں اشارہ کر چکا ہوں کہ جینی سادھو تو خرقہ بھی نہیں پہن سکتا۔ اس کے لئے برہنگی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یہی حال ہندو دھرم کا ہے۔ وہ بھی ویراگ، تیاگ اور سنیاس (رہبانیت) کو طرزِ حیات قرار دیتا ہے رہی موجودہ مسیحیت تو اس کے متعلق اقبال کا یہ شعر کافی ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں، اس فقیری میں میری

ان مذاہب نے حصولِ دولت کو روحانی ترقی کے حق میں علم قاتل قرار دیا ہے۔ یعنی نفس کشی کو بہترین اخلاقی نیکی بتایا ہے۔

ان مذاہب کے مقابلہ میں مادیت اور اشتراکیت نے حصول دولت ہی کو مقصد حیات قرار دیا ہے چونکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی

نہیں ہے۔ اس لئے حتی المقدور دولت حاصل کرو۔ اور اسے ذاتی عیش و عشرت میں استعمال کرو۔ چونکہ تہذیبِ مغرب کی بنیاد ہی انکارِ خدا پر ہے۔ اس لئے مغربی اقوام نے بھی حصولِ دولت کو مقصدِ حیات بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور جائز و ناجائز، حرام و حلال کی تمیز بالکل اٹھا دی ہے۔ بلکہ ان کے ضابطۂ اخلاق کی رو سے ہر وہ فعل اچھا ہے جس کے ذریعہ سے دولت حاصل ہو سکے۔

ع آدمی درندہ بے دندان و چنگ

خلاصہ کلام اینکہ دنیا کے بعض مذاہب نے مال و دولت کو مذموم قرار دیا ہے اور اس لئے رہبانیت کی تعلیم دی۔ ان کے مقابلہ میں بعض مذاہب نے مال و دولت کو محمود قرار دیا۔ اور اس لئے تکاثر (حصولِ دولت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے) کی تعلیم دی۔

اسلام نے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ اسی طرح مال و دولت کے متعلق بھی ایسی تعلیم دی ہے جو افراط اور تفریط دونوں عیوب سے پاک ہے۔

قرآنِ حکیم نے ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید کی ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) کتاب اللہ نے مال کو فتنہ یعنی آزمائش قرار دیا ہے۔

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ط (۶۴-۱۵)

بیشک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد یہ دونوں تمہارے حق میں آزمائش ہیں یعنی اللہ تمہارا امتحان لیگا کہ تم کس کو زیادہ محبوب

رکھتے ہو؟ مال اور اولاد کو یا اللہ کو؟ اسی لئے اگلی آیت میں فرمایا۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ ط (۶۴-۱۷)

اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے (یعنی اپنی دولت اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حاجتمند بندوں میں تقسیم کرو گے) تو وہ اسے تمہارے لئے دگنا کر دے گا۔

۲۔ چونکہ دولت بروئے تعلیماتِ قرآنی آزمائش ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دولت کی محبت کو مذموم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۨ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخْلَدَہٗ ۝ (۱۰۴-۱ تا ۳)

تباہی ہے ہر اس غیبت کرنے والے (اور) طعنہ دینے والے کے لئے جو اپنی دولت کو جمع کرتا رہتا ہے۔ اور اسے گنتا رہتا ہے وہ (اپنی حماقت کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اس کی دولت اس کے ساتھ ہمیشہ رہیگی۔ یا اسے غیر فانی بنا دے گی۔

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ط (۹-۳۴)

اور جو لوگ سونا اور چاندی (اپنی دولت) جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (اے رسول! آپ) انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔

۳۔ لیکن قرآنِ حکیم ہمیں دولت حاصل کرنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ بلکہ اسے اللہ کا "فضل" قرار دیتا ہے۔ اسی سے ثابت ہوا کہ

دولت مذموم نہیں ہے دولت کی محبت مذموم ہے

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔

پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی معاش کی طلب میں مشغول ہو جاؤ۔ (۶۲-۱۱)

وَآخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِی الْأَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ
(۷۳-۲۰)

اور بعض خدا کے فضل (یعنی معاش) کی تلاش میں ملک میں سفر کر رہے ہوں گے۔

۴۔ قرآنِ حکیم رہبانیت (ترکِ دنیا) کو بھی مذموم قرار دیتا ہے۔

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ
(۵۷-۲۷)

اور جہاں تک رہبانیت (ترکِ لذّات) کا تعلق ہے تو اس نظام کو انہوں نے خود اپنے مذہب میں ایجاد کیا ہے۔ ہم نے (یہ طریقِ زندگی) ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ [۱]

---

[۱] قرآنِ حکیم کی اسی آیت نے مجھے اس بات کی تحقیق پر مائل کیا کہ جنابِ مسیح کے لائے ہوئے مذہب میں جو یقیناً اللہ کی طرف سے تھا یہ خلافِ عقل اور خلافِ فطرت طریقِ زندگی جسے عرفِ عام میں رہبانیت (MONASTICISM) کہتے ہیں کب، کیسے، کیونکر، کہاں سے اور کس کے ذریعہ سے داخل ہوا۔ تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عیسائیوں نے دیگر مذاہب کے علاوہ سب سے

باقی صفحہ ۴۷۱ پر

۵۔ قرآنِ حکیم ہمیں دنیاوی نعماء (مکان، باغ، فواکہ، لباس وغیرہ) سے متمتع ہونے کی بھی اجازت دیتا ہے۔

بودھ دھرم اور رومن کیتھولک فرقہ کے مذہبی طبقہ کے افراد نکاح نہیں کر سکتے۔ بھکشو اور بھکشن کی طرح پادری اور راہبات (NUNS) دونوں کیلئے تجرد شرط ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ تجرد کی زندگی سراسر خلاف فطرت ہے۔

لیکن اسلام نے نہ تو ان مذاہب کی طرح انسانی معاشرہ میں دین اور دنیا کی تفریق کی ہے اور نہ اپنے پیروؤں کو دیندار اور دنیادار دو غیر فطری طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ بلکہ ہر شخص کو شرعی حدود میں تمام جائز نعمتوں (زن، زر اور زمین) سے بہرہ اندوز ہونے کی اجازت دی ہے۔ جیسا کہ اسی آیت سے ثابت ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷ـــ۳۲)

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۰: ۔ زیادہ اثر بودھ دھرم سے قبول کیا اور رہبانیت کا طریقہ انہی سے اخذ کیا۔ چنانچہ رومن کیتھولک فرقہ کے پادریوں اور تارک الدنیا عورتوں (NUNS) اور بودھ دھرم کے راہبوں اور راہبات (بھکشو اور بھکشن) کی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر لوتھر نے پاپائیت کے ساتھ ساتھ رہبانیت کے خلاف بھی علم جہاد بلند کیا تھا یہی وجہ ہے کہ پراٹسٹنٹ فرقہ کے پادری شادی کر سکتے ہیں۔ اور اس فرقہ میں راہبات کا وجود بھی نہیں ہے۔۔ ۱۲

اے رسول آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ اللہ نے جو زینت کے ساز و سامان اور کھانے پینے کی ستھری چیزیں اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں ان کو کس نے حرام کیا ہے؟

۶۔ ان آیتوں کو مجموعی طور پر پیشِ نظر رکھنے سے دو باتیں روزِ روشن کی طرح ثابت ہو سکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دولت کمانے اور دنیاوی نعمتوں سے متمتع ہونے کی اجازت دی ہے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دولت اور دنیوی ساز و سامان سے محبت کرنے یا ان کو مقصودِ حیات بنانے سے روکا ہے بالفاظِ دیگر دولت کماؤ اور خوب کماؤ۔ مگر اس سے دل مت لگاؤ۔

۷۔ تو پھر کیا کرو؟ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ پہلے اسے اپنی ضروریات پر خرچ کرو۔ اور تمہاری جائز ضروریات سے جو باقی بچے۔ اسے اللہ کو قرض دے دو۔

واضح ہو کہ جس طرح اکتناز (دولت جمع کرنے) کی ممانعت کی ہے۔ اسی طرح اسراف اور تبذیر (بے دریغ خرچ کرنا یا فضول خرچی کرنا) بھی ممنوع ہے۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ط (۱۷-۲۷)

بلا شبہ فضول خرچی کرنے والے اشخاص شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اب جبکہ ایک مسلمان

(ا) نہ تو اکتناز کر سکتا ہے یعنی نہ اپنی دولت کو جمع کر سکتا ہے۔

(ب) نہ وہ تبذیر کر سکتا ہے یعنی نہ ناجائز طریق پر صرف کر سکتا ہے۔

(ج) تو صرف ایک ہی صورت رہ گئی۔ یعنی وہ اسے قربِ الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے اور اسی کو شریعت کی اصلاح میں "انفاق سبیل اللہ" کہتے ہیں۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ط (۹-۹۹)

اور دیہاتیوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ اسے خدا کی جناب میں تقرب اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں (اے رسول۔ آپ مسلمانوں کو آگاہ کر دیجئے کہ بیشک وہ خرچ کرنا ان کے لئے موجبِ قربتِ ایزدی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں انہیں دو عظیم الشان فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

(ا) انہیں قربِ خداوندی حاصل ہو جاتا ہے۔

(ب) سرکارِ ابد قرار صلعم ان کے لئے دعا فرماتے ہیں۔ یعنی حضور انور صلعم کی دعائیں ان کے شاملِ حال ہوتی ہیں۔ اب مسلمان خود غور کر لیں کہ دنیا اور آخرت میں ان دو نعمتوں سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے بار بار اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اے مسلمانو! چونکہ تم اپنی دولت کے مالک نہیں ہو بلکہ امین ہو۔ اس لئے اگر تم درحقیقت نیک بننا چاہتے ہو تو اپنی دولت جسے تم تقاضائے فطرت محبوب رکھتے ہو، ہماری راہ میں خرچ کرو۔

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ط (۳-۹۲)

اے مسلمانو! جب تم خدا کی راہ میں ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو گے جن کو تم عزیز رکھتے ہو۔ اس وقت تک تم نیکی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتے۔ یعنی تم پر ایک نکوکار انسان کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ کلام اینکہ دولت کے متعلق قرآنی تعلیم یہ ہے کہ

(۱) وہ بذاتِ خود کوئی بڑی یا ناپاک شی نہیں ہے۔

(۲) بلکہ وہ خدا کا فضل ہے۔ یعنی اس کی پیدا کردہ نعمتوں میں سے ہے۔

(۳) انسان پر دولت حاصل کرنا فرض ہے۔

(۴) لیکن وہ اسے مقصدِ حیات نہیں بنا سکتا۔

(۵) وہ اس کا امین ہے۔ اصلی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

(۶) مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی جائز ضرورتوں کے بعد جس قدر ممکن ہو سکے اپنی دولت اللہ کو قرض دے (یعنی اس کے محتاج بندوں میں تقسیم کر دے)۔

---

[۱] راہب دولت سے نفرت کرتا ہے اس لئے ترکِ دنیا کر دیتا ہے اور حصولِ دولت سے باز رہتا ہے اور کافر دولت سے محبت کرتا ہے۔ اسی لئے اسی پر قابض ہو جاتا ہے۔ لیکن مسلمان نفرت کبھی نہیں کرتا اس لئے دولت کماتا ہے۔ اور اس سے محبت بھی نہیں کرتا۔ اسی لئے اس پر قبضہ کبھی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی عطا کردہ دولت کا امین سمجھتا ہے، اور دنیا جانتی ہے کہ امین نہ امانت سے نفرت کرتا ہے، نہ محبت۔ فافھم تدبّر ۱۳۔

(۷) نہ فضول خرچی کرے اور نہ سینت سینت کر رکھے۔

(۸) لامحالہ ایک ہی صورت رہ گئی کہ قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے اپنی دولت کا بڑا حصہ اللہ کے محتاج بندوں میں تقسیم کردے۔

(۹) جب تک اللہ اور اس کے رسول کی محبت دل میں راسخ نہ ہو جائے دولت کو اپنے حق میں فتنہ (آزمائش) سمجھو۔

(۱۰) لیکن جب دولت کی محبت دل سے نکل جائے اور اس کی جگہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت دل میں راسخ ہو جائے تو پھر وہی دولت جو موجب فتنہ تھی۔ باعثِ برکت ہو جائے گی۔

نوٹ:۔ اگر مثال درکار ہو تو جامع آیات رحمان، کامل الحیاء والایمان سیدنا عثمان ابن عفان اور حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی اور ان کے فرزند شیخ صدر الدین عارف اور سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلوی کے سوانح حیات کا مطالعہ کافی ہوگا۔ ان حضرات کے تصرف میں ہر وقت لاکھوں روپے رہتے تھے۔ مگر انہیں ان زخارفِ دنیاوی سے لگاؤ یا تعلق نہ تھا۔

چنانچہ شیخ صدر الدین کو ترکہ میں سات لاکھ درہم نقد ملے مگر انہوں نے یہ ساری رقم ایک ہی دن میں فقراء و مساکین میں تقسیم کردی اور اپنے لئے ایک درم بھی نہ رکھا۔ کسی نے عرض کی کہ آپ کے والد بزرگوار (شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی) اپنے خزانے میں نقد و جنس جمع رکھتے تھے۔ اور اس کو تھوڑا تھوڑا صرف کرنا پسند کرتے تھے۔ آپ کا عمل بھی ان ہی کی روش کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ شیخ موصوف نے فرمایا حضرت بابا دنیا پر غالب تھے اس لئے اگر دولت ان کے پاس جمع ہو جاتی تو انکو علائق دنیا

کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ اور وہ دولت کو تھوڑا تھوڑا خرچ کرتے تھے۔ مگر مجھ میں یہ وصف نہیں ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہوا کہ مال و دولت کی وجہ سے کہیں دنیا کے فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤں اس لئے میں نے ساری دولت یک لخت علیحدہ کر دی۔"

(بزمِ صوفیہ مؤلفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم۔ اے ص۱۰)

---

# تیسری بحث

## تحصیلِ دولت

(جسے اصطلاح میں پیدائشِ دولت کہتے ہیں)

**تمہید:۔**

تحصیل یا پیدائشِ دولت کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اسلام کے چند بنیادی معاشی اصولوں کی توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۱) معاشی نقطۂ نظر سے اسلامی معاشرہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "لا رهبانية في الاسلام" یعنی اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔

(۲) قرآنِ حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ انسان فطری طور پر دولت اور نعمائے دنیوی کا دلدادہ ہے۔ اور ان کے حصول کا جذبہ ہر وقت اس کے اندر کارفرما ہے۔ اور جب خدا نے خود انسان کو پیدا کیا ہے اسی نے اس کے اندر حصولِ دولت کی آرزو بھی

پیدا کی ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط (۳-۱۴)

لوگوں کی بناوٹ (فطرت) اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ان کو دنیا کی مرغوب چیزوں یعنی عورتوں (بیویوں) بیٹوں، سونے اور چاندی کے ڈھیروں، عمدہ گھوڑوں اور مولیشیوں اور کھیتی کے ساتھ محبت (دلبستگی) بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

چونکہ ان چیزوں کے ساتھ دلبستگی فطری امر ہے۔ اس لئے خالقِ فطرت نے انسان کو ان کے حصول سے منع نہیں کیا۔ یعنی ترکِ دنیا کا حکم نہیں دیا۔ اگر وہ ایسا کرتا۔ تو پھر اسلام کو انسان کا فطری دین قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اسی لئے اللہ نے یہ فرمایا۔

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ٥

زمین (کائنات) میں جو کچھ ہے اسے اللہ نے تمہارے (ہی) لئے پیدا کیا ہے۔

مزید ارشاد فرمایا:۔

لَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸-۷۷)

اے انسان تو اس دنیا سے اپنا حصہ لینا فراموش مت کر

لیکن قرآنِ حکیم نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ دنیا اور نعمائے دنیوی کو مقصودِ حیات مت بناؤ۔ یعنی ان کے حصول میں اس درجہ منہمک مت ہو جاؤ کہ اللہ اور آخرت ہی سے غافل ہو جاؤ۔ آیت:

ذیل میں قرآن نے مسلمانوں کے لئے مسلک حق بیان کردیا ہے۔
رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ
(۲۴ — ۲۷)

اللہ کے ایسے بندے اس کے نام کی تمجید و تقدیس کرتے رہتے ہیں جنکو سوداگری یا خرید و فروخت (تجارت) اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔

۳۔ دین اور دنیا میں خوشگوار امتزاج قائم کرنے کے بعد اسلام نے اپنے معاشی نظام کو اخوت، مساوات، اور حریت کے اصولوں پر مبنی کیا ہے۔

(۱) اخوت سے مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹ — ۱۰)
بیشک تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام اس بنیادی تصور پر قائم ہے کہ ہر مسلمان کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اور جماعت میں جو لوگ محروم یا سائل ہیں ان کی مدد کرے۔

اس آیت کی تفسیر میں سرکار ابد قرار صلعم نے فرمایا

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے مثل اس عمارت کے ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصوں کو تقویت دیتا ہے۔ یہ فرما کر آپ نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر صحابہؓ کو دکھائیں اور فرمایا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اسی طرح تقویت دیتا ہے۔

پھر فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ

اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔
(صحیح بخاری)

(ب) مساوات کا مطلب یہ ہے کہ سب مسلمان آپس میں یکساں ہیں۔ کسی دولت مند کو کسی مفلس پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اس اصول کا اثر معاشی نظام پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ معیشت کے اسباب وذرائع سب مسلمانوں کو یکساں حاصل ہوں گے۔ کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائیگا۔ یعنی جب دولت یا سامانِ معیشت تقسیم ہوگی تو سب کو یکساں حصہ ملے گا۔

(ج) حریت کا مفہوم یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی شخص عوام کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ اور نہ امیر قوم سیفٹی ایکٹ کے ذریعہ سے عوام کی زبانوں پر قفل لگا سکتا ہے۔

اسلام دنیا میں ہر قسم کی حریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ وہ ہر قسم کی غلامی کو ــــ سیاسی ہو یا معاشی ذہنی یا معاشرتی مٹانا چاہتا ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں

(ارمغانِ حجاز)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک ایک انسان کو ہر قسم کی آزادی نصیب نہ ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم سرکارِ ابد قرار صلعم کی شان میں گوہر افشانی کرتا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔

اور یہ رسول لوگوں کی گردنوں سے اس بوجھ کو جو اُن پر تھا اور اُن بیڑیوں کو جن میں وہ گرفتار تھے۔ ان سے دور کرتا ہے۔ یعنی انسانوں کو ہر قسم کی حریت سے بہرہ ور کرتا ہے۔ (۷-۱۵۷)

ایک دفعہ ایک شخص نے فاروقِ اعظمؓ سے عمرو ابن عاص والئی مصر کے متشددانہ طرزِ عمل کی شکایت کی تو انہوں نے ان کو دار الخلافہ میں طلب فرمایا۔ اور ان سے دریافت کیا۔ اے عمرو! تم نے کب سے باشندگانِ مصر کو اپنا غلام بنا لیا۔ حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔؟

نوٹ:- انقلابِ فرانس کے بانی اور روسو نے جو بات اٹھارویں صدی میں اہلِ یورپ سے کہی۔ وہ فاروقِ اعظم نے ساتویں صدی ہی میں دنیا کو بتادی تھی۔ کہ کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہیں ہے۔ آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔

ان بنیادی اصولوں کی وضاحت کے بعد اب ہم پیدائش دولت کی ان صورتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔

(۱) اسلامی معاشی نظام نے جائز طریقوں سے دولت کمانے کی اجازت دی ہے مگر ایسی پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں جن کی بنا پر

(ا) انسان حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہو سکے۔

(ب) سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا نہ ہو سکے۔

(ج) معاشی جدوجہد سے دینداری اور پاکیزگی اخلاق پیدا ہو سکے۔ تاکہ تمام معاشی جدوجہد عبادت بن جائے اور اس طرح دین اور دنیا میں جو تفریق کلیسا نے پیدا کر دی ہے وہ مٹ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیدائش دولت اور حصولِ معاش کیلئے جدوجہد کیلئے جو نمونہ سرکارِ ابد قرار صلعم نے پیش کیا ہے اگر مسلمان اس پر عامل

ہوجائیں تو کوئی مسلمان کبھی بے روزگار نہیں رہ سکتا۔

قرآنِ حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ صرف مذہبی رسوم ادا کرنے سے کوئی شخص نیک نہیں بن سکتا۔ جب تک (نماز روزے) کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی محبّت میں اپنی دولت اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں، قیدیوں کو آزاد کرانے کے سلسلے میں تقسیم نہ کرے۔ (۲ - ۱۷۷)

بنظرِ اختصار میں پیدائش دولت کے مختلف ذرائع کی طرف صرف اشارات کردونگا جو حضرات تفصیل کے آرزومند ہوں وہ ڈاکٹر یوسف الدین صاحب حیدر آبادی کی گرانقدر تالیف "اسلام کے معاشی نظریئے" کا مطالعہ کرلیں جس سے میں نے بھی استفادہ کیا ہے۔

(۱) اسلام نے انسانوں کو حیوانات سے استفادہ کی اجازت دی ہے۔ مثلاً ماہی گیری، گلہ بانی، بھیڑ بکریوں کی پرورش، بھیڑوں سے اون حاصل کرنا، گھوڑوں کی تربیت، مویشیوں کی نسلی ترقی، مرغیاں پالنا، شہد کی مکھیاں پالنا کرم پروری وغیرہ۔

(۲) نباتات سے استفادہ، مثلاً جنگل کاٹنا، لکڑیاں جمع کرنا، باغبانی اور کھیتی باڑی وغیرہ۔

(۳) جمادات سے استفادہ مثلاً معدنیات (جواہرات) سمندر سے موتی نکالنا۔ زمین کھود کر مختلف اشیاء نکالنا۔

(۴) صنعت وحرفت، مثلاً جہاز بنانا۔ مختلف دھاتوں سے اشیاء بنانا پارچہ بافی، سنگ تراشی، عمارت سازی، زیور سازی، چرم سازی نعلین سازی دباغت، لعبت سازی (TOYS) فرنیچر سازی۔

(۵) تجارت۔ یہ پیدائش دولت کا (زراعت کے بعد) سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ حضور فرماتے ہیں تسعہ اعشار الرزق فی التجارۃ یعنی ۹/۱۰ رزق تجارت میں ہے۔ انفرادی کاروبار، مصاربت، شرکت اور اس کی مختلف صورتیں۔

لیکن حضور نے دیانت اور صداقت کو تجارت کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں دیندار تاجر قیامت کے دن انبیاء کے زمرہ میں ہوگا۔ آپ نے فرمایا گاہک کو دھوکہ مت دو۔ چنانچہ ترمذی میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر تم بکری فروخت کرو تو اسی کے تھنوں میں دودھ جمع مت کرو۔ کیونکہ خریدار دھوکہ میں مبتلا ہو جائیگا۔

ایک مرتبہ آپ بازار میں تشریف لئے جا رہے تھے غلہ کا انبار نظر آیا۔ آپ نے اپنا دست مبارک اس میں ڈالا آپ کی انگلیاں گیلی ہو گئیں۔ معاً آپ پر حقیقتِ حال منکشف ہو گئی اور آپ نے دوکاندار سے پوچھا۔

مَا هٰذَا؟ يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ۔ اے مالکِ غلہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا۔ یا رسول اللہ! اس اناج پر بارش ہو گئی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ اَفَلَا جَعَلْتَهٗ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰى يَرَاهُ النَّاسُ؟ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔

یعنی تو تم نے اس گیلے اناج کو اوپر کیوں نہ رکھا کہ خریدار لوگ اسے فوراً دیکھ لیتے۔ جو لوگوں کو دھوکہ دے وہ ہم سے نہیں ہے۔

چونکہ پیدائش دولت کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت ہے اس لئے میں نہایت اختصار کے ساتھ اسلام کے زرعی نظام کی خصوصیات ذیل میں بیان کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کے

معاشی نظام میں جاگیرداری اور زمینداری کی گنجائش کس حد تک ہے۔

# چوتھی بحث

## اسلام کا زرعی نظام

**تمہید:-**

اسلام کے زرعی نظام کی وضاحت سے پہلے ایک نکتہ مفیدہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اسلام کی روح جاگیرداری اور زمینداری کے موافق ہے یا مخالف ہے؟ اور اسلام جس قسم کا معاشرہ دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اس میں جاگیرداری اور زمینداری کے لئے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟

سب جانتے ہیں کہ اسلام نے سود اور ہر قسم کے سودی کاروبار کو ممنوع قرار دیا ہے اور یہ ممانعت اس شدت کے ساتھ کی ہے کہ سارے قرآن میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ط فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ط (۲-۲۷۹)

اے ایمان والو! اللہ کے احکام کی نافرمانی سے بچو اور دستبردار ہو جاؤ اس رقم سے جو سود کے سلسلہ میں قرضداروں پر باقی رہ گئی ہے

اگر تم واقعی مومن ہو۔ اگر ایسا نہ کرو تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اب میں ناظرین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس حکم کے علاوہ سارے قرآن میں کوئی اور حکم بھی ہے جس کی نافرمانی کرنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ کی دھمکی دی گئی ہو؟ اگر نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب وہ یہی دیں گے کہ سود کی وجہ سے۔

(۱) اسلام کا معاشی نظام باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ قوم کی دولت صرف اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے لیکن سود کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ دولت صرف دولتمندوں کے طبقہ میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ یعنی سود اسلام کی ضد ہے یا اس کی نفی ہے۔

(۲) اسلام کا اخلاقی نظام بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ ہر دولتمند مسلمان نادار اور مفلس مسلمانوں کے ساتھ محبت رحمدلی اور ہمدردی کا برتاؤ کرے۔ اپنی دولت اُن کو آسودہ کرنے کے لئے صرف کرے لیکن سود خور کی نگاہ میں محبت، رحمدلی اور ہمدردی سے بڑا جرم کوئی نہیں ہے۔ یعنی سود اخلاقِ حسنہ یا اسلام کی ضد ہے۔

(۳) سرمایہ داری کو فروغ ہوتا ہے۔ سود خوار دولت سے محبت کرنے لگتا ہے اور دن رات اس کو بڑھانے میں مشغول رہتا ہے۔ وہ ہر اس بات سے گریزاں رہتا ہے جس سے دولت میں کمی ہو سکتی ہے یعنی اکتناز (دولت جمع کرنا) اس کا مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔ اور

اکتناز اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ اسلام تو انفاق کا حکم دیتا ہے
اور اکتناز انفاق کی ضد ہے۔

(۴) ملک میں ایک طبقہ ایسے افراد کا پیدا ہو جاتا ہے جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کی محنت کا پھل کھاتا رہتا ہے سود خواروں کا طبقہ بلا مبالغہ غریبوں کا خون چوستا رہتا ہے اور خود تو دولتمند ہوتا جاتا ہے اور عوام مفلس ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ میں سخت ناہمواری اور شدید طبقاتی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔

فی الجملہ اگر یہ جوابات صحیح اور قابلِ تسلیم ہیں تو میں کہتا ہوں کہ جاگیرداری اور زمینداری کے نتائج بھی بعینہٖ یہی نکلتے ہیں۔

(۱) محنت تو کاشتکار کرتا ہے۔ لیکن اس کا پھل زمیندار کھاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نے دولت کے بل بوتے پر ہزاروں ایکڑ زمین خرید لی۔ اور اب بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے وہ اپنی دولت میں مزید اضافہ کرتا رہتا ہے۔

اسی لئے اقبال نے یہ لاکھ روپے کا نکتہ بیان کیا ہے۔

حکم حق ہے لیس الانسان الا ما سعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

(۲) زمینداری اور جاگیرداری سے سرمایہ داری پیدا ہوتی ہے اور سرمایہ داری سے زمینداری میں اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی سود سے سرمایہ سرمایہ سے زمینداری، زمینداری سے مزید سرمایہ، مزید سرمایہ سے سود کا کاروبار میں مزید ترقی، مزید سود سے سرمایہ داری میں مزید اضافہ وقس علیٰ ھذا۔

(۳) زمیندار بھی سرمایہ[1] دار اور سود خوار[2] کی طرح محبت اور رحمدلی، ہمدردی کے جذبات سے معریٰ ہوجاتا ہے۔ اور وہ بھی ۱ اور ۲ کی طرح عیش و عشرت میں غرق رہتا ہے اور کاشتکار کے ہاتھ سے روٹی ہی نہیں چھینتا بلکہ اس کی بیٹی سے اس کی آبرو بھی چھین لیتا ہے۔ کما قال اقبال:-

آبروئے دخترِ مزدور برد

(۴) زمینداری سے بھی اسلام کا اخلاقی اور معاشی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ زمیندار روزانہ کاشتکاروں کو دیکھتا ہے کہ نہ انہیں کھانے کو روٹی ملتی ہے نہ پہننے کو کپڑا نصیب ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان غریبوں کے لئے اس کے دل میں کسی قسم کی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

(۵) سود خور کی طرح زمیندار کے گھر میں بھی دولت کی ریل پیل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے شکاری کتوں اور شکاری پرندوں پر ہزاروں روپے ہر سال ضائع کر دیتا ہے۔ مگر غریبوں کے لئے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کر سکتا۔ اور اللہ کے نام پر دینا (انفاق فی سبیل اللہ) تو اس کے مذہب میں سب سے بڑا گناہ ہے۔

(۶) اگر دولت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اس لئے دولت کا کرایہ (سود) لینا حرام ہے۔ تو زمین کا حقیقی مالک بھی اللہ ہی ہے اس لئے زمین کا کرایہ لینا بھی حرام ہے۔

(۷) اگر سود اس لئے حرام ہے کہ اس کی وجہ سے دولت اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہوجاتی ہے تو زمینداری بھی حرام ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بھی زمین زمینداروں کے طبقہ میں محدود ہوجاتی ہے۔

(۸) اگر سود خوار اپنے طرز عمل سے اسلام کے معاشی نظام کو باطل کر دیتا ہے تو زمیندار اپنے طرز عمل سے اس نظام کو بدرجۂ اولیٰ باطل بلکہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ فافہم و تدبر۔

خلاصہ کلام اینکہ سود خوار اور زمیندار دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور دونوں یکساں طور پر اسلام کے معاشی نظام سے برسرپیکار ہیں۔ بلکہ میری دانست اور میرے مشاہدہ کی رو سے سود خوار کے مقابلہ میں زمیندار کہیں زیادہ بنی آدم پر ظلم و ستم روا رکھتا ہے۔ جسے شک ہو وہ پنجاب اور سندھ کے دیہات کا دورہ کر کے دیکھ لے۔

سود خور صرف دولت پر (جو در اصل اللہ کی ملک ہے) ناجائز قبضہ کرتا ہے۔ اور اس طرح عوام (مفلس، محتاج، معذور، محروم، سائل) کو جائز انتفاع سے محروم کر دیتا ہے۔ لیکن زمیندار تو دوگونہ مجرم ہے کیونکہ وہ اللہ کی دولت کے علاوہ اللہ کی زمین پر بھی قبضہ مخالفانہ کرتا ہے۔ اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی زمین سے بھی جائز طور پر انتفاع سے محروم کر دیتا ہے۔

لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو دین سود خوری کو ناجائز قرار دے رہا ہے۔ وہ زمینداری کو جائز قرار دے گا؟ جب سود خوری اور زمینداری دونوں یکساں طور پر اسلام کے اخلاقی اور معاشی نظام کی ضد ہیں۔ تو یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ اسلام ایک کو ممنوع اور دوسری کو مباح یا جائز قرار دے سکتا ہے۔ اگر سود سے دولت اغنیاء کے طبقہ میں محدود ہو جاتی ہے تو زمینداری سے بھی یہی خرابی رونما ہوتی ہے۔ اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن اس بات کو گوارہ

نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ دولت (جو در اصل اسی کی ملک ہے)
صرف اغنیا کے طبقہ میں محدود ہو کر رہ جائے۔

کما قال اللہ تعالیٰ

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (۵۹-۷)

(جو مال اللہ اپنے رسول کو لبستیوں کے لوگوں سے مفت میں
دلوا دے تو وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور آپ کے قرابتداروں
کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور بے توشہ مسافروں کا اور یہ حکم اس لئے
دیا گیا) تاکہ وہ مال صرف تمہارے دولتمندوں کے طبقہ ہی میں نہ گردش
کرتا رہے۔ ۱۲

اس نص صریح سے ثابت ہوا کہ ہر وہ ادارہ یا گروہ یا نظام
جس کی بنا پر مال و دولت صرف اغنیار کے طبقہ میں محدود ہو جائے اسلام
کے معاشی نظام سے متصادم ہونے کی بناء پر قابلِ مذمت اور لائقِ
نفرت ہے۔

چونکہ جاگیرداری اور زمینداری دونوں کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ
دولت صرف دولتمندوں ہی کے طبقہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اللہ
تعالیٰ کے محتاج اور مفلس بندے اس سے محروم رہتے ہیں۔

اس لئے جاگیرداری اور زمینداری دونوں اسلام کی روح
کے خلاف ہیں۔ اور اس کے پیش کردہ معاشی نظام کی ضد ہیں۔ یعنی
اسلام میں جاگیرداری اور زمینداری کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم ناظرین کو اسلام کے زرعی
نظام سے روشناس کراتے ہیں۔

# پہلی فصل

واضح ہو کہ دنیا میں جاگیرداری اور زمینداری کی بنیاد ملوکیت کی بدولت قائم ہوئی بادشاہوں نے عوام کی غلامی کو صفت دوام عطا کرنے کے لئے یہ اسکیم بنائی کہ

(۱) اپنے مصاحبوں اور ہواخواہوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں اور ان سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ "تاج" کے وفادار رہیں گے۔ اور اپنے ضمیر کے بجائے بادشاہ کے احکام کی اطاعت کریں گے۔ ہر حال میں اسی کے وفادار رہیں گے۔ یعنی جس کا کھائیں گے۔ اسی کا گن گائیں گے۔ اگر بادشاہ سے غداری کریں گے تو جاگیر منصب اور عہدہ ہر چیز ضبط ہو جائیگی۔ بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ؎

---

؎ ناظرین غور کریں کہ ملوکیت در اصل خدا سے بغاوت کا دوسرا نام ہے اسی لئے قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ "لا ملوکیت فی الاسلام" اور اسی لئے اقبال نے اسے "ابلیسی نظام" سے تعبیر کیا ہے۔ ملوکیت بلاشبہ خدائی حکومت کے مقابلہ میں ایک متوازی حکومت ہے۔ ہر بادشاہ اپنے طرز عمل سے خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یعنی جن باتوں کا مطالبہ خدا اپنے بندوں سے کرتا ہے۔ مثلاً (۱) میرے قانون کی اطاعت کرو۔ (۲) میرے وفادار رہو (۳) ہر حال میں میرے رسول کا ساتھ دو۔

(باقی صفحہ ۴۹۰ پر)

(ب) عوام چونکہ مذہبی پیشواؤں کے زیر اثر ہوتے ہیں لہٰذا ان کو ممنونِ احسان کرنے کے لئے بادشاہوں نے ان کو راج گرو یا شیخ الاسلام کا عہدہ عطا کیا۔ یعنی مسلمان بادشاہوں نے دین اسلام کو جو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ مذہب اور سیاست دو شعبوں میں تقسیم کر دیا۔ ملک میں شرعی قانون کے بجائے اپنا قانون نافذ کیا اور علماء کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ صرف پوجا پاٹ (نماز روزے کا نام ہے) اس لئے بادشاہ کے احکام کی اطاعت مذہب کے خلاف نہیں۔

جن علماء نے بادشاہوں کی اطاعت سے انکار کیا ان فرعونوں نے ان کو بلا تامل سیفٹی ایکٹ کے شکنجہ میں کس دیا۔ اور چونکہ ہر عالم دین امام

---

بقیہ حاشیہ صہ ۴۸۹ :- (۴) میرے احکام کی تعمیل اپنا فرضِ منصبی سمجھو (۵) ساری عمر میرا شکوا دا کرتے رہو۔ انہی سب باتوں کا مطالبہ بادشاہ اللہ کے بندوں سے کرتا ہے۔ اندریں حالات انسانوں کے لئے صرف ایک ہی راہِ عمل ہے یا وہ اللہ کے قانون کی اطاعت کریں یا بادشاہ کے قانون کی۔ لہٰذا ایک مسلمان ملوکیت کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہے۔

یہ حقیقت کہ ملوکیت اسلام کی ضد ہے اس واقعہ سے بھی ثابت ہو سکتی ہے کہ جب امرائے نے عبدالملک بن مروان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کی کہ حضور تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوں تو اس وقت وہ قرآن پڑھ رہا تھا۔ جب اس نے یہ مژدہ جانفزا سنا تو قرآن کو یہ کہہ کر جزدان میں بند کر دیا کہ ھٰذا فراق بینی وبینک۔ یعنی اے قرآن آج کے دن سے میرے اور تیرے درمیان ہمیشہ کے لئے جدائی ہو گئی۔

ابو حنیفہؒ امام ابن حنبلؒ امام ابن تیمیہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے علماء کی اکثریت نے جان کے خوف سے ان سلاطین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

جب ان سلاطین نے علماءِ سوء کے ذریعہ سے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر دیا۔ تو رفتہ رفتہ عوام اس حقیقت سے بیگانہ ہو گئے کہ اسلام ملوکیت کا دشمن ہے یعنی دیگر مذاہب کی طرح اسلام میں بھی ملوکیت کی لعنت داخل ہو گئی۔

قصہ مختصر یہ کہ بادشاہوں نے جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کی اور ان دونوں گروہوں نے ملوکیت کی حمایت کی اور عوام کو اس لعنت کا عادی اور غیر اللہ کی اطاعت کا خوگر بنا دیا۔

چونکہ جاگیردار بطورِ خود لاکھوں ایکڑ زمین کا انتظام نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اللہ کی اس زمین کو جو اس نے عوام کے فائدے کے لئے بنائی تھی۔ دولتمندوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جو دولت کے بل بوتے پر اللہ کی زمین کے مالک ہو گئے۔

چونکہ زمیندار بھی بطور خود ہزاروں بیگھے زمین میں کاشت نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کاشتکاروں کو بٹائی پر دے دیئے۔ اور ان غریبوں کا خون چوسنا شروع کر دیا۔

خلاصہ کلام ایں کہ سب سے پہلے

(۱) بادشاہوں نے اللہ کی زمین پر ناجائز طور سے قبضہ کیا اس کے بعد

(۲) انہوں نے اپنے مصاحبوں کو یا فوجی سرداروں کو جنہوں نے

ان کی مدد کی تھی۔ جاگیریں عطا کیں۔

(۳) انہوں نے اللہ کی زمین دولتمندوں کے ہاتھ فروخت کردی اور یہ دولتمند لوگ زمیندار بن گئے۔ ان تینوں گروہوں (بادشاہوں جاگیرداروں اور زمینداروں نے عوام کا خون چوسنا شروع کر دیا اب پڑھیے اقبال کے اس شعر کو

حاصل آئین و دستور ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

(جاوید نامہ)

تمام مفسرین، محدثین، فقہا اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ملوکیت حرام ہے اس لئے میں حیران ہوں کہ اگر شجرِ ملوکیت حرام ہے تو اس کے اثمار تلخ (جاگیرداری اور زمینداری) کس طرح اور کیونکر حلال ہو سکتے ہیں؟ اگر اسلام ملوکیت کا دشمن ہے۔ تو وہ جاگیرداری اور زمینداری کا حامی کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس آدمی کو عقلمند کہہ سکتا ہے جو سانپ تو مار ڈالے مگر اس کے بچوں کو زندہ رہنے دے۔ ؟

# دوسری فصل

ظہور اسلام سے پہلے ساری دنیا میں ملوکیت کا سکہ رواں تھا۔ اور ملوکیت کی بدولت اللہ کی زمین[1] جو ملوکیت سے قبل سب انسانوں میں مشترک تھی (جس طرح ہوا، پانی اور آگ) جاگیرداروں اور زمینداروں کے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اور یہ لوگ اللہ کے بیکس بندوں کا خون چوس رہے ہیں۔

یہ حالات تھے جب اسلام حریت، اخوت، مساوات، رحمت عدالت اور ایثار کا انقلاب آفریں پیغام لیکر وادی غیر ذی زرع سے ظاہر ہوا۔ اور اس نے ایسا عمرانی نظام پیش کیا جس کی رو سے نہ تو ملوکیت باقی رہ سکتی ہے نہ جاگیرداری اور زمینداری کی بقا کا کوئی امکان ہے یعنی کوئی انسان روٹی کے لئے دوسرے انسان کا دست نگر یا غلام نہیں بن سکتا۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس

واضح ہو کہ اسلام ایسا نظامِ حیات ہے جس کی بنیاد اللہ تعا

---

[1] وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (۵۵ – ۱۰)
اور زمین کو اللہ نے عوام کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔

کی حاکمیت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:۔

(۱) وللّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر

اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت (حاکمیت) صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور اللہ ہی ہر شی پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے (۳ - ۱۸۹)

(۲) کائنات کی ہر شی کا خالق (اس لئے مالک اور حاکم) اللہ ہی ہے۔ اس لئے مالکیت اور حاکمیت میں کوئی ہستی اس کی شریک نہیں ہو سکتی۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ (۲۵ - ۲)

اور حکومت میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ (کیونکہ ہو ہی نہیں سکتا)

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی الٰہ نہیں ہے۔ یعنی خالق یا مالک یا حاکم نہیں ہے۔

ع حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

(۳) انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ یعنی وہ ایسا نظامِ حیات قائم کرنے پر مامور ہے جس میں سب انسان اللہ تع کے قانون کی اطاعت کر سکیں اور کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہ ہو سکے۔ اور اللہ کی عطا کردہ نعماء سب کے لئے عام ہو سکیں۔ یعنی ہر شخص ان سے یکساں طور پر مستفید ہو سکے

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (۱۲ - ۴۰)

آگاہ ہو جاؤ کہ حکمرانی صرف اللہ کے لئے ہے کوئی انسان اللہ کے بندوں پر حکمراں نہیں ہو سکتا۔ بالفاظِ دگر کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنا غلام یا دست نگر نہیں بنا سکتا۔

(۴) اللہ تع نے زمین و آسمان کی ہر شی کو انسان کا خادم بنا دیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ٥

اور اللہ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ (۴۵ - ۱۳)

(۵) اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔ اور یہ ساری اشیائے کائنات (ما فی الارض جمیعا) "بطور امانت" اس کے سپرد کر دی ہیں۔

(۶) یعنی خلافت (حکومتِ الٰہیہ) دراصل امانت ہے اور خلیفہ امین ہے۔ بالفاظِ دگر زمین اور اس میں جو کچھ ہے۔ دراصل اللہ کی ملکیت ہے۔ مگر اللہ نے بمصلحتِ خاص انسان کو اپنی ملکیت کا امین بنا دیا ہے۔

(۷) خلافت کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اللہ کی اس عظیم الشان (امانت) (حکومتِ ارضی) کی نگرانی اور حفاظت کرے اور ایسا معاشی انظام قائم کرے جس کی بدولت ہر فرد اس امانت سے یکساں طور پر مستفید ہو سکے بالفاظ دگر خلیفہ اس امانت کو اللہ کے بندوں میں ایسے عادلانہ طریق پر تقسیم کرے کہ وہ اللہ کی صفت رزّاقیت کا مظہر اتم بن جائے۔

(۸) چونکہ خلافتِ الٰہیہ میں ہر شی کا حقیقی مالک اللہ ہے اس لئے مملکت کی ساری اشیاء افراد کو بطور امانت[۱] محض انتفاع کیلئے دی

---

[۱] قرآنِ حکیم نے آیتِ ذیل میں اسی امانت کی طرف اشارہ کیا ہے۔
اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ

جائیں گی۔ یعنی افراد اللہ کی زمین اور ما فیہا کے مالک نہیں ہوں گے۔ بلکہ امین ہوں گے۔

(۹) خلافتِ الٰہیہ میں ذرائع پیداوار (قطعات ارض یا جاگیریں) ذاتی اقتدار یا ذاتی سرمایہ یا ذاتی دولت میں اضافہ کے لئے کسی کو نہیں دیئے جا سکتے۔ کیونکہ اس طرح وہ شخص سرچشمۂ رزق (اللہ کی زمین) پر قابض ہو کر زیردستوں، کمزوروں مفلسوں۔ اور عوام کو جنکے پاس دولت نہیں ہے۔ اسبابِ معیشت سے محروم کر کے اپنی غلامی پر مجبور کر دے گا۔

(۱۰) خلافتِ الٰہیہ میں انفرادی یا اجتماعی ملکیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اصل چیز مقصدیت ہے۔ اگر کسی وقت یہ مقصد (اسبابِ معیشت سے تمام افراد کا یکساں طور پر انتفاع اور استفادہ) افراد میں تقسیم کرنے سے حاصل ہو تو ذرائع پیداوار کو فرداً فرداً تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور اگر یہ مقصد اجتماعی طور سے

---

بقیہ صفحہ ۴۹۵

یحملنہا و اشفقن منہا و حملہا الانسان۔ ط (۳۳-۷۲)

اور ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا (مگر) انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔ اور اس سے ڈر گئے۔ اور آدمی نے اس کو اٹھا لیا۔ یہاں امانت سے استعداد تکلیف با وامر و نواہی یا اتباع احکام الٰہی یا آسان لفظوں میں خلافت الٰہیہ کی ذمہ داری مراد ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تفسیر بیان القرآن حکیم الامت مولانا تھانوی جلد نہم صفحہ ۷)

کاشت کرانے سے حاصل ہو تو خلافت اس صورت کو بھی اختیار کر سکتی ہے۔

بدقسمتی سے ذرائع پیداوار کی تنظیم میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ ملکیت زمین کو دے دی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس کے پاس ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دولت کی فراوانی ہو گئی۔ دوسری طرف دوسرا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو دن رات محنت کے باوجود نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔

اسلام نے ملکیت کے تباہ کن اور فساد انگیز تصور کو خلافت کے تصور کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ قرآن نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ کھیتی باڑی ہی پر کیا موقوف ہے اور اسی کی کیا خصوصیت ہے۔ کائنات کی ہر شی اللہ کی ملک (ملکیت) ہے۔ ہر شی کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ اور اس نے تمام اشیاء انسان کو بحیثیت خلیفہ، بطور امانت برائے انتفاع۔ یعنی صرف استعمال کے لئے دی ہیں۔[1] اور ہر امین (مسلمان) کو ان اشیاء کے استعمال کا حق اسی وقت تک ہے۔ جب تک اس کے استعمال یا تصرف سے امن عامہ، رفاہِ عامہ اور مفادِ عامہ میں اختلال و انتشار کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر کوئی امین، اللہ کی امانت میں خیانت کرنے لگے۔ یا دوسروں کو حق انتفاع سے محروم کرنے لگے یا امانت کا ناجائز

---

[1] کیا خوب لکھا ہے اقبال نے

وہ خدایا انکتہ ازمن پذیر
رزق دگور اردسے بگیر اورا مگیر

استعمال کرنے لگے۔ تو خلافت کو حق حاصل ہے کہ اس خائن سے امانت واپس لے لے۔[1]

اگر ہم اس حق انتفاع کو اپنے دل کی تسکین کیلئے ملکیت سے تعبیر کر لیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے اس لفظ کے استعمال سے کوئی امین مالک نہیں بن سکتا۔

(۱۲) فی الجملہ خلافت الٰہی انسانوں کے لئے امانت کی بقا کی ضامن ہے۔ اور اس کی بنیاد عدل و انصاف، شفقت و رحمت، ہمدردی، ایثار اور خدمتِ خلق پر ہے۔ اور یہی حیات بخش اصول، تمام معاشی نظام خصوصاً زرعی نظام کے لئے بمنزلہ سنگِ بنیاد ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ بروئے قرآن

(ل) اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق ہے۔ اس لئے مالک ہے۔ اور چونکہ مالک ہے اس لئے رازق بھی ہے بالفاظِ دیگر وہ اپنی مخلوقات کے رزق اور ان کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔
وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (۱۱-۶)

---

[1] واضح ہو کہ قرآنِ حکیم کی رو سے صرف مال و دولت یا زمین ہی امانت نہیں ہے بلکہ خود انسان کا وجود بھی اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک امانت ہے۔ اب ناظرین خود غور کر لیں کہ جب انسان خود اپنے وجود ہی کا مالک نہیں ہے تو دوسری اشیا مثلاً زن، زر اور زمین کا مالک کس طرح ہو سکتا ہے؟ فافہم و تدبر

اور زمین میں کوئی چلنے والا (حیوان، انسان، طیور، وحوش و دیگر حشرات الارض) ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ لیکن اللہ تو خود رزق تقسیم نہیں کرتا بلکہ اس نے بمصلحت خاص انسان کو اپنا نائب مقرر کر کے حکم دیا کہ تم ہماری طرف سے ہماری زمین کے امین ہو۔ اور تمہارا فرض بحیثیت خلیفہ یہ ہے کہ تم سامان رزق کی تنظیم اس طرح کرو کہ ہماری تمام مخلوقات ہماری زمین بلکہ ہماری عطا کردہ تمام نعمآ سے یکساں طور پر منتفع ہو سکیں۔ ہماری نعمآ میں سب سے بڑی نعمت زمین ہے۔ اور ہم نے اسے سب کے لئے بنایا ہے ۱؎ تم ایسا نظام قائم کرو کہ کوئی شخص ہماری زمین پر ناجائز طور سے قابض ہو کر دوسروں کو انتفاع سے محروم نہ کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک شخص تو دو لاکھ ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھے۔ اور اسی کے بھائی بند نانِ شبینہ کے لئے بھی محتاج ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک شخص کے پاس پچاس کروڑ روپے ہوں۔ اور اسی کے رشتہ دار ضروریاتِ زندگی کے لئے بھی ترستے رہیں۔

مختصر یہ کہ رزق کے دو بڑے سرچشمے ہیں۔ مال و دولت اور زمین۔ تم ایسا نظامِ حکومت قائم کرو جس میں رزق کے ان سرچشموں پر چند افراد قابض نہ ہو جائیں (ایسے نظامِ حکومت کو شرعی اصطلاح میں خلافت کہتے ہیں)

---

۱؎ والارضَ وَضَعَهَا لِلأنامِ ط (۵۵-۱۰)
اور ہم نے زمین کو عامۃ الناس کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ ۱۲

ذیل میں اسلام کے زرعی نظام کا ایک مجمل خاکہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن حکیم نے تمام مفتوحہ اشیا کو اللہ کی ملک قرار دیا ہے۔
یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ط (۸-۱)
لوگ آپ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ مالِ غنیمت (زمین اور دولت) اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔

(۲) اس بناء پر مفتوحہ زمین، اللہ کی ملک قرار دی جاتی تھی نہ کسی فرد کی ملکیت نہ کسی جماعت کی بلکہ خلیفہ "امین" ہونے کی حیثیت سے اس کو افراد میں تقسیم کر دیتا تھا۔

(۳) خلافت راشدہ کے عہد میں حسب ذیل صورتیں مروج تھیں:-

(ا) بعض اوقات خلافت، مفادِ عامہ کے لئے افراد کو برائے کاشت زمین دیتی تھی۔

(ب) بعض اوقات خلافت قطعیہ دینے میں نفع خلق سمجھتی تھی۔

(ج) بعض حالتوں میں خلافت خود کاشت کراتی تھی اور پیداوار لوگوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔

(د) بعض اوقات خلافت خود کاشت کراتی تھی۔ اور پیداوار سے اخراجات کی رقم نکال کر بقیہ رقم صاحب زمین کے حوالے کر دیتی تھی۔

یعنی زمین جو در اصل اللہ کی ملکیت ہے خلافت کے قبضہ اور تصرف میں ہوتی تھی۔ اور خلیفہ جس بات میں عوام کا فائدہ دیکھتا تھا اس پر عمل کرتا تھا کیونکہ خلافت ہر شخص کی ضروریات پوری کرنے

کی ذمہ دار تھی۔

(۴) حضرت عمرؓ نے اس آیت کی روشنی میں عراق کی زمینوں کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیا تھا۔ کیونکہ تقسیم سے جاگیرداری نظام پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

وَمَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹-۱۰)

اور جو مال اللہ اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مفت میں دلوادے (لڑے بغیر) تو وہ حق ہے اللہ کا اور رسول کا اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور ناداروں کا اور مسافروں کا اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ جو لوگ تم میں مالدار ہیں یہ مال انہیں میں گردش نہ کرتا رہے (یعنی قوم کی دولت صرف چند سرمایہ داروں میں محدود ہو کر نہ رہ جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام نان شبینہ کو محتاج ہو جائیں گے)

(۵) تاریخ خلافت راشدہ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جائیگی کہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے خلفائے راشدین نے زمین کی تقسیم و تنظیم میں مفاد عامہ اور نفع خلق ہی کو اصل الاصول قرار دیا تھا۔

(۶) خیبر فتح ہونے کے بعد پوری زمین اللہ کی ملک قرار دی گئی تھی۔ اور خلافت نے حسب ذیل طریقہ پر اس کی تقسیم و تنظیم کی تھی۔

(۱) زمین کا کچھ حصہ مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔

(ب) بقیہ زمین اصلی باشندوں کے قبضہ میں رہنے دی گئی اور ان سے یہ معاملہ طے کیا گیا کہ نصف پیداوار خلافت کی ہوگی۔ نصف کاشتکاروں کی۔

نیز ان کو اس قانون سے مطلع کر دیا گیا تھا کہ اسلام کی رُو سے زمین در اصل اللہ کی ملک ہے۔ اس لئے اگر تم میں سے کسی فرد کی جانب سے کوئی بات مفاد عامہ کے خلاف سرزد ہوئی تو خلافت اس شخص کو زمین سے بے دخل کر دے گی۔

نوٹ:۔ اس تصریح سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ زمین درحقیقت اللہ کی ملکیت ہے۔ اللہ کا نائب، اللہ کے بندوں کے مفاد عمومی کو مدنظر رکھ کر اُسے افراد میں تقسیم کر دے گا اور اگر کسی شخص کا طرز عمل، مفاد عمومی کے خلاف ہوگا۔ تو وہ خلافت اپنی زمین اس شخص سے واپس لے لیگی۔

اقبال بھی یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کی کوشش کریں جس کی بدولت زمین اور دیگر ذرائع الرزق کی ایسی عادلانہ تقسیم و تنظیم ہو سکے گی کہ کوئی کسی کا محتاج نہ ہوگا کیونکہ اسلام کے معاشی نظام کی رو سے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی کہ ملک میں چند افراد تو کروڑ پتی بلکہ ارب پتی ہو جائیں اور بقیہ افراد اپنی ضروریاتِ زندگی بھی پوری نہ کر سکیں۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔

(ج) جب بنو نضیر کے اموال پر قبضہ ہو گیا۔ تو رسول اللہ صلعم نے مہاجرین اور انصار دونوں کو جمع کر کے انصار سے خطاب فرمایا

یا معشر الانصار! تم جانتے ہو کہ اس وقت مہاجرین کے پاس کچھ مال و دولت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر یہاں تمہارے پاس آئے ہیں۔ اسلئے دو صورتوں میں ایک صورت اختیار کر لو۔

(ا) یا تو اپنے ذاتی مال کو بنو نضیر کے اموال میں شامل کر لو اور پھر اس کو تم سب میں یکساں تقسیم کر دیا جائے۔

(ب) یا یہ کرو کہ بنو نضیر کے اموال کو مہاجرین میں تقسیم کر دیا جائے۔

انصار نے اس سوال کا وہ جواب دیا جس کا اس زمانہ کے مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی یہ کہ یا رسول اللہ! بنو نضیر کا مال صرف مہاجرین میں تقسیم کر دیجئے۔ اور ہمارے اموال میں سے بھی جس قدر آپ مناسب سمجھیں ہمارے ان بھائیوں کو دے دیجئے۔

ثابت یہ ہوا کہ عہدِ رسالت و خلافت میں تمام مسلمان زمین اور دولت میں برابر کے شریک تھے۔

(۸) آنحضرت صلعم کی دہ سالہ مدنی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آراضی کی تقسیم و تنظیم اس نہج پر فرمائی تھی جس سے تمام امت کو یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکے۔ آپ کے سامنے کسی خاص طبقہ کا مفاد نہیں تھا۔ بلکہ ساری قوم کا عمومی مفاد تھا۔ نیز آپ کی نظر میں ملکیت ارضی کی حیثیت حق استعمال یا حق انتفاع سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہ حق بھی اسی وقت تک قابلِ تسلیم تھا جب تک دوسروں کی حق تلفی نہ ہو۔

آپ نے ایسا معاشی نظام قائم فرمایا تھا جس میں نہ تو ملکیت کی آڑ میں جور و استبداد کی گنجائش تھی۔[1] اور نہ انسان کو جماعتی شکنجہ میں کس دینے اور اسے اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما سے محروم کر دینے کا امکان تھا۔[2] بلکہ ہر شخص کو اللہ کی زمین اور دولت سے یکساں طور پر مستفید ہونے کے ذرائع مہیا کر دیئے گئے تھے۔

آج دنیا ملکیت و عدم ملکیت کی بحث میں الجھی ہوئی ہے حالانکہ آج سے تیرہ صدی پہلے اسلام نے اس مسئلہ کو بہترین طریق پر حل کر دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(ا) ہر شی کا حقیقی مالک اللہ ہے۔

(ب) ذرائع پیداوار (زمین اور سونا چاندی) مفاد عامہ کے لئے ہیں۔ نہ کہ تنہا خوری کے لئے۔

(ج) انسان کی حیثیت مالک کی نہیں ہے بلکہ "امین" کی ہے اور اس حیثیت سے اس کو زمین سے انتفاع کا حق حاصل ہے۔

چنانچہ سرکار ابد قرار صلعم فرماتے ہیں:۔

إِنَّ الْأَرْضَ أَرْضُ اللّٰهِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللّٰهِ مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ (ابوداؤد شریف)

بیشک ساری زمین اللہ ہی کی ہے۔ اور سب بندے (افراد) اللہ ہی کے بندے ہیں۔ لہٰذا جو کوئی کسی بنجر زمین کو آباد کرے گا وہی

---

[1] جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام (CAPITALISM) میں نظر آرہا ہے۔
[2] جیسا کہ اشتراکی نظام (COMMUNISM) میں لازماً ہوتا ہے۔

شخص اس پر متصرف ہو جائے گا۔ (وہ اسی کی ہو جائیگی)

اس حدیث کی شرح میں حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلوی فرماتے ہیں۔ زمین پر آدمی کے حقِ ملکیت کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ قابض کو دوسروں کے مقابلہ میں انتفاع کا زیادہ حق حاصل ہے۔

# عہدِ فاروقی

جب عراق اور شام فتح ہوئے تو فاروقِ اعظم نے ارکانِ مجلسِ شوریٰ کے سامنے یہ تقریر کی

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد والوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ وہ اس میں سے کچھ بھی حصہ نہ پا سکیں؟ کیا آپ لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے۔ اور اسی طبقہ میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے؟

حضرت علیؓ نے فاروق اعظم کی تائید بایں الفاظ کی:-

مجاہدین میں زمین تقسیم کر دینے سے یقیناً وہ انہی کے خاندانوں میں محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ کاشتکاروں اور آراضی کو علی حالہ قائم رکھئے تاکہ یہ وسیع زمین سب مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر معاشی فوائد کا ذریعہ بن سکے۔ اور سب لوگ یکساں مستفید ہو سکیں ۱۲

فاروقِ اعظم کے فیصلہ سے ثابت ہوا کہ انہوں نے عراق اور شام کی آراضی مفتوحہ کو اس لئے مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا کہ کچھ عرصہ کے

بعد اسلام میں جاگیر دارانہ نظام قائم ہو جاتا اور یہ نظام اسلام کی روح کے خلاف ہے لہٰذا انہوں نے ان زمینوں کو حکومت کے قبضہ میں رکھا تاکہ جاگیرداروں کا طبقہ پیدا نہ ہو سکے۔

جب عمرو بن عاص نے فاروق اعظم کو مصر کی زمین کے متعلق لکھا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا:۔

اگر میرے سامنے عام مسلمانوں کمزوروں محروموں مفلسوں اور سائلوں کا معاملہ نہ ہوتا تو میں زمین کو تقسیم کر دینے کا حکم دے سکتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات متقاضی ہیں کہ مصر کی زمین کو تقسیم نہ کیا جائے بلکہ عام مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا جائے تاکہ آئندہ نسلیں بے دست و پا ہو کر نہ رہ جائیں ۔[۱]

جس طرح آفتاب کی روشنی اور دھوپ بارش ہوا آگ، پانی اور پھل پھول سے ہر شخص نفع حاصل کر سکتا ہے اسی طرح زمین بھی اللہ کی ان نعمتوں میں سے ہے جن سے ہر شخص نفع حاصل کر سکتا ہے۔ اور اسی لئے خلافت اسلامیہ کو ہر وقت اس بات کا احساس رہنا ہے کہ مملکت میں کوئی شخص ننگا یا بھوکا نہ رہے۔

حضور کے وصال کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ فدک آپ کے وارثوں کا حق ہے یا خلافت کا؟ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے جن سے بڑھ کر محرم اسرار نبوت کون ہو سکتا ہے۔ یہ فیصلہ صادر کیا کہ چونکہ پیغمبر کے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی[۲] بلکہ جملہ اشیاء عامتہ

---

[۱] جس طرح آج پاکستان کے ہر خطہ میں عوام بے دست و پا نظر آتے ہیں۔

[۲] یہ فیصلہ حسب ذیل احادیث کی روشنی میں کیا گیا تھا

(باقی ص ۵۰۷)

المسلمین کے فائدے کے لئے وقف ہوتی ہیں اس لئے ارضِ فدک خلافت کی ملکیت ہوگی۔

فاروقِ اعظم کے اس ارشادِ گرامی سے اسلام یا خلافت اسلامیہ کے قائم کردہ معاشی نظام کی روح اپنی پوری تابانی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر رہی ہے۔

"لو مات کلبٌ علی شاطی الفرات جوعاً لکان عمر مسئولاً عنہ یوم القیمۃ"

دریائے فرات کے کنارے اگر ایک کتا بھی بھوک سے مر جائیگا تو بلاشبہ قیامت کے دن عمرؓ سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اگر حضرت عمرؓ کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے تو ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ اسلام میں جاگیرداری اور زمینداری کی گنجائش کیسے اور کیونکر نکل سکتی ہے۔ جس کا سارا تار و پود ہی زبردست آزاری، ظلم و ستم، سفاکی، ایذا رسانی، قتل و غارت، آبرو ریزی، نفرت انگیزی، نفس پرستی

---

بقیہ حاشیہ ص ۵۰۶:-

(۱) لا یقتسم ورثتی دینارًا۔ یعنی میرے بعد میرے وارث نقدی تقسیم نہ کریں۔

(۲) لا نورث ما ترکنا صدقہ۔ یعنی ہم (جماعت انبیاء) کسی کو وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ صدقہ ہے جسے مفاد عامہ کے لئے صرف کیا جائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے صدیقِ اکبرؓ کے فیصلہ کو منسوخ نہیں کیا۔ یعنی ارضِ فدک حضرات حسنؓ و حسینؓ کو نہیں دی۔

(دیکھو صحیح مسلم شرح نووی جلد دوم ص ۹۱)

قساوت، سنگدلی، بے رحمی، اور تمام اخلاقِ رذیلہ اور خصائلِ بہیمانہ سے مل کر بنتا ہے۔ یعنی جو اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہے۔؟

## ایک شبہ اور اس کا ازالہ کاملہ

ہم دکھا چکے ہیں کہ اسلام نے اپنے زمانے کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے عدیم المثال نظام کی بنیاد ڈالی جس میں زمین یا دولت (سونا چاندی) کی ملکیت کا تصور نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کو امانت قرار دیا ہے۔

لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے بعض صحابہ کو وسیع قطعہ ہائے زمین (جن کو اصطلاح میں قطائع کہتے ہیں) عطا فرمائے تھے (جن کی نوعیت ان لوگوں کی رائے میں جاگیروں کی سی تھی) اس لئے اسلام میں جاگیرداری اور زمینداری ممنوع نہیں ہے۔ اس شبہ کا جواب حسبِ ذیل ہے۔

واضح ہو کہ خلافتِ الٰہی میں قطائع کی جو نوعیت تھی اس کو مدِّ نظر رکھ کر ان کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ قطائع وہ غیر آباد زمینیں تھیں جو مفادِ عامہ کی حفاظت کی خاطر بعض افراد کو دی جاتی تھیں۔ اور ان سے سرکاری ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔

"خلیفہ کو قطائع کا دینا جائز ہے خواہ زمین کا مالک بنا دے یا صرف انتفاع کی اجازت دے۔"

زمانہ خلافت میں انہی زمینوں سے قطائع دیئے جاتے تھے جو نہ تو کسی کے قبضہ میں ہوتی تھیں اور نہ کوئی ان کا مالک یا وارث ہوتا تھا۔

اور نہ وہ ایسی زمین ہوتی تھی جس کے دینے سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ اگر خلیفہ مناسب خیال کرے تو قطعیہ واپس لے لے۔ چنانچہ سرکار ابد قرار صلعم نے بلال بن حارث کو پوری وادی عقیق بطور قطعیہ دے دی تھی۔ لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے۔ اس لئے فاروق اعظم نے ان سے کہا کہ حضور سرکار دو عالم صلعم نے یہ زمین آپ کو آباد کاری کے لئے دی تھی لیکن آپ نے تھوڑا سا حصہ آباد کیا ہے۔ اس لئے بقیہ زمین واپس کر دیجئے۔ انہوں نے کہا۔ یہ قطعہ مجھے آنحضرت صلعم نے دیا تھا۔ اس لئے میں واپس نہیں کروں گا۔ فاروق اعظم نے فرمایا۔ مگر میں مفاد عامہ کی خاطر اس کو ضرور واپس لے لوں گا۔ چنانچہ بلال بن حارث کو وہ قطعیہ واپس کرنا پڑا۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ حکومت الٰہیہ میں خلیفہ کے سامنے خلق اللہ کا مفاد ہوتا تھا۔ صاحب قطعیہ کو اس پر مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے۔

صدیق اکبر رض نے حضرت طلحہ کو ایک قطعیہ دیا اور اس پر چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکمنامہ ان کے حوالہ کر دیا۔ ان گواہوں میں حضرت عمر رض کا نام بھی تھا۔ جب حضرت طلحہ رض ان کے پاس حکمنامہ پر دستخط کرانے گئے تو اسلام کے معاشی اور اقتصادی اور زرعی نظام کے سب سے بڑے ماہر نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا :-

اھذا کلہ لک دون الناس ؟ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا بڑا قطعہ آراضی صرف تمہیں مل جائے۔ اور دوسرے لوگ اس سے انتفاع سے محروم رہیں ؟

حضرت طلحہؓ کبیدہ خاطر ہو کر صدیق اکبرؓ کے پاس گئے اور کہا:۔
واللّٰہُ مَا ادری ءَ انت الخلیفۃ ام عمر؟
واللہ میں نہیں جانتا کہ آپ خلیفہ ہیں یا عمرؓ؟
صدیق اکبرؓ نے جواب دیا۔ بل عمرؓ۔ میں نہیں بلکہ عمرؓ ہی خلیفہ ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو ضرور میرے اس حکم میں کوئی بات مفادِ عامہ کے خلاف نظر آئی۔ ورنہ وہ دستخط سے انکار نہ کرتے چنانچہ صدیقِ اکبرؓ نے اپنا حکم نامہ منسوخ کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم دونوں کے پیشِ نظر یہ بات رہتی تھی کہ اللہ کی زمین چند افراد کے ہاتھوں میں آ کر ان کے عیش و عشرت اور آرام طلبی اور لذات کوشی کا سبب نہ بن جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں امام را باید کہ اقطاع کند (دلے) بقدر حاجت۔ یعنی خلیفہ کو بقدر حاجت لوگوں کو زمین دینی چاہیئے۔

مسوّی شرح موطا صـ ۴۰۵

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومتِ الٰہیہ میں قطائع نہ تو ذاتی اقتدار بڑھانے کے لئے ہوتے تھے۔ اور نہ کاشتکاروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے۔ بلکہ عامۃ الناس کو فائدہ پہنچانے کے لئے ان دنوں حالات ہر عقلمند آدمی بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ موجودہ زمینداری اور جاگیرداری کی شکل زمانہ خلافت کے قطائع سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس نظام میں جاگیرداری اور زمیندار ہزاروں ایکڑ

زمین کے مالک بن کر مزدوروں کا خون چوستے ہیں۔ اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دادِ عیش دیتے رہتے ہیں۔ اسی لئے اقبال نے بجا طور پر احتجاج کیا ہے :-

حکم حق ہے لیس للانسان الاما سعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

خلاصہ کلام اینکہ حکومت الٰہی میں زمین یا جائداد پر کسی کے قبضہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ قابض کو بحیثیت " امین " اس سے انتفاع کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں صرف اس وقت تک رہ سکتی ہے جب تک وہ شخص خلق اللہ کے مفاد میں خلافت کا ہاتھ بٹا سکے۔ اور ایسی فضا پیدا کرنے میں خلافت کی مدد کرے جو خلق اللہ کی خوشحالی اور فارغ البالی کی ضامن ہو۔ لیکن اگر وہ شخص امانت میں خیانت کرنے لگے تو خلافت اسے بلا تامل بے دخل کر دے گی۔

# تیسری فصل

## تقسیم دولت

قرآنِ حکیم نے بنی آدم کی دنیوی زندگی سنوارنے اور پُر امن بنانے کے لئے جو نظام مدوّن کیا ہے۔ اس کا نمایاں پہلو تقسیم دولت ہے یعنی دولت کو عوام میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ وہ صرف دولتمند طبقہ کے افراد ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔

كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْكُمْ (۵۹-۷)

تاکہ وہ مال ان لوگوں میں گردش نہ کرتا رہے۔ جو تم میں سے دولتمند ہیں۔

قرآنِ حکیم نے سرمایہ داری اور ذرائع معاش پر کسی خاص گروہ کی اجارہ داری کے خلاف متعدد دلائل دیئے ہیں، مثلاً:

(۱) انسانوں میں بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کو وہ قویٰ حاصل نہیں ہیں جن کی بدولت وہ اسباب معاش حاصل کر سکیں۔

سرمایہ دار کہتے ہیں کہ کمزوروں کو اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ مگر ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم اپنی ناقص الاعضا اولاد کو قتل کر دیتے ہو؟ اگر نہیں تو خدا کی کمزور اولاد

کو کیوں فنا کر دیا جائے۔

الغرض چونکہ ناقص الاعضاء افراد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لہٰذا دولتمند افراد کا فرض ہے کہ ان کی کفالت کریں۔ اور یہی قرآن و حدیث کا حکم ہے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ ط (۴۳-۳۲)

ہم نے ہی تقسیم کی ان کے درمیان ان کی روزی دنیا کی زندگی میں اور بلند کئے بعض کے مرتبے بعض پر۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں فطری تفاوت موجود ہے۔ اس لئے اسباب معیشت سے انتفاع میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔ یعنی مشیت ایزدی یہ تو بیشک ہے کہ کسی کو اسباب معیشت زیادہ حاصل ہیں۔ کسی کو کم۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طبقہ اسبابِ معیشت سے قطعاً محروم ہو جائے۔ صاحبِ قوئی اور اپاہج دونوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کو زیادہ دولت کمانے کے مواقع حاصل ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کریں۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ دولتمندوں کی کمائی میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو کمانے سے معذور ہیں۔

انفرادی ملکیت جائز ہے مگر اسی وقت تک جب تک آپ قومی فرائض مستعدی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اگر آپ اپنی دولت میں سے محتاجوں کو ان کے حق نہیں دیتے تو اسلام آپ کی دولت کا کچھ حصّہ آپ سے بجبر وصول کر کے محتاجوں میں تقسیم کر دیگا۔

اسلامی نظام میں انفرادی حقوق اور ذاتی ملکیت کی حدود مقرر ہیں اگر کوئی شخص ان حدود سے تجاوز کرے گا تو حکومتِ الٰہیہ اس سے باز پرس کرے گی۔

اسلام کسی شخص کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دولت کے بل بوتے پر دوسروں کو اپنا غلام بنائے۔ کیونکہ اس صورت میں کوئی شخص بھی توحید کے اقتضاء پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دستورِ حیات کی حقیقت سے اسلام ختم ہو جائیگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ج فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِہِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُہُمْ فَہُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ ط اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ۝ (۱۶-۷۱)

اور اللہ نے (اپنی مصلحت سے) تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔ اندریں حالات یہ بات کس قدر مذموم ہے کہ وہ لوگ جن کو برتری دی گئی ہے۔ ان لوگوں کا رزق انہیں واپس نہیں دیتے جو ان کے زیر دست ہیں۔ تاکہ وہ بھی (اسبابِ معیشت کے لحاظ سے) ان کے برابر ہو جائیں۔

مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ جن کو نسبتاً زیادہ روزی دی گئی ہے۔ ان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے زیر دستوں کو ان کا رزق واپس کر دیں۔ کیونکہ اسبابِ معیشت میں تفاوت کے باوجود حقِ معیشت میں سب انسان برابر ہیں۔ یعنی زندہ رہنے کا حق سب کو یکساں طور پر حاصل ہے۔ اگر کوئی دولتمند اپنی دولت محتاجوں پر تقسیم نہیں کرتا تو

اسلامی حکومت اس دولتمند کو تقسیم دولت پر مجبور کر سکتی ہے تاکہ نظام معاشرت درہم برہم نہ ہو جائے۔ چنانچہ خلافت فاروقی میں ایک شخص محتاج تھا۔ حضرت عمرؓ نے جب اس کے حالات کی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ اس کے چچا زاد بھائی دولتمند ہیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان دولتمند افراد کے خلاف مقدمہ چلایا جائے اور فرمایا الغُرمُ بالغُنمُ" یعنی جو فائدہ حاصل کرنے کے متمنی ہوں! بشرطِ ضرورت تاوان بھی انہیں کو دینا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اس محتاج کے پاس اگر مال ہوتا تو اس کی وفات کے بعد اس کے چچا زاد بھائی اس مال کے وارث یا حقدار ہوتے تو پھر اس کے افلاس میں وہ اس کے شریکِ حال کیوں نہیں ہوتے؟

فاروقِ اعظمؓ کے اس طرزِ عمل سے ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ اسلام کے معاشی نظام کی روح کیا ہے: تقسیم دولت یا سرمایہ داری؟

چنانچہ قرآنِ حکیم اس باب میں یہ فیصلہ صادر کرتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿﴾

اور وہ لوگ اللہ کی نظر وں میں محبوب ہیں جن کے اموال میں سائل اور محروم کا حق مقرر ہے) یعنی جو لوگ اپنی دولت میں سے سائل اور محروم کو اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی لوگ اللہ کی نگاہ میں نکوکار اور اس کے نیک بندے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو دولت مند اپنی دولت میں سے سائل اور محروم کو دیتا ہے وہ اس پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ بلکہ اپنا

فرض ادا کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے اس کی دولت میں سائلوں اور محتاجوں کا بھی حق ہے۔ کیونکہ اس کی دولت اسی کی ملکیت نہیں ہے۔ اگر اللہ اس کو دوسروں کے مقابلہ میں حصولِ دولت کے زیادہ ذرائع نہ دیتا۔ تو وہ اتنی زیادہ دولت ہرگز نہ کما سکتا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ دولتمند کی دولت میں ان لوگوں کا حصہ ہے۔

(۱) جو حصولِ دولت کے لئے قوی تو رکھتے ہیں۔ مگر کسی حادثہ کی وجہ سے اکتساب دولت سے "محروم" ہو گئے ہیں (ان کو محروم قرار دیا)

(۲) جو ناقص الاعضا ہیں اس لئے دولت کما ہی نہیں سکتے (ان کو سائل قرار دیا)

دوسری آیت اس سے بھی واضح ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۵ (۱۷-۲۶)

اور دیدے قریبی رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی مت کر۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اقرباء مساکین اور بے زادراہ مسافروں کا دولتمندوں کی دولت پر حق ہے۔ اگر وہ ان کو اپنی دولت میں سے دینگے تو ان پر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ بلکہ اپنا فرض ادا کرینگے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ محض قرابت ہی دلیلِ استحقاق نہیں ہے بلکہ افلاس اور احتیاج بھی دلیلِ استحقاق ہے۔ چونکہ ناداری یا مفلسی استحقاق کی اصلی علت ہے۔ اس لئے یہ علت جہاں پائی

جائے گی۔ دولتمندوں کو وہی اپنی دولت میں سے صاحبانِ استحقاق کو ان کا حق دینا پڑیگا۔ علت اعانت، قرابت نہیں ہے بلکہ افلاس ہے۔!

تیسری بات یہ ہے لفظ مسکین اور ابن السّبیل میں عمومیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمان پر واجب ہے کہ وہ بلا امتیاز مذہب و نسل و قوم و وطن، تمام محتاجوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔

قرآن حکیم فرماتا ہے کہ رزق کی فراخی اور تنگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کی روزی چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ اور جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ جس کی روزی فراخ ہو جاتی ہے۔ اس فراخی کے ساتھ ساتھ اس پر ذمہ داری بھی عاید ہو جاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ دولتمند سے یہ چاہتا ہے کہ وہ مفلسوں کی امداد کرے۔ کیونکہ تقسیم دولت ہی میں قومی فلاح مضمر ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ؗ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(۳۸ - ۳۰)

پس تم پر لازم ہے کہ رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں کو ان کا حق (خوشی کے ساتھ) دو۔ یہ فعل بہت بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو طالبِ رضائے الٰہی ہیں۔ اور (یہی بات ہے کہ) وہی لوگ مقصدِ حیات میں کامیاب ہوں گے۔ ۱۲

تقسیم دولت کے لئے قرآنِ حکیم نے جو جامع اور مانع اصطلاح

استعمال کی ہے۔ وہ انفاق فی سبیل اللہ یا محض انفاق ہے۔ اور کلام اللہ نے اس پر اس قدر زور دیا ہے کہ اگر بعض آیات ایسی نہ ہوتیں جن میں وصیت کا حکم دیا گیا ہے (اور وصیت کے لئے پس انداز کرنا شرط ہے) تو انفاق کا مطلب یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ جس قدر عطا فرمائے سب خرچ کر دو کل (آئندہ) کے لئے کچھ پس انداز مت کرو۔[1]

اسلام نے انفاق پر اس لئے زور دیا ہے کہ اس کے بغیر قومی زندگی کا قیام ناممکن ہے۔ اور اسلام جیسا کہ صاحبانِ علم پر روشن ہے۔ محض پوجا پاٹ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اپنی ساخت اور ترکیب (ازدواج) کے اعتبار سے وہ ایک مخصوص ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا دوسرا نام ہے۔

---

[1] اگرچہ قرآن و حدیث سے (EMERGENCY) کے لئے پس انداز کرنے کی اجازت ہے۔ کیونکہ اچانک یا غیر متوقع ضرورت ہر شخص کی زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔ مگر جو صاحبانِ عزیمت ہیں ان کا طرزِ عمل اربابِ رخصت سے جدا ہے۔ چنانچہ سرکار ابد قرار صلعم اور آپ کی اتباع میں حضرات خواجگانِ چشت نے ساری عمر (TOMARROW) آئندہ کے لئے پس انداز نہیں کیا۔ ہمارے علماء اور فقہاء صرف لفظ تزکیہ کا لغوی مفہوم بیان کرنے پر اکتفا فرماتے ہیں۔ لیکن صوفیائے کرام اس مفہوم پر عمل کرتے ہیں یعنی بالفعل اپنے دل کو دولت کی محبت سے پاک کر لیتے ہیں۔ عالم اور عاشق میں یہی فرق ہے۔ ۱۲

# شعبہ ہائے انفاق

## (ا) ایتائے زکوٰۃ :-

یہ ایک مقررہ ٹیکس ہے۔ جو اللہ کی طرف سے اغنیاء کی دولت پر عاید کیا گیا ہے۔ دونوں کی حسب ذیل صورتیں ہیں :-

سونا چاندی، مال تجارت، چوپائے، زمین اور کان کی پیداوار۔

## (ب) ایتائے جزیہ :-

یہ وہ ٹیکس ہے جو دولتمند غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔ عیسائیوں نے خواہ مخواہ اس جائز قانون کو مذموم شکل میں پیش کیا ہے۔ مقصد اس کا غیر مسلموں کی تذلیل نہیں ہے۔ بلکہ ناداروں کی پرورش کا سامان مہیا کرنا۔ اگر اس کا مقصد توہین ہوتا ۔ تو فاقد الاسباب اور فاقد القویٰ غیر مسلموں سے بھی وصول کیا جاتا مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ جزیہ صرف صاحب حیثیت یعنی دولتمند غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا۔ جزیہ کا فلسفہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت غیر مسلموں کی جان و مال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی امداد کریں۔ تاکہ وہ ان لوگوں کو تنخواہ دے سکے جو ملک کی

حفاظت کرتے ہیں۔

## (ج) احسان :-

بنی نوع آدم کے ساتھ نیک سلوک کرنا ہر دولتمند مسلمان کا فرض ہے۔ یا یوں سمجھو کہ اسلامی حکومت کا قانون ہے۔ اس کے تحت حسب ذیل افراد آتے ہیں :-

والدین۔ ان کے والدین، ذی القربیٰ، ازدواج، اولاد، خدام، احباب، یتامیٰ اور مساکین وغیرہ۔ واضح ہو کہ حسن سلوک کے اعتبار سے کافر اور مومن میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

## (د) مضاربت :-

اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ داروں سے نقد روپیہ وصول کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اور ان کو اس کی حفاظت کا یقین دلا کر مفلس کارکنوں کو وہ رقم دی جائے۔ تاکہ وہ مفید کاموں میں صرف کریں۔

## (ہ) وصیت :-

دولتمندوں کو اجازت ہے کہ اپنے اموال کے ⅓ میں حسب مرضی وصیت کر سکتے ہیں۔

## (و) تقسیم ترکہ :-

اس کا مطلب یہ ہے کہ متوفی کی پس ماندہ دولت صرف بڑے بیٹے کو نہ ملے بلکہ اس کے تمام اقرباء میں تقسیم کر دی جائے۔ تاکہ سرمایہ داری پیدا نہ ہو سکے۔ یا وہ دولت چند افراد میں محدود نہ ہو جائے۔ چنانچہ اکتناز کی مذمت میں یہ آیت نص قطعی الثبوت اور قطعی الدولہ ہے۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۙ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

(۹-۳۴-۳۵)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو (مطلقاً) خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اے رسول! ان کو عذاب دردناک کی خوشخبری سنا دو جبکہ اس سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں رکھ کر تپایا جائیگا پھر ان سے ان کے ماتھے اور ان کی کروٹیں اور ان کی پیٹھیں داغی جائینگی۔ اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے دنیا میں جمع کیا تھا۔ تو آج اپنے جمع کئے ہوئے مال کا مزہ چکھو۔ ۱۲

(نمبر) اس آیت میں قرآن حکیم نے سرمایہ داری (اکتناز) کے بدترین نتائج واضح کر دیئے ہیں۔ اور جس طرح اکتناز ممنوع ہے۔ اسی طرح تبذیر و اسراف یعنی فضول خرچی بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (۱۷/۲۶)

اور فضول خرچی مت کرو۔ بلاشبہ فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

ان دو آیتوں کی روشنی میں یہ صداقت نکھر کر سامنے آگئی کہ مسلمان (۱) نہ تو اپنی دولت جمع کر کے رکھ سکتا ہے

(۲) اور نہ وہ اسے فضول خرچی میں ضائع کر سکتا ہے۔

تو صرف ایک ہی صورت اس کے لئے باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اسے اللہ کی راہ میں صرف کرے یعنی انفاق فی سبیل اللہ ہر دولتمند پر فرض ہے

(ج) صدقات (اموال زکوٰۃ) کا مصرف قرآن حکیم نے یہ بتایا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط (۹-۶۰)

صدقہ کا مال (یعنی مال زکوٰۃ) اور کسی کے لئے نہیں ہے صرف فقیروں کے لئے ہے۔ اور مسکینوں کے لئے۔ اور ان کے لئے جو اس کی وصولی پر مقرر کئے جائیں۔ اور وہ کہ ان کے دلوں میں (کلمۂ حق کی) الفت پیدا کرنی ہے اور غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے۔ اور قرضداروں کا قرض ادا کرنے کے لئے جو ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے۔ مثلاً مجاہدین یا مبلغین اسلام کی ضروریات پوری کرنے کے لئے۔ اور مسافروں کے لئے جو مفلسی کی وجہ سے اپنے وطن نہیں جا سکتے۔)

جس طرح اکتناز کا نتیجہ فساد ہے۔ اسی طرح انفاق کا نتیجہ اصلاح قوم ہے۔ اور چونکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو ضروریات زندگی حاصل ہو سکیں۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کو اکتناز سے روکا ہے۔ اور انفاق کا حکم دیا ہے۔

بلکہ اللہ تو مسلمانوں سے فرماتا ہے:-

(ط) وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ط (۷۳-۲۰)

اے مسلمانو! اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔

واضح ہو کہ یہ سورۃ (یعنی سورہ مزمل ترتیبِ نزول کے لحاظ سے قرآن کی دوسری سورۃ ہے، یعنی انفاق سبیل اللہ، اسلام کا پہلا حکم ہے (نماز پنجگانہ تو شبِ معراج میں فرض ہوئی تھی) اور سچ بھی ہے جب تک معاش کی طرف سے اطمینان نہ ہو نمازیں بھی لطف نہیں آسکتا۔

(ی) امداد باہمی:-

قرآن حکیم مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ جان سے مال سے اور اخلاق سے۔

واضح ہو کہ شرکت (CO-OPERATION) کے لئے قرآنِ حکیم نے دو لفظ استعمال فرمائے ہیں۔

(۱) بِر

(۲) تقویٰ جیسا کہ آیتِ ذیل سے ثابت ہے۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔

یعنی نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔

اسلامی فقہ میں شرکت کی مختلف اقسام قرار دی گئی ہیں تاکہ مختلف طبقات کے لوگ (شرکت) میں حصہ لے سکیں۔ بعض شرکتیں ایسی ہیں جن میں تمام شرکاء غریب ہی ہوں گے۔ یہ اس لئے کہ اگر کسی شرکت میں چار پانچ بڑے بڑے سرمایہ دار بھی شریک ہو جاتے تو لوٹ پھر کے سارا نفع انہی کو ملے گا۔ اسی لئے فقہاء نے شرکت کی حسبِ ذیل اقسام قرار دی ہیں۔

شرکت المفاوضہ، شرکت الوجوہ، شرکت الصنائع اور
شرکت العنان مضاربت بھی اسی شرکت ہی میں داخل ہے۔
(ک) دولتمندوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غریبوں کو صدقہ دیں۔ ہدایا
دیں۔ اپنی دولت کا کچھ حصہ ہبہ کر دیں (عطایا بخشش) اور قرض
دیں۔ لیکن اگر کوئی دولتمند نہ ہدیہ دے سکتا ہے نہ بخشش کر سکتا
ہے نہ قرض دے سکتا ہے۔ تو چوتھی صورت یہ ہے کہ اس کی دولت
کو چند مزدوروں کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اپنی محنت، اپنا دماغ اور
اپنا وقت صرف کریں اور اس طرح منافع دولتمند اور مزدور دونوں
میں تقسیم ہو جائے۔ یہ مضاربت ہے۔
(ل) وصیت:۔
قرآن حکیم دولتمندوں کو حکم دیتا ہے کہ ساری عمر اپنی دولت
اللہ کی راہ میں صرف کرتے رہو۔ بلکہ مرتے وقت بھی وصیت کر جاؤ کہ
میرے بعد میری دولت کا ⅓ حصہ اللہ کی راہ میں صرف کیا جائے۔
بقیہ ⅔ وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔
كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا
الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا
عَلَى الْمُتَّقِينَ ۵ (۲-۱۱۰)

فرض کر دیا گیا ہے تم پر کہ جب تم میں سے کسی کی موت آ پہنچے۔ اگر
وہ چھوڑے مال تو وصیت کر جائے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے
مناسب طور پر۔ ہم نے متقی لوگوں پر یہ بات فرض کر دی ہے۔
(م) وراثت:۔

مقصد اس کا بھی یہی ہے کہ متوفی کی دولت مختلف افراد میں تقسیم ہو جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ (۴-۷)

مردوں کے لئے حصّہ ہے اس میں جو چھوڑا والدین اور قریبی رشتہ داروں نے اور عورتوں کے لئے بھی حصّہ ہے اس میں جو چھوڑا والدین اور قریبی رشتہ داروں نے۔ خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ حصّے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

خلاصہ کلام اینکہ قرآن کا معاشی نظام انفاق فی سبیل اللہ پر مبنی ہے۔ اور اسی لئے وہ دولتمندوں سے مختلف صورتوں میں دولت وصول کر کے محتاجوں اور مسکینوں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرتا رہتا ہے تاکہ

(ا) دولت صرف اغنیا میں گردش نہ کرتی رہے بلکہ

(ب) عامتہ الناس اس سے مستفید ہوتے رہیں۔

قرآن و حدیث سے تقسیم دولت کی حسب ذیل صورتیں ثابت ہیں:-

(۱) زکوٰۃ (۲) جزیہ (۳) ہدیہ (۴) ہبہ (۵) عاریت (۶) احسان۔ (۷) انفاق فی سبیل اللہ (۸) صدقات (۹) قرضہ حسنہ (۱۰) ترکہ (۱۱) فئے (۱۲) غنیمت (۱۳) خمس (۱۴) عشر (۱۵) شرکت (۱۶) مضاربت (۱۷) نان و نفقۂ زوجہ (۱۸) وصیت (۱۹) وراثت (۲۰) تالیف قلوب۔

# خلاصۂ مباحث

قارئین کی سہولت کے لئے گزشتہ مباحث کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) اللہ تبارک وتعالےٰ اس کائنات کا خالق، رازق، مالک اور حاکم ہے۔

قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (۱۳-۱۶)

(کہہ دیجئے) اللہ ہی ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا (لا شریک) اور زبردست ہے۔

(۲) اس نے کائنات ایک مقصد کے لئے پیدا کی ہے۔

مَا خَلَقْنٰھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

(۴۴-۳۹)

(اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیلتے ہوئے) نہیں پیدا کیا ہم نے ان کو مگر ایک غرض اور مصلحت سے۔ لیکن اکثر لوگ اس بات سے واقف نہیں ہیں۔

(۳) اس نے انسان کو بھی ایک مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

(۳-۱۵)

پس کیا تم نے خیال پیدا کر لیا تھا کہ ہم نے تم کو یونہی بیفائدہ اور بیکار پیدا کیا تھا۔ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

(۴) اس نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے: تاکہ وہ اس کائنات میں اس کا قانون نافذ کر سکے: تاکہ اس کے بندے غیر اللہ کی اطاعت نہ کریں۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ؕ (۲-۳)

جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

(۵) اس لئے ساری کائنات کو اس کا خادم بنا دیا۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ ؕ

(۴۵ — ۱۳)

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمہارا تابع فرمان بنا دیا۔

(۶) انسان کو نیکی اور بدی میں سے کوئی ایک راستہ اپنے لئے منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اور اس سے بازپرس ہوگی۔

اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَہُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَہُمْ (۸۸-۲۶)

بیشک ہماری ہی طرف انہیں لوٹ کر آنا ہے۔ اور پھر ہمارے ہی ذمہ ان سے حساب لینا ہے۔

وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی ثُمَّ یُجْزٰىہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی ؕ (۵۳-۴۰-۲)

اور بلا شبہ ان کی کوشش (کارگزاری) آگے چل کر (قیامت کے دن) دیکھی جائیگی۔ اور اس کو اس کا پورا پورا بدلہ ملیگا۔ اور آخر کار سب کو خدا تک پہنچنا ہے۔

(۷) یہ زندگی ابتلاء اور آزمائش ہے۔ اور جو کچھ اُس نے دیا ہے وہ بھی آزمائش ہی کی غرض سے دیا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرُ نِ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (۶۷-۲)

با برکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ساری خدائی ہے اور ساری کائنات پر جس کی فرمانروائی ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ یہ بات آزمائے کہ تم میں کون زیادہ اچھا ہے۔ بلحاظِ اعمال۔

(۸) اموال اور اولاد (اس لئے عورت اور زمین بھی) انسان کے حق میں فتنہ (آزمائش) ہیں۔ کیونکہ زن، زر اور زمین ہی کے لئے وہ خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات انسان عورت اور اولاد کی محبت میں بالکل اندھا ہو جاتا ہے۔ اور خدا، رسول، اور شریعت، تینوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے صاف لفظوں میں ہمیں متنبہ فرمایا ہے کہ

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْكُمْ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ط (۶۴-۱۴-۱۵)

اے ایماندار لوگو! تمہاری بیویوں اور اولادوں میں سے بعض تمہارے دین کے دشمن ہیں۔ اس لئے ان سے احتیاط کرتے رہو۔ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے حق میں نرا جنجال (آزمائش ہے)

مطلب صاف ہے کہ جن عورتوں اور بال بچوں کی خاطر تم اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی کر بیٹھتے ہو وہ بلاشبہ تمہارے حق میں تمہارے دشمن ہیں۔ بیوی ہو یا اولاد جب کسی کی خاطر انسان اللہ سے غافل ہو جاتے وہ بلاشبہ اس کے حق میں دشمن ہے۔

دوسری آیت میں مال اور اولاد کو آزمائش قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں دولت اولاد اس لئے دی ہے کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم ان سے زیادہ محبت کرتے ہو یا ہم سے ؟

(ب) وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸-۲۸)

آگاہ ہو جاؤ کہ بلاشبہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد تمہارے حق میں آزمائش ہے۔

(ج) وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ط (۶-۱۶۵)

اور اللہ ہی وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا اور بلند کئے تم میں سے بعض کے بعض پر درجے تاکہ وہ تمہیں ان نعمتوں کے ذریعہ سے آزمائے جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں۔ مثلاً زن، زر، زمین۔

(۹) اس حقیقت کو واضح کر دینے کے بعد کہ دولت ذریعہ آزمائش

ہے، بالفاظ دگر، قرآن کی رو سے دولت نہ تو مذموم ہے نہ مقصود ہے۔ بلکہ آزمائش ہے۔ اللہ نے اس بات کو بھی ہمارے ذہن نشین کر دیا کہ مسلمان وہ ہے جو مال و دولت کے حصول میں ہم سے غافل نہ ہو جائے یعنی دولت کو مقصودِ حیات نہ بنائے۔ بلکہ اسے ہماری خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے۔

یعنی اس لئے کمائے کہ ہماری راہ میں اس کو خرچ کرے گا۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

(۲۴-۳۷)

اللہ کے بندے وہ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت (دولت) ہماری یاد سے غافل نہیں کرتی۔

(۱۰) یاد الہی سے غفلت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری زندگی پریشانی میں گزرتی ہے۔ یعنی اطمینان قلب جو مقصود ہے۔ زائل ہو جاتا ہے۔ کروڑ پتی لوگوں کی زندگی اس صداقت پر شاہد عادل ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى (۲۰-۱۲۴)

اور جو شخص میری یاد سے روگردانی کریگا۔ تو بلاشبہ اس کی زندگی تنگی اور پریشانی میں بسر ہوگی۔ اور ہم قیامت کے دن اسے اندھا اٹھائیں گے۔

(۱۱) اس سلسلہ میں آخری تنبیہہ۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (۵-۱۰۵)

اے ایماندارو! اپنے نفس کی محافظت کرو۔ (عاقبت سے

غافل مت ہو۔

(۱۲) قرآنِ حکیم نے خدا، انسان اور کائنات کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی رو سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہے کہ در اصل انسان کسی شی کا بھی مالک نہیں ہے۔ کائنات اور اس کی ہر شے کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔[۱] ملکیت کے جس قدر حقوق اس کو حاصل ہیں وہ سب مالکِ حقیقی کی طرف سے عطا ہوتے ہیں۔ یعنی جن چیزوں (زر، زن، زمین) کو وہ اپنی ملک سمجھتا ہے۔ وہ در اصل "امانت" ہیں اور وہ ان کا امین ہے مالک نہیں۔ چنانچہ اللہ ارشاد فرماتا ہے۔

---

[۱] غور سے دیکھو تو انسان اپنی دولت اور جائداد کا تو کیا مالک ہوگا وہ تو خود اپنی جان کا بھی مالک نہیں ہے۔ وہ دوسروں کا تو کیا مالک ہوگا خود اپنا بھی مالک نہیں ہے۔ جس طرح حقیقی معنیٰ میں اللہ ہی مالک ہے اسی طرح حقیقی معنیٰ میں صرف اللہ ہی موجود ہے لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ لا موجود الا اللہ۔ قرآن کی رو سے صرف اللہ "الحق" ہے۔ یعنی بذاتِ خود موجود ہے۔ یعنی صرف وہی واجب الوجود ہے۔ اس کے علاوہ ساری کائنات "ممکن الوجود" ہے۔ یعنی اس کے موجود کرنے سے موجود ہوئی ہے۔

مگر ایک شخص پر وحدت الوجود کا مفہوم منکشف ہو جائے تو وہ کبھی بھی دنیا کی کسی شے کو اپنی ملک قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ جب وہ خود اپنی جان کا مالک نہیں ہے تو کسی شے کا مالک کب اور کیسے ہو سکتا ہے۔ ۱۲

قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○ قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ○ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۚ قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ○

اے رسول! آپ ان لوگوں سے دریافت کیجئے کہ یہ زمین کس کی ہے۔ اور اس میں جس قدر مخلوق ہے وہ کس کی ہے۔ اگر تمہیں علم ہے تو بتاؤ۔ وہ یقیناً جواب دیں گے کہ سب اللہ ہی کا ہے وہی اس کائنات کا مالک ہے۔ آپ ان سے پوچھئے کہ کون ہے رب ساتوں آسمانوں کا اور کون ہے رب عرش عظیم (ساری کائنات) کا! وہ کہیں گے کہ سب اللہ ہی کا ہے۔ (یعنی ہر شے کا مالک وہی ہے) آپ ان سے پوچھئے کون ہے وہ جس کے قبضۂ قدرت میں ہے حکومت اور فرمانروائی ہر شے پر، وہی سب کو پناہ دیتا ہے (۲۳-۸۴-۸۸) اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ

(ا) اللہ ہی اس کائنات کا مالک ہے۔ اس لئے کوئی شخص کسی شے کا مالک نہیں ہے۔

(ب) زمین اس کی ملکیت ہے۔ لہٰذا کوئی شخص حقیقی معنی میں زمین کا مالک نہیں ہو سکتا۔

(ج) وہ ساری کائنات کا رب ہے۔ یعنی سب کو رزق دینے والا ہے۔ (اس لئے رزق کے سر چشمے کسی انسان کے قبضہ میں نہیں ہو سکتے۔)

(د) وہی ساری کائنات پر حاکم ہے (اس لئے کوئی انسان اللہ کے بندوں پر حکمراں نہیں ہو سکتا۔)

(۱۳) لہٰذا جس انسان کے پاس دولت یا زمین ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے بلکہ امین ہے۔ وہ ان چیزوں سے انتفاع کر سکتا ہے۔ مگر ان پر اپنی ملکیت قائم کر کے دوسروں کو انتفاع سے نہیں روک سکتا۔

مثال کے طور پر انسان زراعت کرتا ہے۔ اور غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ زمین سے پیدا ہوا ہے یہ میں نے پیدا کیا ہے۔ اور میں اس کا مالک ہوں۔ حالانکہ حقیقی زراعت وہ نہیں ہے بلکہ اللہ ہے دیکھئے قرآن حکیم کیا فرماتا ہے۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝ أَفَرَءَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝

(۵۶-۶۴ تا ۷۲)

بھلا دیکھو تو سہی کہ تم لوگ جو کھیتی کرتے ہو کیا تم اس کو اگاتے ہو۔ یا ہم اگاتے ہیں؟ ہم چاہیں تو کوئی آفت نازل کر کے پکنے سے پہلے ہی اس کو چورا چورا کر دیں۔ اور تم باتیں بناتے ہی رہ جاؤ کہ ہم تو بلا وجہ تاوان میں آ گئے۔ بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹ گئے بھلا دیکھو تو یہ پانی جو تم پیتے ہو کیا اس کو بادل سے تم نے برسایا ہے یا ہم برساتے ہیں، ہم چاہیں تو اس کو ایسا کھاری کر دیں کہ زبان

پر کبھی نہ رکھا جائے۔ تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ بھلا دیکھو! تو یہی آگ جو تم سلگاتے ہو۔ اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں؟

اللہ صاف لفظوں میں فرماتا ہے کہ زارع (کھیتی اگانے والے) تم نہیں ہو۔ بلکہ ہم ہیں۔ آئندہ آیتوں میں اس دعویٰ پر دلائل پیش کئے ہیں۔ مثلاً:۔

(ا) زراعت کے لئے زمین پہلی شرط ہے اور وہ اللہ کی مخلوق اور اور اسی کی ملک ہے۔

(ب) دوسری شرط آفتاب ہے اور وہ اللہ کی ملک ہے۔

(ج) تیسری شرط پانی ہے اور وہ بھی اسی کی ملک ہے۔

(د) چوتھی شرط بیج ہے اور وہ بھی اللہ ہی کا عطیہ ہے۔

(ہ) پانچویں شرط بیل ہے وہ بھی اللہ کا مخلوق ہے۔

(و) چھٹی شرط مناسب حالات ہیں۔ وہ بھی اللہ کے قبضہ میں ہیں۔

چنانچہ وہ خود فرماتا ہے کہ تم اپنی محنت یا کوشش پر ناز مت کرو کیونکہ اگر ہم چاہیں تو تمہارے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیں۔ اگر ہم چاہیں تو تمہاری لہلہاتی ہوئی کھیتی کو نہس نہس (حطام) کر کے رکھ دیں۔ زمین ہماری، دھوپ اور گرمی ہماری۔ پانی ہمارا، بیج ہمارا۔ بیل ہمارے، حالات ہمارے قبضہ میں۔ اب رہے تم تو تم بھی ہمارے۔ اندریں حالات خود غور کر کے فیصلہ کر لو کہ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ؟ سوچ سمجھ کر خود ہی جواب دو کہ کیا تم کھیتی

اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟

درحقیقت زارع کون ہے؟ تم یا ہم؟

پس اگر حقیقی زارع ہم ہیں تو پھر تم ہمارے پیدا کردہ اناج کو گوداموں میں ذخیرہ کیوں کرتے ہو؟ (اسی کو اصطلاح شریعت میں احتکار کہتے ہیں) اور ہمارے بندوں کو ہمارے پیدا کردہ اناج سے کیوں ترساتے ہو؟ ہماری امانت میں خیانت کیوں کرتے ہو؟ بالفاظِ واضح تر "بلیک مارکیٹ" کیوں کرتے ہو؟

زمین ہماری، پانی ہمارا، گرمی ہماری، بیج ہمارا، بیل ہمارے تم ہمارے، تمہارا مال ہمارا، تمہارے ہاتھ پاؤں ہمارے، جب سب کچھ ہمارا ہے تو یہ اناج تمہارا کیسے ہو گیا؟ جب زارع ہم ہیں تو تم زراعت کے مالک کیسے بن بیٹھے؟

ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ؟

(۱۴) بہرحال یہ بات ثابت ہے کہ انسان کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہے۔ مالک حقیقی اللہ ہے انسان امین ہے۔ چنانچہ یہ صداقت ان آیتوں سے بالکل واضح ہے۔

(۱) وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْۤ اٰتٰىكُمْ ۰ (۲۴-۳۳)

اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ وہ مال جسے تم اپنی ملک سمجھتے ہو اور اس لئے سینت سینت کر رکھتے ہو (اسی کو شریعت کی اصطلاح میں اکتناز کہتے ہیں) دراصل ہماری ملک ہے ہم نے تمہیں امانتاً دیا ہے۔ تاکہ تم اسے ہمارے ان بندوں میں تقسیم

کردو جنکو ہم نے اپنی مشیت کی بنا پر تمہارا دست نگر بنا دیا ہے۔

(ب) آمِنُوا بِاللّٰہِ وَرَسُولِہٖ وَاَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَکُم مُّستَخلَفِینَ فِیہِ ط (۵۷-۷)

اے لوگو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس مال میں سے جس کا (اللہ نے) تمہیں اگلوں کا جانشین بنا کر مالک کر دیا ہے اس کی راہ میں بھی خرچ کرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ انسانوں کو اُن کے اسلاف کے اموال کا مالک نہ بناتا تو آج کوئی شخص بھی مالک نہ ہوتا۔ مثلاً زید مر گیا اور پچاس لاکھ روپیہ نقد چھوڑ گیا۔ اور اس کے بیٹے (خالد۔ علی حسن۔ حسین اور مسلم) ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دس دس لاکھ کے مالک بن گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو مالک بنایا ہے۔ ورنہ ان سے پوچھو کہ تم لوگ یہ رقم کہاں سے لائے؟ مطلب یہ کہ زید کو یہ رقم ہم نے دی تھی۔ اس لئے دراصل مالک ہم ہیں۔ اب ہم نے زید کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں کو اس رقم کا امین بنا دیا ہے۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ اس رقم میں سے "انفاق" بھی کریں۔ یعنی ہماری راہ میں بھی خرچ کریں۔

اللہ نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ مزید تاکید فرمائی۔

وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

اے لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم اپنی دولت، اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ جبکہ آسمانوں اور زمین (کائنات) میں جو کچھ ہے وہ

اللہ ہی کی میراث ہے۔ (یعنی اگر تم برضاء ورغبت اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کروگے تو اپنے ساتھ تو ایک پیسہ بھی نہیں لے جا سکو گے۔ اب اگر تمہارے مرنے کے دو منٹ بعد قیامت آجائے تو جس قدر دولت تم نے چھوڑی ہے۔ اس کا مالک کون ہے۔ اور وہ کس کی میراث ہے؟

(۱۵) ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ دولت یا جائداد (پراپرٹی) ہمارے پاس ایک امانت ہے جس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور چونکہ انسان اس کا خلیفہ (نائب) ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ مالک کے احکام اور منشاء کی تعمیل کرے اور مالک کا حکم یہ ہے کہ اپنی دولت میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میرے محتاج بندوں میں تقسیم کرے۔

(۱۶) کتنی تقسیم کریں؟ اس کا جواب بھی موجود ہے۔

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ

اے رسول! مسلمان آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس قدر خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جس قدر دولت تمہاری ضرورت سے زائد تمہارے پاس ہو۔ وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کردو۔ اسی لئے تو اقبال نے یہ کہا ہے۔

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ

آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ

(۱۷) آخر میں ایک فیصلہ کن بات فرمادی

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ

بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کی دولت دونوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ (۹-۱۱۲)

اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ اے مسلمانو! دولت کماؤ اور خوب کماؤ۔ اور خوب دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ کیونکہ تمہارا مقصود اور محبوب دولت نہیں ہے بلکہ اللہ ہے جو تمہارا خالق بھی ہے اور مالک بھی۔ اور تمہیں انجام کار اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تم اسی کے، تمہاری دولت اس کی، تمہاری زمین اس کی، لہٰذا تم اسی کی دولت اور اس کی زمین اس کی خوشنودی کے لیے اس کے مستحق بندوں میں تقسیم کردو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو دنیا اور آخرت دونوں میں تمہیں فلاح حاصل ہوگی۔

دولت حاصل کرنا اور دولت جمع کرنا جرم نہیں ہے۔ مگر اس کو محبوب بنانا اور اسے "کنز" کرنا۔ یعنی سینت سینت کر رکھنا کہ کم نہ ہوجائے یہ ضرور جرم ہے۔ اگر تمہارے پاس دو کروڑ روپے ہوں۔ اور تم یہ سمجھو کہ یہ دولت میری نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی ہے۔ میں تو صرف اس کا "امین" ہوں۔ اور اس عقیدے کو عمل سے ثابت کرو۔ یعنی واقعی تم اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور کرتے رہو تو تم سچے مومن ہو۔ یعنی سرمایہ دار نہیں ہو۔ اکتناز کے مجرم نہیں۔ سوسائٹی کے دشمن نہیں ہو۔

خلاصہ کلام اینکہ

(۱) دولت اور زمین اللہ کی ملکیت ہے۔

(۲) تم ان دونوں کے امین ہو۔

(۳) اس لئے ان دونوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

نفس دولت حصولِ دولت اور تقسیم دولت کے متعلق قرآنی تعلیمات کی وضاحت کے بعد اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

## پہلا بند:۔

اس بند میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان دولت کو دین کے لئے حاصل نہ کرے بلکہ اپنے لئے حاصل کرے تو اللہ اس کا معبود نہیں ہے۔ بلکہ دولت اس کی معبود ہے۔ اس کے بعد سرمایہ داری کی مذمت کی ہے۔

کہتے ہیں کہ مرشد رومی نے کیسا دلپذیر نکتہ بیان کیا ہے:۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول
نعم مال "صالح" گوید رسول

یعنی اگر تو دین کی اشاعت کے لئے دولت حاصل کرے یا حاصل کر کے جمع کرے تو تیرا یہ فعل مذموم نہیں ہے۔ اور وہ دولت جو تو نے جمع کی ہے "کنز" کے ذیل میں نہیں آتی۔ بلکہ بقول سرکار ابد قرار وہ مال جو دینی امور میں خرچ کرنے کے لئے جمع کیا جائے مالِ صالح ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس نکتہ کو مدِ نظر نہ رکھے بلکہ حصولِ دولت کو مقصود بنا لے تو پھر

او غلام و خواجۂ او سیم و زر

یعنی دولت اس کا آقا اور وہ اس کا غلام ہو جائیگا۔ اس کی

تشریح تمہید میں ہو چکی ہے۔

کہتے ہیں کہ قوم کے تہی دست (مفلس) لوگ تو قوم کے حق میں کسی نہ کسی رنگ میں مفید ہو سکتے ہیں۔ مگر ایسے دولتمند جو سرمایہ داری اور اکتناز کو مقصود حیات سمجھتے ہوں۔ اور صرف دولت جمع کرنے ہی کے لئے جیتے ہوں۔ قوم کے حق میں مفید ہونے کے بجائے موجب فساد ہیں۔ کیونکہ وہ دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نہ خود اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کو دیتے ہیں۔

بعض ایسے ہیں جو صرف اپنی ذات پر صرف کرتے ہیں اور اسراف و تبذیر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بہر حال دونوں صورتوں میں عوام الناس ان کی دولت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اقبال کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ

ع از چنیں منعم فسادِ اُمتاں

اس کے بعد اقبال ان منعموں کی مذمت کرتے ہیں۔ جو اپنی دولت ذاتی آسائش اور عیاشی میں خرچ کرتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں ایک کوڑی بھی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) سرمایہ دار، مال و دولت کے پرستار، عیش کے بندے، دنیا کے غلام ہر وقت انقلاب سے خائف رہتے ہیں تو وہ قدامت پرست ہیں۔ اور پرانی لکیر کے فقیر۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ جو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام صدیوں سے مروّج ہے۔ وہ بدستور قائم رہے۔

وجہ یہ ہے کہ زر پرستی اور نفس پرستی نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ نیک و بد کی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔ ان کی نگاہ میں پرانی ناصواب

بھلائی (صواب) معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس غیر اسلامی زندگی اور غیر اسلامی نظام کو محبوب رکھتے ہیں۔ اور انقلاب کے نام سے ان کی روح کانپتی ہے۔

ان منعموں (سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں) کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ مزدوروں کی محنت کا پھل خود کھا لیتے ہیں اور ان کو نانِ شبینہ سے محروم کر دیتے ہیں۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اگر کسی مزدور کی لڑکی پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے تو اسے بھی "آبرو" سے محروم کر دیتے ہیں۔ نہ اللہ سے ڈرتے ہیں نہ قانون سے۔

جو لوگ (مزدور) ان کے کارخانوں یا کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ دن رات ان کا خون چوستے رہتے ہیں۔ وہ غریب مزدور رات دن نالہ و فریاد کرتے ہیں[1]۔ لیکن ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔

ان غریبوں کی حالت کس قدر قابلِ افسوس ہے۔ نہ ان کے پیٹ میں روٹی ہے نہ تن پر کپڑا ہے۔ رہا سوال سکونت کا، تو

کاخ ہا تعمیر کردہ خود بکوست

غریب مزدور ان سرمایہ داروں کے لئے شاندار کوٹھیاں

---

[1] مزدوروں کے نالہ و فریاد کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ہڑتال کرنا جلوس نکالنا، وزیروں کی کوٹھیوں کے سامنے مظاہرہ کرنا۔ ریزولیشن پاس کرنا۔ اور تنگ آکر بھوک ہڑتال کرنا۔ اور انجام کار لاٹھیاں کھانا۔

تعمیر کرتا ہے مگر خود سڑک (فٹ پاتھ) پر رہتا ہے۔[1]

آخر میں اقبال کہتے ہیں کہ مبارک ہے وہ دولتمند جو اپنی دولت کو اللہ کا عطیہ سمجھے اور اپنے آپ کو اس کا امین تصور کرے۔ اور اس لئے اس کو محتاجوں میں تقسیم کرتا رہے۔ اور لاکھوں کروڑوں کا مالک ہونے کے باوجود درویشوں کی سی زندگی بسر کرے۔ مبارک ہے وہ دولتمند جو اس دورِ مادیت میں اللہ کے قانون کی اطاعت کرے اور ہر وقت اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرے۔

---

## دوسرا ابیات:۔

کہتے ہیں کہ جب تک انسان "اکل حلال" کے نکتہ سے آگاہ نہ ہوگا۔ وہ دنیا میں آرام و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ آج ہر قوم کی زندگی بلا مبالغہ "وبال" ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیا کی تمام قوموں کا معاشی نظام سرمایہ داری اور سود پر مبنی ہے۔ اور سرمایہ داری اور سود میں دولت کی عادلانہ تقسیم ناممکن ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم کے پانچ چھ فیصد افراد تو ارب پتی اور کروڑ پتی ہیں۔ باقی پچانوے فیصد افراد مفلسی اور محتاجی کی زندگی بسر

---

[1] جسے شک ہو وہ پاکستان کے پایہ تخت کراچی میں چند روز قیام کر کے اپنی آنکھوں سے ان آفت کے ماروں کو سڑکوں کے کنارے یعنی فٹ پاتھ پر اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ ۱۲

کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سرمایہ داری اور سود خوری دونوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے بجائے ایسا معاشی نظام پیش کیا ہے جس کی رو سے دولت چند افراد میں گردش نہیں کر سکتی۔ اس کی تفصیل ہم تمہید میں درج کر چکے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ افسوس ہے کہ یورپ اس نکتہ سے آگاہ نہیں ہے کہ اکل حرام سے انسان کو حقیقی راحت اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔

ع چشم او منظر بنور اللہ نیست

اس مصرع میں تلمیح ہے۔ اس حدیث کی طرف:

اتقوا فراسۃ المومن لانہ ینظر بنور اللّٰہ۔

یعنی مومن کی فراست سے ڈرو۔ کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مومن کو دھوکہ دینے کی کوشش مت کرو۔ کیونکہ وہ قرآن سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ تمہارے فریب میں نہیں آ سکتا۔

یورپ کی قومیں حرام اور حلال میں تمیز نہیں کر سکتیں (کیونکہ وہ قرآنی تعلیمات سے بیگانہ ہیں) اس لئے ان کی حکمت ناقص ہے۔ ان کے غیر قانونی نظام زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنا غلام بنا رہی ہے۔ اور ہر طاقتور قوم کمزور قوم کا خون چوس رہی ہے۔

ان کی نگاہ میں حکمت یا دانائی اس بات میں منحصر ہے کہ کمزور قوم کو نانِ شبینہ سے بھی محتاج کر دیا جائے۔

تہذیبِ حاضر کا شیوہ (طریقہ) یہ ہے کہ طاقتور قومیں

کمزور قوموں کو فنا کردینے پر تلی ہوئی ہیں۔ اور یہ کام تجارت کے پردے میں انجام دے رہی ہیں۔ یعنی طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اقتصادی اور معاشی اعتبار سے اپنا غلام بناتی ہیں۔ پھر ان کا خون چوستی ہیں۔ چنانچہ یہودیوں نے بڑے بڑے بنک قائم کردیئے ہیں اور لوگوں کو معاشی اعتبار سے اپنا غلام بنا کر اللہ سے بیگانہ کردیا ہے۔

آخر میں اقبال ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ جب تک موجودہ معاشی نظام کو (جو سرمایہ داری اور سود خوری پر مبنی ہے) ختم کرکے اس جگہ اسلام کا معاشی نظام نافذ نہیں کیا جائیگا۔ اس وقت تک دنیا میں دینداری، خدا پرستی اور حقیقی تہذیب و تمدّن کو فروغ حاصل نہیں ہوسکتا۔

بات تو صحیح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب تک مسلمان خود اسلام کے اصولوں پر عامل نہ ہوں اس نظام کو ختم کون کرے؟

---

## تیسرا بند :-

جیساکہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے یہ بند اس فصل میں سب سے زیادہ غور طلب ہے۔ کیونکہ اس بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ شریعت کا منبع کہاں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ

(۱) اس دنیا میں ہر جگہ خیر و شر دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو موجود نہ ہوں اس لئے انسان بطور خود اس بات کا فیصلہ نہیں کرسکتا کہ نفع کس

پہلو میں ہے۔ اور نقصان کس پہلو میں ہے؟ بالفاظِ دگر وہ بطورِ خود اچھائی اور برائی کا معیار متعین نہیں کر سکتا۔ ایک شخص جس بات کو اچھا سمجھتا ہے۔ دوسرا اسے برا خیال کرتا ہے۔ اندریں حالات انسان ہدایتِ ربانی کا محتاج ہے۔ خدا چونکہ خالقِ کائنات ہے۔ اس لئے وہی اس بات کا علم رکھتا ہے کہ انسان کے لئے کونسا راستہ خوب، نیک ہے۔ اور کونسا راستہ زشت (بد) ہے۔

(۲) لہٰذا خدا نے بندوں کی راہنمائی کے لئے شریعت نازل کی شریعت سے مراد ہے اسلام۔

(۳) شریعت کا منبع انسان کے اعماقِ حیات میں پوشیدہ ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

شرع بر خیزد ز اعماقِ حیات
روشن از نورش ظلامِ کائنات

یعنی شریعت، حیات کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے (خارج سے انسان پر مسلط نہیں ہوتی) اور اس کے نور سے کائنات کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ یعنی انسان آگاہ ہو جاتا ہے کہ کونسا فعل زشت (بد) ہے اور کونسا خوب (اچھا) ہے۔

چونکہ یہ مصرع "شرع بر خیزد ز اعماقِ حیات" تشریح طلب ہے اس لئے ذیل میں اس کی وضاحت ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

## پہلی بحث

واضح ہو کہ اس شعر کا مفہوم حسبِ ذیل آیت سے ماخوذ ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۰ - ۳)

تشریح الفاظ:-

(۱) فاقم میں فائے غائبہ یا فائے فذلکہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ چونکہ ایسا ہے۔ ایسا ہے اس لئے تم ایسا کرو۔

(۲) اقم وجہک کے لفظی معنی ہیں۔ سیدھا کر اپنا منہ۔ مراد یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی تمام قوتوں کو دین پر مرکوز کر دو۔

(۳) "دین" کثیر المعانی لفظ ہے۔ یہاں اسلام مراد ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

(۴) حنیفا۔ حنف سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں حق و صداقت کی طرف میلان۔ حنیف وہ ہے جو حق کی طرف مائل ہو۔ اس لئے مرادی معنی ہوئے سب سے منہ موڑ کر۔

(۵) فطرت۔ فطر سے ماخوذ ہے فطر بمعنی شق کرنا۔ کثیر المعانی لفظ ہے۔ فطرت بمعنی خلقت۔ پیدائش، تراشش، طبیعت افتادِ طبع، سرشت، ساخت، جبلت، سانچہ، دین، طریقہ، ابتداء و اختراع۔

(۶) قیم۔ قوم سے مشتق ہے۔ بمعنی تقسیم، راست، ثابت، نگراں، ذمہ دار، محافظ۔ یہاں مراد ہے ایسا دین جو انکے معاشی، سیاسی اور دینی امور کا نگراں (مقوم) ہو۔

ترجمہ :-

پس تو سیدھا کر منہ اپنا واسطے عبادت کے دینِ ابراہیمی پر ہو کر (حنیف ہو کر) لازم پکڑ خدا کی پیدائش کو (اپنی فطرت کو) جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدائش میں تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی ہے دینِ درست مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں مطلب یہ ہے کہ تم ایک خدا کے ہو کر اسی کے دین کی طرف اپنا رُخ کئے رہو۔ یہ دین کیا ہے؟ وہی خدا کی بنائی ہوئی سرشت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ پس تم اسی فطرتِ الٰہیہ سے واقف ہو جاؤ۔ یعنی دین خود تمہاری فطرت ہے۔ اور تمہاری فطرت ہی دین ہے۔ خدا کی تخلیق میں کبھی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ فطرت میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی تمہاری فطرت "الدّین القیّم" ہے یعنی شریعت کا منبع خود تمہاری فطرت ہے اور یہ خود تمہارے اندر موجود ہے۔ باہر سے تم پر مسلط نہیں ہوتی ہے۔ یعنی شریعت کوئی خارجی دباؤ نہیں ہے بلکہ خود تمہاری فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کا دوسرا نام ہے۔

فطرت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں خَلقَۃً استعداد رکھی ہے۔ کہ اگر حق کو سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتا ہے۔ اور اگر اس کا اتباع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اقامتِ وجہ برائے دین کا حکم اس لئے دیا کہ یہ طرزِ عمل (توجہ بسوئے دین) خود انسانی فطرتِ سلیمہ کا مطالبہ ہے۔ اقامتِ وجہ للدین وہ فطرتِ الٰہیہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے

انسان کو پیدا کیا ہے۔ یعنی دین انسان کی سرشت کا دوسرا نام ہے۔ اور چونکہ انسانی سرشت میں کبھی کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا ہے اس لئے دین (اسلام) میں بھی کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یعنی اسلام، آغاز آفرینش سے لیکر قیامت تک بنی آدم کے حق میں دین قیم رہیگا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں آسکتا جب انسان دین اسلام سے بے نیاز یا بالاتر ہو سکے گا۔ اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کیونکہ دین اسلام تو انسانی فطرت ہی کا دوسرا نام ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ یہ فطرت اللہ کیا ہے؟ کہاں ہے اس کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا منبع کہاں ہے۔ ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ تمہیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اپنے اندر غور کرلو سب کچھ عیاں ہو جائیگا۔

دین ہی کا دوسرا نام شرع بھی ہے۔ تم پر خارج سے مسلط نہیں ہوا ہے۔ ہم نے تمہیں دین (فطرت) ہی پر پیدا کیا ہے۔ تمہاری فطرت اور تمہارے دین میں کوئی تبائن یا مغائرت نہیں ہے تمہاری فطرت (سرشت) ہی تمہارا دین ہے جیسا کہ فطر الناس علیہا سے ثابت اور آشکارا ہے۔

## دوسری بحث

اقبال نے اسی نکتہ کو اپنی بیش بہا تصنیف "تشکیل جدید" کے ساتویں لیکچر میں بایں انداز واضح کیا ہے۔

مذہبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

دورِ اول یا دورِ ایمان

دورِ ثانی یا دورِ تحقیق

دورِ ثالث یا دورِ دریافت

اس تیسرے دور میں نفسیات مابعد الطبیعات کی جگہ لے لیتی ہے اور مذہبی زندگی انسان کے اندر حقیقتِ اخریٰ سے براہِ راست رابطہ قائم کرنے امنگ (آرزو) پیدا کر دیتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر مذہب انسان کے لئے زندگی اور اقتدار کو ذاتی طور پر اپنے اندر جذب کر لینے کا دوسرا نام ہو جاتا ہے۔ اور فرد کو حرّیت کاملہ حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح نہیں کہ وہ شریعت کی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے (یہ بھی حرّیت کی ایک صورت ہے) بلکہ اس طرح کہ وہ اس صداقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ کہ شریعت کا آخری منبع خود اس کے شعور کی گہرائی میں موجود ہے ص۱۸۱

خلاصہ کلام اینکہ

(۱) دین (شرع) کیا ہے اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

(۲) دین کی ماہیت کیا ہے۔؟ خود تمہاری فطرت

(۳) اسلام کیا ہے؟ تمہاری فطرت کے تقاضوں کا صحیح علم

(۴) شریعت کیا ہے؟ ان تقاضوں کی تسکین کا سامان

(۵) اصلی تقاضا (جن پر تمام تقاضے مبنی اور موقوف ہیں) کیا ہے۔؟

کسی کامل، بے عیب، پاکیزہ، حسین وجمیل، مجمع کمالات ذات سے محبت کرنا۔ مگر انسان کسی غلطی (رسم پرستی) تقلید، ماحول، جہالت جذبات، تعصب کی وجہ سے کسی ناقص ہستی کو (کامل سمجھ کر) اپنا محبوب (آئیڈیل) بنا لیتا ہے۔

(۶) قرآن کیا ہے؟ محبوب حقیقی (کامل بے عیب ذات) کی صفات کا روشن ترین اور دلکش ترین بیان ہے۔ تاکہ عاشق کسی ناقص ہستی کو اپنا محبوب بنا کر اپنی زندگی تباہ نہ کر لے۔

(۷) اسی لئے مرشد رومی ہمیں آگاہ فرماتے ہیں۔

عشق آں زندہ گزیں کو باقی است
وز شراب جاں فزائیت ساقی است

یعنی عورت، دولت اور زمین کو محبوب مت بناؤ۔ کیونکہ یہ تینوں چیزیں فانی ہیں۔ اس لئے ان سے دل لگانے کا نتیجہ مایوسی ناکامی اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کی بجائے اس حیّ القیوم سے عشق کرو۔ جو ہمیشہ زندہ رہیگا۔ بلکہ تمہیں بھی ہمیشگی عطا کرے گا[1]

(۸) اس سے عشق کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ حنیف بن جاؤ۔

صد کتاب و صد ورق درنار کن
روئے خود را جانب دلدار کردن در اصل" اقم وجہک للدین

---

[1] فَلَهُمْ غَيْرُ مَمْنُونٍ (۹۵-۶)
پس ان کے لئے وہ اجر ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا - ۱۲

حنیفا" کا فارسی میں ترجمہ ہے۔

(۹) یہ رنگ یعنی "حنف" کیسے پیدا ہو۔؟

قال رابگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

یعنی منطقی بحثوں میں الجھنے کے بجائے کسی مرد کامل (شیخ طریقت) کی صحبت اختیار کرلو۔ وہ تمہارا رشتہ سب سے توڑکر محبوب حقیقی سے جوڑ دیگا۔

چوتھا شعر:-

گر جہاں واندر حرامش را حرام الخ

اگر دنیا کے لوگ شریعت اسلامیہ کے سامنے سر تسلیم خم کردیں۔ اس کے حلال کو حلال اور جن باتوں کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ ان کو حرام سمجھیں تو یہ نظام قیامت تک بنی آدم کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

پانچواں شعر:-

نیست ایں کار فقیہاں اے پسر الخ

لیکن علمائے ظواہر اسرار شریعت سے آگاہ نہیں ہو سکتے ان کو سمجھنے کے لئے عشق رسول لازمی ہے۔

عم "بانگاہِ دیگرے او را نگر" میں نگاہِ دیگرے سے عاشق (صوفی) کا زاویۂ نگاہ مراد ہے۔ جو محبوب کے احکام کی تعمیل میں مطلق چوں و چرا نہیں کرتا۔ اقبال کی رائے میں فقہا صرف شریعت کے ظاہری پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ صرف

اتنا بتا سکتے ہیں کہ شریعت فلاں فلاں باتوں کا حکم دیتی ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ ان باتوں پر عمل کیسے کیا جائے؟ وہ اس نکتہ سے واقف نہیں ہیں کہ جب تک ایک مسلمان مسلکِ عشق اختیار نہ کرے وہ شرعی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

چھٹا شعر:۔

حکمش از عدل است و تسلیم و رضا ست الخ

یعنی شریعتِ اسلامیہ انسان کو عدل کرنے اور اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت کا حکم دیتی ہے۔ یعنی شریعت اسلامیہ کی روح یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو۔ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں شیوۂ تسلیم و رضا کہتے ہیں۔ اور ایک مسلمان کی تمام روحانی ترقی اسی مسلکِ تسلیم و رضا پر موقوف ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں مسلمانوں کو شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ ذیل میں چند اشعار درج کرتا ہوں:۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

(اسرار خودی)

برون کشید ز پیچاک ہست و بود مرا
چہ نکتہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا

(زبور عجم)

حسین و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیل

(بالِ جبریل)

دیں سراپا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق و آغازش ادب

(جاوید نامہ)

واضح ہو کہ دین اسلام کا مفہوم تسلیم و رضا، کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ صداقت آیتِ ذیل سے آشکارا ہوسکتی ہے کہ اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن یا سرِ تسلیم خم کردن یا احکامِ شرع کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔

فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۵ (۳۷-۱۰۳)

جب ابراہیم اور اسماعیل دونوں نے ہمارے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور باپ (ابراہیم) نے بیٹے (اسماعیل) کو ہماری راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔

عہ بیخ او اندر ضمیر مصطفےٰ است

یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں شریعت کی دولت عطا فرمائی ہے۔ اور آپ ہی نے ہمیں شیوۂ تسلیم و رضا کی تعلیم دی ہے۔

میری رائے میں "بیخ او" میں "او" کا مرجع "تسلیم و رضا" ہے۔ لیکن اگر "او" کا مرجع "شرع" کو قرار دیا جائے۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ شریعت کا منبع فطرتِ انسانی ہے۔ اور آپ نے ان ہی فطری

تقاضوں کی تکمیل کا مکمل ضابطہ یا دستور عطا فرمایا ہے۔ اس لئے "ضمیر مصطفیٰ" یا قلب نبوی جو مہبط وحی ہے بمنزلہ بیخ شریعت ہے۔ یعنی اگر آپ کی ذات نہ ہوتی تو ہم شریعت کی دولت سے بہرہ ور کیسے ہوتے؟

## ساتواں اور آٹھواں شعر:-

یہ دو شعر بطور جملہ معترضہ ہیں۔ اور اس جملہ معترضہ کو مضمون کے درمیان لانے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ بعض صوفیہ حالاتِ صحو پر حالتِ سکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اقبال ان سے متفق نہیں ہیں۔ اس لئے ان دو شعروں میں انہوں نے ان حضرات سے اختلافِ رائے کر کے اپنا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ یعنی

ع وصل او کم جو، رضائے او طلب

ذیل میں اس اجمال کی تفصیل کرتا ہوں:-

(۱) حالتِ صحو، تصوف کی اصطلاح میں ہوشیاری کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ حالت جس میں صوفی (طالبِ مولیٰ) اپنے ہوش و حواس میں رہ کر شریعت محمدیہ کا اتباع کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے روحانی مدارج حاصل کرتا ہے۔ اصطلاح میں اس کو "سلوک" کہتے ہیں۔ اور وہ شخص "سالک" کہلاتا ہے۔ اس حالت میں سالک کو اپنی انفراد بہت کا احساس باقی رہتا ہے۔ اقبال نے اس حالت میں سالک کو "فراق" سے تعبیر کیا ہے۔ بعض صوفیہ نے اس حالت کو گستن سے بھی تعبیر کیا ہے۔ خلاصہ کلام اینکہ حالت صحو یا سلوک یا فراق یا گستن میں طالب "من و تو" میں امتیاز کرتا ہے۔ اور بقائمی ہوش و حواس

اتباع شریعت کرتا ہے۔ یعنی اس کی رضا طلب کرتا ہے۔

(۲) حالت سکر:۔

یہ وہ حالت ہے جس میں طالب پر شدت جذبات سے عالم بیخودی طاری ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اور اس پر مستی کی کیفیت غالب آجاتی ہے اس لئے وہ اتباع شریعت سے معذور ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو جذب یا ہوستن سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے اسے وصل سے تعبیر کیا ہے۔ اور طالب کو "مجذوب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس حالت سکر یا جذب یا بیخودی میں طالب "من و تو" میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

خدا رسی کے یہ دو طریقے دنیائے تصوف میں مشہور ومعروف ہیں۔ چنانچہ اسی بناء پر صوفیوں میں بعض سالک گذرے ہیں اور بعض مجذوب۔ سالک ہمیشہ ہوشیار رہتا ہے۔ اور مجذوب کبھی ہوشیار نہیں ہوتا۔ اقبال نے اس شعر میں ان دونوں حالتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قلب او را قوت از جذب و سلوک
پیش سلطاں نعرۂ او لا ملوک

اس تمہید کے بعد اب ہم دونوں شعروں کا مطلب بیان کرتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تیرے دل میں جو اُس سے ملنے کی آرزو موجزن ہے۔ یہ اسی وقت تک ہے جب تک تو

حالت صحو (فراق) میں ہے۔ یعنی جب تک تیرے اندر مغائرت کا احساس باقی ہے یہ احساس تجھے ملاقات کی کوشش پر اکساتا رہیگا۔ اور تو ہر آن مراحلِ شوق طے کرتا رہے گا۔ یعنی روحانی عروج حاصل کرتا رہے گا۔ تیرے قلب پر ہر لحظہ نئی تجلّی ہوتی رہے گی اور چونکہ تجلیات لاانتہا ہیں اس لئے تو ابد الآباد تک مسلسل ترقی کرتا رہے گا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

لیکن اگر وہ بے حجاب ہو کر تیرے سامنے آجائے تو یہ یقینی بات ہے کہ تو تجلّی ذات کی تاب نہیں لاسکے گا۔ یعنی تو باقی نہیں رہیگا اور جب تو ہی باقی نہ رہا۔ تو ترقی کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔

ستارے رات کے وقت جگمگاتے ہیں۔ کیونکہ آفتاب حجاب میں ہوتا ہے۔ لیکن جب صبح کے وقت آفتاب بے حجاب ہوتا ہے تو تمام ستارے کالعدم ہو جاتے ہیں۔ جب ستارے آفتاب کی تاب نہیں لاسکتے تو ذرا سوچ کہ تو خالقِ آفتاب کی تاب کس طرح لاسکتا ہے؟ جب حضرت موسیٰ اس کی صفت تجلّی کی تاب نہ لاسکے (حالانکہ اس نے براہِ راست تجلّی نہیں فرمائی تھی۔ بلکہ طور کو واسطہ بنایا تھا) تو کوئی شخص اس کی ذاتی تجلّی کی تاب کیسے اور کیونکر لاسکتا ہے؟

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (۷-۱۴۳)

پس تجلّی فرمائی اس کے رب نے بواسطہ جبل (یعنی جب اللہ

نے پہاڑ پر اپنی تجلّی ڈالی) تو کر دیا اسے ریزہ ریزہ اور گر پڑے حضرت موسیٰ بیہوش ہو کر۔ ۱۲

اندریں صورت تیرے لئے انسب اور اولیٰ یہی ہے کہ اگرچہ جدائی سے تو جاں بلب ہو جائے تو بھی حالتِ صحو ہی کو ترجیح دے۔ یعنی۔

وصل او کم جو رضائے او طلب

وصل یا حالتِ سکر کے بجائے حالت صحو میں رہ کر اس کی رضا، طلب کرتا رہ! بالفاظِ دگر! محبوب سے وصل کے مقابلہ میں اس کا فراق تیرے لئے مفید ہے۔ یہ سچ ہے کہ تیرا المقصود "خدا رسی" ہے۔ مگر اس کا ذریعہ جذب نہیں ہے بلکہ سلوک ہے۔ وصل نہیں ہے بلکہ رضاء ہے۔ وصل کی طلب مت کر اس کی رضا طلب کر۔ کیوں؟ اس لئے کہ

مصطفےٰ داد از رضائے او خبر
نیست در احکامِ دیں چیزے دگر

یعنی سرکار ابد قرار صلعم نے طلب وصل کی تعلیم نہیں دی بلکہ طلبِ رضا کی تعلیم دی ہے۔ آپ ساری عمر سالک رہے ساری عمر اس کی رضا، طلب کرتے رہے۔

نوٹ:۔ بیشک مجذوب بھی اسے حاصل کر لیتا ہے مگر وہ دوسروں کو اس تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے برعکس سالک جب اس تک پہنچ جاتا ہے۔ تو دوسروں کو بھی اس لذت سے آگاہ کر سکتا ہے۔ جو اسے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے سالک کا مرتبہ اور مقام، مجذوب

کے مرتبہ اور مقام سے بہت اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی "مجذوب" نہیں ہوا۔ بالفاظ دگر، اللہ نے کسی مجذوب کو نبوت سے نہیں نوازا۔ کیونکہ مجذوب نہ دوسروں کی اصلاح کر سکتا ہے اور نہ فریضۂ ہدایت انجام دے سکتا ہے۔

اے مخاطب! تو خود قرآن اور حدیث کا مطالعہ کر لے تو تجھے معلوم ہو جائیگا کہ احکام دین یعنی شریعت محمدیہ میں ہر جگہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی رضا طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تمام شریعت کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں بیان کرنا مطلوب ہو تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

شریعت: امترضاہ باری تعالےٰ کا دوسرا نام ہے۔

قرآن کی رو سے مقصود مومن صرف ایک بات ہے اور وہ یہ کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے اور جسے شریعت کہتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ مگر اللہ کو راضی کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ یعنی وہ طریقہ جو خود اللہ تعالیٰ نے بواسطہ سرکار ابد قرار صلعم اپنے بندوں کو بتایا ہے۔

دسواں شعر:-

تخت جم پوشیدہ زیر بوریاست
فقر و شاہی از مقامات رضاست

بہت بلیغ اور بلند پایہ شعر ہے۔ اور اس میں اقبال نے خود ہی گذشتہ شعر کی شرح کر دی ہے۔ یعنی مقصود حیات نہ تخت جم ہے نہ بوریا۔ نہ فقر ہے نہ شاہی نہ مفلسی ہے نہ تونگری نہ سلطنت ہے نہ گدائی۔ نہ فتح ہے نہ شکست۔ بلکہ صرف یہ کہ اللہ

ہم سے راضی ہو جائے۔ چنانچہ جس بوریا نشین نے اللہ کو راضی کر لیا اسے بوریئے پر تختِ شاہی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ تختِ شاہی کی اس بوریئے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔

مثال درکار ہو تو تاریخ اسلام کا مطالعہ کافی ہوگا۔ مثلاً شمس الدین التمش با ایں ہمہ کر و فر۔ اسی درویشِ بے نوا کے سامنے دست بستہ حاضر ہوا کرتا تھا۔ جسے دنیا خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے نام سے یاد کرتی ہے۔

فقیری (بوریا) اور شاہی (تخت) یہ دونوں رضا کے مقامات ہیں۔ اللہ کے بعض بندوں مثلاً سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی رح نے بوریئے پر بیٹھ کر اس کی رضا (خوشنودی) حاصل کر لی۔ اور بعض مثلاً حضرت عمر رض نے دنیائے اسلام پر فرمانروائی کر کے اسے راضی کر لیا۔

بالفاظِ دگر، جب اللہ کسی بندے سے راضی ہو جاتا ہے تو اس کو سلطان صلاح الدین ایوبی بنا دیتا ہے۔ اور کسی دوسرے سے راضی ہو جاتا ہے۔ تو اس کو خواجہ فرید الدین گنج شکر رح بنا دیتا ہے دنیا جانتی ہے کہ دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں بادشاہت ہی کی۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
وہ نگہ کی تیغ بازی یہ سپہ کی تیغ بازی

## گیارھواں شعر:-

چونکہ شریعت (اسلام) نام ہے تسلیم و رضا (اطاعت) کا اس لئے اے مسلمان! تو امیر قوم (سلطان) کے حکم کی تعمیل کر

اور کسی حال میں بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لا۔ کیونکہ

ع روز میداں نیست روز قیل و قال

مطلب یہ ہے کہ جس طرح میدانِ جنگ میں کوئی سپاہی اپنے افسر سے بحث نہیں کر سکتا۔ بلکہ بلا چوں و چرا اُس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اسی طرح مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے امیر (امام) کے احکام کی تعمیل کرے۔

اس مصرع میں "روز میداں" کی ترکیب بہت ہی معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سپاہی تو دو چار مرتبہ ہی میدانِ جنگ میں جاتا ہے۔ مگر مسلمان کی پوری زندگی بمنزلۂ عرصۂ جنگ ہے۔ کیونکہ وہ تو پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔

اقبال نے یہ مصرع ایسا لکھا ہے کہ مسلمان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ گویا دو لفظوں میں اس کی پوری زندگی کی داستان بیان کر دی ہے۔ یعنی اقبال مسلمان سے کہتے ہیں کہ تمہاری پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ تم تو تادمِ وفات میدانِ جنگ میں ہو۔ اور چونکہ میدانِ جنگ میں کوئی سپاہی قیل و قال (چوں و چرا) نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے سردار کی اطاعت کرتا ہے۔ اس لئے تم بھی اپنے امام کی اطاعت کرو۔ اب ہم اقبال کی اس تعلیم کو آیاتِ قرانی سے مبرہن کرتے ہیں۔

(۱) جب ایک شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتا ہے تو ایمان لانے کے بعد وہ اللہ سے ایک معاہدہ کرتا ہے۔ ان دونوں باتوں میں منطقی لزوم پایا جاتا ہے۔ کلمۂ شہادت زبان سے ادا

کرنے اور دل سے اس کی تصدیق کرنے کے بعد اللہ سے معاہدہ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ معاہدہ نہیں کرتا تو وہ اپنے عمل سے اپنے اس قول کی (کہ میں مسلمان ہوں) تکذیب و تردید و تغلیط کر دیتا ہے۔ لہٰذا اعلان اسلام کے بعد معاہدہ ناگزیر (لازمی) ہے۔

(ب) معاہدہ یہ ہے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال دونوں چیزیں اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اور اللہ ان کے عوض اپنی جنت دینے کا وعدہ فرماتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ط (۹-۱۱۲)

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ (تعالیٰ) نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ لہٰذا (اس کے بعد) وہ اپنی پوری زندگی جہاد میں بسر کر دیتے ہیں۔ یعنی قتل کرتے ہیں اور قتل ہو جاتے ہیں۔

(ج) ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مقصود حیات، اللہ کو راضی کرنا ہے اور اللہ صرف ان لوگوں سے راضی ہوتا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا (۶۱-۴)

بلاشبہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر جنگ کرتے ہیں (گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں)

(د) چونکہ دل میں یہ خیال گزر سکتا تھا۔ کہ شاید مجھے کثرتِ اعداد (مشرکین) کی وجہ سے غلبہ حاصل نہ ہو سکے۔ اور میں ناکام ہو جاؤں اس لئے اللہ نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا۔ کہ اللہ کی فوج کبھی مغلوب نہیں ہو سکے گی۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ؕ (۵-۵۶)

بیشک اللہ کی فوج ہی غالب آئیگی۔

(ڈ) مزید اطمینان کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرما دی ہے کہ ہر گاہ تمہارا مقصودِ حیات یہ ہے کہ ہم تم سے راضی ہو جائیں۔ تو آگاہ ہو جاؤ کہ اگر تم ہماری فوج میں اپنا نام درج کرا لو گے تو ہم تم سے راضی ہو جائیں گے۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ (۵۶-۱۲)

مومنوں کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے کبھی رشتۂ مودت استوار نہیں کر سکتے۔ خواہ وہ ان کے والدین یا فرزند ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ ان مومنوں کو جنت میں داخل کریگا۔ اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا۔ اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہی ہے اللہ کی جماعت یا فوج۔

بارھواں شعر:

سالفہ شعر کی تائید میں کہتے ہیں کہ اے مسلمان! جہاں تک ممکن ہو۔ اللہ کے احکام (شریعت) سے سرتابی مت کر (اگر تو اس کے احکام کی اطاعت کریگا) تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا میں کوئی شخص

تیرے احکام سے سرتابی نہیں کریگا۔ اگر تو اللہ کا مطیع ہو جائے تو دنیا تیری مطیع ہو جائیگی۔ یہ مضمون سعدیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد زحکم تو ہیچ

مثال درکار ہو تو حضرات خواجگان چشت رحؒ کی پاکیزہ اور مبارک زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔ چونکہ یہ حضرات اللہ (شریعت) کی اطاعت کرتے تھے۔ اس لئے ساری دنیا ان کی اطاعت کرتی تھی۔ بادشاہوں سے لیکر عوام تک ساری مخلوق ان کے آستانہ پر دست بستہ حاضر رہتی تھی۔ اور ان کی کفش برداری کو اپنے لئے موجب سعادت یقین کرتی تھی۔

آخری شعر:-

اے مخاطب! اگر تو شریعت کی پابندی کریگا۔ تو تجھ پر اس آیت کی حقیقت منکشف ہو جائیگی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۵ (۹۵-۴)

ہم نے انسان کو بہترین انداز، بہترین ساخت اور بہترین سانچہ میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔

اقبال مسلمان سے کہتے ہیں کہ اگر تو شریعت کی اتباع کرے تو بلاشبہ تو اس آیت کا مصداق بن سکتا ہے۔ یعنی تیری تمام پوشیدہ صلاحیتیں اور استعدادیں بالفعل ظاہر ہو سکتی ہیں۔ اور ان کے ظہور کے بعد تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی۔ کہ

ہیں واقعی احسن تقویم پر پیدا ہوا ہوں۔

اور جب یہ صداقت تجھ پر واضح ہو جائیگی تو قدرتی طور پر تیرے اندر ابراہیمی ایمان (کامل ایمان) پیدا ہو جائیگا۔

---

## چوتھا بند:۔

اس بند کے پہلے سات شعر بہت غور طلب ہیں۔ ان میں اقبال نے مسئلہ جبر و قدر کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(ب) اشعار ۸ تا ۱۲ میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے کہ

مصرعہ: درجہاں اسرارِ دیں را فاش کن

(ج) آخری چھ اشعار میں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے اور مسلمان کو عمل کی دعوت دی ہے۔

---

پہلا شعر:۔

اے مخاطب! یہ تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ شرع خارجی سے انسان پر مسلط نہیں ہوتی۔ بلکہ خود اس کی حیات کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے بالفاظِ دیگر! شریعت اس کی فطرت کے تقاضوں کا دوسرا نام ہے۔ اب اگر تو یہ سوال کرے کہ طریقت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ طریقت شریعت سے کوئی مختلف النوع چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس صداقت کو بچشمِ خود دیکھنے کا نام ہے کہ

مصرعہ: شرع برخیزد ز اعماق حیات

(۱) شریعت کا منبع، اعماقِ حیات ہے۔

یہ ایک صداقت ہے جس طرح یہ دوسری صداقت ہے کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن ایک اور دو کی نسبت سے ملا دیا جائے تو پانی بن جاتا ہے۔

(۲) اب اگر کوئی شخص اس صداقت کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے تو اس کا یہ دیکھنا طریقت ہے۔ جس طرح اگر کوئی شخص آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملا کر دیکھ لے تو اس کے اس دیکھنے کو مشاہدہ کہتے ہیں۔

جس طرح سائنس میں دو چیزیں ہیں علم اور عمل جن کو تھیوری اور پریکٹس کہتے ہیں۔ اسی طرح مذہب میں دو چیزیں ہیں علم اور عمل جن کو شریعت اور طریقت کہتے ہیں۔

شریعت :۔ مذہب کا علمی پہلو

طریقت :۔ اسی مذہب کا عملی پہلو۔

عالم زبان سے کہتا ہے کہ

شرع بر خیزد ز اعماقِ حیات

عارف اس صداقت کو بچشم خود دیکھتا ہے

گویا شریعت شنید ہے، طریقت دید ہے۔

مرشدِ رومی فرماتے ہیں :۔

بدانکہ شریعت ہمچو شمع است کہ راہ می نماید، تا شمع بدست نیاری راہ رفتہ نہ نشود (دکارے کردہ نگردد) چوں در راہ آمدی ایں رفتن تو طریقت است و چوں بمقصود رسیدی، ایں رسیدن تو حقیقت است۔

(دیباچہ دفترِ پنجم)

یعنی اے مخاطب! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ شریعت وہ شمع ہے جو سالک کو راہ دکھا سکتی ہے (لیکن جب تک کوئی شخص چلنا شروع نہ کرے محض شمع اس کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی) جب تو نے شمع ہاتھ میں لیکر چلنا شروع کیا۔ تو یہ تیرا چلنا طریقت ہے۔ (یعنی طریقت شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ شریعت پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے) اور جب تو منزلِ مقصود کو پہنچ گیا تو یہ تیرا پہنچنا حقیقت ہے۔"

عالم یا فقیہہ صرف زبان سے کہہ دیتا ہے کہ شریعت کا منبع خود انسان کی فطرت ہے۔ یا شریعت انسان کے ضمیر کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے۔ لیکن صوفی اس قول پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے کہ واقعی ایسا ہی ہے۔

اسی لئے فقہا کو اربابِ قال اور صوفیہ کو اربابِ حال کہتے ہیں۔

عالم جو بات منہ سے کہتا ہے عارف اس پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔

گفت دین عامیاں ؟ گفتم شنید
گفت دینِ عارفاں ؟ گفتم کہ دید

(جاوید نامہ)

واضح ہو کہ یہ دیکھنا ایک فن ہے۔ اور جس طرح کوئی طالب علم لیبارٹری میں داخل ہوئے بغیر اور ڈیمانسٹریشن (استاد) کی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر اپنے پڑھے ہوئے پر عمل نہیں کر سکتا۔ یعنی بالفعل آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملا کر پانی نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح کوئی طالب حق (سالک) خانقاہ میں داخل ہوئے بغیر اور مرشد (شیخِ طریقت) کی توجہ اور رہنمائی و تلقین کے بغیر اپنے پڑھے ہوئے پر عمل نہیں کر سکتا

یعنی بالفعل نہیں دیکھ سکتا۔ کہ واقعی شریعت میری حیات کی گہرائیو سے ابھر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں بزرگانِ دین نے مسلمانوں کو صحبتِ شیخ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور اسی لئے قرآنِ حکیم نے آفاق کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہمیں "نفس" میں بھی غوطہ زن ہونے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَ فِی الارضِ آیاتٌ لِلموُقنِینَ وَ فِی اَنفُسِکُم ط
اَ فَلاَ تبُصِرُونَ ط

یقین کرنے والوں کے لئے ہماری قدرتِ کاملہ کی نشانیاں زمین میں (بھی) موجود ہیں اور خود تمہارے نفسوں میں بھی۔ پس تم غور سے کیوں نہیں دیکھتے ط (۵۱-۲۱)

واضح ہو کہ طریقت اسی حکم "تبصُرُونَ" پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جب سالک تبصرہ کرتا ہے یا اپنے نفس میں غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جسے میں خارج سے اپنے اُوپر مسلط سمجھ رہا تھا۔ وہ خود میرے ہی ضمیر کی گہرائیوں سے اُبھر رہی ہے۔ یعنی شریعت جسے میں کسی خارجی طاقت کا دباؤ (جبر) گمان کر رہا تھا۔ وہ تو خود میری ہی فطرت کی اندرونی آواز ہے بالفاظِ دگر شریعت جسے میں سمجھ رہا تھا کہ خدا نے اپنی مرضی سے مجھ پر عاید کردی ہے۔ وہ تو میری ہی فطرت کے تقاضوں کی تسکین کا دوسرا نام ہے۔

یہ وہ حالت ہے۔ جب سالک اس صداقت کو بطور خود دریافت (Discovery) کرتا ہے۔ جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (۳۰ - ۳۰)

اور جب وہ اسی حقیقت کو دریافت کرلیتا ہے تو اُسے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ میں تو آزاد ہوں، حریت کاملہ سے سرفراز ہوں۔ اگر شریعت کی اتباع کرتا ہوں تو کسی غیر کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا بلکہ خود اپنی ہی فطرت کے تقاضوں کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہوں۔

اسی حقیقت کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے۔

مذہبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے دور کو دورِ ایمان، دوسرے کو دور عقل اور تیسرے کو دورِ ریاضت وشہود کہہ سکتے ہیں۔ اس تیسرے دور میں نفسیات، منطقی بحثوں اور عقلی دلیلوں کی جگہ لے لیتی ہے۔ یعنی انسان اپنے اندر، اپنے ضمیر کی گہرائی میں غوطہ زن ہوتا ہے اور مذہبی زندگی سالک کے دل میں یہ آرزو پیدا کر دیتی ہے کہ حقیقت اخریٰ سے براہِ راست رابطہ پیدا کیا جائے۔ یہی آرزو جب مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو عرف عام میں اسے عشق سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر مذہب انسان کو زندگی اور قوت سے بہرہ اندوز کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور فرد کی شخصیت، حریت سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے یہ حریت اس طرح حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو شریعت کی قیود سے آزاد کر لیتا ہے۔ بلکہ اس طرح کہ وہ اس حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے کہ شریعت کا منبع خود اس کے شعور کی

گہرائیوں میں ہے۔

اس مفہوم کو مدِ نظر رکھ کر ہم مذہب کو تصوف سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یعنی تصوف نام ہے اس حقیقت کے مشاہدہ کا، کہ شریعت خود انسان کے شعور کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے خارج سے اس پر مسلّط نہیں ہوتی۔

افسوس ہے کہ لفظ تصوف آج کل بہت بدنام ہو چکا ہے یعنی اس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ زندگی سے انکار کرنے اور حقائق سے گریز کرنے کا نام ہے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ مذہب جو اپنے اعلیٰ مفہوم کے اعتبار سے وسیع تر زندگی کی جستجو کا نام ہے، اپنی اصل کے اعتبار سے تجربہ اور مشاہدہ کا دوسرا نام ہے۔

(تشکیلِ جدید خطبۂ ہفتم ص۱۴۱)

اقبال کے اس اقتباس کا مطلب یہی ہے کہ تصوف، مذہب کی روح ہے اور جب تک انسان مسلکِ تصوف پر گامزن نہ ہو وہ اس حقیقت کو دریافت نہیں کر سکتا کہ شریعت کا منبع خود انسان کے ضمیر میں پوشیدہ ہے۔

میں اس پر اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ صرف عشق میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کو اس مقام پر پہونچا سکتا ہے جہاں پہونچکر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے یعنی بچشم خود دیکھ سکتا ہے کہ شریعت خارج سے مجھ پر مسلط نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کا منبع خود میری ذات (فطرت) میں موجود ہے۔

جب انسان پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے تو وہ احکامِ شرعی کا اتباع بغیر کسی خارجی دباؤ کے کرنے لگتا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو مجبور نہیں سمجھتا۔ بلکہ بطیب خاطر اتباعِ شریعت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے میں، میں خود اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہوں۔

دوسرا شعر:-

اے مخاطب! اگر تو اپنے دین کے اسرار (پوشیدہ حقائق) سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوجا۔ اس کو تصوف کی اصطلاح میں سیر النفس یا مراقبہ کہتے ہیں۔

تیسرا شعر:-

اگر تو اس حقیقتِ مذکورہ کا مشاہدہ نہیں کریگا تو تیرے اندر "جبر" کا رنگ پیدا ہوجائیگا۔ یعنی تو اپنے آپ کو مجبور سمجھے گا اور جو شخص اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے وہ خدا سے دور ہوجاتا ہے۔

چوتھا شعر:-

یاد رکھو جب تک انسان اس حقیقت کا بطور خود مشاہدہ نہ کرے کہ شریعت کا منبع خود میرے اندر موجود ہے (شریعت خارج سے مجھ پر مسلط نہیں ہوتی ہے) وہ جبر و اختیار کی الجھن سے نجات نہیں پا سکتا۔ یعنی اگر وہ یہ سمجھتا رہے گا کہ شریعت خارج سے مجھ پر مسلط ہوگئی ہے تو وہ احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کریگا۔ جس طرح ایک غلام یا مزدور اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ یعنی وہ تعمیلِ احکام میں اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے۔ لیکن

اگر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے کہ تعمیل احکامِ شرعی، خود میری فطرت کا اقتضا ہے۔ تو پھر وہ جبر کے دائرے سے نکل کر حریت (اختیار) کے مقام پر پہنچ جائے گا۔

واضح ہو کہ اقبال نے مسئلہ جبر و اختیار کی بحث اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر اٹھائی ہے۔ اور مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ ذیل میں ان کی تصانیف سے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

(ا) در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

(اسرارِ خودی)

(ب) چہ گویم از چگوں و بے چگونش
بروں مجبور و مختار اندرونش
چنیں فرمودہ سلطان بدر است
کہ ایماں درمیان جبر و قدر است

(گلشن راز جدید)

(ج) بال بازاں را سوئے سلطاں برد
بال زاغاں را بگورستاں برد

(بال جبریل)

(د) جبر دین مردِ صاحب ہمت است
جبر مرداں از کمال قوت است
جبر خالدؓ عالمے برہم کند
جبر ما بیخ و بن ما بر کند

(جاوید نامہ)

ان اشعار میں اقبال نے جبر و قدر کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ ان کی تشریح میں ان کتابوں کی شرح میں درج کر چکا ہوں یہاں اس شعر کی وضاحت میں چند باتیں لکھنی چاہتا ہوں۔

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار
برنمی آید ز جبر و اختیار

واضح ہو کہ یہاں اقبال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان من کل الوجوہ مختار بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بات تو سلطان بدر سرکار ابد قرار صلعم کے ارشاد کے خلاف ہے۔ حضور نے اس حقیقت کو خود واضح کر دیا ہے۔

ع کہ ایماں درمیاں جبر و قدر است

یعنی مسلمان وہ ہے جو یہ تسلیم کرے کہ "الایمان بین الجبر والاختیار" یعنی انسان بعض معاملات میں مجبور ہے۔ اور بعض میں مختار۔

یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ کوئی شخص ہر اعتبار سے مختار نہیں ہو سکتا۔ بعض امور میں یقیناً مجبور ہے۔ لیکن یہاں اقبال جس چیز کی نفی کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ میں شریعت کے یہ احکام کی تعمیل پر مجبور ہوں۔ اور اس غلطی کا منبع یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ شریعت خارج سے مجھ پر مسلط ہو گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر تم "حق" کو دیکھ لو۔ اور یہاں لفظِ حق سے مراد ہے یہ حقیقت کہ

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات

یعنی شریعت خود انسان کے ضمیر کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے (شریعت کا منبع خود اس کی فطرت میں مرکوز ہے) تو پھر تم تعمیل احکام شرعی میں اپنے آپ کو مجبور قرار نہیں دو گے بلکہ بخوشی شریعت کے احکام کی تعمیل کرو گے کہ میں کسی خارجی دباؤ کے تحت ایسا نہیں کر رہا ہوں بلکہ خود اپنی فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہوں۔ یعنی خود فطرت انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ احکام شریعت کی تعمیل کی جائے۔

## پانچواں شعر:-

لہٰذا اے مخاطب! تو اپنی فطرت کا مطالعہ کر (مطالعہ فطرت کو اصطلاح میں مراقبہ کہتے ہیں) تجھے معلوم ہو جائیگا کہ اسلام تیری فطرت کے عین مطابق ہے۔ یعنی شریعت اسلامیہ، فطرتِ انسانی سے مطابقتِ کلی رکھتی ہے۔

لہٰذا تو صحبتِ شیخ میں بیٹھ کر "مردِ حق" بن جا۔ یعنی اپنی فطرت کا مطالعہ کر اور ظن و تخمین، یعنی اپنے ذاتی خیالات پر اعتماد مت کر۔

مشامِ تیز سے صحرا میں ملتا ہے نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

یعنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے تجھ کو طریقت کے دائرہ میں داخل ہونا پڑے گا۔ جب تو صحبتِ شیخ میں بیٹھ کر سلوک کی منزلیں طے کریگا (اسی کو طریقت کہتے ہیں) تو تجھے یہ دولت نصیب ہو گی یعنی اس وقت تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ

ع شرع برخیزد ز اعماقِ حیات

حاصل کلام اینکہ ان اشعار میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ امور تکوینی (نظام عالم) میں ہر انسان مجبور ہے۔ بقول شخصے

ع جسے چاہا جیسا بنادیا تیری شان جل جلالہٗ

لیکن امور تشریعی (اکتساب خیر) میں ہر انسان مختار ہے جو شخص ان امور میں بھی اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ شریعت خارج سے مجھ پر مسلّط ہو گئی ہے۔ یعنی کسی خارجی طاقت نے یہ بار گراں میرے سر پر رکھ دیا ہے اور میں اس کو اٹھانے پر مجبور ہوں۔ اس احساسِ جبر کی وجہ سے وہ ساری عمر خدا سے دور رہتا ہے۔ یعنی خدا کو ایک قاہر اور جابر ہستی سمجھتا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ جس شخص کو قاہر اور جابر سمجھیں گے۔ اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتے۔

ع ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

اسی نکتہ کو اقبال نے باندازِ دگر یوں بیان کیا ہے۔

بے تجلّی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دیں مجبوری است

(جاوید نامہ)

یعنی جب تک انسان کے اندر عشق کا رنگ پیدا نہ ہو (جس کا ثبوت تجلّی سے مل سکتا ہے۔ یعنی تجلّی سے صرف عاشق ہی بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔) اس کی زندگی اس کے حق میں رنجوری (مصیبت عذاب یا الم ہے) اور اس کی عقل خدا سے مہجوری کا سبب ہے۔ اور اس کا دین سراپا جبر ہے۔

چھٹا شعر :-

اس وقت تجھے خیر و شر کا صحیح علم حاصل ہو جائیگا۔ اس وقت تجھ میں نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے گی۔ اور اس وقت تو رازِ کائنات سے آگاہ ہو سکے گا۔

ساتواں شعر :-

یاد رکھ! جو شخص عشق رسول کی بدولت نبوت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے یعنی جو شخص فناء فی الرسول کا مقام حاصل کر لیتا ہے اس میں نبوت کے خواص ظلّی طور پر منعکس ہو جاتے ہیں۔ اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو پھر وہ جبریل امین کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بواسطہ رسول اس مردِ مومن کو بھی اپنے الہامات سے سرفراز فرما دیتا ہے [1]

---

[1] واضح ہو کہ نبوت تو سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے لیکن مبشرات یعنی الہامات کا دروازہ بواسطۂ حضور مومنوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اور جب ایک مومن حضور کی اتباع کاملہ کی بدولت اپنے آپ کو ذاتِ رسالت مآب میں فنا کر دیتا ہے۔ جسے اصطلاح میں "فناء فی الرسول" کا مقام کہتے ہیں۔ تو اللہ اُس مومن کو الہام کی نعمت سے سرفراز فرما دیتا ہے۔ چنانچہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصانیف میں اس بات کو واضح کر دیا ہے۔ اور شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے بھی فتوحات مکیہ میں اپنے الہامات کا تذکرہ کیا ہے نیز سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ الہام ربانی کی بنا پر تبلیغ کے لئے ہندوستان تشریف لائے۔ دکتر اللہ تعالیٰ امثالہم ۱۲

لیکن جب ایک شخص مسلکِ عشق اختیار کر لیتا ہے تو پھر وہ اس حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے کہ شریعت خود میرے ضمیر کی گہرائی سے ابھر رہی ہے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں بیحد مسرت محسوس کرتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی خدا کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے۔ یعنی "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ (اسی حالت کو مقامِ رضا کہتے ہیں۔)

جب یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو اللہ کی مرضی (شریعت) سالک کی ذاتی مرضی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جب وہ احکامِ شریعت کی تعمیل کرتا ہے تو وہ گویا اپنی مرضی پر چلتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اپنی مرضی پر چلنے میں ہر شخص کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔

طریقت نام ہے اس بات کا کہ سالک کی ذاتی مرضی (جسے ہوا کہتے ہیں)[۱] فنا ہو جائے۔ اور اللہ کی مرضی اس کی مرضی ہو جائے۔ اس مقام پر پہنچ کر سالک کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اسے اپنا محکوم اور خادم (زیر فرماں) نظر آتا ہے۔ اور بات بھی یہ صحیح ہے۔ جسے اللہ کی معیت اور اس کا قرب حاصل ہو جائے وہ بھلا مجبور کیسے ہو سکتا ہے۔

خدا کے ساتھ نہیں ہو تو کچھ نہیں ہو تم
خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے!

(اکبر الہ آبادی)

---

[۱] مرشد رومی فرماتے ہیں ؎

خلق اطفال اند جز مرد خدا ❊ نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

پھر یہ کائنات سالک کے اشاروں پر رقص کرتی ہے۔ کیونکہ

(ا) یہ کائنات خدا کے حکم کی پابند ہے۔ اس کی مرضی کے مطابق حرکت کرتی ہے۔

(ب) چونکہ سالک کی مرضی وہی ہو جاتی ہے جو خدا کی مرضی ہے۔

(ج) اس لئے یہ کائنات، سالک کو اپنی مرضی کے مطابق گردش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

فی الجملہ جب معیّتِ حق نصیب ہو جاتی ہے تو مومن "جبر" کے دائرہ سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ مرشد رومی فرماتے ہیں:-

ایں معیّت با حق است و جبر نیست

ایں تجلّیٔ مہ است و ابر نیست

غور سے دیکھو تو سارے مسئلے اور ساری الجھنیں "دوئی" سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب یہ دوئی مٹ جاتی ہے (اور تصوّف اسی دوئی کو مٹانے کی ترکیب کا نام ہے) اور سالک خدا کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لیتا ہے تو جبر و اختیار کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود

بندۂ مومن قضائے حق شود

پھر اس کے جبر میں اختیار کا اور اختیار میں جبر کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ایک طرف وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کر کے بظاہر مجبور بلکہ کالمیّت (مثل مردہ) بن جاتا ہے۔ تو دوسری طرف اس کا مولیٰ اس کی نگاہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور جس طرف وہ چاہتا ہے۔ اسی طرف تحویلِ قبلہ کر دیتا ہے [1]

(دیکھو حاشیہ صفحہ ۵۷۸ پر)

لیکن یہ سب کچھ اپنے "دیدار" پر موقوف ہے۔ اور اسی لئے اقبال نے ہر جگہ دیدار کی اہمیت واضح کی ہے:-

چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش

اشعار ۹ تا ۱۰:

شریعت اور طریقت کا مفہوم واضح کرنے کے بعد اب اقبال مردِ مومن سے جلالی رنگ میں خطاب کرتے ہیں۔ کہ اے مسلمان! اگر تو قرآنِ حکیم پر ناز کرتا ہے۔ یعنی اگر تو اس کو بنی آدم کے لئے بہترین اور افضل ترین اور کامل ترین دستورِ حیات یقین کرتا ہے۔ تو پھر تو حجرے میں کیوں بیٹھا ہوا ہے۔

اٹھ! دنیا کو اس دین کی خوبیوں سے آگاہ کر! دین اسلام کے حقائق و معارف ساری دنیا میں بیان کر! اور دنیا والوں کو شریعت کی سلسبیل سے بڑی خوبی سے روشناس کر دے۔

---

ص ۵۷۵ کا حاشیہ:- قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔

اے رسول! حکم تحویل قبلہ کے انتظار میں ہم آپ کو منہ اٹھا اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ تو آپ پریشان نہ ہوں جس قبلہ کی طرف آپ منہ کرنا چاہتے ہیں ہم آپ کو اسی طرف منہ کرنے کا حکم دینگے اچھا تو پھر آپ نماز پڑھتے وقت مسجد مکرم (کعبہ) ہی کی طرف منہ کر لیا کیجئے۔ ۱۲ ۲/۲ - ۱۴۴ ل

اور وہ خوبی کیا ہے؟ نکتہ شرع مبیں کیا ہے؟ یہ کہ ایسا نظام حکومت قائم کرو جس میں کوئی انسان اپنی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ہم ابتدا ہی میں واضح کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم نے ایسا عمدہ معاشی نظام دنیا کو عطا فرمایا ہے کہ اگر اس کو نافذ کر دیا جائے تو ع

کس نباشد در جہاں محتاج کس

اشعار ۱۱، ۱۲:۔

اپنا فرض ادا کر دینے کے بعد اب اقبال اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ چونکہ علما نے حق گوئی کے بجائے "سخن سازی" کو شیوۂ زندگی بنا لیا۔ اس لئے افرادِ قوم (مومناں) اس نکتہ سے واقف ہی نہ ہو سکے۔ کہ اسلام ملوکیت کا اشد ترین دشمن ہے۔ بلکہ وہ دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کرنی چاہتا ہے جس میں ہر شخص کو روٹی ملے گی کپڑا ملے گا۔ مکان ملے گا۔ تعلیم ملے گی اور انصاف ملے گا اور مفت ملے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان تو زندہ قوم تھے۔ مگر علما نے تاویلاتِ رکیکہ کا دروازہ کھول کر ان کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یعنی ملوکیت کا خوگر بنا دیا۔ اور جب وہ بندوں کی غلامی کرنے لگے تو

ع آتشِ او در ضمیر او فسرد

وہ آگ جو قرآنِ حکیم نے ان کے دلوں میں بھڑکائی تھی ٹھنڈی ہو گئی۔

"آتش" کنایہ ہے جذبۂ حریت سے جو قرآنِ حکیم نے ان کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔

از تاویل "مرد" سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ جب دورِ خلافت ختم ہو گیا اور مسلمانوں کی شومیٔ قسمت سے ملوکیت کی لعنت ان پر مسلط ہو گئی۔ یعنی

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

تو بادشاہوں نے علماء اور فقہاء کو حکم دیا کہ اب تم قرآن و حدیث کی وہ تفسیر بیان کرو جو ہماری خواہش کے مطابق ہو اور ہماری خواہش یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے ملوکیت کا جواز ثابت کرو تاکہ مسلمان ہمارے خلاف علمِ بغاوت بلند نہ کریں۔ علماء اور فقہا نے (باستثنائے معدودے چند) اپنی جان کے خوف سے قرآن و حدیث کو بادشاہوں کی مرضی کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ جن علماء نے بادشاہوں کے احکام کی تعمیل سے انکار کیا۔ ان ظالموں نے ان حق پرستوں کو محبوسِ زنداں کر دیا۔ اگر اس بات کی تفصیل بیان کروں تو یہ شرح بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کی تاریخ میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس لئے قلم روکتا ہوں اور یہ واضح کرتا ہوں

(ا) اسلام ملوکیت کی ضد ہے۔

(ب) اسلام نے انسان کو انسانوں کی غلامی سے آزادی عطا کی۔ آزادی زندگی ہے۔

(ج) ملوکیت نے انسانوں کو انسانوں کا غلام بنا دیا۔ غلامی

بروئے قرآن موت ہے۔
(د) اس لئے اقبال نے بالکل صحیح لکھا ہے۔
ع زندہ قومے بود، از تاویل مُرد
اشعار ۱۳ تا آخر:۔
ان آخری اشعار میں اقبال نے عصر حاضر کے علماء فقہاء اور صوفیہ کی روش پر تنقید کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ میں نے صوفیوں کی زندگی بھی دیکھی ہے اور علماء کے طرز عمل کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ بلکہ میرے زمانہ میں تو ایک پیغمبر بھی پیدا ہوا۔ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا قرآن میری نبوت پر شاہد ہے۔ لیکن یہ تینوں قرآن وحدیث کا علم رکھنے کے باوجود شریعت کے مفہوم سے بیگانہ ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کو ملوکیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا درس نہیں دیتا۔
بیشک ان حضرات نے عقلی اور نقلی دونوں قسم کے علوم حاصل کئے ہیں۔ مگر وہ جملہ علوم ان کی ذاتی اغراض کے پابند ہیں یہ جس منبر پر بیٹھ کر قرآن اور حدیث کا درس دیتے ہیں وہ منبر علم نہیں ہے۔ بلکہ منبر کاک ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ جس طرح نانبائی اپنے منبر پر روٹی (کاک) رکھ کر بیچتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے منبر پر اپنا ضمیر یا علم دین رکھ کر فروخت کرتے ہیں۔
اگرچہ یہ لوگ اپنے آپ کو انبیاء کے جانشین کہتے ہیں مگر ان کی آستین ید بیضا سے محروم ہے۔ یعنی ان میں انبیاء

کی کسی صفت کا عکس نظر نہیں آتا۔ لہٰذا یہ لوگ قوم کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ اس لئے اے مسلمان! اب تو ہی اپنے عمل سے یہ بات ثابت کر کہ اسلام ایسا دین ہے جو قوموں کی بگڑی بنا سکتا ہے۔ ۱۲

# فصل دہم

## اشکے چند بر افتراق ہندیاں

اے ہمالہ! اے اٹک! اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ

پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبّت بے نصیب

شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

زندگانی بر مرادِ دیگراں
جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں

نیست ایں مرگے کہ آید ز آسماں
تخمِ او می بالد از اعماقِ جاں

صیدِ او نے مردہ شو[1] خواہد نہ گور
نے ہجومِ دوستاں از نزد و دور

جامۂ کس در غمِ او چاک نیست
دو نہِ خ ادآں سوئے افلاک نیست

---

[1] غسل دینے والا۔

در ہجومِ روزِ حشر اورا مجو — ہست در امروز او فردائے او

ہر کہ ایں جا دانہ کشت ایں جا درود — پیشِ حق آں بندہ را بردن چہ سود

امتے کز آرزو نیشے نہ خورد — نقشِ او را فطرت از گیتی سترد

اعتبارِ تخت و تاج از ساحری است — سخت چوں سنگ ایں زجاج از ساحری است

در گذشت از حکم ایں سحرِ مبیں — کافری از کفر و دیں داری ز دیں

ہندیاں با یک دگر آویختند — فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

تا فرنگی قومے از مغرب زمیں — ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں

کس نداند جلوۂ آب از سراب

انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب!

اے ترا ہر لحظہ فکرِ آب و گِل — از حضورِ حق طلب یک زندہ دل

آشیانش گرچہ در آب و گِل است — نہ فلک سرگشتۂ ایں یک دل است

تا نہ پنداری کہ خاک است او — از بلندی ہائے افلاک است او

ایں جہاں او را حریمِ کوئے دوست — از قبائے لالہ گیرد بوئے دوست

ہر نفس با روزگار اندر ستیز — سنگِ رہ از ضربتِ او ریز ریز

آشنائے منبر و دار است او | آتشِ خود را نگہدار است او
آبجوئے و بحرہا دارد بہر | حی دہد موجش ز طوفانے خبر
زندہ و پایندہ بے نانِ تنور | میرد آں ساعت کہ گردد بے حضور
چوں چراغ اندر شبستانِ بدن | روشن از وے خلوت و ہم انجمن
ایں چنیں دل خود نگر اللہ مست | جز بہ درویشی نمی آید بدست

اے جواں دامانِ او محکم بگیر
در غلامی زادۂ آزاد میر

# تمہید

واضح ہو کہ اقبال نے یہ مثنوی ۱۹۳۶ء میں لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اختلاف اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا۔ کہ اتحاد کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی اس جگہ بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ لکھنی تو مقصود نہیں ہے۔ لیکن اس قدر صراحت ضروری ہے کہ

(۱) ۱۹۲۰ء میں ہندو مسلمانوں میں عارضی طور پہ اتحاد ہو گیا تھا۔

(۲) انگریزوں کو یہ اتحاد ایک آنکھ نہ بھایا اور بھاتا بھی کیسے؟ وہ تو ابتدا ہی سے دونوں قوموں کو آپس میں لڑا رہے تھے۔ مثلاً

(ا) ۱۷۹۹ء میں دولتِ خداداد کے شیعوں کو سلطان شہیدؒ کے خلاف بھڑکایا کہ اگر تم اس وقت ہماری مدد کرو گے تو تمہیں مراسم مذہبی ادا کرنے کی کامل آزادی عطا کی جائے گی۔

(ب) ۱۸۵۷ء میں سکھوں کو یہ کہہ کر تسخیر دہلی کے لئے آمادہ کیا کہ دلی کے مسلمانوں سے اپنے گرو (تیغ بہادر) کے خون کا بدلہ لے لو!

(ج) ۱۹۰۱ء میں یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر نے ہندوؤں سے کہا

کہ تم اُردو کی بجائے ہندی کی اشاعت کرو (اس سے پہلے ہندوستان میں اُردو، ہندی کا کوئی مسئلہ موجود نہ تھا۔

(د) چونکہ ایک عرصہ سے انگریز ہندو نواز پالیسی پر عمل کر رہے تھے اس لئے ۱۹۰۵ء میں انہوں نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا گیا۔ گویا مشرقی بنگال کو آسام کے ساتھ ملا کر خود مشرقی پاکستان قائم کر دیا۔

(ہ) چونکہ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی بے اندازہ مخالفت کی۔ اس لئے ۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے مجبور ہو کر تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا۔ یہ حکم تنسیخ بقول نواب وقار الملک" ایک توپخانہ تھا جو مسلمانوں کو روندھتا ہوا چلا گیا۔

(و) ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے پردے میں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑایا۔

(ز) جب ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد زندہ باد کے نعرے بلند ہو رہے ہیں تو لالہ منشی رام جالندھری آریہ سماجی کانگریسی المعروف بہ سوامی شردھانند کو اس شرط پر جیل سے رہا کیا۔ کہ باہر نکل کر خرمن اتحاد میں آگ لگا دو۔ چنانچہ اس شخص نے جیل سے باہر نکلتے ہی دھولپور، بھرتپور اور آگرہ کے ملکانوں کو "شدھ" کرنے کا کام شروع کر دیا۔ قربان جائیے انگریز کی سیاست کے، ایسا منتر پھونکا کہ ہندو مسلم اتحاد ہمیشہ کے لئے ختم

ہو گیا۔ یا تو ۱۹۲۲ء میں ہندو مسلمان باہم گلے مل رہے تھے یا ۱۹۲۴ء میں سارا ہندوستان "شدھی اور سنگھٹن" اور تبلیغ اسلام کے نعروں سے گونجنے لگا۔

(ج) ۱۹۳۵ء میں انگریز نے سوچا کہ اگر پنجاب میں مسلمان اور سکھ متحد ہو گئے تو ہمارا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ اس لئے سکھوں سے کہا کہ تم مسجد شہید گنج (لاہور) کے حصول کے لئے ہائی کورٹ میں دعویٰ دائر کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنی نگرانی میں دن دہاڑے مسجد کو شہید کرا دیا۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ انگریز ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتا رہا۔ چنانچہ جاتے جاتے ضلع گورداسپور کو بلا وجہ تقسیم کر کے کشمیر کا مسئلہ پیدا کرتا گیا۔ جو تا ایں دم ہندوستان اور پاکستان کے درمیان استخوان منازعت بنا ہوا ہے۔

اس پر مستزاد یہ ہوا کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء میں برسر اقتدار آکر مسلمانانِ ہند کے ساتھ شدید نا انصافی پر کمر باندھ لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں نے تقسیم ہند کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اور ۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی صوابدید کے مطابق تقسیم کر دیا۔

اس فصل میں بعض باتیں ناظرین کو ایسی ملیں گی جو موجودہ حالات میں خارج از بحث ہیں اور اسکی وجہ پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی۔ اور ۱۹۴۷ء میں انقلاب برپا ہو گیا ناظرین

ان امور کو ذہن میں رکھ کر اس فصل کا مطالعہ کریں۔

## خلاصۂ مباحث :-

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے مسلمانوں کو انقلاب برپا کرنے کی دعوت دی ہے۔ دوسرے بند میں انقلاب برپا کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :-

(ا) اسلامی خطوط پر انقلاب اس وقت برپا ہو سکتا ہے۔ جب مسلمان اپنے دل کو زندہ کرلے۔

(ب) اور دل زندہ ہوتا ہے "درویشی" اختیار کرنے سے۔

این چنیں دل خود نگر اللہ مست
جز بدرویشی نمی آید بدست

(ج) اور درویشی کا رنگ کسی درویش کی صحبت میں بیٹھنے ہی سے چڑھ سکتا ہے (ٹھیک جس طرح کپڑے پر رنگ چڑھانا ہو تو اسے کسی رنگریز کے پاس لے جاتے ہیں)

(د) اس لئے اقبال نے یہ تلقین کی ہے۔

اے جواں دامانِ او محکم بگیر
در غلامی زادۂ آزاد میر

نوٹ :- اس جگہ اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ انقلاب کی دو قسمیں ہیں اسلامی اور غیر اسلامی۔

اقبال کی آرزو یہ تھی کہ مسلمان اسلامی انداز میں انقلاب برپا کریں اسی لئے انہوں نے ان کو اپنے اندر شانِ درویشی پیدا کرنے کی ہدایت کی تھی۔ چونکہ مسلمانوں نے ان کی نصیحت پر عمل نہیں کیا اس لئے

انقلاب تو برپا ہوا مگر غیر اسلامی خطوط پہ ہوا۔ جس کا نتیجہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

"عیاں راچہ بیاں"

پہلا بند :-

کہتے ہیں۔ اے باشندگانِ ہند (ہمالہ) اے مسلمانو! (اٹک) اے ہندوؤ (گنگا) تم کب تک غلامی کی زندگی بسر کرتے رہو گے۔ تمہاری یہ حالت ہے کہ تم میں جو لوگ بوڑھے ہیں ان میں دانائی اور دور اندیشی کا فقدان ہے۔ اور نوجوان محبت سے بیگانہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری قومیں تو آزاد ہیں مگر ہم غلام ہیں۔ سچ یہ ہے کہ غلامی کی زندگی (برمراد دیگراں) مرگ جاوداں ہے۔ نہ کہ خواب گراں۔ مگر یہ موت وہ نہیں جو اللہ کے حکم (آسمان) سے آتی ہے۔ بلکہ یہ وہ موت ہے جو زندگی کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہے۔ یعنی غلامی وہ موت (لعنت) ہے جسے انسان خود اپنے اوپر وارد کرتا ہے۔ خارج سے اس پر وارد نہیں ہوتی۔ اس موت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس مُردے کو نہ غسال کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کفن کی۔ نہ قبر کی اور نہ کوئی شخص اس کی موت پر رنج و غم کرتا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ غلام مرنے کے بعد دوزخ میں نہیں جاتا۔ بلکہ یہی دُنیا اس کے لئے دوزخ بن جاتی ہے۔ یعنی جیتے جی دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔

حشر ہست در امروز او فردائے او

بات بھی ٹھیک ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی، پھر ایسے بندے کو خدا کے سامنے لیجانے کی کیا ضرورت ہے؟

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

کہتے ہیں کہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ جو قوم آزادی کی آرزو اپنے دل میں پیدا نہیں کرتی پھر اس آزادی کی تکمیل کے لئے جدوجہد نہیں کرتی، اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔

اے مخاطب! ملوکیت ساحری کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ملوکیت اپنی ذات کے اعتبار سے شیشہ کی طرح کمزور ہے مگر ارباب ملوکیت عوام کے دل و دماغ پر کچھ ایسا جادو کر دیتے ہیں کہ وہ ان کی نگاہ میں پتھر کی طرح سخت مستحکم معلوم ہوتی ہے۔

اس ملوکیت کی بدولت، ہندو اپنے کفر سے اور مسلمان اپنے دین سے بیگانہ ہو گئے۔ اور آپس میں لڑنے لگے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندو دھرم اور اسلام دونوں نے محبّت، ہمدردی اور رحمدلی و شرودھا، کرپا اور دیا کی تعلیم دی ہے۔ مگر ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات کو فراموش کر دیا۔ ان کے باہمی اختلافات کی وجہ سے فرنگیوں کو ہندوستان فتح کرنیکا موقع مل گیا۔ اب ان کی غلامی سے رہائی پانے کی صورت یہ ہے کہ انقلاب برپا کیا جائے یعنی ہندوستان کے باشندے جلوہ آب (آزادی) شراب (غلامی) میں فرق نہیں کر سکتے اس لئے ضرورت ہے اس امر کی کہ ایک انقلاب برپا کیا جائے۔ جس کی بدولت دونوں کو آزادی کی نعمت حاصل ہو سکے۔

دوسرا بند:-

اے مخاطب! تو ہر وقت جسمانی ضروریات اور مادی خواہشات کی تسکین میں منہمک ہے۔ ہر لحظہ سامان آسائش مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر تو آزادی کا طالب ہے۔ تو مادیات اور لذاتِ جسمانی

سے قطع نظر کر اور اللہ تعالیٰ سے ایسا دل طلب کر جو جذبۂ حریت سے سرشار ہو۔

آئندہ آٹھ اشعار میں اقبال نے اس دل کی خصوصیات بیان کی ہیں، جن کو مجموعی طور پر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) کہتے ہیں کہ یہ دل اگرچہ پایا تو اسی جسم میں پایا جاتا ہے۔ مگر ہے اس قدر قیمتی اور مفید کہ ساری کائنات (نہ فلک) اس کی تلاش میں سرگرداں ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ دل ساری کائنات کے حق میں پیامِ رحمت ہے۔ جس شخص کے سینہ میں ایسا دل ہوتا ہے۔ وہ ساری کائنات کو عدل و انصاف اور آسمانی برکات سے معمور کر دیتا ہے۔

(۲) اے مخاطب! یہ گمان مت کر کہ وہ دل آب و گل (ذراتِ مادّی کی پیداوار ہے وہ مادہ میں ہے۔ مگر مادّی نہیں ہے۔ وہ تو عشق (آسمان) کا ثمرہ ہے۔ یعنی بذاتہٖ خود دل "انبارِ گل" ہے۔ مگر جب اس میں عشق کی آگ سلگتی ہے تو وہ حقیقی معنی میں دل بن جاتا ہے۔

دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن
چو از ذوقِ تپش افتاد گل شد

(پیامِ مشرق)

یہ دل جس میں عشق کارفرما ہو۔ خاکی نہیں ہے بلکہ افلاکی ہے۔ یعنی عالمِ لاہوت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی لئے یہ سارا جہاں اس کی نگاہ میں "حریمِ کوئے دوست" ہے۔ یعنی عاشق ساری

دنیا سے محبت کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں ہندو اور مسلمان دونوں عیال اللہ" اللہ کے کنبے کے افراد ہیں۔

اس کی قبائے لالہ سے بھی دوست (خدا) ہی کی خوشبو آتی ہے۔ قبائے لالہ میں ابہام ہے۔ اس سے گل لالہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یعنی لالہ خدا کی ہستی پر شاہد ہے۔ اور قبائے لالہ سے خونِ شہداء بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یعنی ایسا دل انسان کو شہادت پر آمادہ کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک خدا کی محبت دل میں موجزن نہ ہو کوئی شخص "قبائے لالہ" در بر نہیں کر سکتا۔

(۴) عاشق ہر وقت باطل سے برسرِ جنگ رہتا ہے اور اس کی ہر ضرب کاری ہوتی ہے۔

(۵) عاشق منبر اور دار دونوں سے آشنائی رکھتا ہے۔ یعنی وہ منبر پر بیٹھ کر قرآن و حدیث کا درس بھی دے سکتا ہے اور بوقتِ ضرورت قرآن و حدیث کی عزت کی خاطر دار کو بھی اپنے وجود سے مشرف کر سکتا ہے۔ اور بڑے اطمینان کے ساتھ یہ شعر پڑھ سکتا ہے۔

بجرم عشق توام می کشند غوغا ئیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ئیست

(۶) یہ دل عاشق زندہ رہنے کے لئے روٹی کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو صرف اپنے معشوق کے درشن کی بدولت زندہ رہتا ہے اور جب درشن (حضور) سے محروم ہو جاتا ہے یعنی جب خدا سے غافل ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے۔

آخری دو۲ شعر :-

اے مخاطب! ایسا دل جو خودنگر ہو اور اللہ کی محبت میں سرشار ہو شان درویشی کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور درویشی ایک فن ہے اور ہر فن، اس فن کے ماہر کی صحبت میں بیٹھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے درویشی کا فن حاصل کرنے کے لئے درویشوں کی صحبت اختیار کرو۔ ؎

جلا سکتی ہے شمع کُشتہ کو موجِ نفس اُن کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

اس لئے اے مخاطب! تو اسی دل کا دامن تھام لے۔ یعنی مسلکِ عشق اختیار کرلے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا۔ کہ اگرچہ تو غلامی میں پیدا ہوا ہے مگر آزادی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوگا۔

نوٹ :- واضح ہو کہ اس دل کی تعریف اقبال نے یہ کی ہے کہ وہ "خودنگر" اور "اللہ مست" ہوتا ہے۔ در اصل یہ دونوں صفات ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ لیکن جب تک انسان اللہ مست (عاشقِ خدا) نہ ہو اس کا دل خودنگر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب تک انسان خودنگر نہ ہو وہ اللہ مست نہیں بن سکتا۔ اور عشق کتابوں کے شائع کرنے یا تقریریں کرنے یا انتخابات میں حصہ لینے یا پوسٹر شائع کرنے یا قربانی کی کھالیں جمع کرنے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ دولت تو صرف عاشقوں کی صحبت میں بیٹھنے یا بقول اقبال ان کی سیوا کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ؎

تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
(بانگ درا)

---

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر
(مسافر)

---

# فصلِ یازدہم

## سیاساتِ حاضرہ

می کند بندِ غلاماں سخت تر
حرّیت می خواند او را بے بصر

گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید
پردہ بر روئے ملوکیت کشید

سلطنت را جامعِ اقوام گفت
کارِ خود را پختہ کرد و خام گفت

در فضایش بال و پر نتواں کشود
با کلیدش ہیچ در نتواں کشود

گفت با مرغِ قفس اے دردمند
آشیاں در خانۂ صیّاد بند

ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ
او نباشد ایمن از شاہین و چرخ

از فسونش مرغِ زیرک دانہ مست
نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست

حرّیت خواہی بہ پیچاکش میفت
تشنہ میرو بر نمِ تاکش میفت

الحذر از گرمیِ گفتارِ او | الحذر از حرفِ پہلو دارِ او[1]

چشم ہا از سرمہ اش بے نورتر | بندۂ مجبور از و مجبورتر

از شرابِ ساتگینش[2] الحذر | از قمارِ بد نشینش الحذر

از خودی غافل نہ گردد مردِ حُر | حفظِ خود کن حبِّ افیونش مخور

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم
تا کند ضربِ تو دریا را دو نیم

داغم از رسوائیِ ایں کارواں | در امیرِ او ندیدم نورِ جاں

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ | اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

در حرم زاد و کلیسا را مرید | پردۂ ناموسِ ما را بر درید

دامنِ او را گرفتن ابلہی است | سینۂ او از دلِ روشن تہی است

اندریں رہ تکیہ بر خود کن کہ مرد | صیدِ آہو با سگِ کورے نکرد

آہ از قومے کہ چشم از خویش بست | دل بغیر اللہ داد، از خود گسست

تا خودی در سینۂ ملت بمرد | کوہ کاہی کرد و باد او را ببرد

---

[1] پہلو دار: ایسی بات جس کے کئی معنی نکل سکتے ہوں۔ [2] پیالہ۔

گرچہ دارد لَا اِلٰہ اندر نہاد　　از بطونِ او مسلمانے نزاد

آنکہ بخشد بے یقیناں را یقیں　　آنکہ لرزد از سجودِ او زمیں

آنکہ زیرِ تیغ گوید لَا اِلٰہ　　آنکہ از خونش بروید لَا اِلٰہ

آں سرور آں سوزِ مشتاقی نماند　　در حرم صاحبدلے باقی نماند

اے مسلماں اندریں دیرِ کہن　　تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن

جہد با توفیق و لذّت در طلب　　کس نیابد بے نیازِ نیم شب

زیستن تا کے بہ بحرِ اندر چو خس

سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس

گرچہ دانا حالِ دل با کس نگفت　　از تو دردِ خویش نتوانم نہفت

تا غلامم در غلامی زادہ ام　　ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام

چوں بنامِ مصطفےٰ خوانم درود　　از خجالت آب می گردد وجود

عشق می گوید کہ "اے محکومِ غیر　　سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو

از درودِ خود میالا نامِ او"

از قیامِ بے حضورِ من مپرس | از سجودِ بے سرورِ من مپرس
جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس | قسمتِ مردانِ آزاد است و بس
مردے آزادے چو آید در سجود | در طوافش گرم رو چرخِ کبود
ما غلاماں از جلالش بے خبر | از جمالِ لازوالش بے خبر
از غلامے لذّتِ ایماں مجو | گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو
مومن است و پیشۂ او آذری است | دین و عرفانش سراپا کافری است
در بدن داری اگر سوزِ حیات | ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت[1]
در نداری خونِ گرم اندر بدن | سجدۂ تو نیست جز رسمِ کہن
عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں!

---

[1] ہست معراجِ مسلماں الخ تلمیح حدیث حضور رسالت مآب کی طرف ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز معراج ہے مردِ مومن کی۔

# تمہید

اس فصل میں چار بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے موجودہ مغربی سیاست کی ماہیت اور کیفیت بیان کی ہے۔
اور اقوامِ شرق کو اس سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔ دوسرے بند میں ہندی مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں کی مذہبی اور اخلاقی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

ع در حرم زاد و کلیسا را مرید

تیسرے بند میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ غلاموں کو سرکارِ ابد قرار پر درود بھیجنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

تا نہ داری از محمدؐ رنگ و بُو
از درود خود میالا نام او

چوتھے بند میں مسلمانانِ ہند کی حالتِ زار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ غلام قوم کے افراد (خواہ حافظِ قرآن کیوں نہ ہوں) لذتِ ایمان سے محروم رہتے ہیں۔
اس تعارف کے بعد اب ہم اس فصل کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

پہلا بند:۔

مغربی سیاست (سیاساتِ حاضرہ) کی نمایاں خصوصیات

حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یہ سیاست بنی آدم کے حق میں رحمت اور برکت ہونے کے بجائے سراسر زحمت اور لعنت ہے۔ کیونکہ انسانوں کو انسانوں کا غلام ہی نہیں بناتی بلکہ غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کرتی ہے۔ اسی لئے مردانِ حُر اسے اندھی سیاست کہتے ہیں۔

(۲) جب اربابِ سیاست نے دیکھا کہ عوام میں کچھ سیاسی شعور پیدا ہو گیا ہے تو ملوکیت کے چہرے پر جمہوریت کی نقاب ڈال دی۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
(بانگِ درا)

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
(ارمغانِ حجاز)

یعنی اقبال کی رائے میں جمہوری حکومت بھی در پردہ ملوکیت ہی ہے۔ کیونکہ جمہوریت میں بھی اقتدار ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جسے "وزیر اعظم" کہتے ہیں۔

(۳) جب عوام نے جمہوریت کے خلاف زبان کھولی تو اربابِ سیاست نے لیگ آف نیشنز بنائی۔ اور جب دوسری جنگ عظیم میں کفن چھوڑ دل

کی اس مجلس کا خاتمہ ہو گیا۔ تو اس کی خاکستر سے یو۔ این۔ او (ادارہ اقوام متحدہ) عالم وجود میں آ گیا۔ چنانچہ اربابِ سیاست نے بہت سی سلطنتوں کو متحد کر کے ایک سلطنت بنا دی۔ اور یہ کہا۔ کہ دوستو! کہ سلطنت کوئی مذموم شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو جامع اقوام ہے۔ بیشک انہوں نے یہ کہہ کر اپنا کام تو درست کر لیا۔ (یعنی عوام کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے) لیکن جو بات کہی وہ سراسر غلط ہے۔ سلطنت جامع اقوام نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

(۴) اس سیاست کی فضا میں کوئی انسان اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یعنی کسی کو حریت کی نعمت حاصل نہیں ہو سکتی بظاہر تو یہ عوام کی حکومت ہے عوام پر۔ لیکن دراصل صاحبِ اقتدار پارٹی کی حکومت ہے ساری قوم پر۔ اور چونکہ پارٹی کا نصب العین یہ ہے کہ اقتدار ہاتھ سے نہ جانے پائے اس لئے پارٹی کے افراد تمام اخلاقی اقدارِ حیات سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ ان کی رائے میں ہر وہ کام "خیر" ہے جس سے اقتدار محفوظ رہے۔ یہی توجہ ہے کہ

ع۔ در فضائش بال و پر نتواں کشود

جو شخص بھی اظہار رائے کے "جرم" کا ارتکاب کرتا ہے۔ برسر اقتدار پارٹی اسے "سیفٹی ایکٹ" کے شکنجہ میں کس دیتی ہے۔

(۵) اربابِ سیاست ہر وقت مکر و فن سے کام لیتے ہیں اور محکوم اقوام (مرغانِ قفس) سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے زیرِ سایہ زندگی

بسر کرو۔ اپنا آشیاں صیاد کے گھر میں بناؤ۔ کیونکہ جو پرندا اپنا آشیانہ
جنگل میں بناتا ہے۔ وہ شاہین اور چرغ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔
یہ وہ افسوں ہے کہ اس کی بدولت مرغِ دانا (چونکہ طالب رزق تھا)
اس لئے) صیاد کے دام میں پھنس کر آزادی سے محروم ہو گیا۔
اے مخاطب! اگر تو حریت کا طالب ہے تو اس سیاست
کے پھندے میں نہ آنا۔ اس کے پانی کے مقابلہ میں پیاسا مرجانا
بہتر ہے۔

موجودہ اربابِ سیاست بڑی دلکش تقریریں کرتے ہیں مگر
وہ صداقت اور خلوص سے یکسر خالی ہوتی ہیں۔ پس خدا توفیق دے
تو آدمی ان کی ڈپلومیٹک (پہلودار) گفتگو سے دور ہی رہے۔ اس
لئے اے مخاطب! اگر تو حریت کا طالب ہے تو اپنی خودی کی حفاظت
کر۔ اور ان لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں (حبوب افیون) میں ہرگز
نہ آ۔ بلکہ تو ان کے مقابلے میں سچائی کا علم بلند کر تاکہ ان کے مکرو
فریب کا پردہ چاک ہو جائے۔

دوسرا بند:-

مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو
رہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان کے رہنما دینداری (نورِ جاں) سے
کوسوں دور ہیں۔ بلکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ تن پرست ہیں۔ طالب
جاہ ہیں۔ کم نگہ ہیں اور اسلام سے ناواقف ہیں۔ اگرچہ وہ مسلمانوں
میں پیدا ہوئے ہیں۔ مگر انگریزوں کے ہوا خواہ ہیں۔ ان کے طرزِ عمل
سے ملتِ اسلامیہ ذلیل ہو گئی ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی پیروی

ہیں سراسر نقصان ہے۔

اے مخاطب تو ان پر بھروسہ مت کر۔ کوئی شخص اندھے کُتّے کی مدد سے ہرن کا شکار نہیں کر سکتا۔

افسوس ہے کہ اس قوم پر جو اپنی خودی سے غافل ہو گئی اور جس نے غیر اللہ پر بھروسہ کر لیا ہو۔

چونکہ قوم اپنی خودی سے غافل ہو گئی ہے اس لئے ضعیف ہو گئی اور مخالف قوتیں اس پر غالب آ گئیں۔

اگرچہ مسلمان توحید کے مدعی ہیں۔ مگر ان میں کوئی شخص ایسا پیدا نہ ہوا جو دشمنوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکتا یا جس کی شخصیت سے اسلام کا بول بالا ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں غیرتِ دینی باقی نہ رہی۔ بلکہ ساری قوم (حرم) میں ایک بھی اللہ کا بندہ نظر نہیں آتا۔

اے مسلمان! تو کب تک شیطان کے پھندے میں گرفتار رہے گا۔ یاد رکھ! تیری کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی اور تیری طلب میں اس وقت تک لذّت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک تو آدھی رات کو اٹھ کر خدا سے دعا نہ کرے۔

تیسرا بند:

اے مخاطب! اگرچہ عقلمند آدمی اپنا حالِ دل کسی سے بیان نہیں کیا کرتا۔ مگر میں اپنا دردِ دل تجھ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ میری حالت یہ ہے کہ میں غلام ہوں۔ اور غلامی میں پیدا ہوا ہوں۔ اس لئے اسلام سے کوسوں دور ہوں۔ جب میں

سرکار ابد قرار صلعم پر درود بھیجتا ہوں۔ تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ عشق مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اے محکوم غیر! تیرے دل میں اللہ کے بجائے بتوں کی محبت بسی ہوئی ہے۔ جب تجھ کو سرکار ابد قرار صلعم سے کوئی نسبت ہی نہیں، جب تجھے حضور سے کوئی محبت ہی نہیں تو پھر تو اپنی ناپاک زبان پر آپ کا نام کیوں لاتا ہے؟ آپ کے مقدس نام کو کیوں آلودہ کرتا ہے۔

ان اشعار میں اقبال نے اپنے نام کے پردے میں مسلمانوں پر تعریض کی ہے کہ جب ان کے دل میں حضور کی محبت ہی نہیں تو پھر حضور کے نام پر درود بھیجتے ہوئے انہیں شرم آنی چاہیئے۔

## چوتھا بند:-

اے مخاطب! چونکہ میں غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس لئے میرا قیام بے حضور ہے۔ اور میرا سجدہ بے سرور ہے۔ یعنی مجھے نماز میں کوئی لطف نہیں آتا۔ میری حالت یہ ہے کہ میں مسجد میں نماز پڑھتا ہوں تو اللہ سے یہ کہتا ہوں:-

اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ

اے اللہ ہم تیری ہی اطاعت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

لیکن جب مسجد سے باہر نکلتا ہوں تو غیر اللہ کی اطاعت کرتا ہوں۔ اور اسی سے مدد مانگتا ہوں۔ کیا میری یہ روش صریحاً منافقانہ نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے نماز میں حضور و سرور کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ جلوہ حق، خواہ وہ ایک لمحہ کے لئے کیوں نہ ہو صرف

ان لوگوں کا حصّہ ہے جو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہیں۔

اللہ کے بندے کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے تو ساری کائنات اس کے سامنے سربسجود ہو جاتی ہے یعنی وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور ساری دنیا اس کی اطاعت کرتی ہے۔

لیکن ہم لوگ چونکہ غلام ہیں اس لئے اس کے جلال اور اس کی عظمت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اور نہ اس کے جمال سے آگاہ ہیں۔ یعنی مومن میں شانِ جلال اور شانِ جمال دونوں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اور ہم لوگوں میں نہ شانِ جلال ہے نہ شانِ جمال۔

حقیقت تو یہ ہے کہ غلام، دولت ایمان ہی سے محروم ہوتا ہے۔ غلام اگر حافظ قرآن ہو جائے تو بھی غلام ہی رہتا ہے۔ کیونکہ وہ صرف زبان سے قرآن پڑھتا ہے۔ اور اس کے اقتضا پر عمل نہیں کرتا۔

غلام زبان سے تو اسلام کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر اس کا عمل بالکل کافرانہ ہوتا ہے۔ اس لئے نہ اس میں مومن کی شانِ جلال پیدا ہو سکتی ہے نہ شانِ جمال۔

اے مسلمان! اگر تیرے دل میں ایمان کی حرارت موجود ہو تو تجھے بحالتِ نماز، معراج نصیب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ سرکارِ دو عالم ارشاد فرماتے ہیں:۔

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

نماز مومن کی معراج ہے۔

لیکن تیرے اندر عشق رسول کی آگ روشن نہیں ہے۔ تو پھر تیرا سجدہ ایک رسم لایعنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نمازوں سے وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جو صحابہؓ کرام کی نمازوں سے مرتب ہوتا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے قول اور عمل میں مطابقت نہیں ہے۔ ہم زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ یعنی ایک اللہ کے سوا کوئی طاقت ہم پر حکمراں نہیں ہے۔ مگر ہمارا عمل یہ ہے کہ ہم بڑے اطمینان کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری عیدین کی نمازوں سے نہ ملّت کی سربلندی کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ دین کی عظمت کا اعلان ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عیدین کے موقعوں پر مسلمانوں کا ہجوم مسجدوں میں جمع ہوتا ہے۔

---

# فصل دوازدہم

## حرفے چند با امّتِ عربیّہ

اے در و دشتِ تو باقی تا ابد ‏ ‏ نعرۂ لا قیصر و کسریٰ کہ زد؟[1]

در جہانِ نزد و دور و دیر و زود ‏ ‏ اولیں خوانندۂ قرآں کہ بود؟

رمزِ اِلّا اللّٰہ کرا آموختند؟ ‏ ‏ ایں چراغ اوّل کجا افروختند؟

علم و حکمت ریزۂ از خوانِ کیست؟ ‏ ‏ آیۂ فاصبحتم[2] اندر شانِ کیست؟

از دمِ سیرابِ آں اُمّی لقب ‏ ‏ لالہ رست از ریگِ صحرائے عرب

حریت پروردۂ آغوشِ اوست ‏ ‏ یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست

او دلے در پیکرِ آدم نہاد ‏ ‏ او نقاب از طلعتِ آدم کشاد

---

۱؎ تلمیح ہے مشہور حدیث کی طرف۔ ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ الخ

۲؎ تلمیح ہے آیہ قرآنی کی طرف فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا۔

هر خداوندِ کهن را او شکست | هر کهن شاخ از نمِ او غنچه بست

گرمئ هنگامهٔ بدر و حنین | حیدر رض و صدیق رض و فاروق رض و حسین رض

سطوتِ بانگِ صلوٰت اندر نبرد | قراءتِ الصّٰفّٰت[1] اندر نبرد

تیغِ ایوبی[2] نگاهِ بایزید[3] | گنج هائے هر دو عالم را کلید

عقل و دل را مستی از یک جامِ مے | اختلاطِ ذکر و فکرِ روم[4] و رے

علم و حکمت شرع و دیں نظمِ امور | اندرونِ سینه دلها ناصبور

حسنِ عالم سوز الحمرا و تاج | آنکه از قدوسیاں گیرد خراج

ایں همه یک لحظه از اوقاتِ اوست | یک تجلّی از تجلیاتِ اوست

ظاهرش ایں جلوه هائے دل فروز | باطنش از عارفاں پنهاں هنوز

"حمد بے حد مر رسولِ پاک را

آں که ایماں داد مشتِ خاک را" (خواجہ عطار بہ تغیر لفظی)

---

[1] سورۂ قرآن کا نام

[2] سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ۔

[3] حضرت بایزید بسطامی مشاہیر اولیائے امت سے تھے۔

[4] روم و رے: یعنی حضرت جلال الدین رومیؒ اور امام فخر الدین رازیؒ۔

حق ترا برّاں تر از شمشیر کرد ‏ ‏ ساربان را راکبِ تقدیر کرد

بانگِ تکبیر و صلوات و حرب و ضرب ‏ ‏ اندر آں غوغا کشادِ شرق و غرب

اے خوشا آں مجذوبی دل بردگی ‏ ‏ آه زیں دل گیری و افسردگی

کارِ خود را امتاں بردند پیش ‏ ‏ تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش

امتے بودی امم گردیدۂ ‏ ‏ بزمِ خود را خود زہم پاشیدۂ[1]

ہر کہ از بندِ خودی وارست مُرد ‏ ‏ ہر کہ با بیگانگاں پیوست مُرد

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد ‏ ‏ روحِ پاکِ مصطفےٰ آمد بدرد!

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر ‏ ‏ فتنہ ہا در آستینِ او نگر

از فریبِ او اگر خواہی اماں ‏ ‏ اشترانش را ز حوضِ خود براں

حکمتش ہر قوم را بیچارہ کرد ‏ ‏ وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد

تا عرب در حلقۂ دامش فتاد ‏ ‏ آسماں یک دم اماں اورا نداد

عصرِ خود را بنگر اے صاحب نظر ‏ ‏ در بدن باز آفریں روحِ عمرؓ

قوت از جمعیتِ دینِ مبین ‏ ‏ دین ہمہ عزم است و اخلاص و یقین

---

[1] از ہم پاشیدن : پراگندہ کرنا۔

تا ضمیرش رازدانِ فطرت است / مردِ صحرا پاسبانِ فطرت است

سادہ و طبعش عیارِ زشت و خوب / از طلوعش صد ہزار انجم غروب

بگذر از دشت و در و کوہ و دمن / خیمہ را اندر وجودِ خویش زن

طبع از بادِ بیاباں کردہ تیز / ناقہ را سر دہ بہ میدانِ ستیز

عصرِ حاضر زادۂ ایامِ تست / مستیٔ او از مئے گلفامِ تست

شارحِ اسرارِ او تو بودۂ / اولیں معمارِ او تو بودۂ

تا بہ فرزندی گرفت او را فرنگ / شاہدے گردید بے ناموس و ننگ

گرچہ شیریں است و نوشیں است او / کج خرام و شوخ و بے دیں است او

مردِ صحرا! پختہ تر کن خام را

بر عیارِ خود بزن ایام را

# تمہید

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے عربوں کو ان کے اسلاف کے بلند مقام اور کارناموں سے روشناس کیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ انہیں یہ مقام رفیع اور عزت و شوکت، سرکار ابد قرار صلعم کے دم سے نصیب ہوئی تھی۔ اور اس ضمن میں انہوں نے حضور کے کمالات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا میں جس قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

این ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست
یک تجلّی از تجلّی ہائے اوست

دوسرے بند میں انہوں نے عربوں سے گلہ کیا ہے کہ تم نے اپنی وحدت کو پراگندہ کر دیا بلکہ اپنوں سے منہ موڑ کر غیروں سے ناطہ جوڑ لیا۔

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روح پاک مصطفےٰ آمد بدرد

اس شکوہ کے بعد ان کو نصیحت کی ہے کہ اپنے اندر فاروق اعظمؓ کی روح پیدا کرو۔ تاکہ دوبارہ دنیا میں انقلاب پیدا کر سکو۔

مرد صحرا! پختہ تر کن خام را
بر عیار خود بزن ایام را

---

پہلا بند:-
اے اُمتِ عربیہ! اے عرب قوم کے افراد! خدا کرے تمہارا ملک قیامت تک باقی رہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ
(ا) دنیا کی کس قوم نے دنیا میں سب سے پہلے ملوکیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ کس قوم نے دنیا کو ملوکیت کی لعنت سے پاک کیا؟ کس قوم نے قیصر و کسریٰ کی سطوت کو خاک میں ملا دیا؟ کس قوم نے دنیا میں سب سے پہلے یہ نعرہ بلند کیا:-

لَا کِسْرٰی وَلَا قَیْصَرَ فِی الْاِسْلَامِ

یعنی اسلام میں نہ کوئی کسریٰ ہے اور نہ کوئی قیصر سب انسان اللہ کے بندے ہیں۔ اور اس لئے سب انسان آپس میں برابر ہیں۔
واضح ہو کہ یہ تعلیم اس حدیث سے مقتبس ہے:-

اِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ وَاِذَا هَلَكَ كِسْرٰی فَلَا كِسْرٰی بَعْدَهٗ۔

فرمایا سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم نے۔ جب قیصر ہلاک ہو جائیگا۔ تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا۔ اور جب کسریٰ ہلاک ہو جائیگا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔
(ب) اے عربو! یہ تو بتاؤ کہ دنیا میں سب سے پہلے کس قوم نے

قرآنِ حکیم کی تلاوت کی ؟
اللہ کا کلام سب سے پہلے کس قوم نے دنیا والوں کو سنایا ؟
(ج) کارکنانِ قضا و قدر نے کس قوم کو از سرِ نو کلمہ توحید سے آشنا کیا ۔ ؟
اور توحید کا چراغ کس ملک میں روشن کیا ؟
**نوٹ :۔** رمز **لا الٰہ الا اللہ** یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی طاقت مجھ پر حکمراں نہیں ہے ۔
کیونکہ کوئی شئی اس لائق ہی نہیں ہے کہ حکمراں ہو سکے ۔
کیونکہ کوئی شئی از خود موجود ہی نہیں ہے ۔ یعنی
**لَا موجود الا اللّٰہ**

(د) دنیا میں جس قدر علوم و فنون آج مروّج ہیں ، یہ سب کس قوم کے دسترخوان کے ریزے ہیں ؟ اور یہ تو بتاؤ کہ حسبِ ذیل آیت کس کی شان میں نازل ہوئی تھی ؟
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔ (۳ - ۱۰۳)

(اور یاد کرو احسان اللہ کا جو اس نے تم پر کیا ۔ جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی ، جس کی بدولت تم آپس میں بھائی بھائی ہو گئے ۔ ۱۲
اچھا یہ سب خوبیاں تمہارے اندر کس کے فضل و کرم سے پیدا ہوئیں ؟ بلا شبہ یہ سرکار ابد قرار امّی لقب صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیضان تھا ۔

حضور نے تمہیں پر احسان نہیں فرمایا۔ ساری دنیا کو اپنے فضل و کرم سے نوازا۔ مثلاً

(۱) دنیا کو سب سے پہلے آپ ہی نے حریت کی نعمت سے مالامال کیا۔ دنیا کی قومیں آج جس نعمت (حریت) سے مستفید اور بہرہ اندوز ہو رہی ہیں۔ اس نعمت سے آپ ہی نے سب سے پہلے دنیا کو روشناس کیا تھا۔

کون نہیں جانتا کہ ظہورِ اسلام سے پہلے

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

در کلیسا اسقف رضواں فروش
بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش بہ برد
خرمنش منع زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نَےِ او خوں شدہ

تا امینے حق بحق داراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد

حریت زاد از ضمیر پاک او
ایں مے نوشیں چکید از تاک او

اب پڑھئے اقبال کے اس شعر کو:-

حریت پروردۂ آغوش است
یعنی امروزِ امم از دوش است

(۲) آپ نے حریت، اخوت اور مساوات کے پاکیزہ اصول، انسان کو عطا کر کے گویا اسے نئی زندگی بخشی اور آپ ہی نے

اسے اس کی مخفی صلاحیتوں سے آگاہ فرمایا۔ یعنی انسان کو بتایا کہ تو دنیا میں کسی کا محکوم یا غلام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ساری دنیا تیری محکوم اور غلام ہے۔

(۳) یعنی آپ نے انسان کو توحید کا سبق پڑھا کر اسے تمام معبودانِ باطلہ کی غلامی سے آزادی عطا کر دی۔ آپ نے انسان کو بتایا کہ سورج، چاند، گنگا، جمنا، بندر، سانپ رام، کرشن، عزیز اور مسیح ان میں کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں ہے۔ گویا لا الٰہ اللہ کہہ تمام خداوندانِ کہن کا خاتمہ کر دیا۔

(۴) آپ نے مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دی اور غزوۂ بدر و حنین میں اس تعلیم پر خود عمل کر کے اسوۂ حسنہ پیش کر دیا۔

آپ ہی کی صحبت نگاہ سے جب رر کرار، صدیق اکبر رض، فاروق اعظم رض اور حسین رض نے دنیا کو اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کیا ہے۔

(۵) آپ ہی نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ میدانِ جنگ میں بھی ذکر الٰہی سے غافل نہ ہونا۔ جب کفار اپنی مدد کے لئے لات و ھبل کو پکاریں تو تم اللہ کو پکارو۔ اور اگر لڑائی میں نماز کا وقت آجائے تو جس طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہو، اسی طرح صفیں باندھ کر اللہ کے سامنے جھک جاؤ۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں کوئی قوم ایسی

نہیں گزری جس نے بحالتِ جنگ بھی نماز با جماعت ادا کی ہو
"قرآت الصّٰفٰت" کنایہ ہے. تلاوتِ قرآن سے اور
اقبال نے اس سورہ کو اس لئے منتخب کیا کہ اس کی پہلی
آیت میں اللہ تعالیٰ نے صف باندھ کر لڑنے والوں کی قسم کھائی
چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَالصّٰفّٰتِ صَفّاً (۳۷-۱)

اور غازیوں کے ان لشکروں کی قسم جو دشمنوں سے لڑنے کیلئے
صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔

(۶) آپ ہی کی محبت کی بدولت سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی تلوار
میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر پیدا کر دی کہ اس نے تن تنہا سارے
یورپ کا مقابلہ کیا۔ اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا کر دیا۔
اور آپ ہی کی محبت کی بدولت حضرت بایزید بسطامیؒ کی نگاہ
میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر پیدا کر دی کہ انہوں نے سینکڑوں کافروں
کو مسلمان بنا دیا۔ اور ہزاروں مسلمانوں کو خدا سے ملا دیا۔ گویا
سلطان کی تلوار اور فقیر کی نگاہ دونوں جہان کے خزانوں کی
کنجیاں بن گئیں۔

(۷) آپ نے ایک ہی جام سے عقل اور دل دونوں کو مست (کامل)
کر دیا۔ مثلاً مرشد رومیؒ دنیائے ذکر (عشق) میں اعلیٰ مقام
رکھتے ہیں۔ اور امام رازی دنیائے فکر (عقل) کے مسلّم ثبوت
امام ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں نے آپ ہی سے فیض حاصل
کیا ہے۔

(۸) آپ ہی نے دنیا کو علم و حکمت، شرع و دین، تہذیب و تمدّن اور سیاست و معیشت کے اصول سے آگاہ فرمایا۔ اور آپ ہی نے انسانوں کو اللہ سے محبت کرنے کا طریقہ سکھایا۔
"اندرونِ سینہ دلہا ناصبور" میں ناصبوری کنایہ ہے عشق سے۔

(۹) جن بادشاہوں نے الحمرا اور تاج محل جیسی نادرالوجود عمارتیں تعمیر کیں۔ وہ آپ ہی کے حاشیہ برداروں میں سے ہیں۔
خلاصہ کلام اینکہ یہ تمام خوبیاں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئیں یہ سب خوبیاں آپ کی شخصیتِ مبارکہ کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں۔ ان کمالات کو آپ کی ذات سے وہی نسبت ہے جو ایک لمحہ کو آپ کی زندگی سے ہے۔

بس یوں سمجھو کہ یہ سارے محاسن اور کمالات گویا آپ کی تجلیات میں سے صرف ایک تجلّی ہے۔

(۱۰) اور اے مخاطب! یہ جو کچھ میں نے بیان کیا۔ یعنی جن خوبیوں کا ذکر کیا۔ یہ سب آپ کی شخصیت مبارکہ (ذاتِ اقدس) کا ظاہری پہلو ہے۔ جو ہم عامیوں کو نظر آسکتا ہے۔ یا جس حد تک ہماری نگاہ پہنچ سکتی ہے۔ رہا آپ کی ذات کا باطنی پہلو تو وہ تو عارفوں کی نگاہ سے بھی ہنوز پنہاں ہے۔ اس پہلو کو تو کوئی انسان دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس تک تو کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی اقبال نے سچ کہا ہے۔

؎ باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

میرے نزدیک ساری مثنوی میں اس سے بلیغ تر اور ضیا مع کوئی مصرعہ نہیں ہے۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی کوشش کرتا ہوں۔
واضح ہو کہ کائنات میں ہر چیز کے دو پہلو ہیں۔ ظاہری اور باطنی یہ نکتہ قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (۵۷-۳)

اوست نخستین ہمہ و اوست آخرین ہمہ و اوست آشکارا و او پنہاں و او بہر چیز دانا ست" (شاہ ولی اللہؒ)

"وہی پہلا اور پچھلا ہے۔ اور وہی باہر اور اندر ہے اور وہی سب چیزوں کو جانتا ہے (شاہ عبد القادرؒ) یعنی (ہر شے کا) اول بھی وہی ہے۔ آخر بھی وہی ہے (ہر شے کا) ظاہر بھی وہی ہے اور باطن بھی وہی ہے۔ بالفاظِ دگر، کائنات کا باہر (ظاہر) بھی وہی ہے اور اس کا اندر (باطن) بھی وہی ہے۔

اس آیت کی تفسیر سرکار ابد قرار نے یوں فرمائی ہے:-

انت الاول فلیس قبلک شیءٌ وانت الاخر فلیس بعدک شیءٌ وانت الظاهر فلیس فوقک شیءٌ وانت الباطن فلیس شیءٌ اقضِ عنا الدین واغننا من الفقر" (رواہ مسلم و ترمذی عن ابی ہریرہؓ)

اے اللہ! تو اول ہے اس لئے تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں اور تو آخر ہے اس لئے تیرے بعد کوئی چیز نہیں ہے۔ اور تو ظاہر ہے اس لئے تیرے اوپر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور تو باطن ہے اس لئے تیرے علاوہ

کوئی شے نہیں ہے۔

اے اللہ! اپنے فضل سے ہمارا قرض اتار دے اور ہمیں فقر کی دولت سے مالا مال کر دے۔ یعنی اپنا محتاج بنا کر دنیا والوں سے بے نیاز کر دے۔

(۳) اس لئے سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کے بھی دو پہلو ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی:-

(ا) ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز

آپ کی ذات کا ظاہری پہلو تو یہ تمام جلوہ ہائے دلفروز ہیں:-
(جن کی تفصیل اقبال نے مثنوی کے صـ۵۲ میں بیان کی ہے)

(ب) باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

لیکن باطن آپ کا ابھی تک عارفوں سے پوشیدہ ہے۔ واضح ہو کہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے:-

(ا) ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ ہر شے کا ایک ظاہری پہلو ہے۔ اور دوسرا باطنی پہلو ہے۔ اور باطنی پہلو اس کی حقیقت ہے۔
مثلاً انسان کا ظاہر ہے جو محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت نہ محسوس ہوتی ہے نہ حکماء کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن اربابِ تصوف نے اپنے کشف اور وجدانِ صحیح سے اس کی حقیقت دریافت کی ہے۔ چنانچہ حضرت مولٰنا شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں کہ "حقائق ممکنات، اظلال اسماء و صفاتِ الٰہیہ ہیں۔"
یعنی ممکنات کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ

کی صفات کے عکوس ہیں۔

(ب) اب سوال یہ ہے کہ ان حقائق کی حقیقت کیا ہے ۔؟

بالفاظِ دگر :-

حقیقت الحقائق کیا ہے؟ یا ان اسماء و صفات کی حقیقت کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی حقیقت "تعین اول" ہے۔

جسے اصطلاح میں حقیقت الحقائق یا حقیقت محمدیہ بھی کہتے ہیں۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ آپ کا باطن حقیقت محمدیہ ہے اور یہی حقیقتِ محمدیہ تعین اول ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تعین اول سے صوفیہ کی کیا مراد ہے۔؟

اس کا جواب یہ ہے

(ج) پہلے اصطلاح تعین کا مفہوم سمجھ لینا چاہیئے۔

واضح ہو کہ لفظ تعین سے مراد ہے حق تعالیٰ کا اپنی ذات کو دریافت کرنا۔ اس مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے بعد مطالب آئندہ کا سمجھنا آسان ہو جائیگا۔

(د) تمام مسلمانوں کا خواہ وہ وجودی ہوں یا شہودی، اربابِ حدیث ہوں یا اصحابِ فقہ، متکلمین اشاعرہ ہوں یا ماتریدیہ، اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب

کانَ اللّٰہُ ولم یکن معہٗ شیٔ

صرف ذات حق موجود تھی۔ صرف اللہ تھا۔ اور اس کے ساتھ کوئی شے موجود فی الخارج نہ تھی۔ صوفیہ اللہ تعالیٰ کی اس حالت کو مرتبہ

لا تعیّن سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مرتبہ میں فقط ذات احدیت کی بات ہے۔ بلا اعتبار اجمال و تفصیل صفات۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں حق تعٰ کی کنہ کسی مخلوق کو معلوم نہیں ہو سکتی،

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن

تواں در بلاغت بسحباں رسید
نہ در کنہ بیچون سبحاں رسید

(سعدی)

(ط) سرکار دو عالم صلعم نے جو یہ فرمایا کہ

ما عرفناک حق معرفتک

تو اسی مرتبہ کو مدِ نظر رکھ کر فرمایا۔ کہ معرفت کا حق یہ ہے کہ ذات بحت کی معرفت حاصل ہو۔ اور یہ محال ہے۔ اس لئے اے اللہ ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق ہے،

(ی) خودبخود کسی خارجی طاقت کے دباؤ کے بغیر (کیونکہ خارج میں تو کچھ موجود ہی نہ تھا) حق تعٰ کے دل میں تخلیق کا خیال پیدا ہوا حضرات صوفیہ اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ انہیں اپنے جمال کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ انہوں نے چاہا کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔ تو سب سے پہلے خود، اپنی ذات مخفی میں آپ ہی تجلّی فرمائی۔ یعنی اپنے ہی آئینہ میں اپنے ہی آپ کو اپنے ہی آپ سے دیکھا۔ اسے مرتبۂ وحدت یا تعین اول کہتے ہیں۔ یعنی تعین اول حقیقت محمدؐی ہے۔ یہی سرکار ابد قرار کا باطن ہے۔ تعین اول کیا ہے؟ حق تعٰ کا اپنی ذات کو پانا (دریافت کرنا) یا باصطلاح عرفاء "انا" کہنا۔ اس مرتبہ میں ذاتِ مطلق (حق تعٰ) نے

اپنی ذات کے واسطہ سے اپنی ذات کا مشاہدہ کیا۔ اور فرمایا کہ میں ہی موجود ہوں میرے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔ نیز میں ظہور کی قابلیت اور صلاحیت رکھتا ہوں۔

اس کے بعد دوسری تجلّی فرمائی جسے اصطلاح میں مرتبہ واحدیت کہتے ہیں۔ یہ تینوں مراتب (احدیت، وحدت، اور واحدیت) مراتب داخلی کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد مراتب خارجی شروع ہوتے ہیں اور ان کو عالم ارواح، عالم مثال اور عالم شہادت کہتے ہیں۔ یہ سب ملکر تنزلات ستہ کہلاتے ہیں۔ چونکہ ان کی تفصیل اس جگہ موجب طویل ہوگی اس لیے نظر انداز کی جاتی ہے۔

باز آمدم بر سر مطلب، تعین اوّل ہی حقیقت محمدّیہ ہے جس کی طرف بیدلؒ نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

جو شد حسنِ حقیقت جلوہ اندیش
محمدؐ دید در آئینہ خویش

یعنی جب محبوبِ حقیقی (حق تعالیٰ) نے اپنا جمال دیکھنا چاہا۔ (اور یہ ہر جمیل کی ذات کا تقاضا ہے) تو لامحالہ ایک آئینہ بنانا پڑا۔ (کیونکہ آئینہ کے بغیر دیدار میں لطف نہیں آتا۔) یہ فعل آئینہ سازی اصطلاح میں تعین اول ہے۔ (جب ذات نے اپنے کو دیکھا اور "انا" کہا) اور وہ آئینہ ذات یا حقیقت محمدیؐ ہے۔

اب قارئین خود غور کرلیں کہ اگر سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا باطن، ابھی تک عارفوں کی نگاہوں سے پنہاں ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ رہا آپ کا ظاہر تو وہ بلاشبہ آشکار ہے۔ اور

اس اعتبار سے آپ ہماری ہی طرح ایک بشر ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:۔
قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج

آپ کہہ دیجئے کہ بلا شبہ میں تمہاری طرح بشر ہی ہوں۔ میری طرف یہ وحی کی گئی ہے۔ کہ تمہارا اِلٰہ (معبود) اِلٰہ واحد ہے۔ (جس کے علاوہ کوئی اللہ نہیں ہے) (۱۸ — ۱۱۰)

آخر میں اقبال نے خواجہ فرید الدین عطار کے پند نامہ کے پہلے شعر میں تغیرِ لفظی کر کے سرکارِ دو عالم صلعم سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

یعنی بلا شبہ وہ رسول بیحد حمد و ثنا کے لائق ہے جس نے بنی آدم (مشتِ خاک) کو دولتِ ایمان سے مالا مال فرمایا۔

واضح ہو کہ اقبال کو خواجہ عطارؒ کے مصرع میں تغیر کرنے کا حوصلہ اس لئے پیدا ہوا کہ وہ ایمانداری کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ (جس کا اظہار ایک مرتبہ انہوں نے میری موجودگی میں بھی کیا تھا) کہ عقل کی مدد سے کوئی شخص خدا کی ہستی کا اقرار یا اعتراف نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر سرکار دو عالم صلعم یہ نہ فرماتے کہ اے لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ فی الحقیقت موجود ہے۔ تو میں خدا کی ہستی پر ایمان نہیں لا سکتا تھا۔ اس لئے میری نگاہ میں تو سرکار ابد قرار صلعم اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔

قوتِ قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی
(رموزِ بیخودی ص ۱۱۷)

## دوسرا بند :-

سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلّم کے احسانات عظیم اور الطاف عمیم کا تذکرہ کرنے کے بعد اقبال عربوں سے شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول نے تم پر اس قدر نوازشات فرمائیں -

لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دوسری قومیں ترقی کر رہی ہیں اور تم اپنی یا اپنے ملک کی اہمیت اور قدر و قیمت سے قطعاً ناآشنا ہو۔ اس کے بعد اس کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہیں :-

(۱) تمہیں سرکار نے ایک قوم بنایا تھا۔ (فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا) لیکن، تمہاری حالت یہ ہے کہ اس وقت تم سب " وطنیت " کے طلسم میں گرفتار ہو کر مختلف اقوام میں منقسم ہو چکے ہو۔ اور چونکہ تم سب انفرادی طور پر نہایت کمزور ہو اس لئے تم سب انگریزوں (اور اب امریکہ) کے غلام ہو۔

آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد
روحِ پاکِ مصطفےٰ آمد بدرد

یہ شعر میری تشریح اور توصیف دونوں سے بالاتر اور بے نیاز ہے۔ اقبال نے اس شعر میں عربوں کی حالتِ زار کا نقشہ تو کھینچا ہی ہے۔ خود اپنا کلیجہ بھی کاغذ پر نکال کر رکھ دیا ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ سرکارِ دو عالم صلعم نے عربوں کو ساری دنیا کا سردار بنایا تھا۔ لیکن انہوں نے ملوکیت لعنت دل و جان سے قبول کرلی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عیاشی میں مبتلا ہو کر کمزور ہو گئے اور آج کافروں کے غلام یا دست نگر یا تابع فرمان ہیں۔

اقوامِ فرنگ (برطانیہ اور امریکہ) نے تم پر افسوں کر دیا ہے مگر تم اپنی سادگی کی وجہ سے اس سے بے خبر ہو۔ دراصل وہ تمہیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تمہارا دوست کہیں اور دوستی، ہمدردی، اعانت اور خیر خواہی کے پردوں میں تمہیں اپنا غلام بنا لیں۔ اسلئے اگر تم ان کے فریب (ڈپلومیسی) سے بچنا چاہتے ہو تو ان کو اپنی مملکت کی حدود سے باہر نکال دو۔

فرنگی کی ڈپلومیسی (حکمت) نے آج ہر قوم کو مجبور (بیچارہ) کر دیا ہے۔ اور عربوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔)

لہٰذا تم اپنے اندر دوبارہ حضرت عمرؓ کی روح پیدا کرو اور اس نکتہ کو یاد رکھو کہ

قوت از جمعیتِ دینِ مبین
دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقین

قوت تو جمعیتِ دین پر موقوف ہے۔ یعنی سب افراد قوم (سعودی عرب، یمنی، عراقی، شامی، لبنانی وغیرہ) وطن کے بجائے دین کو قومیت کی بنیاد بنائیں۔ اور سب افراد بلا استثناء کلمۂ توحید (دین) پر مجتمع ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر قوت پیدا ہو جائیگی۔

اب رہا یہ سوال کہ دین کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دین تو عزم، اخلاص اور یقین کا نام ہے۔

عزم سے مراد ہے افرادِ قوم کا یہ فیصلہ کہ سربلندی حاصل

کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگادیں گے۔ واضح ہو کہ ترقی اور کامیابی کے لئے "عزم" شرطِ اولین ہے۔ اسی لئے اقبال نے سب سے پہلے "عزم" کا ذکر کیا۔ جب تک کوئی فرد یا قوم ترقی، عزت اور سرداری حاصل کرنے کا عزم نہ کرے۔ اس وقت تک یہ نعماء حاصل نہیں ہو سکتیں۔

اخلاص سے مراد ہے ہر فرد کا اپنی قوم کی بہبود کے لئے جدوجہد کرنا نہ کہ اپنا فائدہ مدِنظر رکھنا۔ یقین سے مراد ہے ہر فرد کا یہ یقین رکھنا کہ اسلام بہترین دستورِ حیات ہے۔ اور اگر اس کی میں اشاعت کروں گا۔ تو اللہ ضرور مجھے کامیابی عطا فرائیگا۔

اس کے بعد اقبال عربوں سے یہ کہتے ہیں کہ مردِ صحرا (اشارہ بسوئے اقوامِ عرب) پاسبانِ فطرت ہوتا ہے۔ یعنی اس میں اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو بنی آدم کی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

وہ تصنع اور بناوٹ سے بے خبر ہوتا ہے اور اس کی طبیعت برائی اور بھلائی کی کسوٹی ہوتی ہے۔ اگر وہ برسرِ اقتدار آجائے تو "صدر ہزار انجم" بہت سی برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر اقوامِ عرب کو دنیا میں اقتدار حاصل ہو جائے تو بنی آدم کو بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس لئے اقبال آخری اشعار میں دوبارہ اقوامِ عرب سے خطاب کرتے ہیں۔

(۱) خارجی حالات (کوہ و درد دشت و دمن) سے قطع نظر کر کے

اپنی خودی مستحکم کر لو۔

(۲) اور جب طاقت حاصل ہو جائے تو میدان ستیز (جہاد فی سبیل اللہ) میں کود پڑو۔

(۳) یاد رکھو کہ موجودہ تہذیب و تمدن جس پر یورپ کو اسقدر ناز ہے۔ یہ سب تمہارا مرہونِ احسان ہے۔ یعنی جس قدر سائنٹیفک ترقیاں یورپ میں ہوئی ہیں۔ اور تہذیب کے میدان میں جسقدر فتوحات اہل یورپ نے کی ہیں۔ ان کی ابتداء تم نے ہی کی تھی تم ہی نے قرطبہ و غرناطہ میں علوم و فنون کی شمع روشن کی تھی۔ جس نے سارے یورپ میں اجالا کر دیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ جس زمانے میں اندلس کے مسلمان فلسفہ اور سائنس میں حیرت انگیز اختراعات کرتے رہے ہیں اس وقت یورپ میں جہالت اور تعصب کی تاریک گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اس کی تفصیل کے لئے قارئین کرام ڈاکٹر لیکی کی "تاریخ اخلاقِ یورپ" اور ڈاکٹر ڈریپر کی "معرکہ مذہب و سائنس" اور ڈاکٹر (Briffault) کی "تعمیر انسانیت" کا مطالعہ کریں۔

لیکن جب زوال اندلس کے بعد اقوام یورپ، مسلمانوں کی پیدا کردہ تہذیب کی وارث ہوئیں تو انہوں نے اس کے اندر "لادینی" کے عناصر داخل کر دیئے۔ اس لئے موجودہ مغربی تہذیب، گمراہ کن اور بے حیائی سکھانے والی اور ملحد بنانے والی ہے۔

اے مردِ صحرا! اٹھ اور دنیا کو اس "لادینی"

تہذیب کے مضر اثرات سے رہائی عطا کر۔ اس
کی خامیوں کو دور کر۔ اور زمانے کو اپنے سانچے میں
ڈھال دے۔ یعنی اسلام کے اصولوں کی اشاعت
کر — ۱۲

---

# فصل سیزدہم

## پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

آدمیت زار نالید از فرنگ | زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوام شرق؟ | باز روشن می شود ایام شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید | شب گزشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد | زیر گردوں رسم لادینی[1] نہاد
گرگے اندر پوستینِ برۂ | ہر زماں اندر کمینِ برۂ
مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست | آدمیت را غمِ پنہاں ازوست
در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

---

[1] رسم لادینی :- یعنی نظامِ امورِ ریاست میں دین سے بے تعلق ہو جانا۔

هر چه می بینی ز انوارِ حق است — حکمتِ اشیا ز اسرارِ حق است
هر که آیاتِ خدا بیند حُر است — اصلِ ایں حکمت ز حکمِ اُنظُر[1] است
بندهٔ مومن از و بهروز تر — هم به حالِ دیگراں دل سوز تر
علم چوں روشن کند آب و گلش — از خدا ترسنده تر گردد دلش
علمِ اشیا خاکِ ما را کیمیا است — آه! در افرنگ تاثیرش جدا است
عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت — چشمِ او بے نم، دلِ او سنگ و خشت
علم ازو رسواست اندر شهر و دشت — جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش — در هلاکِ نوعِ انساں سخت کوش
با خساں اندر جهانِ خیر و شر — در نسازد مستیٔ علم و هنر
آه از افرنگ و از آئینِ او — آه از اندیشهٔ لا دینِ او
علمِ حق را ساحری آموختند — ساحری نے، کافری آموختند!
هر طرف صد فتنه می آرد نفیر[2] — تیغ را از پنجهٔ رهزن بگیر

---

[1] حکمِ اُنظُر:- تلمیح ہے آیہ قرآنی کی طرف فانظر الی الابل کیف خلقت یعنی نظامِ فطرت کا بغور مطالعہ کرو۔

[2] نفیر آوردن : ہجوم کرنا۔

اے کہ جاں را باز می دانی ز تن سحرِ ایں تہذیبِ لادینی شکن

روحِ شرق اندر تنش باید دمید تا بگردد قفلِ معنی را کلید

عقل اندر حکمِ دل یزدانی است

چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

زندگانی ہر زماں در کشمکش عبرت آموز است احوالِ حبش

شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال برّہ را کرد است بر گرگاں حلال

نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد از کفن دزداں چہ امیدِ کشاد

در جنیوا چیست غیر از مکر و فن صید تو ایں میش آں نخچیرِ من!

نکتہ ہا کو می نہ گنجد در سخن

یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن!

اے اسیرِ رنگ، پاک از رنگ شو مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو

رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست آبروئے خاوراں در دستِ تست

ایں کہن اقوام را شیرازہ بند رایتِ صدق و صفا را کن بلند

اہلِ حق را زندگی از قوّت است قوّتِ ہر ملّت از جمعیت است

رائے بے قوّت ہمہ مکر و فسوں

قوّتِ بے رائے جہل است و جنوں

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست     ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست

عشق را ما دلبری آموختیم     شیوۂ آدم گری آموختیم

ہم ہنر ہم دیں ز خاکِ خاور است     رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است

وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب     آفتاب از ما و ما از آفتاب

ہر صدف را گوہر از نیسانِ ماست     شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست

روح خود در سوزِ بلبل دیدہ ایم     خونِ آدم در رگِ گل دیدہ ایم

فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود     زد نخستیں زخمہ بر تارِ وجود

داشتیم اندر میانِ سینہ داغ     بر سرِ راہے نہادیم ایں چراغ

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں     آں یدِ بیضا برآر از آستیں

خیز و از کارِ امم بکشا گرہ     نشۂ افرنگ را از سر بنہ

نقشے از جمعیتِ خاور فگن

داستاں خود را ز دستِ اہرمن

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ     تا کجا در قیدِ زنّارِ فرنگ

زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو ——— ما و جوئے خون و امیدِ رفو

خود بدانی بادشاہی قاہری است ——— قاہری در عصرِ ما سوداگری است

تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج ——— از تجارت نفع و از شاہی خراج

آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است ——— بر زبانش خیر و اندر دل شر است

گر تو میدانی حسابش را درست ——— از حریرش نرم تر کرپاسِ تست

بے نیاز از کارگاہِ او گزر ——— در زمستاں پوستینِ او مخر

کشتنِ بے حرب و ضرب آئینِ اوست ——— مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست

بوریائے خود بہ قالینش مدہ ——— بیذقِ[1] خود را بفرزینش مدہ

گوہرش را تف[2] دار و در لعلش رگے است ——— مشک ایں سوداگر از نافِ سگ است

رہزنِ چشمِ تو خوابِ مخملش ——— رہزنِ تو رنگ و آبِ مخملش

صد گرہ افگندۂ در کارِ خویش ——— از قماشِ او مکن دستارِ خویش

ہوشمندے از خمِ او مے نخورد ——— ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد

---

[1] بیذق: پیادہ۔ فرزیں: وزیر (اصطلاحاتِ شطرنج)

[2] تف دار = عیب دار۔

وقتِ سودا خند خند و کم خروش | ما چو طفلانیم و او شکّر فروش
محرم از قلب و نگاہِ مشتری است | یارب این سحر است یا سوداگری است
تاجرانِ رنگ و بو بر دند سوز | ما خریداراں ہمہ کور و کبود
آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر | آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند | خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند
اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر | چرب دستیہائے[1] یورپ را نگر
قالی[2] از ابریشمِ تو ساختند | باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش افسوں خورد | رنگ و آبِ او ترا از جا برد

وائے آں دریا کہ موجش کم تپید
گوہرِ خود را ز غوّاصاں خرید

---

[1] چرب دستی: کاری گری۔
[2] قالین۔

# تمہید

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اقبال نے اس فصل میں اس سوال کا جواب دیا ہے۔ جس کے لئے انہوں نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ اصل فصل میں چھ بند ہیں۔ ذیل میں ہم ہر بند کا خلاصہ درج کرتے ہیں) اس کے بعد اس کی شرح ہدیۂ ناظرین کرینگے۔

پہلا بند:- آدمیت زار نالید از فرنگ ——— کا رواں زندگی بے منزل است

(اس بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ بنی نوع آدم کی تمام موجودہ مشکلات اور مصائب کا منبع یورپ (فرنگ) ہے۔ کیونکہ اس نے دنیا میں رسم "لادینی" کی بنیاد رکھی ہے۔)

"رسمِ لادینی" کی تشریح انہوں نے خود حاشیہ میں کردی ہے۔ یعنی نظام امور ریاست میں دین سے بے تعلق ہو جانا اس نظام (طرزِ عمل) کو اصطلاح میں سیکولرازم (SECULARISM) کہتے ہیں۔ یعنی مملکت کو مذہب کی گرفت سے آزاد کر دینا۔ یہ نظام لازمی نتیجہ ہے وطنیت (NATIONALISM) کا، جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ مذہب اور سیاست جدا جدا ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی تعلیم پر اقبال نے یہ تبصرہ کیا ہے:-

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

---

یہی سیکولرازم (رفض الدین) اقبال کی رائے میں انسان کی تمام مشکلات کا سبب ہے۔ اس نے یورپ کا زاویۂ نگاہ مادہ پرستانہ بنادیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی نگاہ میں انسان محض مادہ کی پیداوار ہے۔ یعنی سالمات مادی کے امتزاج کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

در نگاہش آدمی آب و گِل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

---

دوسرا بند :-

دوسرے بند میں اقبال نے اسلام کا نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ جس کی رو سے کائنات کی اصل مادہ نہیں ہے۔ بلکہ "نورِ حق" ہے۔ یعنی یہ کائنات سالمات مادی کے امتزاجات اتفاقی کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اسے اللہ نے بمصلحت خاص (بالحق) پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ کائنات کی تخلیق "بالحق" (با مقصد) ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی کا بھی ایک خاص مقصد ہے۔

چونکہ یورپ کے پاس خیر و شر کا کوئی معیار نہیں اس لئے اس کی چشم بے نم ہے۔ اور اس کا دل سنگ و خشت ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ...

دانش افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش

چونکہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کا خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس لئے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ لادینی تہذیب کا خاتمہ کر دے۔ اور دنیا کو یہ بتائے کہ

عقل اندر حکم دل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

واضح ہو کہ یہ مثنوی ~~اس سوال کا~~ پس چہ باید کرد کا پہلا جواب ہے۔

---

تیسرا بند:۔

تیسرے بند میں اقبال نے "احوال حبش" سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور متنبہ کیا ہے کہ "مجلسِ اقوام" سراسر مکر و فن ہے۔ اس لئے اس سے کسی قسم کی توقعات وابستہ مت کرو۔

---

چوتھا بند:۔

چوتھے بند میں انہوں نے یہ تلقین کی ہے کہ تمام امتیازات رنگ و نسل کو دل سے نکال دو۔ تمام انسانوں کو عالمگیر برادری کے ارکان سمجھو۔ فرنگ سے قطع تعلق کر لو۔ اور اعتماد علی النفس (اپنی ذات پر بھروسہ کرنا) سیکھو۔

یہ اس سوال کا دوسرا جواب ہے۔

مثنوی ۔ ۔ ۔ کا دوسرا جواب ہے۔

## پانچواں بند:-

پانچویں بند میں انہوں نے یہ تلقین کی ہے کہ احساسِ کمتری دل سے نکال دو۔ اور مشرق (ایشیا) کی عظمت کا نقش دنیا میں قائم کرو۔ کیونکہ ایشیا قدیم الایام سے ~~ہنر اور دین~~ (علوم و فنون اور روحانیت) کا گہوارہ رہا ہے۔ سرزمینِ مشرق، یورپ سے ہزار درجہ برتر ہے۔ اس بات پر فخر کرنا سیکھو کہ مشرق ہی نے سب سے پہلے "اسرارِ وجود" دنیا پر آشکارا کیئے ہیں۔

افرنگ کی عظمت کا غلط احساس دل سے محو کردو اور لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوام) کے مقابلہ میں جمعیت خاور کی بنیاد رکھو۔

یہ اس سوال کا تیسرا جواب ہے۔

## چھٹا بند:-

چونکہ اس زمانہ میں بادشاہی دراصل سوداگری ہے۔ یعنی مغربی اقوام نے صنعتی ترقی کرکے ایشیائی ملکوں کو اپنی مصنوعات کی بدولت اپنا دست نگر اور معاشی اعتبار سے اپنا غلام بنالیا ہے۔ اس لئے تمہارا فرض یہ ہے کہ ان کی تمام مصنوعات کا بائیکاٹ کردو اور ان کی بجائے سودیشی اشیاء استعمال کرو۔

آنچہ از خاکِ تو رست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور

اقبال نے "پس چہ باید کرد" کا جو جواب دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) یورپ کو اسلام کا پیغام سناؤ۔

(۲) یورپین تہذیب کے طلسم کو باطل کردو۔

اے کہ جاں را بازی دانی زتن
سحرایں تہذیب لادینی شکن

(۳) یورپ کو یہ بتادو کہ تمہیں عقل کو دل کا تابع فرماں بنانا چاہیئے اگر عقل، دل کی اطاعت سے منحرف ہوگی تو شیطانی۔ اور اس لئے انسانیت کے حق میں بلائے بے درماں بن جائیگی۔

(۴) یورپ کی کسی سیاسی جماعت پر اعتماد مت کرو۔

(۵) رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹادو۔

(۶) فرنگ سے بکلی قطع تعلق کرلو۔

(۷) اپنی ذات پر اعتماد کرنا سیکھو۔

(۸) اپنے اندر راۓ (صحیح علم) اور قوت (سیاسی اقتدار) دونوں خوبیاں پیدا کرو۔

(۹) جمیعت اقوامِ مشرق قائم کرو۔

(۱۰) انگریزوں بلکہ سارے یورپ کا تجارتی بائیکاٹ کردو۔

وائے آں کہ دریا کہ موجش کم تپید
گوہر خود را زغوّاصاں خرید

---

پہلا بند :-

اقبال کہتے ہیں کہ اقوام مغرب (فرنگ) کے دوصد سالہ طرز عمل (استعماریت، وطنیت، لامذہبیت، استحصال بالجبر، زبردست آزاری، عیاری، مکاری، بے ایمانی، ہوس زر، اور

ہوسِ اقتدار کا نتیجہ یہ نکلا کہ

(۱) انسانیت چیخ اٹھی، مطلب یہ کہ بنی آدم مبتلائے صد آلام ہو گئے۔

(۲) زندگی وقفِ ہنگامہ ہو گئی۔ یعنی دنیا سے امن و امان مفقود ہو گیا۔

اندریں حالات اقبال اقوامِ مشرق (بالخصوص مسلمانوں) سے یہ کہتے ہیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے کہ اہلِ مشرق کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو۔؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے وہ یورپ کی موجودہ حالت چند لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد

زیرِ گردوں، رسمِ لادینی نہاد

کہتے ہیں کہ یورپ اپنی تلوار سے خود زخمی ہو گیا۔ "شمشیر" کنایہ ہے۔ رسمِ لادینی (سیکولرازم) سے جو منطقی نتیجہ ہے نظریۂ وطنیت (نیشنلزم) کا۔ یورپ نے یہ تلوار دوسروں کو تباہ کرنے کے لیے بنائی تھی۔ مگر شومیئ قسمت دیکھیے کہ اس تلوار سے خود ہی زخمی ہو گیا۔ یعنی یہ نظریۂ وطنیت خود اس کے حق میں وبالِ جان ثابت ہو رہا ہے۔ ذیل میں نظریۂ وطنیت کی قدرے وضاحت کی جاتی ہے۔

# نظریۂ وطنیت

## میکیاولی کے سوانح حیات

اس نظریہ کا بانی میکیاولی تھا۔ جسے اقبال نے "رموزِ بے خودی" میں "فلارنساوئ باطل پرست" کا لقب دیا ہے۔

یہ شخص ۱۴۶۹ء میں بمقام فلارنس (اطالیہ) پیدا ہوا تھا۔ پوپوں کی حکمتِ عملی کی بدولت اس زمانہ میں اطالیہ متعدد (چھوٹی چھوٹی) ریاستوں میں منقسم تھا۔ جو آئے دن آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ ۱۴۹۲ء میں فلارنساوی جمہوریہ میں ذمہ دار عہدہ پر فائز ہوا۔ بعد ازاں فرانس اور جرمنی میں سفارت کے فرائض ادا کئے۔

۱۵۱۳ء میں اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ (حکومت کو اس کی وفاداری پر شبہ ہو گیا تھا) لیکن کارڈینل جولین کی سفارش سے رہائی نصیب ہوئی۔ چونکہ عقلمند تھا۔ اس لئے ۱۵۱۴ء میں سیاسیات (پبلک لائف) سے کنارہ کش ہو گیا۔ اور تادمِ وفات (۱۵۲۷ء) تصنیف و تالیف میں مشغول رہا۔ اس کی تصانیف میں دو کتابیں بہت مشہور ہیں:۔

الملوک اور مقالات۔

(۱) الملوک (THE PRINCE) ۱۵۱۵ء میں لکھی۔ لیکن یہ کتاب اس کی وفات کے پانچ سال بعد شائع ہوئی۔ (مصلحت کا تقاضا یہی تھا)۔

(۲) اس کتاب کے بعد اس نے اپنے "مقالات" لکھے۔ جو ۱۵۲۰ء میں شائع ہوئے۔

(۳) آخری تصنیف تاریخ فلارنس ہے جو ۱۹۲۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔

میکیاولی کا پیش کردہ نظریۂ وطنیت، در اصل رومن کیتھولک چرچ یا پوپوں کے خلاف ردعمل ہے۔ چونکہ یہ حضرات مذہب کی آڑ میں ذاتی اغراض پوری کرتے تھے۔ اور مذاہب کو ذاتی اقتدار کے حصول کا ذریعہ بناتے تھے۔ اس لئے میکیاولی نے آخر الذکر پر عمل کر کے سیاست کو مذہب سے جدا کر دیا۔ یعنی مملکت کو مذہب (کلیسا) کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے:۔

میکیاولی کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا۔ کہ یہ تو مسلّم ہے کہ یہ دنیا بدی کا گھر ہے۔ (اگر یہ سچ ہے۔ اور واقعی سچ ہے) تو پھر ایک نیک آدمی اس بری دنیا میں برا شہری نہ ہو تو کیا ہو؟ بالفاظِ دگر، اگر اچھا شہری وہ ہے۔ جو اپنی مملکت کا وفادار ہو اور دنیا میں ہر مملکت ایک دوسرے سے برسرِ جنگ ہے تو پھر ایک اچھا شہری اگر برا آدمی نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔؟

میکیاولی نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے۔ ایک اچھے شہری

کو بُرا (بد) آدمی ہونا چاہیئے۔ یعنی ایسا ہونا اس کا اخلاقی فرض ہے
اب ناظرین خود غور کرلیں۔ کہ میکیاولی نے اس جواب میں اخلاق کی
کیسی مٹی پلید کی ہے۔ بقول میکیاولی، دنیا میں اخلاقی قانون کا کوئی
وجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ وطن پرستی (PATRIOTISM) ہے۔
اسے یوں سمجھو کہ وطن پرستی ہی اعلیٰ اخلاقی قانون ہے۔ اور اس کا
مطلب ہے اپنے سیاسی رہنما کے ہر قول اور ہر فعل کی تحسین۔ بالفاظِ دگر
سیاسی رہنما اگر جھوٹ بولے یا فریب دے تو یہ سراسر محمود اور اس کے
لائق تحسین ہے۔ اسی لئے اقبال نے اس نظریہ پر حسب ذیل تنقید
کی ہے :۔

مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید — دہریت چوں جامۂ مذہب درید
سُرمۂ او دیدۂ ہر دم شکست — آں فلارنساوئ باطل پرست
فکرِ او مذموم را محمود ساخت — مملکت را دین او معبود ساخت
باطل از تعلیم او بالیدہ است
حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

(رموزِ بیخودی)

میکیاولی اپنی تصنیف مقالات میں لکھتا ہے :۔
جب ہمارے ملک کی آزادی خطرے میں ہو تو اس وقت ہمیں
انصاف اور ناانصافی، رحمدلی اور ظلم، برائی اور بھلائی، ان تمام
اخلاقی مسائل سے قطع نظر کرلینا واجب ہے۔ اور وہ کام کرنا چاہیئے
جس سے ملک کا وجود اور اس کی آزادی برقرار رہے۔ "[۱] (مقالہ
سوم فصل چہل ویکم)

(حاشیہ صفحہ ۶۴۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

میکیاولی نے جو " دین " پیش کیا۔ اس میں اس نے خدا کے بجائے " وطن " کو انسانوں کا معبود قرار دیا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ

(۱) نیکی وہ ہے جسے اللہ نیکی قرار دے

(۲) مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دین کے لئے اپنی جان قربان کر دے۔

(۳) مقصدِ حیات اللہ ہے۔

(۴) مذہب کی بنیاد نوعیت ہے۔

لیکن جب ہم پاکستان میں اس قسم کے نعرے سنتے ہیں :۔

(۱) ہم اپنے مقدس وطن کی ایک ایک انچ زمین کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

(۲) اب نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان بلکہ سب پاکستانی ہیں۔

(۳) مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

(۴) ہماری پارٹی کا کوئی مذہب نہیں۔

پروفیسر (G.H. SABINE) اپنی تالیف " تاریخ نظریات سیاسی " میں لکھتا ہے۔ اگرچہ میکیاولی کے زمانہ کے پوپ اکثر اوقات رذالت اور اسراف کا اظہار کرتے تھے۔ مگر وہ اپنی مملکت کو اطالیہ کی ساری مملکتوں میں مستحکم ترین بنانے میں ضرور کامیاب تھے۔

---

حاشیہ نمبر ۱۴۲:۔ ناظرین اس اقتباس کو غور سے پڑھیں تاکہ اقبال کے اس مصرع کا مطلب واضح ہو سکے۔

مصرع: مملکت را دین او معبود ساخت

پہلے زمانے میں وہ یہ چاہتے تھے کہ ساری دنیائے نصرانیت انہیں اپنے تنازعات میں حکم تسلیم کرے۔ مگر اب وہ صرف اس پر قانع ہیں کہ وسط اطالیہ میں ان کا اقتدار مسلم اور قائم رہے۔

دوسرے اطالوی باشندوں کی طرح میکیاولی بھی کلیسا کو اہلِ اطالیہ کی سیاسی ذلت وخواری کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تالیف "مقالات" میں لکھتا ہے۔ ہماری برائیوں اور بے دینی (دونوں عیوب) کی ذمہ دار کلیسائے روم اور اس کی قائم کردہ پادریوں کی جماعت ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ہمارے سر پر کلیسا کا احسان یہ ہے کہ اس نے ہمارے ملک کو منتشر اور تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہ افتراق یقیناً ہماری بربادی کا سبب ہوگا۔ کلیسا میں نہ تو خود اس قدر طاقت ہے کہ وہ سارے ملک پر اپنی حکومت قائم کر لے۔ اور نہ وہ کسی دوسرے کو اس کی اجازت دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک متعدد مملکتوں (ریاستوں) میں منقسم ہو کر ہر اعتبار سے ضعیف ہو گیا ہے [1]۔

میکیاولی کے فلسفۂ سیاست کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ سیاست کو اخلاق اور مذہب کی گرفت سے بالکل آزاد کر دیا جائے بلکہ

---

[1] اس اقتباس سے جو پروفیسر مذکور کی کتاب صفحہ ۲۱۰ سے پیش کیا گیا ہے۔ میرے خیال کی تائید اور تصدیق ہوتی ہے۔ کہ نظریۂ وطنیت در اصل کلیسائے روم کے خلاف ردِ عمل کا داستان نتیجہ ہے ۱۲۔

مذہب اور اخلاق دونوں کو مملکت کا غلام بنا دیا جائے۔ یعنی خیر و
شر کا معیار مذہب نہیں بلکہ مملکت ہے۔ نیکی وہ نہیں ہے جسے
خدا نیکی قرار دے۔ بلکہ نیکی یا خیر یا بھلائی وہ ہے جس سے
مملکت (اسٹیٹ) کو استحکام اور اقتدار حاصل ہو۔

میکیاولی نے کہا کہ مذہب کو گرجے کی چار دیواری کے اندر
محدود رہنا چاہیئے۔ پوپ یا کلیسا کو مملکت کے معاملہ میں دخل دینے
کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مملکت یا سیاست
لادین ہوگئی۔ یعنی نظم امور ریاست (انتظام مملکت) میں ارباب
حکومت، مذہب سے بے تعلق ہو گئے۔ اور انہوں نے بآواز بلند
کہنا شروع کر دیا۔ کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ حکومت کو
مذہب سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ (وغیرہ ذالک من الخرافات) [1]

میکیاولی اپنے نظریہ کی حمایت میں صاف لفظوں میں کہتا
ہے کہ نصرانی ضابطۂ اخلاق چونکہ صرف عقبیٰ کے لئے ہے۔ اس لئے

---

[1] دولت خداداد پاکستان کے مستقبل کے لئے یہ بات کس قدر
حوصلہ افزا اور خوش آئند ہے کہ کچھ دن ہوئے ایک مشہور سیاسی
جماعت کے مسلمان لیڈر نے پریس کانفرنس منعقدہ لاہور میں بڑے اطمینان
کے ساتھ یہ ایمان افروز نکتہ ارشاد فرمایا کہ

ہماری پارٹی کا کوئی مذہب نہیں ہے

واضح ہو کہ اسی زریں اصول کو سیاسی اصطلاح میں رسم لادینی
(سیکولرازم) کہتے ہیں۔ ۱۲

ہم اسے قبول نہیں کرتے۔ نیز وہ تمام نصرانی نیکیوں (رحملی، ہمدردی، ایثار، حلم، اور فروتنی) کو انسانی سیرت کی تشکیل کے حق میں مضر سمجھتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان سے انسان کے اندر غلامانہ رجحان طبع پیدا ہوتا ہے (تاریخ نظریات سیاسی صد ۱۹۲)

چنانچہ مقالات ۲:۲ میں وہ لکھتا ہے۔

ہمارا مذہب عاجزی، فروتنی اور انکساری اور دنیاوی اشیاء سے نفرت اور ان کی تحقیر کو بہترین قسم کی راحت و شادمانی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ دوسرے مذہب اس کے برعکس روحانی عظمت جسمانی طاقت اور ان تمام چیزوں کو خیر اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ جن کی بدولت انسان میں سطوت اور طاقت پیدا ہو سکے۔

ان اصولوں نے انسانوں کو ضعیف بنا دیا ہے۔ اسی لئے وہ بدکاروں کے پنجہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اکثر الناس بغرض حصولِ جنت مظالم برداشت کرنے کو بدلہ لینے پر ترجیح دیتے ہیں۔

(تاریخ مذکور صد ۱۹۳)

میکیاولی نے سیاسیات کے باب میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر (باعتبار ذات خویش) خود غرض ہے۔ نیز اس نے عوام اور مدبرین ملک کے لئے جداگانہ اخلاق معیار قائم کیا ہے۔ اور یہ وہ دوگونہ معیار ہی میکیاولی کے پیش کردہ نظریہ کی روح رواں ہے۔ یعنی حکمران تمام قوانین ملکی سے بالاتر ہے۔ بلکہ اگر ملکی قانون کوئی اخلاقی ضابطہ نافذ کرے

تو وہ اس ضابطۂ اخلاق سے بھی بالاتر ہے۔ حکمراں کے طرز عمل کو کسی اخلاقی ضابطہ سے نہیں جانچا جا سکتا۔ اس کے طرزِ عمل حسن و قبح کا معیار اخلاقی ضابطہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ دیکھا جائیگا کہ وہ مملکت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں؟ اگر وہ کامیاب ہے تو لائقِ تحسین ہے۔

چنانچہ میکیاولی نے بادشاہوں اور حکمرانوں کے لئے صاف لفظوں میں قتل و غارت، بے ایمانی اور ظلم و ستم کو جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ ان مذموم افعال سے وہ مملکت کو مستحکم کر سکیں کتاب الملوک فصل پانزدہم میں وہ لکھتا ہے کہ جو بادشاہ اپنے تخت و تاج کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے اس کو لازم ہے کہ وہ موقع اور مصلحت کو دیکھ کر کام کرے۔ اگر کسی وقت بدی کا ارتکاب ضروری ہو تو وہ بلا خوف لومۃِ لائم، بدی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ بادشاہت قائم رکھنے کے لئے ہر فعل (خواہ وہ کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو) جائز ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض اوقات نیکی سلطنت کی تباہی کا موجب ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات وہ امور جو اخلاقی زاویۂ نظر سے مذموم ہیں بادشاہ کے حق میں مفید ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام اینکہ میکیاولی نے مملکت کو معبود بنا دیا اور مذہب اور اخلاق دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور بقول پروفیسر سیدبائن میکیاولی کی تعلیم یعنی مذہب کی حقانیت سے بے اعتنائی، جدید سیاسی فکر کا طغرائے امتیاز ہے۔ (ص ۳۰۲)

ان تصریحات سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ اقبال نے نظریۂ وطنیت کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ بالکل صحیح اور برمحل ہے۔

یعنی یہ نظریہ، مذہب اور اخلاق دونوں کے حق میں سمِّ قاتل ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

(بانگِ درا)

نظریۂ وطنیت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جو قوم اس نظریہ کو قبول کرتی ہے۔ وہ خدا کے بجائے وطن کو اپنا معبود بنا لیتی ہے۔ یعنی مذہب اور اخلاق دونوں سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ اسی نظریہ کو قبول کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ خدا سے بیگانہ ہو گیا۔ اور مادہ پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گیا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:-

در نگاہش آدمی آب و گِل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

یعنی اقوامِ یورپ کی نگاہ میں انسان، سالماتِ مادّی کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ یعنی کائنات کا خالق خدا نہیں ہے۔ بلکہ مادّہ ہے۔ اور چونکہ مادہ بے شعور ہے اس لئے انسان کی زندگی بھی بے مقصد ہے۔ زندگی وہ کارواں (قافلہ) ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔

یورپین اقوام کے اسی ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان، نوعِ انسان کا شکاری بن گیا ہے۔ ہر طاقتور قوم کمزور قوموں کو ہلاک کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ دنیا جہنم بن گئی ہے۔ اور امن و امان بالکل مفقود ہو گیا ہے۔

---

## دوسرا بند :-

پہلے بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ یورپ کی نگاہ میں

(۱) کائنات کی اصل بنیاد مادہ ہے۔

(۲) انسان سالمات مادی کے امتزاج کا نام ہے۔

اس بند میں وہ اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں - چنانچہ کہتے ہیں:

ہر چہ می بینی ز انوارِ حق است
حکمتِ اشیاء ز اسرارِ حق است

اس اہم شعر کے پہلے مصرع میں انہوں نے مسلک مادیت کا ابطال کر دیا ہے کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اس کائنات کی اصل مادہ نہیں ہے۔ بلکہ "نورِ حق" ہے۔ جو کچھ تو دیکھتا ہے (یعنی یہ عالمِ محسوس) سالمات مادی کے امتزاج کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ تمام اشیائے کائنات وہ مظاہر ہیں جن سے نورِ حق ظاہر ہو رہا ہے۔ اصل کائنات مادہ نہیں ہے۔ بلکہ نور ہے۔ یہ تعلیم اس آیت سے مقتبس ہے:-

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (۲۴ - ۳۵)

اللہ ہی نور ہے آسمانوں اور زمین (ساری کائنات) کا۔ ۱۲

بلفظِ دیگر قرآن کائنات کی اصل (مادہ نہیں ہے بلکہ) نور ہے۔

چنانچہ اسی آیت کی شرح اقبال نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "تشکیلِ جدید" صفحہ ۶۸ میں یوں کی ہے۔

یہ دنیا سالماتِ مادی کی بے شعور حرکت سے لیکر انسانی خودی میں فکر کی حرکت تک، انائے کبیر (خدا) کا جلوۂ ذات ہے۔

آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ ہر شئی (ہر چہ می بینی) مظہر ذات وصفاتِ حق ہے۔

نظم ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

اسی حقیقت کو شاہ نیاز احمد صاحب بریلویؒ یوں بیان کرتے ہیں :-

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا

اخذ خواجہ میر درد دہلوی اسی صداقت کو یوں عیاں کرتے ہیں :-

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیاں ہیں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا

اسی نقطۂ نظر کو شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی یوں آشکار کرتے ہیں :-

" عکوس اسماء وصفات، حقائق ممکنات (اصل کائنات) ہیں۔"

آخر میں غالب کا اندازِ بیان بھی لائقِ توجہ ہے :-

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

الغرض اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات کا خالق اور صانع مادہ نہیں ہے۔ بلکہ حق تعا ہے۔ اور چونکہ وہ حکیم اور علیم ہے۔ اس لئے

اس نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی کاروانِ زندگی کی ایک خاص منزل ہے۔

اب دوسرا مصرع پڑھیے۔

ع حکمت اشیا ز اسرار حق است

یعنی اشیائے کائنات میں جو حکمت پائی جاتی ہے۔ وہ خدا کی ہستی پر دلالت کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی بناوٹ میں غور کرنے سے ہر عقلمند آدمی اس نتیجہ پہ پہنچ سکتا ہے کہ ان کو کسی حکیم اور علیم ہستی نے بنایا ہے۔ اسی کو ہم خدا کہتے ہیں۔

ع ہر ورقے دفتر لیست ز معرفت کردگار

(سعدی)

دوسرا شعر:-

ہر کہ آیات خدا بیند حر است الخ

اس شعر کے پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ حُر ہو جاتا ہے۔ یعنی غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح کہ جب اشیائے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر شئی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے یعنی اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے۔ اور میری طرح عاجز، مسکین اور ناتواں ہے۔ چونکہ ایسا ہے اس لئے نہ کوئی شئے مجھے کچھ دے سکتی ہے نہ مجھ سے کچھ لے سکتی ہے۔ نہ مجھے نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان نہ مجھ پر حکومت کر سکتی ہے۔ نہ مجھے اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتی ہے۔ لہٰذا میں اللہ کے سوا کسی کو اپنا رازق مالک یا حاکم نہیں بناؤں گا۔

بس یہ احساس انسان کو "حر" یعنی مومن بنا دیتا ہے۔

جو خود محتاج ہوئے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا

اب دوسرے مصرع کا مطلب سنو:۔
اقبال کہتے ہیں کہ پہلے مصرع میں جو حکمت میں نے واضح کی ہے اس کی بنیاد قرآن حکیم کا یہ حکم ہے:۔

اَفَلَا یَنظُرُونَ اِلَی الاِبِلِ کَیفَ خُلِقَت ط وَ اِلَی السَّمَاءِ کَیفَ رُفِعَت ط وَ اِلَی الاَرضِ کَیفَ سُطِحَت ہ

(۸۸۔ ۱۰ تا ۲۰)

پس کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا؟ اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کیا گیا؟ اور پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے قائم کئے گئے۔؟ اور زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔؟

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین (یعنی جملہ مظاہر فطرت) کا بغور مشاہدہ کریں۔ تاکہ ہمارے اندر اس کی ہستی کا یقین پیدا ہو سکے۔ [۱]

تیسرا اور چوتھا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب انسان

---

[۱] نظامِ عالم بتا رہا ہے کہ ہے اس کا بنانے والا
ظہورِ آدم دکھا رہا ہے کہ ہے کوئی دل میں آنے والا

(اکبر الہ آبادی)

مظاہر فطرت (آیاتِ خدا) کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اس کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جب علم اس کے دماغ کو منور کر دیتا ہے تو اس کے اندر تقویٰ (خشیۃ اللہ) پیدا ہو جاتا ہے۔[1]

اشعار ۵ تا آخر:۔

اس کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ علمِ اشیاء (سائنس) سے ہمارے اندر خدا کی ہستی پر ایمان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ **یورپ** (افرنگ) میں اس کی تاثیر (سائنس کے مطالعہ کا نتیجہ) بالکل برعکس ہے۔ یعنی اہلِ یورپ کے پاس خیر و شر (خوب و زشت) کا کوئی معیار نہیں ہے۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا اور وحی دونوں کے منکر ہیں) اس لئے لازمی طور سے ان کے اندر نہ انسانیت اور ہمدردی ہے۔ نہ رحمدلی اور محبّت ہے۔

ان کا طرزِ عمل ایسا غیر شریفانہ اور بہیمانہ ہے کہ اس کی وجہ سے علم (سائنس اور فلسفہ) بھی سارے عالم میں ذلیل و رسوا ہو گیا ہے۔ بلکہ ان کی اخلاقی حالت اس قدر زبوں ہے کہ اگر کوئی فرشتہ بھی ان کی صحبت اختیار کرے تو شیطان ہو جاتے۔ واضح ہو کہ فرشتوں میں بدی کا مادّہ بالکل نہیں ہوتا۔ لیکن اس قومِ مغرب کی صحبت میں

---

[1] چنانچہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓءُ ط (۳۵-۲۸) خدا سے تو اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (خدا کے آثارِ قدرت) کا علم رکھتے ہوں - ۱۲

وہ گروہ بھی ابلیس صفت ہو جائیں گے۔

چونکہ اہلِ یورپ کا دل ہمدردی کے جذبات سے خالی ہے۔ اس لئے ان کا علم ان کو بنی آدم کی ہلاکت کے نت نئے طریقے سمجھاتا رہتا ہے جن کی وساطت سے وہ نوعِ انسان کو ہلاک کرنے کے لئے ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ [1]

وجہ یہ ہے کہ اس جہانِ خیر و شر میں اگر علم (سائنس) کمینہ فطرت لوگوں کے ہاتھ میں آجائے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ یعنی علم و ہنر کا نشہ ان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔

افسوس! اہل یورپ نے علم حق کو ساحری میں تبدیل کر دیا۔ بلکہ کافر بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ان کی زندگی کافرانہ ہو گئی اور جب وہ اللہ کے منکر ہو گئے تو دنیا میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔

اے مسلمان اگر ہو سکے تو اس رہزن (یورپ) کے ہاتھ سے یہ تلوار چھین لے تاکہ دنیا اس کے ظلم و ستم سے محفوظ ہو جائے۔

اے مسلمان! چونکہ تو انسان کو صرف مادہ کی پیداوار نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک ذی روح ہستی تسلیم کرتا ہے اس لئے

ع سحر ایں تہذیب لادینی شکن

اس ملحدانہ تہذیب کے طلسم کو پاش پاش کر دے۔

---

[1] ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی موجودگی میں اقبال کا یہ شعر بلا مبالغہ بالکل صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ کس قدر صحیح لکھا ہے اقبال نے۔

ع دانش افرنگیاں تیغ بدوش

یورپ کے جسدِ بے روح میں ایمان باللہ کی روح پھونک دے
تاکہ وہ حقیقت تک پہنچ سکے۔ یعنی وہ اس نکتہ کا مفہوم سمجھ سکے کہ اگر
عقل انسانی دل کی مطیع ہو جائے تو انسان کو اللہ تک پہنچا دیتی ہے
اسے اللہ والا یعنی نیک بنا دیتی ہے۔ لیکن اگر عقل انسانی دل کی
گرفت سے آزاد ہو جائے تو پھر وہی انسان خدا کی بجائے شیطان
کا بندہ بن جاتا ہے اور دنیا کو اپنے طرزِ عمل سے زندہ جہنم بنا دیتا ہے۔
جسے شک ہو وہ آنکھیں کھول کر عصرِ حاضر کا مطالعہ کرے۔

ولیکن الاماں از عصرِ حاضر
کہ شیطانی بسلطانی بہم کرد
(ارمغانِ حجاز)

---

## تیسرا بند:-

اس بند میں اقبال نے یورپ کی درندگی اور بہیمت کو
اطالیہ کی مثال سے واضح کیا ہے۔ چونکہ اقوامِ یورپ خدا اور آخرت
دونوں کی منکر ہیں اس لیئے ان میں اور بھیڑیوں میں طرزِ عمل کے
اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ثبوت درکار ہو تو اطالیہ کے طرزِ عمل
کا مشاہدہ کافی ہے کہ اس نے بلا وجہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حبش پہ
حملہ کر دیا۔ اور مئی ۱۹۳۶ء میں اس ملک کا حکمراں ہیل سلاسی اپنے
تخت و تاج کو خیرباد کہہ کر برطانیہ کی حمایت میں آگیا۔
لیگ آف نیشنز نے زبانی بہت کچھ احتجاج کیا۔ مگر مسولینی
نے مطلق توجہ نہ کی۔ اور حبشہ کو اطالوی سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا۔

مسولینی پر احتجاج کا کوئی اثر اس لئے مرتب نہ ہو سکا کہ جو حکومتیں احتجاج کر رہی تھیں وہ خود اس جرم کی مرتکب ہو چکی تھیں (واضح ہو کہ برطانیہ اور فرانس نے ہندوستان اور الجیریا میں اطالویوں سے بڑھ کر ظلم وستم کے مظاہرے کئے تھے۔)

خوش قسمتی سے ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اور ۱۹۴۱ء میں "برادر شغال" نے بادشاہ حبشہ کو دوبارہ تخت نشین کر دیا۔

اس واقعہ سے اقبال نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ

(۱) یورپ کی شریعت میں (ضابطہ اخلاق میں) کمزور قوموں کو غلام بنانا اور بے گناہ انسانوں کو قتل کرنا دونوں باتیں جائز ہیں۔

(۲) جنیوا میں مکروفریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جنیوا کنایہ ہے "مجلسِ اقوام" سے جس کا مرکز اس زمانہ میں جنیوا تھا۔ یہ کفن چوروں کی مجلس گذشتہ جنگِ عظیم میں اپنی موت آپ ہی مر گئی۔ اور اس کی جگہ یو۔ این۔ او۔ معرضِ وجود میں آگئی۔ مسلمانوں کو نہ اول الذکر سے کچھ فائدہ پہنچا نہ آخر الذکر سے کسی فائدے کی توقع ہے۔

اقبال نے احوالِ حبش" سے عبرت اندوز ہونے کی تلقین کی ہے۔ مگر خوش قسمتی سے مسلمانوں کو ایسے رہنما میسر آگئے ہیں جنہوں نے ان کی آنکھوں پر خوب کس کے پٹی باندھ دی ہے اور چونکہ یہ قوم بصارت ہی سے محروم ہو چکی ہے تو "عبرت آموزی" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد اقبال ہمیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

## چوتھا بند:-

(۱) تمام نسلی، قومی، لسانی، لونی اور جغرافیائی امتیازات کو مٹادو۔ کیونکہ اسلام تو عالمگیر برادری قائم کرنے آیا ہے۔ اسلئے

عمد زرنگاہے ادیکے بالا و پست

(۲) اپنی صلاحیتوں پر ایمان لاؤ یعنی اعتماد علی النفس کی صفت پیدا کرو۔ دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا چھوڑ دو۔ اور افرنگ کی عظمت کا صاف لفظوں میں انکار کردو۔ یعنی انہیں اپنے سے زیادہ طاقتور مت سمجھو۔ احساسِ کمتری اپنے دل سے نکال دو۔ تم یورپین اقوام سے کسی طرح کم نہیں ہو۔

دنیا میں سچائی کا علم بلند کرو اور ایشیائی اقوام کو اتحاد کا پیغام دو۔ اے مسلمانوں یاد رکھو کہ مشرقی اقوام کی لاج تمہارے ہاتھ ہے۔

(۳) اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو کہ جب تک تم اپنے اندر قوت اور طاقت پیدا نہیں کرو گے۔ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ یعنی باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اور ہر قوم جمیعت (اتحاد) کی بدولت ہی قوت حاصل کر سکتی ہے۔ جب قوم کے افراد میں اتحاد نہ ہو وہ ہمیشہ غلام رہے گی۔

(۴) یاد رکھو کہ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔

(ا) راتے البصیرت، علم، عقیدہ، تصور، سمجھ بوجھ، دستورالعمل

ضابطہ وغیرہ) کے ساتھ اگر قوت شامل نہ ہو تو وہ محض مکر و فسوں ہے۔ یعنی کوئی شخص اپنے کسی خیال کو خواہ وہ کتنا ہی نیک، پاکیزہ اور اچھا کیوں نہ ہو دوسروں سے تسلیم نہیں کرا سکتا جب تک اس کے پاس قوت نہ ہو۔ کسی اسکیم پر عمل کرانے سے پہلے طاقت کا ہونا اشد ضروری ہے۔

(ب) لیکن اگر کسی کے پاس کوئی صحیح پروگرام یا ضابطہ نہ ہو اور صرف قوت ہی ہو تو وہ قوت بنی آدم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتی بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ ان کے حق میں بلائے بے درماں بن جائے۔

واضح ہو کہ رائے سے در اصل اقبال کی مراد وہ بصیرت ہے جو صرف قرآن و حدیث کے مطالعہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی علم شریعت اور قوت سے خلافت مراد ہے تاکہ خلیفہ نظامِ شرعی نافذ کر سکے اور جو مسلمان اس نظام (قانونِ الٰہی) کو تسلیم نہ کرے اسے "سیفٹی ایکٹ" کے تحت گرفتار کر کے جیل خانہ بھجوا سکے۔ ۱۲

---

## پانچواں بند:-

اس بند میں اقبال نے ایشیا کی عظمت کو اُجاگر کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں یہ براعظم اس لحاظ سے ساری دنیا پر فضیلت رکھتا ہے کہ شروع ہی سے عشق اور عقل دونوں کا گہوارہ رہا ہے۔

دنیا کے مشہور مذاہب مجوسیت، یہودیت، مسیحیت، ہندو دھرم، جین دھرم، بودھ دھرم اور اسلام، اسی برّ اعظم پر پیدا ہوئے۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، شری کرشن

مہاراج اور سرکار ابد قرار صلعم نے انسانوں کو عشقِ الٰہی کا سبق پڑھا کر سوز و ساز درد و داغ سے آشنا کیا۔ انبیاء کے علاوہ ہزاروں اولیاء اسی برِ اعظم کی خاک سے اُٹھے۔ جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو محبتِ خداوندی کا نغمہ سنا کر حقیقی معنی میں انسان بنایا۔

اسی سرزمین سے ہزاروں عرفاء اور رشی پیدا ہوئے جنہوں نے انسانوں کو معرفت کی شراب پلائی۔ اور روحانیت کے پوشیدہ اسرار فاش کئے۔ دنیا میں تمام علوم و فنون ایشیائی قوموں ہی کی بدولت پروان چڑھے۔

ہم ہی سے دنیا میں علم و شعر کی روشنی پھیلی۔ ہم ہی نے دنیا کو اس نکتہ سے آگاہ کیا۔ کہ ہر شے میں ایک ہی حقیقت جاری و ساری ہے۔ وہی ذاتِ واحد انسان میں روح بنکر نمودار ہوتی ہے۔ بلبل میں نغمہ بن کر سننے والے کو محو حیرت بناتی ہے۔ یعنی اصل کے اعتبار سے خون آدم اور رگِ گل میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

ہم ہی نے دنیا والوں کو سب سے پہلے اسرار وجود سے آگاہ کیا یعنی وہ حکماء اسی سرزمین میں پیدا ہوئے جنہوں نے دنیا کو فلسفہ کی لذت سے آشنا کیا۔ اور مسائلِ حیات میں غور و فکر کر کے کائنات کی اصل کا سراغ لگایا۔

؎ زو نخستین زخمہ بر تار وجود

یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ لفظی ترجمہ تو یہ ہو گا کہ ہماری ہی

فکر نے وجود کے تاروں پر سب سے پہلے مضراب لگائی مطلب یہ ہے کہ فلسفۂ اولیٰ (مابعد الطبیعات) کے مسائل میں سب سے پہلے ایشیائی قوموں ہی نے غور و فکر کی۔

ہم نے سب سے پہلے خود اپنے سینہ میں عشق کی آگ روشن کی۔ یعنی بھگتی مارگ (طریق محبت) دریافت کیا۔ پھر دنیا کو اس مسلک سے آشنا کیا۔ واضح ہو کہ حقیقت رسی کے دو ذریعے ہیں عقل اور عشق۔

جن لوگوں نے عقل کے ذریعہ سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کو حکماء کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے فلسفہ کے مختلف مدارسِ فکر قائم کئے جن کو ہندی میں درشن کہتے ہیں۔

جن لوگوں نے عشق کے واسطہ سے حقیقت دریافت کرلی۔ اُن کو عرفاء (رشی) کہتے ہیں ان حضرات نے پریم کا پیالہ پلاکر سالکوں کو راہِ محبت (بھگتی مارگ) پر چلایا۔ اور محبوبِ حقیقی سے واصل کردیا۔

اس کے بعد اقبال ایشیائی اقوام سے خطاب کرتے ہیں کہ تم لوگ تہذیب اور دین کی دولت کے امین ہو اب وقت آگیا ہے کہ یورپ کو اس دولت سے فیضیاب کرو اور اس کی مشکلات کو حل کرو۔ لہٰذا تمہارا فرض یہ ہے کہ یورپ کی غیر واقعی عظمت کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اور ہمت کرکے جمعیت اقوام مشرق قائم کرو۔

نوٹ:- اس بند میں اقبال نے یہ بہت بلند پایہ اور بلیغ شعر کہا ہے۔

فکر ما جویائے اسرارِ وجود
زد نخستیں زخمہ بر تارِ وجود

واضح ہو کہ وجود کے مسئلہ پر دنیا میں سب سے پہلے ہندی حکماء نے غور کیا۔ اور انہوں نے اس مسئلہ میں ایسی دقتِ نظر سے کام لیا۔ اور ایسی ایسی موشگافیاں قائم کیں کہ آج تک کوئی قوم اس میدان میں ان سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

افلاطون، ارسطو، فلاطینس (PLETINES) ڈیکارٹ، اسپنوزا، ہابز، لاک، بارکلے، لائبنز، ہیوم، کانٹ فختے، شیلنگ، ہیگل، شوپن ہار، بریڈلے، الکزینڈر اور میک ٹیگرٹ نے جو کچھ لکھا ہے یہ سب قدیم ہندی حکماء کے افکار کی صدائے بازگشت ہے۔

جب انیسویں صدی میں مستشرقین نے قدیم ہندو فلسفہ کا مطالعہ کیا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ فلسفہ کا کوئی قابلِ ذکر مذہب ایسا نہیں ہے جو ہندوستان میں قائم نہ ہو چکا ہو۔ چنانچہ پروفیسر میکس مولر نے (جو سنسکرت کا بہت بڑا عالم اور ہندو فلسفہ کا بہت بڑا نقاد تھا) ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "ہندوستان ہمیں کون کون سے علوم پڑھا سکتا ہے۔" اس کتاب میں اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ کہ ہندی فلسفہ انسانی فکر کی انتہائی پرزور ہے اس کے علاوہ پروفیسر کیتھ، پروفیسر سیکڈانلڈ، پروفیسر ولسن، مسز ماتینز ولیمس اور دوسرے مستشرقین نے بھی ہندی فلسفہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

یہ صراحت میں نے اس لئے کی ہے کہ ناظرین پر اقبال کے مذکورہ بالا شعر کی صداقت آشکار ہو جائے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شرح میں وجود کی بحث کو تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ یہ بحث انتہائی مشکل ہے۔ اگر اس کو کما حقہ لکھوں تو کئی سو صفحات درکار ہیں۔ اور یہ شرح اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں یہ بحث اس قدر عالمانہ اور دشوار (TECHNICAL)[1] ہے۔ کہ اس شرح کے اکثر ناظرین اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے میں صرف چند تمہیدی امور اور چند اشارات پر اکتفا کروں گا کہ ناظرین کو اس کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

(۱) لفظ وجود کے دو معنی ہیں۔

(ا) وجود بمعنی کون (حصول یا بودن یا ہونا یعنی ایک وصف انتزاعی یا معنی مصدری۔ یہ مصدری مفہوم تمام مفاہیم مصدریہ کی طرح ایک اعتباری مفہوم ہے۔ جو ظرف خارج میں منشاء کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مثلاً کھڑا ہونا یا بیٹھنا۔ جب زید کھڑا ہو تو حالت قیام سے ایک مفہوم ذہن میں موجود ہو گیا لیکن اس تصوّر (قیام) کا منشا کے سوا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے۔ چنانچہ اگر زید بیٹھ جائے تو اب کھڑے ہونے کا وجود خارج میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اس اعتبار سے وجود ایک وصف انتزاعی یا معنی مصدری ہے اور فلسفہ میں وجود کے اس مفہوم

---

[1] یعنی فنی مصطلاحات سے معمور ہے۔ ۱۲

سے بحث نہیں کی جاتی۔

(ب) وجود بمعنی ما بہ الموجودیت یعنی وہ شے جس کی وجہ سے کوئی شئ خارج میں موجود ہو جاتی ہے بالفاظِ دگر وجود بمعنی وہ حقیقت جس کا خارج پایا جانا ضروری ہے جس سے معنی مصدری منتزع ہوتے ہیں. مثلاً وجود زید جس سے قیام یا جلوس کا معنی منتزع ہوتا ہے فلسفہ میں وجود کے اسی مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

(۲) ہر عقلمند آدمی دیکھتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ کائنات موجود ہے اور اس میں لاتعداد اشیاء موجود ہیں. جس طرف دیکھو کوئی نہ کوئی شئ موجود ہے. اس لئے یہ سوال سامنے آیا کہ وجود، جس کی بنا پر تمام اشیائے کائنات موجود ہیں (وجود ہر شے میں مشترک ہے) کیا ہے؟ یہیں سے محبت کا آغاز ہوتا ہے۔

(۳) دنیا کے تمام نامور حکماء نے وجود سے بحث کی ہے اور اس بحث کی وجہ سے حکماء کے کئی گروہ قائم ہو گئے مثلاً مشائیۃ، اشراقیہ، متکلمین (اشاعرہ) اور صوفیہ ان میں اختلافات رونما ہوئے اور ان کی بنا پر بہت سے مسائل زیر بحث آگئے. ذیل میں چند مسائل درج کئے جا رہے ہیں تاکہ ناظرین بحث وجود کی وسعت اور اہمیت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

پہلا مسئلہ :۔ وجود کا تصور ہو سکتا ہے یا نہیں؟

دوسرا مسئلہ :۔ اگر وجود کا تصور ممکن ہے تو وہ تصور بدیہی ہے یا نظری؟

تیسرا مسئلہ :۔ وجود بسیط ہے یا مرکب؟

چوتھا مسئلہ :۔ وجود کی منطقی حد ہو سکتی ہے یا نہیں؟

پانچواں مسئلہ:- وجود کی منطقی رسم ہو سکتی ہے یا نہیں؟

چھٹا مسئلہ:- وجود کا اطلاق موجودات پر کس طرح ہوتا ہے؟
باشتراکِ لفظی یا باشتراکِ معنوی؟
اگر معنوی ہے تو کس طرح کا ہے؟

ساتواں مسئلہ:- متکلمین، مشائیہ اور اشراقیہ یہ تسلیم کرتے ہیں
کہ وجود کا اشتراک، ان غیر متناہی مصادیق میں،
معنوی اشتراک ہے۔ لیکن اس اشتراک کا مفہوم
متعین کرتے ہیں یہ تینوں گروہ مختلف الخیال ہو گئے
اس لئے کئی مسائل پیدا ہو گئے۔

آٹھواں مسئلہ:- امر واحد کا انتزاع، امور کثیرہ سے بلا اشتراک
منشاء ممکن ہے یا نہیں؟

نواں مسئلہ:- موجودات پر وجود کا حمل بالمواطات ہے یا
بالاشتقاق؟

دسواں مسئلہ:- وجود موجودات کے لئے عین ہے یا جزء ہے یا
وصف ہے۔؟

گیارھواں مسئلہ:- وجود باری، عین ذات ہے یا غیر ذات؟

بارھواں مسئلہ:- صوفیہ، اشراقیہ اور متکلمین اگرچہ غیبت کے
قائل ہیں۔ مگر تعبیر میں مختلف الخیال ہیں۔
اس لئے کئی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

تیرھواں مسئلہ:- وجود اصل ہے یا ذات؟ یعنی معقول اول وجود
ہے یا ذات؟

چودھواں مسئلہ :- وجود کا منشاء انتزاع کیا ہے؟
پندرھواں مسئلہ :- وجود، ماہیات کے لئے عین ہے یا غیر؟
سولھواں مسئلہ :- وجود ماہیات کو عارض ہوتا ہے یا ماہیات وجود کو عارض ہوتی ہیں۔؟

حکماء کہتے ہیں کہ وجود عارض ماہیات ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ وجود عارض نہیں بلکہ معروض ہے۔ چنانچہ جامی لکھتے ہیں :-

لیکن، کاشفات اربابِ شہود
اعیان ہمہ عارض اند و معروض وجود

(لائحہ چہارم)

سترھواں مسئلہ :- وجود ممکن کے لئے عین ہے یا زائد بر ذات؟
اٹھارھواں مسئلہ :- وجود کلی طبعی ہے یا جزی حقیقی؟
حکماء کہتے ہیں کہ وجود کلی طبعی ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ جزی حقیقی ہے۔ یعنی فردِ واحد میں منحصر ہے۔ جسے اللہ کہتے ہیں۔
انیسواں مسئلہ :- کلی طبعی خارج میں موجود ہے یا نہیں؟
بیسواں مسئلہ :- وجود ذہنی کا اثبات ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اب ناظرین خود غور فرمالیں کہ اگر ہر مسئلہ پر دس صفحے بھی لکھے جائیں تو ان تمام مسائل کے لئے کس قدر صفحات درکار ہوں گے اور بحث جس قدر عالمانہ فنی اور خشک ہوگی۔ اس کا اندازہ ان سوالات کی نوعیت سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس شرح میں وجود کی بحث چھیڑنے سے اجتناب کیا ہے۔ ناظرین میں سے جن کو اس بحث سے دلچسپی ہو تو حسبِ ذیل کتب کا مطالعہ فرمالیں :-

(ا) شرح مواقف، شرح مقاصد، شرح مطالع، شرح تجرید، اسفار اربعہ، مباحث مشرقیہ، فتوحات مکیہ (اس موضوع پر لاجواب کتاب ہے) حکمتہ الاشراق، حجتہ البازغہ، شفاء الجواہر الغالیہ شرح حواشی، زاہدیہ علی شرح المواقف۔

(ب) انگریزی داں حضرات کو وجود کی بحث حسب ذیل حکماء کی تصنیف میں مل جائیگی۔ ارسطو، پلوٹائینس، اسپنوزا، کانٹ، ھیگل، برگساں، الگزینڈر اور بریڈلے۔

(ج) ہندی حکماء کے افکار سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر رادھاکرشنن اور ڈاکٹر داس گپتا کی تاریخ فلسفۂ ہند کا مطالعہ کافی ہوگا۔

چھٹا بند:۔

کہتے ہیں کہ جب تم اقوام فرنگ کی عیاری سے دروغ بافی اور فریب کاری سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہو تو ان کی قید سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ [۱]

وائے بر حالِ ما کہ یہ قومیں رات دن ملت اسلامیہ کے جسم ناتواں کو مجروح کر رہی ہیں۔ مثلاً کبھی الجیریا کے بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کر رہی ہیں۔ کبھی فلسطین کے ننھے مسلمانوں پر گولہ باری کر رہی ہیں۔

---

[۱] واضح ہو کہ اقبال نے یہ مصرع "تا کجا در قید زنار فرنگ" ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ کسقدر افسوس کا مقام ہے کہ ان کی قید سے نکلنے کی کوشش کے بجائے ہم رات دن اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا۔ ۱۲

لیکن ہم انہی ظالموں سے عدل و انصاف کی توقع کرتے ہیں۔ جو قومیں شبانہ روز چرکے لگا رہی ہیں یا ہم انہی سے "رفو" زخموں کے اندمال کی امید رکھتے ہیں۔!

اے مخاطب! اس زمانہ میں مغربی قومیں سوداگری کے پردے میں قاہری (حکمرانی) کر رہی ہیں۔ پہلے سیاسی طور پر غلام بناتی ہیں۔ پھر معاشی اعتبار سے اپنا دست نگر بناتی ہیں۔

اگر تم ان کی ڈپلومیسی سے بخوبی واقف ہو جاؤ تو تمہیں اپنا ٹاٹ (کرپاس) ان کے ریشم (حریر) سے بہتر معلوم ہوگا۔ یعنی پھر تمہیں ان کی مصنوعات سے نفرت ہو جائے گی۔[۱]

---

[۱] افسوس ہے کہ ہمیں ابھی تک ان کی مصنوعات سے نفرت نہیں ہوئی اور مصنوعات ہی پر کیا موقوف ہے ہمیں ان کی کسی چیز سے نفرت نہیں ہے۔ انہی کا لباس

انہی کی زبان انہی کے آداب انہی کے اصول

مصرع انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی

(اکبر الہ آبادی)

[۲] اقبال نے ولایتی مال کے بائیکاٹ کا مشورہ (جسے ان کی قوم نے مطلق قبول نہیں کیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ "اقبال ڈے" کے جلسوں میں جو حضرات تقریریں کرتے ہیں وہ عموماً ملبوس بفرنگ میں جلوہ گر ہوتے ہیں) ۱۹۳۵ء میں دیا تھا۔ لیکن آرو ندو گھوش نے اپنی قوم کو یہ مشورہ تیس سال قبل دیا تھا اور اس کی قوم نے یہ مشورہ قبول بھی کیا جس کا ثبوت راجن بابو، رادھا کرشنن، راجگوپال اچاریہ، جواہر لال نہرو اور سری کرشن سنہا کی زندگی سے بآسانی مل سکتا ہے۔
(باقی ۶۷۰ پر)

لہٰذا اے مسلمان ان کا تجارتی بائیکاٹ کردے۔ ۱؎
(بے نیاز از کارگاہِ او گذر) اور یاد رکھ! ان قوموں کی عیاری اور خباثت کا یہ عالم ہے کہ تجھے "بے حرب و ضرب" ہلاک کر رہی ہیں۔

"ذبحُ المسلم لغیر سکین"

چونکہ یہ قومیں تیری دشمن ہیں۔ تجھے مٹانے پر تلی ہوئی ہیں اس لئے تو ان سے بکلی قطع تعلق کرلے اور اپنی ادنا چیز (بیدق) کے بدلہ میں ان کی اعلیٰ چیز (فرزیں مت قبول کر) کیونکہ پھر تو معاشی اعتبار سے بھی ان کا غلام ہو جائیگا ۲؎

ان کے جواہرات بظاہر خوش رنگ ہیں مگر در اصل سب میں کوئی نہ کوئی عیب ہے۔ ان کی عیاری اور فریب کاری کا یہ عالم ہے کہ جو مشک وہ تیرے ملک میں بھیجتے ہیں۔ وہ ہرن کی ناف کے بجائے کتے کی ناف سے نکلا ہوا ہے۔ یعنی وہ مشک نہیں ہے۔ بلکہ ایک ناپاک شی ہے۔ اور اس لئے قابلِ احتراز ہے۔

---

لقیہ ص ۶۶۹ :۔ اگر یقین نہ آئے تو ان کی تصویریں ایک نظر دیکھ لی جائیں اس کے بعد مصر، عراق اور کے اربابِ اقتدار کے درشن کر لئے جائیں۔

؏ حقیقت صاف کھل جائیگی وقتِ امتحاں انکی ۱۲

۲؎ یہ حقیقت مختلف ثبوت نہیں ہے :۔

خبر اہر یکہ کی مناتے ہیں
جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

اے مسلمان! اگر تو ان کی تیار کردہ مخمل کے بستر پر آرام کرنے کا عادی ہو گیا تو یاد رکھ کہ کچھ دنوں کے بعد تیری آنکھوں سے نیند ہی غائب ہو جائیگی۔ [1]

اے مسلمان! تو نے اپنے غلط طرز عمل کی بناء پر اپنی زندگی کو بہت دشوار بنالیا ہے۔ دیکھ! ان کے تیار کردہ کپڑے (ململ) سے اپنی دستار مت بنا۔ آگے چل کر یہ دستار تجھے بہت مہنگی پڑیگی۔ [2]

---

[1] اقبال کی یہ پیشنگوئی اس زمانہ میں پوری ہو گئی۔ واقعی اب ہمارے ملک میں اناج کی اسقدر قلت ہے کہ اکثر دردمند افراد قوم کو اس فکر میں رات کو نیند نہیں آتی۔ کہ الٰہی اس قلت اور اس گرانی کا انجام کیا ہو گا۔

[2] اقبال نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنے پیادہ کو ان کے فرزیں سے مت بدلو اور ان کی ململ سے اپنی دستار مت بناؤ۔ ۱۹۳۵ء میں دیا تھا۔
لیکن اکبر الہ آبادی بیس سال پہلے یہی مشورہ دے چکے تھے۔

چلنے آتے ہیں شاطر کسی جزیرے سے
تم اپنے شہد کو بدلو نہ انکے ہیرے سے

نہ کہدو زمزمۂ ارغنوال میں حسن سخن
سنبھال سکتے ہو تم اپنی لے مجیرے سے

علمائے دیں کے تکلف سے احتراز اولیٰ
مفید تر نہیں آتش کریم کھیرے سے

لیکن افسوس ہے کہ

نہ حالی کی مناجاتوں کی پرواہ کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

تو پھر کیا ہوا؟ صرف یہ کہ

ع مسوں کا بے تکلف چڑھ گیا ہر قلب پر پارا

سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ ان شاطر قوموں کے سامنے بالکل بچّوں کی طرح احمق ہیں۔ یہ لوگ میٹھی گولیاں فروخت کر رہے ہیں۔ اور ہم بچّوں کی طرح ان سے یہ مضرِ صحت اشیاء ہاتھوں ہاتھ خرید رہے ہیں۔

اے مسلمان! یہ قومیں "تاجرانِ رنگ و بو" ہیں۔ اپنے ملکوں سے سامانِ آسائش، مثلاً پوڈر، کریم، خوشبو اور دیگر سامانِ تعیش تیرے ہاتھ مہنگے داموں پر فروخت کرتی ہیں۔ اور تو آنکھ بند کر کے یہ لغویات ان سے خریدتا ہے۔ اور تجھے کبھی احساس نہیں ہوتا کہ تو قومی دولت کس بے دردی سے ضائع کر رہا ہے۔

اے مردِ حُر! تو فرنگی مصنوعات کا مکمل بائیکاٹ کر دے۔ اور جو کچھ تیرے ملک میں پیدا ہو۔ اسی کو فروخت کر۔ اسی کو زیب تن کر اور اسی کو اپنی غذا بنا۔ تاکہ تو ان دشمنانِ دین سے بے نیاز ہو سکے۔

اے مسلمان! ذرا اقوامِ یورپ کی فنّی مہارت (چرب دستی تو دیکھ) وہ تیرے ہی ملک سے اُون، ریشم چمڑا ارزاں قیمت پر خرید کرے جاتے ہیں اور پھر ان کو کمبل، قالین اور سوٹ کیس کی شکل میں تبدیل کر کے تیرے ہی ہاتھ گراں قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔

قصّہ یہ ہے کہ تو ان مصنوعات کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر مفتوں ہو جاتا ہے۔ اور آنکھ بند کر کے خرید لیتا ہے۔

افسوس ہے اس قوم پر جس کے افراد پر جمود طاری ہو گیا ہو۔ اور اس لئے وہ اپنے ہی موتیوں کو غواصوں (اغیار) سے خرید رہی ہو اور اپنے تیل کے چشموں کا ٹھیکہ غیروں کو دے رہی ہو۔

نوٹ:- اقبال نے اس فصل میں جو مشورہ اقوام مشرق کو دیا ہے اس میں وہ مشورہ بھی شامل کر لینا چاہیئے جو انہوں نے "مسافر" صفحہ ۴۰ میں ظاہر شاہ کو دیا تھا۔ وَھُوَ ھٰذا۔

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست — اصل او جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است — ایں گہر از دست ما افتادہ است
ایں پری از شیشۂ اسلاف ماست — باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

یعنی اقوام مشرق (علی الخصوص مسلمانوں) کو لازم ہے کہ وہ

(۱) سب سے پہلے سائنس (طبعیات، کیمیا اور علم الحیات وغیرہ) کی تعلیم عام کریں۔

(۲) سائنٹفک علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد صنعت و حرفت کو رواج دیں۔ اور وہ تمام آلات (سامانِ جنگ، آلاتِ حرب اور دیگر اشیاء) اپنے ملک میں تیار کریں۔ جن کے لئے ہم ہر وقت یورپین قوموں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے رہتے ہیں۔ یعنی جب تک مشرقی ملکوں میں صنعتی انقلاب رونما نہیں ہوگا۔ ہماری معاشی اقتصادی اور سیاسی غلامی کا دور ختم نہیں ہو سکتا۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

# فصل چہاردہم

## در حضورِ رسالت مآب

شبِ سہ اپریل ۱۹۳۶ء کہ در دارالاقبال بھوپال بودم سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ را در خواب دیدم فرمودند کہ از علالت خویش در حضورِ رسالت مآب عرض کن

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ  وا رہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

سوختی لات و منات کہنہ را  تازہ کردی کائنات کہنہ را

در جہانِ ذکر و فکر انس و جاں  تو صلاتِ صبح، تو بانگِ اذاں

لذتِ سوز و سرور از لا الٰہ  در شبِ اندیشہ نور از لا الٰہ

نے خدا با ساختیم از گاؤ خر — نے حضورِ کاہناں افگندہ سر

نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر — نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست — فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور — قوم را دارد بہ فقر اندر غیور

اے مقام و منزلِ ہر راہرو — جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو

ساز ما بے صوت گردید آنچناں — زخمہ بر رگہائے او آید گراں

در عجم گردیدم و ہم در عرب — مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ — ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

در جوانی نرم و نازک چوں حریر — آرزو در سینۂ او زود میر

ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام — حریت اندیشۂ او را حرام

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود — از وجودش ایں قدر دانم کہ بود

ایں ز خود بیگانہ ایں مستِ فرنگ — نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

نان خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک — داد ما را نالہ ہائے سوزناک

دانہ چیں مانندِ مرغانِ سرا است — از فضائے نیلگوں نا آشنا است

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر ۔ از مقام او نداد او را خبر

آتشِ افرنگیان بگداختش ۔ یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش

مومن دا از رمزِ مرگ آگاہ نیست ۔ در دلش لاغالب الا اللہ[1] نیست!

تا دلِ او در میانِ سینہ مرد ۔ می نیندیشد مگر از خواب و خورد

بہرِ یک ناں نشترِ لا و نعم ۔ منتِ صد کس برائے یک شکم

از فرنگی می خرد لات و منات ۔ مومن و اندیشۂ او سومنات

قم باذنی[2] گوئے و او را زندہ کن ۔ در دلش اللہ ھو را زندہ کن

ما ہمہ افسونیٔ تہذیبِ غریب ۔ کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب

تو ازاں قومے کہ جامِ او شکست ۔ وانمای یک بندۂ اللہ مست

تا مسلماں باز بیند خویش را

از جہانے برگزیند خویش را

شہسوارا یک نفس در کش عناں ۔ حرفِ من آساں نیاید بر زباں

---

[1] لا غالب الا اللہ : یعنی اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں۔

[2] قم باذنی : یعنی اُٹھ میرے حکم سے۔

آرزو آید کہ نا ید تا بہ لب؟ می نہ گردد شوقِ محکومِ ادب

آں بگوید لب کشا اے دردمند ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند

گردِ تو گردد حریمِ کائنات از تو خواہم یک نگاہِ التفات

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی کشتی و دریا و طوفانم توئی

آہوئے زار و زبون و ناتواں کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہِ من حریم کوئے تو

من بہ امیدے رمیدم سوئے تو

آں نوا در سینہ پروردن کجا وزدمے صد غنچہ وا کردن کجا

نغمۂ من در گلوئے من شکست شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست

در نفس سوزِ جگر باقی نماند لطف قرآنِ سحر باقی نماند

نالۂ کو می نہ گنجد در ضمیر تا کجا در سینہ ام ماند اسیر

یک فضائے بے کراں می بایدش

وسعت نہ آسماں می بایدش

آہ زاں دردے کہ در جان و تن است گوشۂ چشمِ تو داروئے من است

در نسازد با دوا ہا جانِ زار | تلخ و بویش بر مشامم ناگوار

کار ایں بیمار نتواں برد پیش | من چو طفلاں نالم از داروئے خویش

تلخئ او را فریبم از شکر | خندہ ہا در لب بدوزد چارہ گر

چوں بصیری[۱] از تو میخواہم کشود | تا بمن باز آید آں روزے کہ بود

مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است | در خطا بخشی چو مہرِ مادر است

با پرستارانِ شب دارم ستیز | باز روغن در چراغِ من بریز

اے وجودِ تو جہاں را نو بہار | پرتوِ خود را دریغ از من مدار

"خود بدانی قدرِ تن از جاں بود (رومی) قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود"

تا ز غیر اللہ ندارم ہیچ امید | یا مرا شمشیر گرداں یا کلید

فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چست | تخمِ کردارے ز خاکِ من نہ رست

تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من | محنتے دارم فزوں از کوہ کن

---

۱؎ بصیریؒ: مشہور عربی قصیدہ بُردہ کا مصنف، یہ قصیدہ حضور رسالت مآبؐ کی نعت میں ہے۔ روایت ہے کہ بصیریؒ کا قصیدہ بارگاہِ نبویؐ میں مقبول ہوا۔ اور مصنف کو فالج کی بیماری سے نجات ملی۔

مومنم، از خویشتن کافر نیم
بر فسانم زن کہ بد گوہر نیم

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است | چیزکے دارم کہ نامِ او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں | کز سُمِ شبدیزِ تو دارد نشاں
بندہ را کو نخواہد ساز و برگ | زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ!
اے کہ وادی کردہ را سوزِ عرب | بندۂ خود را حضورِ خود طلب
بندۂ چوں لالہ داغے در جگر | دوستانش از غمِ او بے خبر
بندۂ اندر جہاں نالاں چو نے | تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے
در بیابان مثلِ چوبِ نیم سوز | کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز!
اندریں دشت و درے پہناورے | بوکہ آید کاروانے دیگرے

جان ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من وائے من اے وائے من!

---

# تمہید

گذشتہ فصل میں اصل کتاب ختم ہو گئی۔ اس آخری فصل میں اقبال نے اپنے آقا اور مولیٰ سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روحانی طور پر حاضر ہو کر اپنا حالِ دل بیان کیا ہے۔

ایک تو شاعری نام ہی ہے جذبات نگاری کا، اس پر مستزاد یہ کہ اقبال نے اپنے محبوب کی بارگاہ میں اپنی معروضات پیش کی ہیں نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ شرابِ سخن دو آتشہ ہو گئی۔ یہی اس فصل کی خصوصیت ہے۔ جذبات کا ایک بے پناہ سیلاب جو امڈا چلا آتا ہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ تیر و نشتر بن کر دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو ان اشعار کو پڑھے۔ اور از خود رفتہ نہ ہو جائے۔

گرد تو گردد حریم کائنات — از تو خواہم یک نگاہِ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی — کشتی و دریا و طوفانم توئی
آہوے زار و زبون و ناتواں — کس بفتراکم نہ بست اندر جہاں
اے پناہِ من حریم کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

ان اشعار میں جو سوز و گداز ہے اس کی نظیر اقبال کے سارے کلام میں اگر کہیں مل سکتی ہے تو رموزِ بیخودی کی آخری فصل میں جس کا عنوان ہے "عرضِ حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین"

ذیل میں چند اشعار درج کرتا ہوں تاکہ ان کے پڑھنے سے

قندِ مکرّر کا لطف حاصل ہو۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است | در بحرفم غیر قرآں مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور | چشم تو بینندۂ مافی الصدور
پردۂ ناموس فکرم چاک کن | ایں خیاباں، ز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس فصل میں پانچ بند ہیں۔ ذیل میں ہر بند کا خلاصہ درج

کرتے ہیں :-

(۱) پہلے بند میں اقبال نے سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے الطافِ بے پایاں سے آغازِ سخن کیا ہے۔ اس سلسلہ کا آخری شعر یہ ہے۔

اے مقام و منزل ہر راہرو
جذب تو اندر دل ہر راہرو

اس کے بعد انہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی حالتِ زار کا نقشہ حضور کے سامنے کھینچا ہے اور آخر میں حضور سے التجا کی ہے کہ

قم باذنی گوئے و او را زندہ کن
در دلش اللہ ہو را زندہ کن

(۲) یہ بھی ممکن تھا کہ اقبال پہلے ہی بند میں اپنا دردِ دل حضور کو سنا دیتے۔ مگر انہوں نے قصداً ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں خود غرضی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ

کے خادم ہونے کی حیثیت سے انہوں نے پہلے ملّت کا حال زار بیان کیا۔ یعنی اپنی قوم کو اپنی ذات پر مقدم کیا۔ پہلے قوم کی بہبود طلب کی۔ پھر اپنا حال سنایا۔ چنانچہ دوسرے بند میں سرکار ابدقرار صلعم سے التجا کی ہے کہ حضور اب میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۳) تیسرے بند میں اپنی حالت کا اظہار کیا ہے۔ اور سب سے پہلے یہ عرض کی ہے کہ حضور ایسا عارضہ لاحق ہو گیا ہے کہ جس کی وجہ سے میری آواز بالکل بیٹھ گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
لطفِ قرآں سحر باقی نماند

(۴) چوتھے بند میں دیگر عوارض خصوصاً ضعف جسمانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں اپنی صحت کی آرزو کی وجہ بھی بیان کی ہے۔

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

(۵) آخری بند میں اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ اگرچہ میں بہت گنہگار ہوں۔ مگر آپ کی محبت میں بلاشبہ سرشار ہوں اس لئے آپ کی خدمت میں حاضری کا امیدوار ہوں۔

بندہ را کو نخواہد ساز و برگ
زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ

---

## پہلا بند :-

اس بند کے پہلے نو اشعار میں اقبال نے سرکار ابد قرار صلعم کے بعض احسانات کا تذکرہ کیا ہے جو آپ نے بنی آدم پر کئے ہیں سب سے پہلے قوم کی اصلاح حال کی طرف حضور کو متوجہ کیا ہے۔

عہ دار ہاں ایں قوم را از ترس مرگ

کس قدر بلیغ مصرع ہے! قوم کے حق میں اس سے بہتر دعا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اگر مسلمان، خالدِ جانباز رضؓ کی طرح موت کے خوف سے بے پرواہ اور بیگانہ ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔

اس لئے سب سے پہلے اقبال بارگاہِ رسالت میں یہ عرض کرتے ہیں کہ حضور! اس قوم کو (جو آپ کی نام لیوا ہے) موت کے خوف سے رہائی عطا کر دیجئے۔ دین اور دنیا کی ساری دعائیں اس ایک دعا میں آگئیں۔ غور سے دیکھو تو صحابہؓ کی زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت یہی تھی کہ وہ موت کے خوف سے آزاد ہو گئے تھے۔

چنانچہ حضرتِ خالدؓ نے ایرانی سرداروں کو جو خط لکھا تھا۔ اس میں یہ تاریخی فقرہ بھی لکھا تھا۔

"میں ایسی قوم کو تمہارے مقابلہ میں لایا ہوں جو موت کو اسی قدر محبوب رکھتی ہے۔ جس قدر تم زندگی کو محبوب رکھتے ہو۔"

واضح ہو کہ جب کوئی قوم موت کو عزیز رکھنے لگتی ہے تو وہ لازمی

طور سے دنیا میں سربلندی حاصل کر لیتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اس نکتہ غریبہ کو یوں نظم کیا ہے۔

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقین آیا
جسے جینا نہیں آیا، اسے مرنا نہیں آیا

اس کے بعد اقبال نے سرکار ابد قرار صلعم کے احسانات گنائے ہیں مثلاً :-

(۱) آپ نے دنیا سے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا اور اس عالم کو نئی زندگی عطا فرما دی۔

(۲) آپ نے بنی آدم کو توحید کی نعمت سے بہرہ اندوز فرمایا یہ کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کیا ہے؟
مومن کے لئے منبع سوز و سرور ہے۔ اور عقل کی شب تاریک کے لئے سراسر نور ہے۔

(۳) آپ نے مسلمانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے آزاد کر دیا مسلمان نہ کسی حیوان کے سامنے سربسجود ہوتا ہے۔ اور نہ مذہبی پیشواؤں اور کاہنوں کی غلامی کرتا ہے۔ اور نہ وہ بتوں کو اپنا معبود سمجھتا ہے۔ اور نہ بادشاہوں کو اپنا آقا مالک یا حاکم تسلیم کرتا ہے۔

اے میرے آقا بر جملہ نعمائے روحانی آپ ہی کی بدولت ہمیں حاصل ہوئیں۔ آپ کی یاد سے ہمارے دلوں میں عشق کی شمع روشن ہے۔ اور آپ کی محبت وہ طاقت ہے جو ایک مسلمان کو فقیری میں بھی امیری کا لطف بہم پہنچا سکتی ہے۔

یعنی جو لوگ آپ کے عاشق ہیں وہ بحالتِ عُسر بھی اپنی شانِ فقر برقرار رکھتے ہیں۔ خواہ کچھ ہو جائے مگر غیر اللہ کے آگے نہیں جھکتے بلاشبہ آپ ہر مسلمان کا مقصود ہیں اور ہر سالک (مومن) کے دل میں آپ کی محبت رچی ہوئی ہے۔

حضورِ انور صلعم کے الطافِ بے پایاں کے تذکرے کے بعد اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی حالتِ زار، سرکارِ ابدقرار صلعم کی خدمت میں بیان کرتے ہیں۔

ان اشعار میں سوز و گداز، فراوانیِ جذبات اور شدتِ احساس کا جو رنگ جھلک رہا ہے وہ کسی طرح سے نثر میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اشعار پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

ع کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

تاہم چونکہ مجھے شرح کا فرض انجام دینا ہے اس لئے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگاتا ہوں۔ اور لہو لگا کر شہیدوں میں نام لکھاتا ہوں:-

**پہلا شعر:-**

سازِ ما بے صوت گردید آنچناں الخ

معانی سے قطع نظر کر کے شاعرانہ اعتبار سے بھی بہت بلند شعر ہے۔ ساز، صوت، زخمہ اور رگ (تار) کے تلازمہ نے شعر میں غضب کی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ساز کنایہ ہے قلب سے، صوت کنایہ ہے۔ جذبہ عشق سے۔ زخمہ کنایہ ہے یادِ معشوق یا ذکرِ محبوب سے۔ رگ کنایہ ہے تار سے۔ اور تار کنایہ ہے قلب سے۔

مطلب یہ ہے کہ اقبال قوم کی طرف سے اقبالِ جرم کرتے ہیں کہ

اے میرے آقا اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کے قلوب آپ کی محبت سے کچھ اس طرح خالی ہو گئے ہیں کہ اب اگر کوئی اللہ کا بندہ بھولے سے آپ کی یاد انہیں دلاتا ہے یا آپ کا تذکرہ ان سے کرتا ہے تو وہ بھی انہیں ناگوار ہوتا ہے اور وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں۔

؏ کچھ اور ذکر کیجئے یہ قصہ بیاں نہ ہو

میرے آقا میں اعتراف کرتا ہوں کہ مسلمان ساری ساری رات کلبوں اور ہوٹلوں میں دادِ عیش دے سکتے ہیں اور

یک دست جام بادہ و یک دست زلفِ یار

کی زندہ تصویر بن کر کافروں کو شرما سکتے ہیں۔ لیکن آپ کا ذکر بھی ان کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔

مختصر یہ کہ آج عرب اور عجم، یعنی ساری دنیا میں عاشقانِ مصطفےٰ نایاب ہیں اور پیروانِ ابولہب کی افراط ہے۔

اس اعترافِ حقیقت کے بعد اقبال مسلمان نوجوانوں کی حالت بیان کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ نوجوان ہی کسی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ انہی کے طرزِ عمل سے کیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضور! آج کل کے مسلمان نوجوان کی حالت یہ ہے کہ

(۱) اس کا دماغ تو ایم۔ اے کی ڈگری سے منور ہو گیا ہے۔ مگر اس کا قلب (ضمیر) بالکل تاریک ہے۔ یعنی روحانی اعتبار

سے بالکل مردہ ہے۔

(۲) جوانی میں بھی اس کے اندر مردانہ شان نظر نہیں آتی۔ فولاد کی طرح سخت مضبوط ہونے کے بجائے ریشم کی طرح نرم اور نازک نظر آتا ہے۔

ع نوجواناں چوں زناں مشغول تن

(۳) چونکہ وہ خود بھی غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اس کے اجداد بھی اسی لعنت میں گرفتار تھے اس لئے آزادی کا تصوّر بھی اس کے دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر بھولے بھٹکے ہو بھی جاتا ہے تو خود اس کے والدین اور اس کی منگیتر کے والدین سب مل کر اسے ہزاروں سبز باغ دکھاتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کی "خاکِ شفا" چٹاتے ہیں۔ سکریٹریٹ کی کرسی کا لخلخہ سنگھاتے ہیں۔ غرض ایسی بے چھنی پلاتے ہیں کہ انجام کار راہِ راست پر لے آتے ہیں۔

(۴) کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم نے اسے جذبۂ دین سے بالکل بیگانہ کر دیا ہے۔ اب رہا اس کا وجود (یعنی) ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا وجود تو اس کے متعلق اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ ہاں انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے تو وہ ضرور زندہ تھا۔ مگر جب وہ کالج میں پہنچا تو ختم ہو گیا۔[1]

---

[1] واضح ہو کہ اقبال نے کالج کو پھانسی گھر سے اور ان کے استاد اکبر الہ آبادی نے کالج کو مذبح سے تشبیہ دی ہے۔ اقبال کہتے ہیں

باقی ص ۶۸۶ پر

(۵) حضور! اب اس کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی خودی سے بیگانہ ہوگیا ہے۔ اور فرنگی تہذیب پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا ہے۔ بال انگریزی، چال ڈھال انگریزی، لباس انگریزی، بول چال انگریزی، نگاہ انگریزی خیال انگریزی۔ یعنی جسم، دل اور دماغ تینوں انگریزی۔

چونکہ خودی سے بیگانہ ہوگیا ہے اس لئے نانِ جویں کی خاطر انگریز کے آگے دستِ سوال دراز کر رہا ہے اور مطلق غیرت نہیں آتی۔ معمولی سا عہدہ حاصل کرنے کے لئے دین و ایمان بیچنے پر تیار ہے بلکہ چاندی کی چند ٹکلیوں کے لئے مذہب اور ملت دونوں کو قربان کر سکتا ہے۔ (اور کر رہا ہے) [۱]

حضور! افسوس اس بات کا ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر چونکہ خود کم سواد اور کم نظر تھے اس لئے وہ اسے اس کے مقام سے آگاہ نہ کر سکے۔

---

بقیہ صفحہ ۶۸۷:- گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اکبر کہتے ہیں:- یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

[۱] اکبر الہ آبادی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

فرنگی تعلیم اور تہذیب نے اس کی شخصیت کو بالکل پگھلا دیا بالفاظِ دگر اس آگ (تہذیب مغرب) نے اس کی ماہیت ہی قلب کر دی یعنی مومن سے کافر بنا دیا۔ نتیجہ اسی کا یہ نکلا کہ

ع در حرم زائید و در بتخانہ مُرد

(۶) کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مسلمان ہونے کا مدعی ہے۔ اور شہادت کے فلسفہ سے بے خبر ہے۔ یعنی اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان وہ ہے جو جنّت کے عوض اپنی جان اور اپنا مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے[1]۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ جو شخص اللہ کی راہ میں مارا جاتا ہے وہ موت پر غالب آ جاتا ہے اور اس لئے ابدی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم شہید کو مُردہ نہیں کہہ سکتے۔[2]

---

[1] اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ط (۹-۱۱۲)
بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنّت کے عوض خرید لیا ہے۔ ۱۲

[2] وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ط (۲-۱۵۴)
اور جو لوگ راہِ خدا میں شہید ہو جائیں ان کو مُردہ مت کہو حقیقت یہ ہے کہ وہ تو زندہ ہیں۔ لیکن تم اس نکتہ کو نہیں سمجھتے۔ ۱۲

بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگِ او را می دہد جانے دگر

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اس صداقتِ عظمیٰ سے بیگانہ ہو گیا ہے کہ

لا غالبَ اِلّا اللّٰہ

یعنی آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں ہے۔

(۷) چونکہ اس کا دل آپ کی محبت سے خالی ہو چکا ہے اس لیے وہ ہر وقت مادیات میں منہمک رہتا ہے۔ بلکہ اس نے خواب و خور ہی کو مقصودِ حیات بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند لقموں کی خاطر ضمیر فروشی کرتا ہے اور صرف اپنے ایک پیٹ کو بھرنے کے لئے سینکڑوں آدمیوں کی خوشامد میں مشغول رہتا ہے۔ فرنگی اقوام سے غیر اسلامی عقائد اور افکار اخذ کرتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود اس کا دماغ کافرانہ خیالات سے معمور نظر آتا ہے۔

خلاصہ کلام اینکہ مسلمان نوجوان ہر اعتبار سے مردہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اے میرے آقا میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اسے دوبارہ زندہ کر دیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کے دل میں توحیدِ الٰہی (اللہ ھو) کے عقیدہ کو راسخ کر دیجئے۔

نوجوانوں کی حالت بیان کرنے اور ان کے حق میں دعائے خیر کے بعد اقبال عامۃ المسلمین کے لئے دعا کرتے ہیں کہ حضور! حقیقت یوں ہے کہ کیا جوان اور کیا بوڑھے۔ ہم سب مادیت اور الحاد کے طلسم

میں گرفتار رہیں۔ انگریزوں نے اپنے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی بدولت ہمیں بے تیر و تفنگ ختم کر دیا۔ اپنی زبان پڑھا کر ہمیں اسلام سے بیگانہ کر دیا اور اپنا ادب پڑھا کر ہمیں بے ادب بنا دیا۔ اور مغربی افکار کے ذریعہ سے ہماری شخصیت اور ذہنیت کو مسخ کر دیا۔

اے آقا! آپ ایسی قوم میں، جو اسلام سے بیگانہ ہو چکی ہے (جامِ او شکست) کوئی ایسا شخص ہماری راہنمائی کے لئے کھڑا کر دیجئے یا ظاہر کر دیجئے۔ جو فی الحقیقت اللہ کا بندہ (اللہ مست) ہو۔ تاکہ اس کی صحبت میں بیٹھ کر مسلمان دوبارہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں اور آشنائے راز ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو ساری قوموں سے افضل یقین کر سکیں [1]

## دوسرا بند

اقبال نے اس بند میں سرکارِ دو عالم صلعم کو "شہسوار" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شہسوار کنایہ ہے حکمران اور صاحب اقتدار ہستی سے۔ چونکہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے دونوں جہان

---

[1] یہ تصور اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳-۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو پیدا کی گئی لوگوں کی (اصلاح) کے لئے (اور تمہارے تفوق کا ثبوت یہ ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور ان کو برائیوں سے روکتے ہو۔ ۱۲

کی سرداری یا بادشاہت عطا کی ہے اس لئے اقبال نے حضور کو بایں لقب مخاطب کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضور! ایک لمحہ کے لئے آپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنی چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ حضور کے سامنے مجھے یارائے گوئی نہیں ہے۔ میں اس وقت اس کشمکش میں گرفتا ہوں کہ لب کشائی کر کے حالِ دل بیان کروں یا حواسِ خمسہ کو مجتمع کر کے آپ کے جمال سے لطف اندوز ہوں؟ لیکن چونکہ شوق، محکومِ ادب نہیں ہوتا اس لئے عرض کرتا ہوں کہ ؎

گردِ تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

حضور! میرے حالِ زار پر محبت کی نگاہ کیجئے۔ چونکہ میری نگاہ میں میرے لئے آپ ہی سب کچھ ہیں۔ اس لئے آپ سے اپنا حالِ دل نہ کہوں تو اور کس سے کہوں۔ آپ کے سوا اور کوئی ہستی رحمۃ اللعالمین نہیں ہے۔ بالفاظِ دگر کائنات خلقت میں کوئی آپ کا ثانی نہیں ہے [۱]

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

---

[۱] لطف بدایونی نے اس حقیقت کو یوں نظم کیا ہے۔

رُخِ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

آپ ہی کا ذکر میری زندگی کا مقصد ہے میرے دل میں آپ کی یاد بسی ہوئی ہے۔ ہر وقت آپ ہی کا تصور کرتا رہتا ہوں میرے خیال کی دنیا آپ ہی کے دم سے آباد ہے۔ آپ ہی میرے علم و عرفان کا منتہی ہیں مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان خدا کا علم و عرفان تو کما حقہٗ حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ ذاتِ باری حیطۂ ادراکِ انسانی سے وراء الوراء ہے۔ لہذا انسانی فکر کی انتہائی پرواز یہ ہے کہ وہ آپ کے کمالات سے آگاہ ہو سکے۔
کشتی کنایہ ہے رہبر اور محافظ سے، دریا کنایہ ہے علم روحانی (ملکوت، جبروت، لاہوت) سے اور طوفان کنایہ ہے احوال و مقامات سے۔

مطلب یہ ہے کہ میں آپ ہی کے واسطہ اور وسیلہ سے خدا تک پہنچ سکتا ہوں۔ میری کشتی بھی آپ ہی ہیں، دریا بھی آپ ہی ہیں، اور طوفان بھی آپ ہی ہیں۔

حضور میں ایک عاجز اور ناتواں انسان ہوں مجھ میں کوئی خوبی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ؎

کس لبفتر اکم نہ لبست اندر جہاں

میرے آقا! میں کچھ تو تعات لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

تیسرا بند:-

اس تمہید کے بعد اپنا حال دل بیان کرتے ہیں۔

حضور! کچھ عرصہ سے مختلف عوارضِ جسمانی میں مبتلا ہوں۔ ان میں سے ایک عارضہ یہ ہے کہ میرا گلہ بیٹھ گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

در نفس سوز جگر باقی نماند
لطف قرآنِ سحر باقی نماند

یعنی نہ میں اب باآواز بلند گفتگو کر سکتا ہوں۔ نہ کسی جلسہ میں تقریر کر کے سوزِ جگر کا اظہار کر سکتا ہوں۔ اور نہ خوش الحانی کے ساتھ تلاوتِ قرآن کر سکتا ہوں۔

حضور! میرے قلب میں جذبات و احساسات کا ایک دریا موجزن ہے۔ ان کے اظہار کے لئے تو مجھے فضائے بیکراں بلکہ وسعتِ نُہ آسماں درکار ہے۔ اب آپ خود غور فرمائیں کہ میں اپنے افکار و خیالات کو، جو باہر آنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتے ہیں۔ کس طرح اور کب تک اپنے سینہ میں مقید رکھوں۔؟

چوتھا بند:۔

حضور! اس تکلیف کے علاوہ دیگر عوارض بھی لاحق حال ہیں اور اب یہ کیفیت ہے کہ کوئی دوا موافق نہیں آتی۔ بلکہ دواؤں کی بُو مجھے ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ کسی قسم کی دوا پینے کو جی نہیں چاہتا۔ جس طرح بچے دوا پینے سے جان چراتے ہیں۔ بس وہی حال میرا ہے۔ چنانچہ میں اس کی تلخی کو شکر سے دور کرتا ہوں۔ اور اس بات سے میرا معالج زیرِ لب مسکراتا ہے۔

حضور! جس طرح آپ نے بصیریؒ پر نگاہِ کرم کی تھی اسی طرح میری

---

نوٹ:۔ ۱۹۳۴ء میں علامہ مرحوم کی آخری علالت کا آغاز ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کا گلا ایسا بیٹھا کہ تادمِ وفات آواز درست نہ ہو سکی۔ ۱۲

مشکل بھی آسان فرما دیجئے۔ چونکہ میں باطل پرستوں (پرستاران شب) کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہوں۔ اور اس دورِ مادیت میں یہ جہاد اشد ضروری ہے۔ اس لئے میں آپ سے ملتجی ہوں کہ مجھے صحت عطا فرما دیجئے۔

آپ کا وجود، اس عالم کے لئے زندگی اور تازگی کا سبب ہے۔ آپ مجھے اپنے فضل وکرم (پرتو) سے محروم نہ فرمائیں۔

خود بدانی قدرِ تن از جان بود
قدر جاں از پرتوِ جاناں بود

(رومی)

میرے آقا! آپ سے بڑھ کر اس نکتہ سے کون آگاہ ہو سکتا ہے کہ جسم کی قدر وقیمت، جان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر جسم میں جان نہ ہو تو جسم کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اور خود جان کی قدر وقیمت، محبوب کی نگاہِ کرم (پرتوِ ذات) پر موقوف ہے۔ یعنی جس شخص پر آپ مہربان نہ ہوں۔ یا جس شخص کی جان پر آپ اپنا پرتو نہ ڈالیں۔ اس کی جان کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔

یا ز نورِ مصطفےٰ اورا بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

(جاوید نامہ)

میرے آقا میں یہ چاہتا ہوں کہ غیر اللہ سے اپنا رابطہ بکلی منقطع کر لوں کسی انسان کی طرف دستِ سوال دراز نہ کروں۔ کسی شخص سے کوئی امید نہ رکھوں۔ اس لئے یا تو آپ مجھے شمشیر بنا دیں تاکہ جو طاقت

بھی مجھے آپ کے آستانے سے دور کرنے کی کوشش کرے اسے فنا کر دوں۔ یا مجھے ایسی روحانی قوت عطا فرمادیں کہ میری راہ میں جو دشواری حائل ہو اسے دور کر سکوں۔

شمشیر کنایہ ہے مادی ساز و سامان یا مال و دولت سے، اور جو شخص فارغ البال ہوتا ہے۔ وہ ضمیر فروشی سے محفوظ رہتا ہے۔ افلاس انسان کو غیر اللہ کے آستانہ پر جبہہ سائی کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔

" کَادَ الْفَقْرُ اَنْ تَکُوْنَ کُفْراً "

قریب ہے کہ مفلسی انسان کو کافر بنادے۔ (حدیث نبوی)

کلید کنایہ ہے روحانی قوت سے جس کی بدولت انسان اپنی تمام ضروریات خود پوری کر سکتا ہے۔ اور تمام دنیاوی مشکلات پر خود غالب آسکتا ہے اور اس لئے اصحاب اور ارباب اقتدار کے سامنے سرنیاز خم کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ مثال درکار ہو تو محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت موصوف کے لنگر خانہ کا خرچ کئی سو روپے روزانہ تھا (کم و بیش) پانچ ہزار نفوس دونوں وقت آنجناب کے دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے۔ لیکن حضرت نے کبھی کسی بادشاہ یا وزیر یا امیر یا جاگیردار کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔

یہ فقرہ تو میں نے ضابطہ کی خانہ پری کے لئے لکھا ہے ورنہ حضرت کی شان تو یہ تھی کہ سلطان علاؤالدین خلجی ساری عمر قدمبوسی کا آرزومند رہا مگر حضرت نے ہمیشہ اس کی استدعا کے جواب میں یہی فرمایا:-

" بادشاہ کا مقصد میرے پاس آنے سے یہی تو ہے کہ وہ مجھ سے

اپنے لئے اور اپنی سلطنت کے لئے دعا کرائے۔ تو میں خود اس کے حق میں
دعا کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے ملاقات کی ضرورت نہیں ہے۔
اسی شانِ استغناء کو مدِ نظر رکھ کر تو اقبال نے سرکار ابد قرار
صلعم سے یہ التجا کی ہے کہ

ع ۔ بامر اشمشیر گرداں اکلید

حضور! اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے علمِ دین سے بہرۂ وافر عطا فرمایا
ہے۔ مگر میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنے علم کے اقتضاء پر
عمل نہ کر سکا۔ اس لئے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے عمل صالح کی
توفیق عطا فرمائیے۔
کوہکن کے سامنے تو صرف ایک پہاڑ تھا۔ مگر میرے سامنے
تو اس سے بھی دشوار تر کام ہے۔ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار
کرنا اور پھر اُن کے دلوں میں آپ کی محبت کی آگ سلگانا۔ اس لئے میرے
عزم (تیشہ) کو مستحکم تر (تیز تر) کر دیجئے۔ اور میری حوصلہ افزائی کیجئے
مسلمانوں کو آپ کے آستانے پر جھکانا، بلا مبالغہ پہاڑ کھودنے
سے بھی زیادہ صبر آزما ہے۔
حضور! باایں ہمہ کوتاہی اور باایں ہمہ رسوائی، میں آپ کو یقین
دلاتا ہوں کہ میں "کافر خویشتن" نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ
تعالیٰ نے مجھ میں بے انتہا ترقی کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے۔ میں یہ
بھی جانتا ہوں کہ مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے اور میں اس حقیقت
سے بھی آگاہ ہوں کہ

ع ۔ عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

اس لئے میں آپ سے ملتجی ہوں کہ میری خودی کو فقر کی سان پر چڑھا دیجئے (یعنی مجھ پر نگاہِ کرم کر دیجئے)۔

## آخری بند:۔

حالِ دل بیان کر چکنے کے بعد اب اقبال آخر میں وہ بات زبان پر لاتے ہیں۔ جسے ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم ہر عاشق اپنے لئے باعثِ صد فخر و مباہات یقین کرتا ہے۔ بلکہ با ایں ہمہ بے سروسامانی اس پر ناز کرتا ہے۔

ذرا تصوّر کیجئے۔ ایک عاشق صادق کو خوش قسمتی سے یہ زرّیں موقع نصیب ہو گیا ہے کہ وہ اپنے معشوق کے سامنے بیٹھا ہے اور اس سے نگاہِ کرم کی التجا کر رہا ہے۔ قدرتی طور پر معشوق کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اس پر نگاہِ کرم کی جائے تو کیوں؟ یعنی اس عاشق میں کونسی خوبی ہے۔ جس کی بنا پر اسے موردِ الطاف بنایا جائے۔

عاشقِ صادق معشوق کی اس ذہنی کشمکش سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں جب تک کوئی شخص استحقاق ثابت نہ کرلے موردِ الطاف و کرم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ پوری ہمّت کے ساتھ کہتا ہے کہ۔

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است     چیزکے دارم کہ نام او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں     کز سُمِ شبدیزِ تو دارد نشاں

اے محبوب تجھے تسلیم ہے کہ میں اپنی کشتِ عمر سے کوئی "حاصل" فراہم نہ کر سکا۔ بالفاظِ دگر:۔

تخمِ کردارے ز خاکِ من نرست

میں واقعی اس قابل نہیں ہوں۔ کہ آپ کی خدمت میں ارمغانِ عمل

پیش کر سکوں۔ مگر ایک صداقت ایسی ہے جس کے اظہار سے میں
باز نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ لاکھ بُرا سہی مگر ہوں آپ کا عاشق۔

حضور میرے پاس ایک بہت معمولی سی چیز ہے جسے عرفِ عام میں
"دل" کہتے ہیں۔ پس یہ ذرا سا دل میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اور میں نے
اسے دنیا والوں سے ہمیشہ پوشیدہ رکھا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ
اس پر آپ کے گھوڑے کے سُم کا نشان ثبت ہے [1]

دعوئ الفت کے بعد اقبال اپنی دلی آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ
حضور! میں کسی دنیاوی حشمت وشوکت یا مال و دولت کا خواہاں نہیں
ہوں۔ میں تو آپ کا قرب چاہتا ہوں۔ آپ سے دور رہ کر مجھے اپنی زندگی
موت معلوم ہوتی ہے۔ عاشق کے زاویہ نگاہ سے

ع زندگانی بے حضور خواجہ مرگ

کا مصداق ہے۔ آپ سے دور رہ کر زندگی، زندگی ہی نہیں ہے۔

حضور والا! آپ نے تو اپنے ایک طالبِ صادق کو، جو کردی الاصل
ہونے کی بنا پر عربی زبان سے نابلد تھا۔ نطق اعرابی سے بہرہ ور
فرما دیا تھا۔ تو آپ کے لئے مجھے مدینہ بلا لینا کیا

---

[1] چونکہ حضور کو "شہسوار" کہہ کر خطاب کیا ہے لہٰذا اسی مناسبت سے
یہاں شبدیز کا لفظ استعمال کیا ہے سم شبدیز میں ایک عاشقانہ خوبی بھی
مضمر ہے وہ یہ کہ عاشق اپنی فرومایگی کا اظہار کر رہا ہے کہ میں اس قابل کہاں کہ
آپ کا نقش میرے دل پر کندہ ہوتا۔ میرے لئے یہی بس ہے کہ آپ کے گھوڑے
کے سم کا نشان میرے قلب کی زینت بنا ہوا ہے۔ ۱۲

مشکل ہے!

میرے آقا! میری حالت یہ ہے کہ حوادثِ روزگار کی وجہ سے میرے جگر میں لالہ کی طرح داغ پڑے ہوئے ہیں اور میرے احباب میرے حالِ دروں سے بیخبر ہیں۔ وہ اکثر اوقات میرے پاس آتے ہیں ہر قسم کی باتیں کرتے ہیں میری شاعری کی مدح میں نثر میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ کوئی مجھے ٹیگور سے بدرجہا بڑھاتا ہے۔ اور کوئی میرا رشتہ ملٹن اور شکسپیر سے ملاتا ہے۔ کوئی مجھے اپنے وقت کا رومی[۱] اور سعدی قرار دیتا ہے۔ مگر یہ بات کوئی نہیں پوچھتا کہ تم اپنے علاج معالجہ کے لئے ویانا کیوں نہیں جاتے؟[۲]

---

[۱] آنحضرت کے عشاق میں ایک بزرگ گذرے ہیں جو کردستان کے رہنے والے تھے اور عربی زبان سے مطلق ناآشنا تھے۔ انہوں نے حضور سے التجا کی کہ مجھے شرم آتی ہے کہ آپ سے محبت کا دعویٰ اور آپ کی زبان سے بیگانہ ہوں۔ رات کو یہ دعا کی اور جب صبح ہوئی تو وہ عربی زبان میں بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا۔ چنانچہ ان کا یہ قول تذکروں میں منقول ہے۔

اُمْسَیتُ کُرْدِیًّا وَ اَصْبَحْتُ اَعرابیاً

شام تک میں کردی تھا۔ لیکن جب صبح ہوئی تو عربی بن گیا۔ ۱۲

[۲] اس میں شک نہیں کہ اقبال ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے جو مردہ پرست ہے۔ اگر وہ ہندو قوم میں پیدا ہوئے ہوتے تو اس زندہ قوم کے افراد ویانا کے بہترین ڈاکٹروں کو "جاوید منزل" میں تشخیصِ مرض کے لئے لا سکتے تھے۔ لیکن اقبال کے مداح ان کی زندگی میں انہیں ویانا بھجوانے

حضورِ اقدس! میں اس دنیا میں نے کی طرح نالاں ہوں۔ کیونکہ مجھ سے ملنے کے لئے تو بہتیرے آدمی آئے مگر میرا درد کسی نے نہ جانا۔ میں اپنے آپ کو اس دنیا میں اس چوب نیم سوز سے تشبیہہ دیتا ہوں جسے قافلے والے جلتا ہوا چھوڑ گئے ہوں۔ اور اب وہ بیکار جل رہی ہو۔

کارواں کنایہ ہے قوم کی شوکتِ ماضیہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی عظمت کا مدت ہوئی خاتمہ ہو گیا۔ اب نہ کوئی عالمگیرؒ ہے نہ کوئی ٹیپو سلطان۔ صرف میں مرثیہ خوانی کے لئے زندہ ہوں "سوختن" کنایہ ہے قوم کی غفلت یا اس کے زوال پر نوحہ خوانی سے۔ مطلب یہ ہے کہ قوم مردہ ہو چکی ہے۔ بلکہ

خالصہ شمشیر و قرآں را ببُرد
اندریں کشور مسلمانی بمُرد ؎

(جاوید نامہ)

---

(بقیہ صفحہ) کا بھی انتظام نہ کر سکے۔ ہاں جب ان کا انتقال ہو گیا تو اس مُردہ پرست قوم نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق ہزاروں روپیہ مزار کی تعمیر پر بھی خرچ کر دیا اور ہر سال ۲۱ اپریل کو عرس بھی کر رہی ہے۔ غالباً ہندی زبان میں یہ مثل اسی موقع کے لئے وضع کی گئی تھی:-

جیتے تھے تو میرے لیکھوں جرٹے، مر گئے تو میرے موتیوں جرٹے۔ ۱۲

اور میں نوحہ خوانی کر رہا ہوں۔ اور اسی امید پر جی رہا ہوں کہ شاید مسلمانوں میں کوئی انقلاب پیدا ہو جائے۔ اور کوئی جماعت ایسی ظہور میں آجائے۔ جو میرے پیغام (آہ و نالہ و فریاد یا سوختن) سے استفادہ کرسکے اور اس طرح میرا جلنا (پیغام) کارآمد ہو سکے۔ یعنی میرے پیغام کا کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے۔

اے میرے آقا! چونکہ میں اپنے مقصد سے دور ہوں اس لئے مہجوری کا یہ احساس مجھے ہر وقت مصروفِ فغاں رکھتا ہے۔ اور میں ہر وقت اپنے حالِ زار (اپنی بدنصیبی) پر افسوس (وائے من) کرتا رہتا ہوں۔ ۱۲

---

حاشیہ صـ۷۰۱ ـ لـه میں نے دوسرے مصرع میں قدرے تصرف کیا ہے یعنی اندراں کی جگہ اندریں لکھا ہے۔ تاکہ ناظرین کو کشور کا مصداق معین کرنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔ ۱۲

ختم شد